امیر شریعت
حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ

علمی وفکری نقوش۔ ملی واجتماعی جدوجہد۔ دینی وروحانی خدمات

مرتب
حضرت مولانا عمید الزماں قاسمی کیرانوی
(سابق کارگزار صدر تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند)

معاون مرتب
مولانا ڈاکٹر وارث مظہری قاسمی
ایڈیٹر ماہنامہ "ترجمان دارالعلوم" دہلی

باہتمام
تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند نئی دہلی ۲۵

سوانح

امیرِ شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ

[علمی وفکری نقوش۔ ملی واجتماعی جدوجہد۔ دینی وروحانی خدمات]

مرتب

حضرت مولانا عمید الزماں کیرانوی قاسمیؒ
(سابق کارگزار صدر تنظیم ابنائے قدیم دار العلوم دیوبند)

معاون مرتب

مولانا ڈاکٹر وارث مظہری قاسمی
ایڈیٹر ماہنامہ ''ترجمان دار العلوم'' دہلی

باہتمام

تنظیم ابنائے قدیم دار العلوم دیوبند نئی دہلی ۲۵

نام کتاب : امیرِ شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ حیات وخدمات
(علمی وفکری نقوش، ملی واجتماعی جدوجہد، دینی وروحانی خدمات)
مرتب : مولانا عمید الزماں قاسمی کیرانویؒ
معاون مرتب: مولانا ڈاکٹر وارث مظہری قاسمی
کمپوزنگ : نوشاد عالم قاسمی
صفحات : ۶۲۴
قیمت : ۴۰۰
تعداد : ایک ہزار
سن طباعت: ۲۰۱۸ء

ملنے کے پتے:

- تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند، 161/19، سر سید ایونیو جوگابائی، جامعہ نگر نئی دہلی۔25
- دارالاشاعت خانقاہ رحمانی مونگیر (بہار)
- کتب خانہ حسینیہ دیوبند (یوپی)
- دارالاشاعت دیوبند (یوپی)
- مکتبہ فریدیہ قاسمیہ نئی دہلی
- دارالکتاب، دیوبند، ضلع سہارن پور

ترتیب

- پیش لفظ : مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمیؒ ۱۱
- مقدمہ : مولانا عمید الزماں قاسمی کیرانویؒ ۱۵

پیغامات

- حضرت مولانا مرغوب الرحمٰنؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند ۲۳
- حضرت مولانا حمید الدین عاقل حسامیؒ ناظم دارالعلوم حیدرآباد ۲۵

خطبات

- خطبۂ افتتاحیہ : مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ۲۷
- خطبۂ صدارت : مولانا محمد سالم قاسمی ۳۷
- خطبۂ استقبالیہ : مولانا عمید الزماں قاسمی کیرانویؒ ۴۳
- کلماتِ تشکر : مولانا قاضی زین الساجدین قاسمی ۴۷

باب اول ——— حیات وشخصیت

- حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ: کچھ یادیں کچھ باتیں : مولانا عمید الزماں قاسمی کیرانویؒ ۵۳
- مولانا رحمانی کی شخصیت کے عناصر ترکیبی : مولانا ڈاکٹر محمد اجتباء ندویؒ ۷۹

- حضرت امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانی کی شخصیت کے تشکیلی عناصر اور معاصرین میں ان کے امتیازات وتخصصات — مولانا خالد سیف اللہ رحمانی — ۸۵
- حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی: مزاج وانداز : مولانا عزیز الحسن صدیقی غازی پوری — ۱۱۷
- مولانا منت اللہ رحمانی: مزاج ومذاق اور طریقہ کار : انجینئر شاہ محمد صدیقی (ایڈوکیٹ) — ۱۲۹
- مولانا رحمانی کی شخصیت: کچھ یادیں، کچھ باتیں : مولانا غیاث الاسلام رحمانی — ۱۳۷
- حضرت امیر شریعت کی عزیز نوازی: گاؤں سے سری نگر تک : مولانا محمد سعید الرحمٰن شمس — ۱۴۲
- مولانا سید منت اللہ رحمانی کے ہم عصر علماء سے تعلقات : مولانا جنید احمد بنارسی — ۱۴۹

باب دوم ——— افکار وخیالات

- حضرت مولانا منت اللہ رحمانی بحیثیت ایک باحمیت عالم وفقیہ : مولانا محمد برہان الدین سنبھلی — ۱۵۵
- اصلاح معاشرہ: مولانا رحمانی کے فکر وعمل کے آئینے میں : مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی — ۱۶۵
- حضرت امیر شریعت کی حکمت وبصیرت : سید حامدؒ — ۱۷۱
- حضرت امیر شریعت کا سفر مصر وحجاز : شمس الرحمان فاروقی — ۱۸۱
- مولانا منت اللہ رحمانی کے تعلیمی نظریات : مولانا مفتی عبداللہ مظاہری — ۱۸۷
- شیخ طریقت، عارف باللہ مولانا منت اللہ رحمانی کے سماجی نظریات : مولانا امین عثمانی — ۱۹۵
- مولانا منت اللہ رحمانی کے سیاسی نظریات : مولانا امین عثمانی — ۲۰۳

- مولانا رحمانی کا مقالہ 'خاندانی منصوبہ بندی' میری نظر میں : پروفیسر بدرالدین الحافظ ۲۱۱
- مولانا کی شخصیت ''سفر مصر و حجاز'' کی روشنی میں : پروفیسر الطاف احمد اعظمی ۲۱۷
- مولانا منت اللہ رحمانی کی فقہی بصیرت : مولانا سہیل احمد قاسمی ۲۳۱
- مولانا رحمانی بحیثیت فقیہ : ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز ۲۷۹
- حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کے فکری و عملی امتیازات : مولانا ڈاکٹر وارث مظہری قاسمی ۲۸۴
- اکیسویں صدی میں مولانا رحمانی کے افکار کی اہمیت و معنویت : مولانا محمد ادریس صدیقی نانوتوی ۲۹۲
- مولانا رحمانی کی اردو نثر : ڈاکٹر زبیر احمد فاروقی ۲۹۸
- اردو نثر کے اسلوبی ارتقاء میں حضرت مولانا رحمانی کے امتیازات : پروفیسر ڈاکٹر لطف الرحمٰن ۳۰۴

باب سوم ——— خدمات اور کارنامے

- حضرت مولانا منت اللہ رحمانی اور آپ کی خدمات... : مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ ۳۱۹
- تحفظ شریعت تحریک کا اولین علم بردار : محمد عبدالرحیم قریشیؒ ۳۳۱
- حضرت امیر شریعت اور ان کی ملی خدمات : مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی ۳۵۱
- مولانا منت اللہ رحمانی شخصیت اور کارنامے : مولانا بدر الحسن قاسمی ۳۶۱
- مولانا رحمانی کے مجاہدانہ کارنامے : مولانا عبدالحفیظ رحمانی ۳۷۳
- حضرت مولانا منت اللہ رحمانی اور مسلم پرسنل لا بورڈ : مولانا مفتی اسعد قاسم سنبھلی ۳۸۵
- مولانا منت اللہ رحمانی اور مسلم پرسنل لا بورڈ : مفتی احمد نادر القاسمی ۳۹۴
- مولانا منت اللہ رحمانی اور امارت شرعیہ : مولانا انیس الرحمٰن قاسمی ۴۱۶

- امارت کے تاریخ ساز امیر شریعت : مفتی سہیل احمد رحمانی قاسمی ۴۲۲
- نظام قضا کی توسیع میں حضرت مولانا رحمانی کا حصہ : مولانا قاضی محمد جسیم الدین رحمانی ۴۵۱
- مولانا منت اللہ رحمانی کی علمی خدمات : مولانا باقر حسین قاسمیؒ ۴۶۱
- دینی مدارس اور آپ کی سرپرستی : مولانا محمد قاسم مظفر پوری ۴۷۱
- جنگ آزادی اور حضرت امیر شریعت : امتیاز رحمانی ۴۷۶
- مولانا منت اللہ رحمانی ایک مردم ساز شخصیت : مولانا اظہار الحق مظاہری ۴۸۰
- فرقہ وارانہ فسادات اور حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی : مولانا محمد انیس الرحمٰن قاسمی ۵۰۰
- تحفظ شریعت کا مرد میداں : مولانا مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی ۵۱۲

باب چہارم ——— نقوش وتاثرات

- جامع شریعت وطریقت : مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ ۵۲۱
- مولانا سید منت اللہ رحمانی: تھی جس کی فقیری میں بھی بوئے اسد اللہی : ڈاکٹر عبدالحق انصاریؒ ۵۲۹
- بیسویں صدی کی تاریخ ساز شخصیت : مولانا محمد عبداللہ مغیثی ۵۳۳
- بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا : مولانا احمد علی قاسمیؒ ۵۴۳
- حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی: بے باک قائد وعبقری مربی : مولانا نور عالم خلیل امینی ۵۴۷
- قومی ملکی اور انسانی مسائل کے بارے میں مولانا رحمانی کا نقطۂ نظر اور طرز عمل : مولانا محمد اسرار الحق قاسمی ۵۵۸

● ایک عہد ساز شخصیت	: مولانا اختر امام عادل	۵۶۵
● اجتماعیت، عزیمت اور جہد مسلسل...	: مولانا مفتی جمیل الرحمٰن قاسمیؒ	۵۷۲
● پیکر عظمت حضرت مولانا... یادوں کے چند نقوش	: ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی	۵۸۳
● نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری	: محمد مشتاق ملک	۵۹۰
● امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی اور میرا خاندان	: شاہد صدیقی	۵۹۶
● ملت کے مسیحا حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانیؒ	: صفی اختر	۶۰۲
● مولانا رحمانی کی چند نمایاں خصوصیات	: مفتی ارشد فاروقی	۶۰۶
● امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ	: ڈاکٹر عبدالقادر شمس قاسمی	۶۰۹
● مولانا منت اللہ رحمانی: نہنگوں کے نشیمن۔۔۔	: مولانا عین الحق امینی	۶۱۲

رپورٹ

● رپورٹ سیمینار	: ڈاکٹر عبدالقادر شمس قاسمی	۶۱۵

مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی ☆

پیش لفظ

مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے نقوش قدم

جامعہ نظامیہ بغداد نے اسلام کے ابتدائی دور میں غزالی جیسے طالب علم کو امام غزالی بنا دیا تھا تو دارالعلوم دیوبند نے ہندوستان کو بیسویں صدی میں جنید وشبلی بھی دیے۔ رازی وغزالی بھی اور ایسے ایسے نائبین رسول پیدا کر دیے جنھوں نے اسلامی ہند کو باقی بھی رکھا ترقی بھی دی اور ترقی کے راستے بھی ہموار کر دیے۔ مولانا منت اللہ رحمانی قدس سرہ ان ہی بزرگوں میں سے تھے جنھوں نے ملک وقوم کے لیے، اسلام اور مسلمانوں کے لیے اور تعلیم وتربیت کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں اور جگہ جگہ نشان راہ چھوڑ کر تشریف لے گئے۔

وہ جن عناصر سے بنائے گئے تھے وہ خالص دینی تھے۔ علوم بھی فنون بھی اور ماحول بھی۔ لیکن ان کو جو میدان عمل ملا وہ دین دار بھی تھا دنیا دار بھی اور انھوں نے دونوں کو اپنی ذہانت وجرأت اور علمیت سے نہ صرف نبایا بلکہ ترقی دی اور سنوار دیا۔ وہ جب ملک وقوم کو ضرورت پڑی تو جیل گئے۔ اخلاقیات اور معاملات کے لیے امارت شرعیہ کے میدان میں نکل آئے۔ شاہ بانو کیس کے دور میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی قیادت کرتے ہوئے جمہوری طریقے پر ملک گیر احتجاجی تحریک چلائی اور سپریم کورٹ کے فیصلے کو بدلوانے میں کامیاب ہوئے۔ تعلیم وتربیت کے نازک

☆ صدر تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند

مسئلے کے لیے جامعہ رحمانی مونگیر کو آگے بڑھایا اور دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء کو مفید سے مفید مشوروں سے نوازا۔ وہ ان دونوں دینی اداروں کے تاعمر رکن رہے۔ عالمی مسائل میں رابطہ عالم اسلامی کے ساتھ چلے اور دور تک چلتے گئے کیونکہ ان کی شخصیت ملکی نہیں عالمی تھی۔

دارالعلوم سے فراغت کے بعد انھوں نے بہار کو اپنی سرگرمیوں کے لیے منتخب کرلیا۔ جمعیۃ علماء ہند اور شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کے اکثر پروگرام میں شریک رہتے تھے اور خود مجلس عاملہ کے ممبر تھے۔ حضرت مدنیؒ کو بہار بلاتے تو سارے پروگرام خود ترتیب دیتے اور ان کے ساتھ ہر وقت رہنے کا اہتمام کرتے۔

مولانا رحمانیؒ نے امارت شرعیہ کو نظم وضبط دیا اچھے اچھے کارکن اور پروگرام دیئے اور مختلف شعبہ جات قائم کرکے مسلمانوں کے اجتماعی مسائل حل کرتے رہے جسے دوسرا کوئی انجام نہیں دے سکتا تھا۔

ان کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ اپنے اجتماعی کاموں کے لیے انھوں نے ذہین سے ذہین افراد کو اپنے ساتھ لگایا اور ان کی سرد وگرم میں سرپرستی کرکے میدان عمل میں سرگرم کردیا اور بھرپور رہنمائی فرمائی۔ ذہین افراد کو اپنے ساتھ ملانا اور ان سے کام لینا اور ان کو مطمئن رکھنا کسی قائد کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اور اس کے لیے مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی شخصیت مثالی تھی جس طرح حضرت شیخ الاسلامؒ نے مولانا حفظ الرحمٰنؒ، قاری محمد طیبؒ، مولانا محمد میاںؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کے ساتھ علمی، دینی اور سیاسی میدان سر کیے۔ اسی طرح مولانا رحمانیؒ نے اپنے دائرۂ کار میں ہر طرح کے رفقائے کار سے کام بھی لیا۔ ان کو مطمئن بھی رکھا اور ان کی رہنمائی بھی کی اس سلسلے کا ایک اہم نام قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کا ہے جن کو دینی اور سیاسی بلندیوں تک پہنچایا اور انھیں ہر طرح کے سہارے دینا اور مشکل سے مشکل جماعتی کاموں میں رہنمائی کرکے آگے بڑھانا مولانا رحمانیؒ کا قابل تقلید کارنامہ ہے۔

مولانا سے میری ملاقاتیں بہت کم رہی ہیں مگر جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ میں شریک ہونے کی وجہ سے میں نے ان کو قریب سے دیکھا ہے مثلاً مولانا اسعد صاحب کو مجلس مشاورت

بنانے میں بڑا اشکال تھا مگر مولانا رحمانی اس کے بنانے والوں میں سرگرم رہے تھے کیونکہ جس طرح انھوں نے مسلم پرسنل لا بنانے میں سرگرمی دکھائی تھی اسی طرح وہ مجلس مشاورت کو بھی مسلمانوں کی اجتماعی سربراہی کے لیے بہت مفید سمجھتے تھے مگر اس کی سرگرمی اس پر موقوف تھی کہ دوسری تمام جماعتوں کے سربراہ اور ذمہ داران اس کے متحرک اعضاء بن کر تعاون کرتے مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔

مولانا رحمانی کی آزمائش کا سب سے بڑا میدان تھا دارالعلوم دیوبند اور اس کی مجلس شوریٰ جہاں مولانا منظور صاحب نعمانی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور عبید الرحمٰن خاں شیروانی جیسے اہم حضرات ممبر شوریٰ تھے اور سب مل جل کر دارالعلوم کو چلاتے تھے ان حضرات نے طے کر لیا تھا کہ کوئی بھی معاملہ کثرت رائے سے نہیں اتفاق رائے سے طے کرنا چاہیے مگر اس کے لیے جتنی ذہانت جتنی قوت برداشت اور جس قدر ایثار کی ضرورت تھی وہ انھیں لوگوں کو معلوم ہے جو اس میدان میں اترے ہوں۔

مولانا رحمانی مجلس شوریٰ کے اہم رکن تھے اور ہمیشہ قابل قدر رہے اس سلسلے میں مجھے ایک مرتبہ واسطہ پڑا تو میں نے ان کی عظمت کا احساس کیا۔ کیونکہ دارالعلوم نے جب صد سالہ اجلاس کیا اور اس کے لیے ساری دنیا کے علماء کو اکٹھا کر لیا تھا تو اجلاس کے بعد بدقسمتی سے عالمی موتمر اور تنظیم فضلاء کے نام سے دو متوازی تنظیمیں قائم ہو گئیں اور دونوں کی سرگرمیاں بڑھیں اور بڑھتی چلی گئیں پھر دہلی لکھنؤ اور بمبئی تک دو طرفہ کوششوں میں دارالعلوم میں کشاکش کا ماحول پیدا ہو گیا مجلس شوریٰ دارالعلوم نے اسے محسوس کیا اور متفقہ طور پر طے کیا کہ موتمر اور تنظیم دونوں کے ذمہ داروں سے گفتگو کر کے دونوں کو قریب کر دیا جائے تو اس اہم کام کے لیے مجلس شوریٰ نے مولانا منت اللہ رحمانی کو منتخب فرمایا انھوں نے موتمر کے دو نمائندگان کو دارالعلوم کے مہمان خانے میں مدعو کیا تو مولانا اسعد صاحب کے ہمراہ بحیثیت جنرل سکریٹری راقم الحروف بھی حاضر ہوا وہاں مہمان خانے میں حضرت مولانا رحمانی اور حضرت مہتمم صاحب (حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ) تشریف رکھتے تھے ہم لوگ پہونچے تو بلا کسی تمہید کے مولانا رحمانی نے فرمایا کہ دارالعلوم کی صورت

حال بہت خراب ہو رہی ہے اس لیے ہم لوگ چاہتے ہیں کہ دونوں تنظیموں کو قریب کر دیں پھر خود ہی تجویز رکھی کہ آپ لوگ بھی حضرت مہتمم صاحب کو مؤتمر کا صدر منتخب کر لیں تو بات بہت مختصر اور آسان ہو جائے گی۔ ہم لوگوں نے ان کی تجویز منظور کر لی تو فرمایا کہ دوسرے عہدیداران کا انتخاب عشاء بعد کر لیا جائے گا۔ لیکن بعض وجوہات کی بناء پر بات آگے نہ بڑھ سکی۔

ہندوستان میں ان کی تگ و دو اور سوجھ بوجھ نے ان کو صف اول کے رہنماؤں میں پہنچا دیا تھا اور انھوں نے اپنی ذہانت، معاملہ فہمی اور جد و جہد سے ثابت کر دیا کہ قیادت پر ان کا حق ہے اس لیے جہاں پہنچتے ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ ان ساری بلندیوں کے باوجود ان کا خمیر جن عناصر سے بنا تھا اس بنا پر اور مولانا محمد علی مونگیریؒ کی نگرانی اور دعاؤں کا اثر تھا کہ مولانا رحمانی نے ذکر و شغل کو ایک دینی ضرورت سمجھ کر جاری رکھا اور استحضار آخرت قدم قدم پر ان کے ساتھ رہا۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایمان جب مکمل ہو جاتا ہے تو روح کے ۷۰ شعبے متحرک ہو جاتے ہیں جو آدمی کو انسان کامل بنا دیتے ہیں۔

چنانچہ مولانا رحمانیؒ جس مجلس میں پہنچ گئے یا جس تحریک میں شریک ہو گئے اسے انھوں نے اپنی ذکاوت، اخلاق اور حسن تدبیر سے بام عروج تک پہنچا دیا۔ اس لیے ان کے ساتھ کام کرنے والے انھیں اور ان کے اخلاق کو ہمیشہ یاد رکھیں گے اور ان سے رہنمائی حاصل کرتے رہیں گے۔

مولانا رحمانیؒ کے فرزند ارجمند ہندوستان کے مشہور و معتبر عالم دین مولانا محمد ولی رحمانی مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے والد محترم کے چھوڑے ہوئے کاموں کو مکمل کرنے اور ان کی دکھائی ہوئی راہوں کو منزل تک پہنچانے کا بیڑا اٹھایا ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولانا محمد ولی رحمانی نے بڑی حد تک والد محترم کے نقوش قدم کو نہ صرف باقی رکھا ہے بلکہ انھیں منور کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ مولانا محمد ولی رحمانی اپنے ساتھیوں کے ساتھ نہ صرف والد محترم بلکہ جد محترم کے کاموں کو بھی روشن کریں۔

———— ⊙⊙⊙ ————

مولانا عمید الزماں قاسمی کیرانویؒ☆

مقدمہ

ہندستان میں اسلام کے احیا اور مسلمانوں کے وجود کے استحکام کی جدوجہد کرنے والے اصحاب عزیمت کی عظیم تاریخ رہی ہے۔ اس خطے میں اسلام کی آمد کے بعد ہر دور میں اللہ تعالیٰ کی جاری سنت اور مشیت کے تحت ایسے لوگ سامنے آتے رہے جنھوں نے یہ فریضہ انجام دیا۔ ان کی بدولت اسلام اس ملک میں پھلا پھولا اور اس کی بنیادیں اس طرح مضبوط ہوگئیں کہ وہ ہر طوفان بلا خیز کا مقابلہ کرسکتی ہیں۔

بیسویں صدی میں اس قبیل کی جو عظیم و عبقری شخصیات پیدا ہوئیں ان کی فہرست طویل ہے۔ تاہم اس صدی کے نصف ثانی میں اسلامی اقدار کے احیا اور شریعت اسلامی کے تحفظ کی عملی تاریخ رقم کرنے والوں کی جو بھی مختصر سے مختصر تاریخ ترتیب دی جائے، اس میں ہمارے مخدوم و ممدوح حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی رحمہ اللہ کا نام گرامی سرفہرست ہوگا۔ آپ کے ذکر خیر کے بغیر آزاد ہندستان کی ملت اسلامیہ کی اجتماعی تاریخ نامکمل اور غیر معتبر ہوگی۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف واحساس آپ کی زندگی میں ہی کیا جانے لگا تھا پھر آپ کی وفات کے بعد اس پر علی الاعلان یا خاموشی کے ساتھ مسلمانانِ ہند کے تقریباً ہر باشعور و مخلص طبقے نے مہر تصدیق ثبت کی کیوں کہ آپ کی خدمات کسی ایک یا مخصوص طبقے تک محدود نہ تھیں۔ وہ پورے طور پر اسلام کے سپاہی تھے اور اسلام کے بنیادی اقدار کے احیاء و بقا کو اپنا مشن تصور کرتے تھے۔

☆ کارگزار صدر تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند

آپ کی عظیم شخصیت جمالی اور جلالی دونوں طرح کی صفات سے مرکب ہے یعنی ایک طرف آپ عارف طریقت، بحر معرفت کے غواص اور صاحب زاویہ وخانقاہ صوفی ہیں اور مفکرانہ دماغ رکھنے والے صاحب قلم عالم تو دوسری طرف میدان عمل کے مجاہد عظیم اور بطل جلیل.. ایک طرف آپ نے دردِ دل کی دولت تقسیم کی تو دوسری طرف جہد وعزیمت کے چراغ روشن کیے۔ آپ کے خانوادے کی روایت بھی یہی تھی۔ آپ کے والد گرامی قدر حضرت مولانا محمد علی مونگیری قدس سرہ کی شخصیت میں بھی یہ دونوں صفات وخصوصیات بہم آمیختہ تھیں جو گویا آپ کو ان سے وراثت میں حاصل ہوئیں۔

آپ کی شخصیت اور خدمات کے مختلف اور نوع بہ نوع پہلو ہیں۔ ہر پہلو کی اپنی جامعیت و وسعت ہے اور اس اعتبار سے ہر پہلو اس بات کا متقاضی ہے کہ اس پر شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈالی جائے جو اس مختصر سی تحریر میں ممکن نہیں اور شاید یہاں اس کی باضابطہ ضرورت بھی نہیں کیوں کہ زیر نظر کتاب میں شامل مقالات انھی مختلف پہلوؤں سے بحث کرتے ہیں۔ تاہم ان میں سے بعض خصوصیات کا اہم خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کرنا چاہیں گے جنھوں نے ذاتی طور پر خود مجھے اور مجھ جیسے ہزاروں لوگوں کو متاثر کیا اور جن سے آنے والی نسلوں کو فکر وعمل کو ہموار کرنے میں مدد ملتی رہے گی۔

ان خصوصیات میں میری نظر میں حضرت امیر شریعتؒ کی سب سے بڑی خصوصیت مستقبل شناسی پر مبنی حرکیاتی (Dinamic) سوچ اور عملیت پسندی تھی۔ اس سوچ اور عمل کی ہم آہنگی نے حضرت مولانا کو ہندستان کی ملت مسلمہ کے لیے سراپا اضطراب بنا دیا تھا۔ اسی وصف کی بدولت وہ مدرسہ وخانقاہ سے متعلق ڈھلی ڈھلائی فکر (Steriotype)، جس کا اظہار اقبال کے اس مشہور مصرعے میں ہوا ہے:

نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

کو بدلنے میں کامیاب رہے۔ انھوں نے اپنے مدرسہ وخانقاہ کو متحرک اور عمل مسلسل کی تصویر بنا دیا اور انہیں ایک زندہ وتوانا تحریک میں تبدیل کر دیا۔ مستقبل شناسی، زمانہ شناسی کا حتمی

نتیجہ ہوتی ہے۔حدیث میں اسے مومن کا وصف بتایا گیا ہے۔امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول ہے کہ: جو اہل زمانہ سے واقف نہیں وہ جاہل ہے (من لا یعرف أهل زمانه فهو جاهل)۔اہل زمانہ سے واقفیت کی یہ فقیہانہ تعبیر دراصل زمانہ شناسی اور گردش حالات سے واقفیت سے عبارت ہے جس کی نمایاں صلاحیت اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ودیعت کی تھی۔اپنی اس غیر معمولی وہبی صلاحیت اور بصیرت کی بنیاد پر پیشگی طور پر طوفان کا انداز کرتے ہوئے انھوں نے ہندوستان کی امت مسلمہ کے ملی واجتماعی تحفظ کا بھرپور بندوبست کرنے کی کوشش کی اور یہ کوشش کامیاب رہی جس کا اندازہ مسلمانوں کے ملی واجتماعی مسائل پر نگاہ رکھنے والا ہر شخص بہ آسانی کرسکتا ہے۔

حضرت مولانا رحمانی کے اندر موجود اس جوہر کو چمک حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد، بانی امارت شرعیہ بہار کی صحبت کے فیض وتاثیر سے حاصل ہوئی تھی۔یہ حقیقت ہے کہ آزادی سے قبل ملک میں قلعۂ اسلام کے تحفظ کے لیے مولانا سجاد علیہ الرحمہ نے افراد سازی اور ادارہ سازی کی سطح پر جو عملی پیش بندی کی، آزادی کے بعد اس نوع کی عملی پیش بندی اور تحفظ اسلام ومسلمین کی کوشش کو سب سے بڑا ملی فریضہ سمجھ کر حضرت مولانا رحمانی نے انجام دیا۔فطری سطح پر موہوب ومستحکم شخصیات کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ حالات کی نزاکت اور سنگینی میں ان کی صلاحیت کار میں اور اضافہ ہوتا ہے۔ان کی ہمتوں اور عزائم کو اس سے مہمیز ملتی ہے۔حضرت مولانا رحمانی اسی قبیل کی شخصیات میں سے تھے۔پچھلی صدی کے نصف آخر کی ابتدائی چار دہائیوں میں خانقاہ رحمانی مونگیر، امارت شرعیہ، پٹنہ اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے حوالے سے جن نازک اور آشوب ناک حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے انھوں نے ملت کے قافلے کو آگے بڑھایا وہ اس حقیقت پر شاہد عدل ہے۔حضرت مولانا اپنی مختلف الجہات خصوصیتوں اور صلاحیتوں کی بنا پر اپنے کام کے لیے متعدد میدانوں کا انتخاب کرسکتے تھے لیکن انھوں نے اپنے لیے جس میدان کا انتخاب کیا وہ ان تمام میدانوں اور راہوں کے بیچ سے گزرتا تھا۔نئی نسلوں کے لیے اس میں یقیناً ایک اہم پیغام پوشیدہ ہے۔

حضرت امیر شریعتؒ کے انھی امتیازات وخصوصیات کی بنا پر تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم

دیوبند کی طرف سے ان پر سیمینار کے انعقاد (مارچ ۲۰۰۵ء) کا جب اعلان کیا گیا تو علما اور دانشوروں کے دونوں حلقوں کی طرف سے اس کا بھرپور خیر مقدم کیا گیا اور ملک کے موجودہ سیاسی ماحول میں اس کو ایک بروقت اقدام تصور کرتے ہوئے لوگوں نے اس کی مکمل تائید وحمایت کی، جس سے کارکنانِ تنظیم کو کافی حوصلہ ملا۔ چناں چہ انھوں نے سیمینار کو متوقع کامیابی سے ہم کنار کرنے کی جدوجہد میں کوئی فروگزاشت نہیں کی۔ البتہ ہمارے ذہنوں میں تادم آخر یہ کھٹک باقی رہی کہ اگر حضرت امیر شریعت کی والا قدر شخصیت کے مطابق اور شایانِ شان سمینار کے انعقاد میں ہم ناکام رہے تو بہر حال ہم اہل تنظیم کو تو ندامت ہوگی ہی، ملت کے بڑے حلقے کی طرف سے تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑے گا، لیکن بحمد اللہ سیمینار کے بعد علما اور اہل دانش دونوں حلقوں کی طرف سے جو تاثرات ہمیں موصول ہوئے وہ سیمینار کی کامیابی کی عکاسی کرتے تھے۔ اس سے ہمیں کچھ ویسا ہی اطمینان اور خوشی حاصل ہوئی جو ۲۰۰۰ء میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند پر سیمینار کر کے حاصل ہوئی تھی۔

اب سیمینار میں پیش کردہ مقالات کے مجموعے کو قارئین کے سامنے پیش کرتے ہوئے ہمیں دوبارہ انتہائی خوشی ومسرت حاصل ہو رہی ہے۔ سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالات کے لیے ہم نے ہمہ گیر خاکہ بنایا تھا۔ تفصیلی عنوانات مرتب کیے تھے جو حضرت امیر شریعت کی شخصیت اور خدمات کے تمام اہم اور جامع پہلوؤں اور گوشوں کو محیط تھے۔ اہل علم وقلم کو ہم نے الگ الگ عنوانات ارسال کیے اور ان سے مقالات کی درخواست کی، لیکن جیسا کہ عموماً سیمینار منعقد کرنے والوں کو اس کا تجربہ ہوتا ہے، اہل قلم حضرات کی بڑی تعداد نے خود اپنے طور پر اپنے احساسات ومشاہدات کو زیب قرطاس کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ اس وجہ سے بہت سی باتیں، واقعات اور تبصرے اعادہ وتکرار کے ساتھ مختلف مقالوں میں موجود ہیں۔ ہم نے مناسب سمجھ کر بعض مقالات میں اس طرح کے مکررات کو اس شکل میں لانے یا معمولی قطع وبرید کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس سے نفس مقالہ کی ساخت اور روح متاثر نہ ہو۔ تاہم ایسے اکثر مقالات سے ہم نے مختلف النوع افادیتوں کے پیشِ نظر، چشم پوشی کرنا ہی مناسب سمجھا ہے۔

مقالوں کی ترتیب میں بھی مقالہ نگار کی بجائے جس شخصیت پر یہ مقالے لکھے گئے ہیں، اس کے اہم پہلوؤں کی ترتیب اور قدر کو اہمیت دی گئی ہے۔

اسی طرح بعض جگہوں پر ہم نے فٹ نوٹ لگائے ہیں۔ اس کا مقصد، متعلقہ امور کی تشریح و وضاحت ہے۔ اس سے مقالہ نگار کی تنقید و تردید ہرگز مقصود نہیں ہے۔ بسا اوقات کوئی چھوٹی سی بھول، غلطی بہت بڑی سطح پر غلط فہمی اور بداندیشی کا باعث بن جاتی ہے اور اصل حقیقت کے نظر سے اوجھل ہو جانے سے گونا گوں نقصانات کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مختلف مقامات پر توضیحی حواشی کو ناگزیر تصور کیا گیا۔

ہمیں احساس ہے کہ اس مجموعۂ مقالات کو بہت پہلے منظر عام پر آجانا چاہیے تھا لیکن گوناگوں تنظیمی و جماعتی مصروفیات کی وجہ سے اس میں تاخیر ہوئی اور قارئین کو انتظار کا کرب جھیلنا پڑا۔ امید ہے کہ ان قیمتی مقالات کو پڑھ کر، انشاء اللہ اس کی تلافی ہو جائے گی۔

اخیر میں ہم اپنے تمام اہل قلم اور معاونین کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرنا ضروری تصور کرتے ہیں جن کی وجہ سے سیمینار کا انعقاد عمل میں آسکا اور اس موقع پر لکھے اور پیش کیے گئے مقالات کا یہ مفید مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ امید ہے کہ یہ مجموعہ مقالات حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت، فکر اور خدمات پر مستقبل میں کام کرنے والوں کے لیے ایک اہم ماخذ اور موجودہ و آئندہ نسلوں، خصوصاً ان میں سے تحریکی اور علمی میدانوں میں کام کرنے والے اصحاب عمل و عزیمت کے لیے، مشعل راہ ثابت ہوگا۔

اخیر میں اپنے احباب و معانین کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض تصور کرتا ہوں۔ سب سے پہلے میں اپنے دیرینہ رفیق حضرت مولانا محمد ولی رحمانی صاحب مدظلہ کا شکرگزار ہوں کہ جب تنظیم کی طرف سے سیمینار کے انعقاد کی پرعزم خواہش کی انہیں اطلاع ملی تو انہوں نے اس پر اپنی مسرت کا اظہار کیا اور بنفس نفیس بھی اس پروگرام میں شریک رہے۔ میں خاص طور پر مولانا وارث مظہری قاسمی (مدیر تحریر ''ترجمان دارالعلوم'') کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ شروع سے اخیر تک مقالات کی ترتیب میں ان کی معاونت شامل رہی۔ انہوں نے حضرت امیر شریعتؒ سے

اپنی فکری وابستگی کی بنیاد پر اس کام میں خصوصی دل چسپی لی۔اسی طرح مولانا مزمل الحق الحسینی (کارگزار جنرل سکریٹری تنظیم ابنائے قدیم) کا بھی میں تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ سیمینار کے انعقاد وانتظام سے متعلق ایک ذمہ دار کی حیثیت سے انہوں نے نہایت اہم اور بنیادی ذمہ داریاں نبھائیں۔۔اللہ تعالیٰ ان کو بیش از بیش جزادے۔علاوہ ازیں مولانا عبدالرحمان قاسمی اور مولانا نوشاد عالم قاسمی (آفس سکریٹری تنظیم) کا بھی مشکور ہوں کہ ان کے توسط سے اس مجموعے کی کمپوزنگ اور متعلقہ مراحل طے ہوئے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری اس کوشش کو قبول فرمائے اور اس کو ہمارے لیے ذخیرہ آخرت بنائے۔(آمین)☆

☆ نوٹ:افسوس کہ مولانا عمید الزماں کیرانوی مرحوم کا 24راکتوبر2010 کو انتقال ہوگیا۔اور وہ اس مجموعہ مقالات کو مطبوعہ شکل میں نہ دیکھ سکے۔اس مجموعے کی ترتیب واشاعت مولانا کی دلی آرزوؤں کا حصہ تھی۔وہ اس مجموعے کے لیے ایک طویل اور پر مغز مضمون بھی تحریر کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔مجموعے کی ترتیب میں تاخیر کی ایک وجہ یہی رہی کہ اپنی فعال علمی وعملی زندگی اور اس کی شب وروز کی مصروفیات میں ان کو اس کے لیے وقت نکال پانا مشکل ہوتا رہا۔اس کے علاوہ بعض دوسرے مسائل کی بنا پر بھی اس کتاب کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہوتی چلی گئی اور اب مولانا کے انتقال کے ایک مدت کے بعد اس کو منظر عام پر آنے کا موقع مل رہا ہے۔دعا ہے کہ مولانا مرحوم کی یہ کوشش ان کے حسنات میں شمار ہو کر ان کے لیے ذخیرہ آخرت بنے۔(ادارہ)

پیغامات
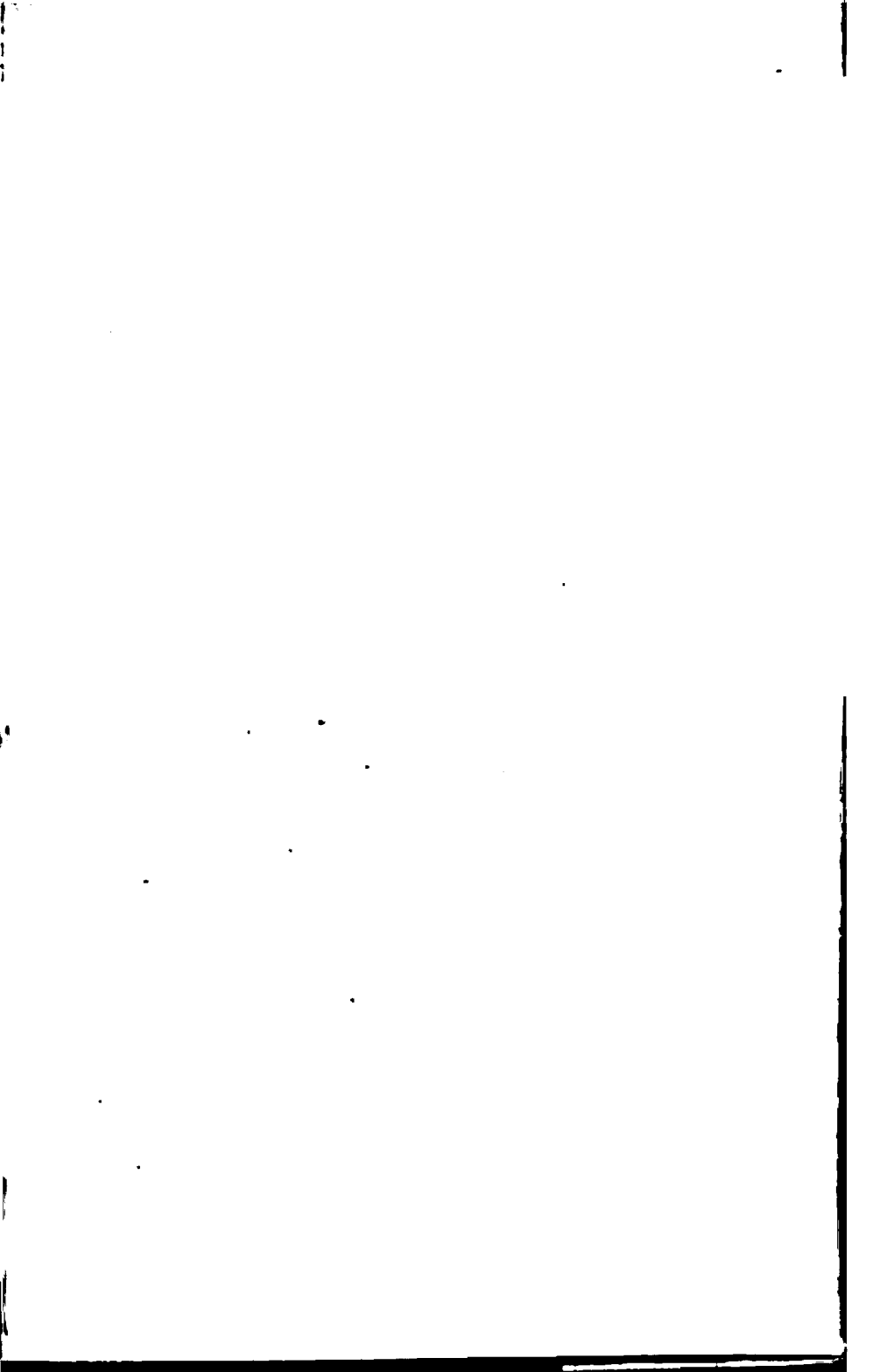
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰنؒ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

حامداً و مصلیاً! دارالعلوم دیوبند کی علمی اور روحانی فضاؤں میں جن احباب سے مخلصانہ تعلقات قائم ہوئے اور ان کی محبت کے نقوش آج تک لوحِ دل پر ثبت ہیں، اُن میں جناب مولانا منت اللہ رحمانی رحمہ اللہ کی شخصیت اور یادوں کو بھلا دینا ممکن نہیں۔

موصوف علم و فضل کے لیے مشہور خاندان کے نامور فرزند اور خود اخلاقِ حمیدہ کے حامل انسان تھے، دارالعلوم سے فراغت کے بعد انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ان میں موصوف کے اخلاص، جد وجہد، اصابتِ رائے اور سلیقہ کا بڑا دخل ہے، ان کی زندگی، اسلام اور وطن کی تعمیر و ترقی کے لیے وقف تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی جلیل القدر خدمات سے، ان کے آباء و اجداد کا، دارالعلوم دیوبند کا اور خانقاہ رحمانی کا نام روشن ہوا، امید کہ پروردگار عالم ان کی خدمات کو شرفِ قبول عطا کرے گا۔

مجھے یہ معلوم کر کے بے پایاں مسرت حاصل ہوئی کہ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند، موصوف کی شخصیت اور خدمات پر سیمینار منعقد کر رہی ہے، خدا اسے کامیابی سے ہمکنار کرے۔

مولانا منت اللہ رحمانی مرحوم سے راقم الحروف کے تعلقات کی نوعیت کے تقاضے میں راقم کو خود شریک مجلس ہونا چاہیے تھا، لیکن میں اپنے ضعف و ناتوانی کے باعث شرکت سے معذور ہوں اور اس تحریر کے ذریعہ سیمینار کا انتظام کرنے والوں کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں

اور امید کرتا ہوں کہ ان کے دامنِ فیض سے انتساب کا شرف رکھنے والے ان کے مشن کو آگے بڑھائیں گے۔

فضل خداوندی سے امید رکھنی چاہیے کہ ان شاء اللہ، موصوف کے نقش قدم کی پیروی اور ان کے کاموں کی تکمیل، حسنات میں اضافہ کا سبب ہوگی۔ والحمد للّٰه اولا و آخرا.

———— ⊙⊙⊙ ————

حضرت مولانا حمید الدین عاقل حسامیؒ

سابق امیر ملت اسلامیہ حیدرآباد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلہ نبوت کے ختم ہو جانے کا لازمی تقاضہ ہے کہ اس امت میں ایسی شخصیتیں پیدا ہوتی رہیں جو مسلمانوں کی اصلاح اور اہل ہوس کی طرف سے پیدا کیے جانے والے انحرافات سے اسلام کی حفاظت کا فریضہ انجام دیں۔ ایسی ہی شخصیتوں میں ماضی قریب کی ایک اہم شخصیت، شیخ طریقت، مصلح امت، امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی نور اللہ مرقدہ، امیر شریعت بہار واڑیسہ وسجادہ نشین خانقاہ رحمانی مونگیر کی تھی۔ وہ بڑے صاحب علم تھے، تفقہ فی الدین کی نعمت سے سرفراز تھے، لاکھوں اشخاص نے ان کے دست حق پرست پر بیعت کی، بہار واڑیسہ وجھارکھنڈ میں انھوں نے امارت شرعیہ کے نظام کو ایک نئی زندگی عطا فرمائی۔ پورے ملک کے لیے اس کی حیثیت نمونہ اور روشنی کی ہوگئی اور ملک کے کئی دوسرے صوبوں میں بھی نظام امارت کے قیام میں ان کا حصہ رہا۔ انھوں نے جامعہ رحمانی مونگیر کی نشاۃ ثانیہ کر کے تعلیم وتربیت کے میدان میں ایک ناقابل فراموش کارنامہ انجام دیا۔ جہاں سے راسخ العلم علماء کی ایک بڑی تعداد نکلی۔ وہ اثر انگیز خطیبانہ صلاحیت کے حامل بھی تھے اور شیریں قلم مصنف بھی۔ ہندوستان کے کتنے ہی اہم اداروں اور تنظیموں سے ان کا ذمے دارانہ تعلق تھا اور ہر جگہ ان کی رائے کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن ان کا سب سے امتیازی وصف تحفظ شریعت کی تحریک کا قیام اور اس راہ میں پر عزیمت کردار ہے۔ ان ہی کی تحریک اور توجہ سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ وہ باتفاق رائے اس کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے

اور اپنی اس ذمے داری کو حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیا اور اس قافلہ کو آگے بڑھایا جو ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا ناقابل فراموش باب ہے۔ انھوں نے اس راہ میں کبھی مداہنت کو گوارہ نہیں کیا اور دین حق کی ترجمانی میں کسی تعلق اور مفاد کو سدّ راہ نہیں بننے دیا اور نہ دوسروں کو ایسی جسارت بے جا کا موقع دیا۔ وہ جس بات کو حق سمجھتے تھے اس کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کو تیار رہتے تھے، نہ کوئی طاقت انھیں خوف زدہ کر سکتی تھی اور نہ دنیا کی متاع حقیر ان کے قدم پھسلا سکتی تھی۔

تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کی طرف سے موجودہ حالات میں ان کی شخصیت پر سیمینار منعقد کرنا نہایت ہی بروقت اقدام ہے۔ اس سے نئی نسل کو ناموافق حالات میں بھی استقامت اور حسن تدبیر کا سبق ملے گا۔ میں دعا کرتا ہوں کہ یہ سیمینار اپنے مقصد میں کامیاب ہو، اس کے ذریعے مولانا رحمانی کا پیغام امت اسلامیہ تک پہنچے اور ہم سبھوں کو ان کے عزیمت مندانہ راستہ پر چلنے اور ثابت قدم رہنے کی توفیق میسر آئے۔ اللہ تعالیٰ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو ان کی خدمات کا بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے اور ان کی چھوڑی ہوئی امانتوں کو زندہ، پائندہ اور تابندہ رکھے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ☆

خطبۂ افتتاحیہ

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین محمد، وعلی آلہ وصحبہ أجمعین، وبعد:

برصغیر ہندو پاک میں مسلمانوں نے صدیوں حکومت کی، اس دوران مختلف خاندانوں کے حکمراں آئے اور گئے اور اس بڑے ملک کے معاملات کی انجام دہی میں اپنی اپنی ذہانت اور قوت کار کی تاریخ بنائی۔ ان حکومتوں کا ملک کے عام معاملات میں طرز عمل سیاسی اور غیر مذہبی رہا۔ اس طرح اس ملک کے مختلف مذاہب کو اپنے اپنے طرز پر رہنے اور اپنے اپنے ماننے والوں میں اپنے مذہب وملت کے تقاضوں پر عمل کرنے کی آسانی رہی۔ گزشتہ دو صدیوں کے دوران برطانوی حکومت کے ہاتھوں میں یہاں کی عنان حکومت آگئی اور انھوں نے ملک کے باشندوں کے لیے اگرچہ سیکولر انداز ہی اختیار کیا لیکن اپنے برطانوی ملک کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ملک کو اپنے ملک کی جائداد سمجھا اور اسی کے مطابق سیاسی وانتظامی رویہ اختیار کیا اور اپنے کو برتر اور ملک کے عوام کو کمتر درجہ کا سمجھنے کا رویہ اختیار کیا، چنانچہ ان سے گلوخلاصی کی تحریکیں چلیں اور ملک کے سب طبقات نے متحد ہوکر جہاد آزادی میں شرکت کی اور طویل جدوجہد کے بعد ۱۹۴۷ء میں ملک کو آزادی ملی اور یہ آزادی شاہی نظام کے بجائے جمہوری

☆ ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

نظام کی صورت میں حاصل ہوئی۔

۱۸۵۷ء کے بعد کا دور مسلمانوں کے لیے خاص طور پر بہت سخت گزرا، جب کہ برطانوی استعمار نے اپنے انتقام کا نشانہ زیادہ تر مسلمانوں کو بنایا اور صرف اسی برصغیر ہی میں نہیں بلکہ مغربی ایشیا کے مسلم ممالک کو بھی اپنی سامراجی زیادتیوں کا نشانہ بنایا، وہاں اس کی چیرہ دستیوں نے ترکوں اور عربوں کو سخت گزند پہنچائی اور وہاں مسلمان حکومتوں کو شکستہ اور پراگندہ بنایا۔ ایسے وقت میں ہمارے برصغیر کی بزرگ شخصیتوں نے اپنی صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے امت مسلمہ کے دینی بقاء اور ملی تحفظ کے لیے بڑی کوششیں کیں، چنانچہ ایک طرف اس برصغیر کی آزادی کی لڑائی چھیڑی اور دوسری طرف مسلمانوں کی دینی وسماجی اقدار کو بچانے کا کام انجام دیا۔ ملک کی آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد ایسی بڑی شخصیتوں کے نام نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

آزادی کے بعد ملک کے جمہوری چوکٹے میں مسلمانوں کو اقلیت کی حیثیت حاصل ہوئی اور اقلیت میں ہونے کی صورت میں ان کو اپنے مذہب اور ملی اقدار کے تحفظ کی ضمانت کی ضرورت محسوس ہوئی، جو ملک کے دستور میں ان کو دی گئی ہے، لیکن ایسی کسی ضمانت کے صحیح نفاذ کے لیے خود اقلیت کو بیدار مغزی سے کام لینا ہوتا ہے اور حسب ضرورت قوت کردار کو صحیح طور پر استعمال کرنا ہوتا ہے۔

ہمارے اس ملک کے مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے کہ ان میں برابر ایسے افراد پیدا ہوتے رہے جو اس مطلوبہ بیدار مغزی اور صحیح قوت کردار کے حامل رہے، ماضی قریب کے ایسے ہی عظیم افراد میں ہمارے اس مذاکرۂ علمی کی اختیار کردہ شخصیت حضرت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی (رحمۃ اللہ علیہ) کی شخصیت بھی نمایاں طریقہ سے سامنے آئی، وہ ایک طرف عظیم القدر عالم دین اور دوسری طرف دینی مرشد ومربی، تیسری طرف ملت کے سماجی وملی معاملات کی فکر رکھنے والے رہبر قوم اور چوتھی طرف سیاسی بصیرت رکھنے والے کارگزار رہبر تھے۔

انھوں نے اپنی اس چوگوشہ صلاحیتوں اور خصوصیات سے ملک وملت کو بڑی تقویت

پہنچائی اور قابل توجہ معاملات کے حل کے لیے خصوصی کارگزاری کا ثبوت دیا۔

انھوں نے ملت کے دو میدانوں یعنی ملت کے تشخص اور اس کی شریعت کی حفاظت کی طرف خاص طور پر توجہ دی، ان میں ایک خود ملت کے اندرون کے دائرے میں پیش آنے والے معاملات تھے۔ مولانا کو ان کی مبصرانہ اور رہبرانہ صلاحیت کی بناء پر امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کا منصب پہلے ہی حاصل ہو چکا تھا، لہٰذا اس کے ذریعہ مسلمانوں کے شرعی معاملات کے لیے ضروری تدبیر و انتظام سے کام لیا، اور ملت کے اپنے سماجی معاملات اور شریعت اسلامی پر عمل کے نفاذ کی فکر کی۔ پھر اس کام کو نئے قائم ہونے والے پوری ملت کے نمائندہ ادارہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذریعہ مزید وسیع کرنے کی قابل قدر فکر کی۔

دوسرا میدان عمل ان کا شریعت اسلامی کے تحفظ میں ملت کے باہر سے پیش آنے والے خطرہ کا معاملہ تھا جو ملک کے قومی و وطنی دائرے کے اندر ابھرتا نظر آنے لگا تھا، اس کے لیے ضرورت تھی کہ شریعت اسلامی کے تحفظ میں دستور کے ذریعہ حاصل کردہ اسلامی شریعت کا حق صحیح طور پر برقرار رہے، چنانچہ جس وقت شریعت کے تحفظ کے سلسلہ میں خطرہ محسوس کیا گیا اور دستور کے دیئے ہوئے حق کی بنیاد پر اس خطرہ کو دور کرنے کی کوشش کی ضرورت سامنے آئی تو اس کے لیے متفقہ طریقہ سے کوشش کرنے کی خاطر مسلمانوں کے اس مشترکہ و متفقہ فورم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل عمل میں لائی گئی اور اس میں مولانا منت اللہ صاحب نے خصوصی روح رواں کی حیثیت سے کردار انجام دیا اور پھر زندگی بھر اس کے معاملات و مسائل کے حل میں پیش پیش رہے اور انھوں نے بورڈ کے منتخب جنرل سکریٹری کی حیثیت سے بورڈ کے اول صدر مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے صدر مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے اتفاق و مشورہ سے قابل حل مسائل کے حل کا نمایاں کام انجام دیا۔ اس طرح آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذریعہ ان مذکورہ بالا حضرات نے مسلمانوں کے ملی اتفاق و اتحاد کی ایک غیر معمولی بنیاد قائم کی جو عوامی سطح پر بالکل منفرد مثال ہے اور مسلمانوں کی سمجھ داری اور ان کی ملی عزت و شہرت کا بھی ذریعہ ہے۔

مولانا منت اللہ صاحب رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ اعلیٰ صفات کچھ تو ان کے والد ماجد حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ سے ورثہ میں ملی تھیں جو عظیم عالم دین اور داعی و رہبر ملت تھے اور کچھ ان میں والد ماجد کی نگرانی اور جذبۂ اصلاح و تربیت کے سایے میں تربیت پانے سے حاصل ہوئی تھیں۔ انھوں نے دیکھا تھا کہ کس غیرت دینی اور سوز عمل سے ان کے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ملت کے تعلیمی اور سماجی تحفظ کے لیے کام کررہے تھے، ان کے والد ماجد نے مسلمانوں کے تعلیمی نصاب و نظام کو بہتر بنانے کے لیے ندوۃ العلماء کے قیام کے عمل میں اولین حصہ لیا اور عیسائیت اور قادیانیت کے فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لیے مونگیر کو مرکز عمل بنایا اور مسلمانوں کی دینی واخلاقی تربیت کا بھی اس کو مرکز بنایا۔ مولانا منت اللہ رحمانی صاحب کے ذہن نے اپنے والد کے جذبۂ دینی و فکر و عمل سے یقیناً خصوصی اثر لیا ہوگا۔ چنانچہ اپنے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد انھوں نے ملت کے دینی و سماجی مقاصد کے لیے فکر اور جدوجہد کا پورا ثبوت دیا اور ملت کے دینی و سماجی تحفظ کا کام انجام دیا۔

انھوں نے اپنی تعلیمی زندگی کا آغاز مونگیر و حیدرآباد سے کیا، پھر چار سال ندوۃ العلماء میں اور اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں رہے اور تعلیم مکمل کر کے ملت و شریعت کی نصرت کی ذمہ داری سنبھالی۔

ملت اسلامیہ کے مفاد کی فکر میں ان کا جو حصہ رہا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے، ان کی دوراندیشی، حکمت عملی اور جذبۂ عمل کی داد عام طور پر دی گئی۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ جن کا بحیثیت صدر بورڈ کے اور بحیثیت ایک دوست اور شریک عمل کے مولانا منت اللہ صاحب کا ساتھ رہا، انھوں نے مولانا کی وفات پر جو تاثرات تحریر کئے، ان میں وہ لکھتے ہیں:

> ''مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کا احساس ذمہ داری، ملت کے ساتھ رابط و تعلق اور اس کے مصائب و ابتلاءات پر دلگیر و فکر مند ہونا، مسلم پرسنل لا کی تحریک ہی میں محدود نہیں تھا، وہ فرقہ وارانہ فسادات، مسلمانوں کی نسل

کشی، مساجد کے انہدام وغیرہ کے واقعات پر بھی ایسے ہی فکرمند ہوجاتے تھے اوران کے سلسلہ میں کوئی سعی وکوشش اٹھانہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ نومبر ۱۹۸۹ء میں بھاگلپور میں ایک سفاکانہ اور انسانیت سوز فرقہ وارانہ فساد ہوا، مولانا نے اس سلسلہ میں جو کچھ ممکن تھا کیا، انھوں نے ایک بڑا مؤثر اور دردانگیز خط تحریر فرمایا جس میں انھوں نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا تھا۔ راقم نے اس مکتوب کو سامنے رکھ کر اور اس میں سے کچھ اقتباسات اخذ کر کے اکثریتی فرقہ کے مذہبی پیشواؤں، ملک کے سیاسی رہنماؤں اور ہندوستان کے ممتاز دانشوروں کے نام ایک پراثر خط کا مسودہ بنایا جس کی بنیاد اور مواد مولانا ہی کا خط تھا، وہ خط ڈاک اور ملاقات کے ذریعہ سربرآوردہ ترین اشخاص تک پہنچایا گیا اور جہاں تک اندازہ ہے وہ بےاثر نہیں رہا"۔[1]

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ مزید لکھتے ہیں:

"مولانا کی شخصیت اپنی ریاست اور ملک ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ اس عہد کے عالم اسلام کی ممتاز ترین شخصیتوں میں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے علم واخلاص، عزم وقوت ارادی، اصابت رائے، توازن واجتماعیت کی ان کی ذات میں ایسی متعدد خصوصیتیں پیدا فرمادی تھیں جن کا ایک شخصیت میں بہت مشکل سے اجتماع ہوتا ہے، اس کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے ایسے متعدد یگانہ دینی وملی تاریخی کام لیے جن کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ مدارس سے علماء، دانش گاہوں سے فضلاء اور سیاسی میدانوں سے اور جدوجہد کے مرکزوں سے قائدین اور زعماء نکلتے رہیں گے، لیکن ہاتف غیب کی صدا کانوں میں آتی رہے گی:

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مولانا کی وفات سے نہ صرف امارت شرعیہ بہار واڑیسہ جیسی فعال، مؤثر ومبارک تحریک وتنظیم (جس کی نظیر ملنی مشکل ہے) اور ریاست ہائے بہار

واڑیسہ کی دینی وملی قیادت میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا جس کا بظاہر پُر ہونا دشوار معلوم ہوتا ہے، اور نہ صرف آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جیسا فعال اور ضروری ادارہ اپنے بانی ومحرک وروح رواں شخصیت سے محروم ہوا بلکہ ہندوستان کی دینی، ملی وفکری قیادت میں ایک ایسا خلا پیدا ہوا جس کا قحط الرجال کے اس دور میں پُر ہونا بہت دشوار معلوم ہوتا ہے''۔[۲]

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کو بیان کرتے ہوئے ملک کے مایۂ ناز مؤرخ و پروفیسر ڈاکٹر خلیق احمد نظامی تحریر کرتے ہیں:

''مولانا رحمانیؒ کی شخصیت بہت ہمہ جہت تھی اور وہ ہر پہلو سے اپنی مختلف النوع ذمہ داریوں کو پورا کرتے تھے۔ ایک طرف ''خانقاہ رحمانی'' کی سجادہ نشینی، دوسری طرف ''جامعہ رحمانی'' کی نگرانی، تیسری طرف دارالافتاء اور دارالقضاء کی تنظیم اور چوتھی طرف پرسنل لا سے متعلق مسائل کا حل۔ وہ ۱۹۴۲ء میں خانقاہ رحمانی کے سجادہ نشیں اور ۱۹۵۷ء میں بہار اور اڑیسہ کے امیر شریعت مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۳ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے، پھر جناب محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ (اب رحمۃ اللہ علیہ) کی صدارت میں بڑے خلوص اور محنت سے کام کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ (رحمۃ اللہ علیہ) کی فکر اور امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانی کی تنظیمی صلاحیتوں نے ایک پُر آشوب دور میں سرمایۂ ملت کی نگہبانی کی ہے:

موجوں کی تپش کیا ہے؟ فقط ذوقِ طلب ہے
پنہاں جو صدف میں ہے وہ دولت ہے خداداد''[۳]

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''مولانا سید منت اللہ رحمانی نے وقت کی آواز کو پہچانا اور پوری دینی بصیرت اور

مجاہدانہ عزم کے ساتھ علوم دینی کے احیاء، مسلمانوں کے دینی تشخص کے تحفظ اور شریعت اسلامیہ کی پاسداری میں اپنی عمر گزار دی۔'' [۴]

معروف عالم دین ومحقق مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ لکھتے ہیں:

''ان کی خدمات کی فہرست بہت طویل ہے۔ ۳۴ سال تک امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے امیر شریعت رہ کر مسلمانوں کے جملہ دینی ومذہبی امور ومعاملات میں ذمہ دارانہ کردار ادا کیا۔ تقریباً ۱۸ر سال تک آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی نظامت کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیئے اور اس سلسلہ میں بڑے بڑے فتنوں اور سازشوں کو ناکام کیا۔ ۴۶ سال تک جامعہ رحمانی مونگیر کی تعمیر وترقی اور تعلیمی وتدریسی خدمت میں لگے رہے۔ ۴۹ سال تک خانقاہ رحمانی کے سجادہ نشیں رہ کر ارشاد وتلقین اور بیعت وتربیت کا مشغلہ بھی جاری رکھا۔ مزید برآں سادگی، بے نفسی اور خوردنوازی نے ان کی شخصیت کو پُرکشش بنادیا تھا۔'' [۵]

مولانا منت اللہ صاحب رحمانی رحمہ اللہ نے امارت شرعیہ کی ذمہ داری ملنے پر اس کی افادیت کو بڑھانے اور اس کے مقصد کے تحت آنے والے پہلوؤں کو فعال بنانے میں اپنی عالمانہ اور مدبرانہ صلاحیتوں سے جو کام لیا وہ ایک عظیم کام تھا، جس کے نتیجہ میں صوبۂ بہار واڑیسہ کے مسلمانوں کو اپنے شرعی معاملات اپنے طریقے سے جاری کرنے اور ان کو انجام دینے میں امارت شرعیہ کے ذریعہ بڑی حد تک خود کفالتی حاصل ہوئی اور شریعت کے دائرے میں آنے والے ان کے مسائل کا حل خاصی حد تک ایسے ذمہ دارانہ طریقہ سے ہونے لگا کہ صوبہ کی عدالتوں تک کو متعدد معاملات میں اس کے فیصلوں کی تائید کرنا پڑی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ میں دینی حمیت کے ساتھ وسیع النظری کا ایسا انداز تھا کہ پوری ملت اسلامیہ کے لیے شریعت کے تحفظ کی ضرورت کو انھوں نے پوری اہمیت کے ساتھ دیکھا اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل میں نہ صرف یہ کہ بنیادی کردار ادا کیا، بلکہ اس کے جنرل سکریٹری

کی حیثیت سے حالات کے صحیح جائزہ کے ساتھ شریعت اسلامی کی نصرت کا کام انجام دیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ اس میں غیر اسلامی ذہنوں کی طرف سے عدم تعاون کی فضا چل رہی تھی۔ ایسے حالات میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا پلیٹ فارم جو ملت اسلامیہ کا متفقہ پلیٹ فارم بن کر ابھرا اس ملت پر اللہ تعالی کا خصوصی انعام قرار دیا جا سکتا ہے، کیونکہ متفقہ پلیٹ فارم کے ذریعہ ہی ملت کے بنیادی مذہبی حقوق کا تحفظ کیا جا سکتا تھا۔ اس پلیٹ فارم کو ملت اسلامیہ کے صرف اتفاق واتحاد ہی کی طاقت حاصل نہیں ہوئی بلکہ اس کو علم وحکمت کے لحاظ سے متعدد عظیم شخصیتیں کام میں مشارکت وتقویت کے لیے حاصل ہوئیں، جن میں سرفہرست بورڈ کے باوقار صدور مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بعد مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو مسائل کے حل میں جو کامیابیاں حاصل ہوئیں ان میں ان کا اچھا حصہ رہا۔

یہ وہ دور تھا کہ اس میں ملت کے بنیادی مذہبی حقوق کے تحفظ کی راہ میں جو کامیابیاں حاصل ہوئیں ان کی اہمیت اور قدر وقیمت کو آج کے حالات میں پوری طرح محسوس نہیں کیا جا سکتا، ان کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے اس عہد کے حالات پر نظر ڈالنے سے صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ ملک وقوم کی تعمیر اور تشکیل کا دور تھا، اور اہل وطن کے ذہنوں میں مسلم اقلیت کے ملی تحفظ وتشخص کے حق میں ہمدردانہ تصور نہ تھا، ایسے میں ہمارے اسلاف کی کوشش جن میں مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ کی فکرمندی وعمل کی سنجیدہ اور اتحاد واتفاق کی کوشش نمایاں رہی، ایک مشکل ترین کام انجام دینے کی حیثیت رکھتی ہے، ان محترم حضرات نے مسلمانوں کی متفرق قیادتوں کو امت کے اہم ترین مسئلہ یعنی ان کی شریعت کے تحفظ کے لیے آپس کے ایک اتحاد کی لڑی میں پرو دیا، یہ ایک اہم کارنامہ ہے۔ دیکھنا ہے کہ اب ہم اس وحدت کی کتنی حفاظت کرتے ہیں۔

امت اسلامیہ ہندیہ پر جس کے لیے امیر شریعت مولانا منت اللہ صاحب رحمانیؒ نے اپنی زندگی کی توانائیاں صرف کیں اس کا حق ہے کہ ان کی یاد کو بھولنے نہ دے اور اس کے لیے یہ مذاکرۂ علمی ان کا حق ادا کرنے کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے۔ میں مبارکباد دیتا ہوں اس مذاکرۂ علمی کے ذمہ داروں کو کہ انھوں نے مولانا رحمہ اللہ کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے یہ مذاکرہ

منعقد کیا اور اس طریقہ سے ان کے حق کو ادا کرنے کی قابل تعریف کوشش کی۔ ہم سیمینار کے منتظمین کی اس کوشش کو سراہتے ہیں، انھوں نے اس میں شرکت کرنے اور خطاب کرنے کی مجھ کو بھی دعوت دی، اس طرح مولانا منت اللہ صاحب رحمانیؒ کی قدر دانی میں مجھے بھی حصہ ملا۔ خاص طور پر مولانا عمید الزماں صاحب کیرانوی کا میں مشکور ہوں کہ انھوں نے اس کا خصوصی اہتمام فرمایا۔

مراجع وحواشی:

۱۔ پرانے چراغ حصہ سوم ص: ۱۲۵۔
۲۔ پرانے چراغ حصہ سوم ص ۱۲۶
۳۔ حضرت امیر شریعت نقوش وتاثرات، مضمون پروفیسر خلیق احمد نظامی ص: ۲۵
۴۔ حضرت امیر شریعت نقوش وتاثرات، مضمون پروفیسر خلیق احمد نظامی ص: ۱۷
۵۔ حضرت امیر شریعت نقوش وتاثرات، مضمون قاضی اطہر مبارکپوری ص: ۱۱۵-۱۱۶۔
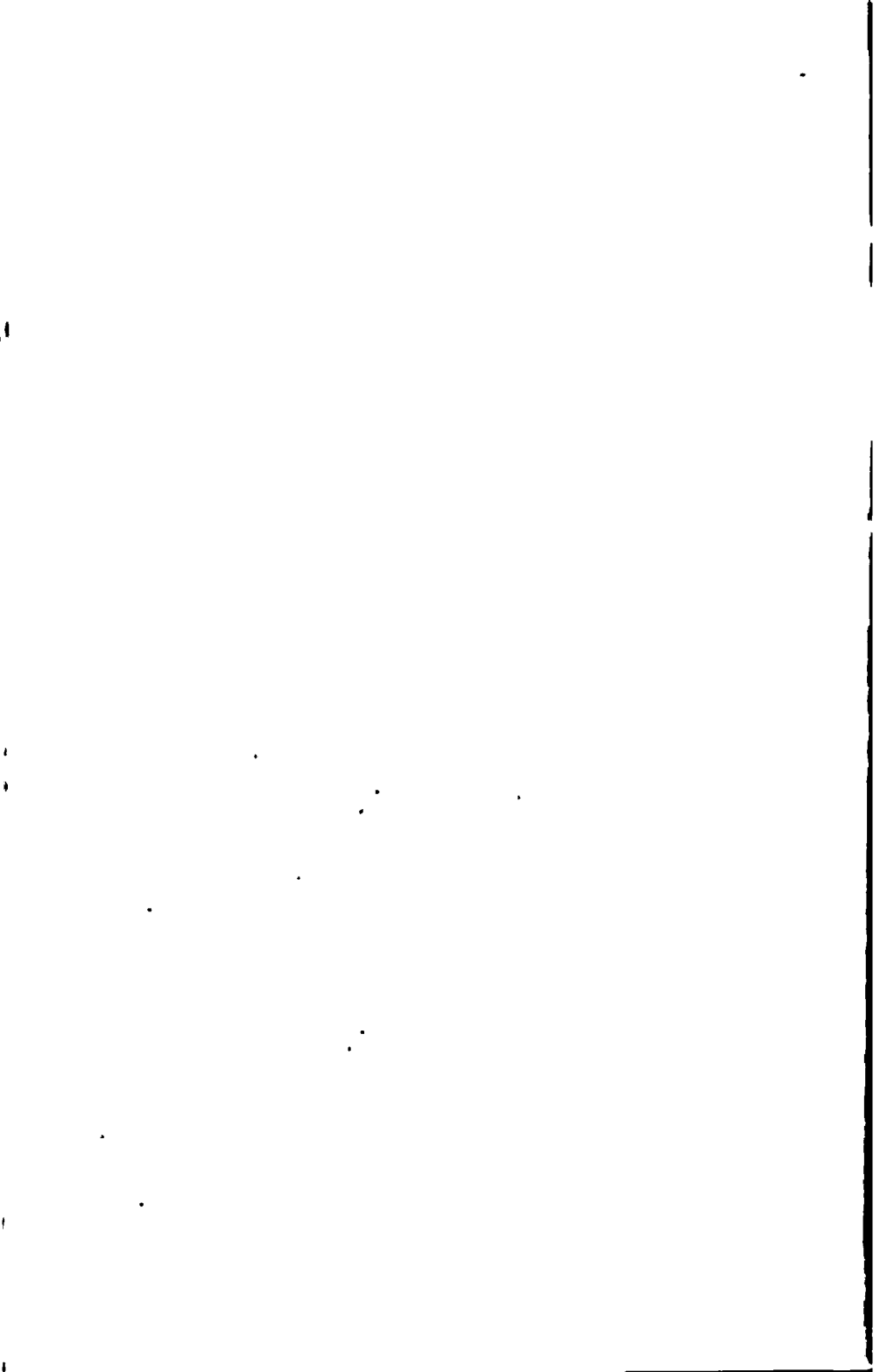
حضرت مولانا محمد سالم قاسمی☆

خطبۂ صدارت

الحمد للّٰه وحده والصلوة علی من لانبی بعده.

اس تاریخی سیمینار کی صدارت کے لیے احقر ناکارہ کا انتخاب حیرت ناک، ناقابل فہم اور احقر کے لیے موجب صد ندامت تو ہے ہی، لیکن سیمینار کے متدین ارباب بست وکشاد کے اس عمل کی قرین صواب توجیہ احقر کے نزدیک اس کے سوا دوسری نہیں ہوسکتی کہ " ظنوا بالمؤمنین خیرا" پر عمل بجذبۂ امتثال امر نبوی، برائے اجر وثواب فرمایا گیا ہے، خدا کرے کہ بصد ادب احقر بھی الأمر فوق الأدب کے تحت شریک امتثال ہوکر، ان صالحین کے ساتھ ثواب سے حصہ یاب ہوجائے۔

گزشتہ چند سالوں میں ملت اسلامیہ ہندیہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے بہت سی ایسی مایۂ ناز شخصیات سے محروم ہوئی ہے کہ جو جلوتوں میں ملت کو زبوں حالی سے نکالنے کی جہد مسلسل میں سراپا عمل تھیں اور خلوتوں میں بارگاہ رب کریم میں گناہ گار امت خاتم الرسل پر نگاہ عفو وکرم کی بھیک کے لیے سربسجود رہتی تھیں۔

انہی میں امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کی وہ قد آور ذات گرامی بھی ہے کہ قدر شناس قلوب میں ان کے مسلسل علمی، عملی اور اجتماعی افادیت سے محرومی کے زبردست احساس الم کے ساتھ ان کی شخصیت زندہ تو ہے لیکن چھٹی حس ان کے بارے میں

☆مہتمم دارالعلوم (وقف) دیوبند

اس مجمل احساس کو وقتاً فوقتاً یقین سے دوچار کرتی رہتی ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسلام کے نام پر ذاتی عظمت و برتری کے لیے نبرد آزمائی کرنے والوں کی ایمان فروشی کا ان کی غیرت ایمانی تحمل نہ کرسکی ہو اور اس المناک صورت حال میں داعیٔ اجل کو جلد لبیک کہنے کی دعائے مستجاب فرمائی ہو؟ یا آج کی مسلم اجتماعیات کی قیادت کی اغراض فاسدہ کے کھلے عام مناظر نے انھیں زندگی سے اس لیے بیزار کردیا ہو کہ:

کعبے میں نظر آتے ہیں جو صبح اذاں دیتے
میخانے میں راتوں کو ان کا بھی گزر دیکھا

یا ملت کی جہالت سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے مالی مفاد کے حریصوں کی جنگ زرگری کی روحانی ایذا نے داعیٔ اجل کی صدا پر لبیک کے ذریعہ ہی نجات ہونے کا یقین ان کے قلب مزکیٰ میں پیدا کردیا ہو۔

اسباب یہ ہوں یا کچھ اور، لیکن بے دینی کے باوجود، دین کو دنیوی اقتدار کا وسیلہ بنانے والے، یا مالی دولت کے بے کمال خواہش مند ملت کے اجتماعی امور میں تنگ نظری سے اپنے کو اہم بنانے والے ہی درحقیقت، ارباب اخلاص کی راہوں کا سنگ گراں بنتے ہیں۔

یہ ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کی جہد و عمل میں دینی خدمات اور اجتماعیات، سیاسیات دونوں داخل وشامل تھیں اور ان دونوں دائروں میں، ان کا اقدام و عمل، دونوں کی مکمل حدود کی پاسداری سے کبھی متجاوز نہیں ہوتا تھا۔ جس کی بنیاد ان کی یہ حقیقت شناسی تھی کہ اجتماعی عناد ہمیشہ دو فاسد ''اقدامات کے بطن سے پیدا ہوتا ہے، یعنی یا مذہبی معتقدات کی پیشکش میں تعصب وجود میں آتا ہے اور یا سیاسی نظریات میں تشدد فساد کو جنم دیتا ہے لیکن مذہب میں تعصب سے مجتنب رہنا اور سیاست میں تشدد سے بلند رہنا علم کثیر، اخلاق رفیع، اور حوصلۂ وسیع کے بغیر ممکن نہیں، اسی لیے بے تعصب اہل مذہب اور بے تشدد اہل سیاست، تاریخ اقوام و امم میں ایسے دل گردے والے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہونے کے لحاظ سے، بے نہایت علم کثیر کا حامل ہے۔ اس لیے اس میں نہ بذات خود تعصب ہے اور نہ وہ اہل تعصب کا ہم قدم بن سکتا ہے، ایسے ہی اجتماعیت وسیاست کے دائروں میں نہ وہ خود تشدد کی اجازت دیتا ہے، اور نہ وہ اہلِ تشدد کا ساتھ دے سکتا ہے۔

دورِ حاضر میں اسلام اور مسلمانوں کے تنزل وانحطاط کی حقیقی بنیاد اس کے سوا کچھ نہیں کہ عملاً دین کے معتقدات کے ترجمان وہ قلیل العلم، رذیل الاخلاق، اور بے حوصلہ افراد بن گئے ہیں کہ دین کے نام پر ان کا دینی اقتدار صرف تعصب پر ہی مبنی اور قائم ہے اور اجتماعی اور سیاسی نظریات کے دعویدار وہ بے مایہ لوگ بنے ہوئے ہیں کہ ان کی دکان از اول تا آخر صرف تشدد ہی پر چلتی ہے۔

حضرت امیر شریعت (رابع) اپنی علمی وسعت اور فکری رفعت کی بناء پر ان نام نہاد دین دار متعصبین سے، اور سیاسی متشددین کی حدود رسائی سے بھی کما حقہ واقف تھے اور اس سے بھی باخبر تھے کہ یہ طائفۂ دزداں دین و سیاست ہوسِ اقتدار میں ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ اس لیے دینی اور سیاسی ناکامیوں کا مداوا کرنے کے لیے دین وسیاست کے پردوں میں اپنی چالاکیوں کا ہدف اہلِ حق اور ارباب علم کو بنا کر اپنے اغراض کی تکمیل کرنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ ان دونوں گروپوں کو ایک یا دو بار نہیں بلکہ ہمیشہ حضرت امیر شریعت کے مدبرانہ، عالمانہ طریق عمل کے نتیجے میں ناکامیوں کے سوا کوئی نتیجہ ہاتھ نہ آیا۔

اجتماعی اور سیاسی میدانوں میں غیروں سے زیادہ اپنے ان کے مدمقابل رہے، لیکن حضرت موصوف کی یہ عالی ظرفی اور بلند اخلاقی ناقابل انکار ہے کہ مخالفین کی شخصیات اور ان کی رایوں کے احترام میں مولانا موصوف نے کبھی ادنیٰ کمی نہیں کی۔ لیکن ساتھ ہی اس مسلمہ حقیقت سے انھوں نے کبھی رایوں کے احترام کے باوجود ان سے اتفاق نہیں کیا۔ دینی، علمی اخلاقی اور سیاسی اصول کے اگر کوئی رائے برخلاف ہے تو اس سے برملا شائستہ اختلاف میں کبھی ادنیٰ مداہنت مولانائے محترم نے نہیں برتی۔ ایسے ہی اصولی تفاوت نہ ہونے کی صورت میں ان کا

ذہن وفکر کسی تأمل کو قبول نہیں کرتا تھا، یہ کہنے میں بات معمولی لگتی ہے لیکن عملی دنیا میں اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ارباب فکر و بصیرت ہی کر سکتے ہیں۔

اختلافی مسائل میں حضرت امیر شریعت کا طرز افہام وتفہیم متانت کے ساتھ استدلال اور جذاب ہوتا تھا کہ مخاطب اگر اپنی رائے پر بضد نہ ہوتا تو تسلیم نہ کرنے کی صورت میں بھی معقول بنیاد پر ان کی بات کا رد اس کے لیے آسان نہیں ہوتا تھا۔

خطاب وخطابت میں جہاں تک بڑوں سے بات پہنچی ہے وہ اپنے والد ماجد حضرت اقدس مولانا محمد علی مونگیری قدس اللہ سرہ العزیز کے واقعۃً ''سرلابیہ'' تھے۔ یہ حضرت مونگیری رحمۃ اللہ کا فیضان باطن تھا کہ جس طرح ان کے مؤثر خطاب وکلام نے بیشمار دلوں کو خطا سے صواب کی اور لاتعداد کو باطل سے حق کی نورانیت بخشی۔ اسی طرح بفضل خداوندی حضرت امیر شریعت کے فیضان علم وعرفان نے زمین کی طویل ترین مسافتوں کو جس طرح طے کیا کہ اس کے بارے میں یہ کہنا ایک امر واقعی کا اعتراف ہوگا کہ:

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

حضرت امیر شریعتؒ کے خطاب وخطابت کے ہر امتیازی وصف کا بیشتر استعمال دین حق کی ترجمانی، اور اصلاح عامۃ المسلمین ہی کے لیے بمشیت ربانی ہوتا رہا۔ صوبۂ بہار اور ملک کا وہ وسیع حصہ جو ان کے والد ماجد حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیری قدس سرہ کے فیضان علم وعرفان سے فیض یاب رہا۔ ان کے بعد حضرت مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کی مستجاب دعاؤں سے اسی وسعت وہمہ گیری کے ساتھ اس علوی فیض نے منت اللہی فیض بن کر اپنی وسعت وافادیت کے دائرہ کو وسیع سے وسیع تر بنادیا۔ ذلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء۔

حضرت امیر شریعت کے حسن فکر و نظم کا ایک دوسرا رخ، جامعہ رحمانی مونگیر ہے جس کی حضرتؒ کے عہد میمون نے علمی، تعلیمی، تعمیری اور مختلف دائروں میں اپنی افادی عظمت کو نہ صرف ناقابل انکار ہی بنادیا بلکہ ایک مدرسہ سے صحیح معنی میں جامعہ بن کر، ملک وبیرون ملک کے علمی اور

دینی حلقوں کو اپنی وقیع اہمیت پر شاہد عدل بنادیا۔ مدرسہ درحقیقت تعلیمی برتری اور حسن نظم کا نام ہے۔

حضرت مولاناؒ نے ''جامعہ رحمانی مونگیر'' کے ان دونوں رخوں پر ہمیشہ غیر معمولی توجہ رکھ کراس کی عزت وعظمت کو مائل بارتقاء رکھا۔ اللہ اس صدقۂ جاریہ کے ذریعہ اجر عظیم سے انھیں ہمیشہ فیض یاب رکھے آمین۔

مدارس اسلامیہ کی برقراری، تحفظ اور ترقی حضرت موصوفؒ کا خصوصی موضوع تھا، جس کے نتیجے میں بہار کے بہت سے مدارس اسلامیہ حضرت کی سرپرستی کے شرف کے ساتھ جامعہ رحمانی مونگیر سے وابستہ بھی تھے۔ اس مرکزی درسگاہ کے انتساب سے طبعی طور پر ان مدارس کے تعلیمی اور انتظامی امور میں بھی معیاری برتری پیدا ہوئی، ورنہ عمومی طور پر آزاد مدارس کسی قابل ذکر ترقی کے حامل نہیں ہیں۔ حضرت مولانا کی مساعی جمیلہ آزاد مدارس کی ترقی کی جانب خصوصی طور پر مبذول رہتی تھیں۔ اجتماعیات وسیاسیات میں کسی پارٹی کی فکری محدودیت سے حضرتؒ نے اپنے دائرۂ خدمت کی وسعتوں کو محدود کرنا کبھی گوارہ نہیں کیا چنانچہ فکری، یا عملی یا اخلاقی تعاون کی ضرورت مند شخصیات اور اداروں سے مکاتب فکر کے اختلاف کے باوجود حضرت موصوف کے مومنانہ اور حوصلہ مندانہ رابطوں میں یا اپنوں کی یہ خود ساختہ نام نہاد محدودیتیں کبھی حائل نہیں ہوتی تھیں۔

اسی ہمہ گیر وسعت فکر کے باعث آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت کے عہدۂ جلیلہ کے لیے اکابر ملت کی روز اول ہی میں بلا اختلاف نگاہیں حکیم الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی پر جم گئی تھیں اور تاحیات حضرت والا پر ہی جمی رہیں۔ ٹھیک اسی طرح جنرل سکریٹری کے لیے جس وسیع الفکر اور پرسنل لا بورڈ کی عظیم وخالص شرعی غیر سیاسی اور تمام مختلف الفکر مکاتب فکر کو بصیرت مندی کے ساتھ لے کر چلنے والی شخصیت کی ضرورت تھی، بورڈ کی تشکیل کو پہلے ہی مرحلے پر امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی نے مختلف الفکر مفکرین کو مطمئن فرمادیا اور اس عہدۂ وقیعہ پر حضرت کی

- تاحیات برقراری اس انتخاب کی صحت پر ناقابل شکست حجت ودلیل بن گئی۔

اجتماعی تنظیم کی حیثیت سے مسلم پرسنل لا بورڈ میں سخت اختلاف آراء کے مراحل پیش آئے۔لیکن بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ حضرت موصوف نے اخلاص وبصیرت کے ساتھ ملت اسلامیہ کی اس نمائندہ تنظیم کی مکمل نمائندگی برقرار رکھتے ہوئے مسائل مہمہ کو ناقابل فراموش کامیابی سے ہمکنار فرمایا جس پر ان کی جنرل سکریٹری کے عہدۂ عظیمہ پر تاحیات برقراری کو ناقابل شکست شاہد عدل قرار دینا قطعاً مبالغہ سے خالی ہوگا۔

آج بھی مسلم پرسنل لا بورڈ کے لیے ان کی خدماتِ جلیلہ رہنما منارۂ نور ہیں۔ایک ہی مکتب فکر کی اجتماعی تنظیمات میں بھی عموماً وقت وحالات کی تبدیلی، افکار ونظریات میں تغیر کا ذریعہ بنتی رہتی ہیں۔لیکن ان میں اصولی وحدتِ فکر کی بنیاد پر اختلافی مسائل میں راہ صواب نکالنا غیر معمولی طور پر دشوار نہیں ہوتا لیکن پرسنل لا بورڈ جیسی افکار وخیالات ہی میں نہیں بلکہ عقائد دینیہ تک میں اختلاف رکھنے والی ملک گیر تنظیم میں وحدت کی برقراری کے ساتھ متفق علیہ راہِ عمل کا نکالنا جس اہمیت کا حامل ہے۔اس کو دیگر تنظیمات کی کسوٹیوں پر پرکھنا غالباً صحت سے بدر جہا دور ہی سمجھا جائے گا۔لیکن یہ حق تعالیٰ کا فضل خصوصی ہے جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاص پر مرتب ہونے والا ثمرہ ونتیجہ بن کر ہمارے لیے ہمیشہ رہنما رہے گا۔

اللّٰهم اكرم نزله وَوَسِّع مَدْخَلَه وأبدل له داراً خيراً من داره واهلاً خيراً من اهله ونقّه من الخطايا كما ينقى الثوب الأبيض من الدنس، اللهم لا تحرمنا اجره ولا تفتنّا بعده.

⊙⊙⊙

مولانا عمید الزماں کیرانویؒ☆

خطبۂ استقبالیہ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على افضل الأنبياء والمرسلين، محمد بن عبدالله الأمين، وعلى آله وصحبه أجمعين، ومن تبعهم باحسان إلى يوم الدين.

جناب صدر محترم حضرات علماء و دانشوران و معزز شرکاء سیمینار اور لائق احترام مہمانان گرامی! اس وقت ہندوستان کی مشہور اور تاریخی دانش گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وسیع ہال میں دیوبند سے منسوب بیسویں صدی کی ایک معروف و عظیم شخصیت پر ہونے والے اس سیمینار میں شرکت پر آپ حضرات کا خیر مقدم اور استقبال کرتے ہوئے مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ اس مبارک موقع پر آپ حضرات کے جذبۂ خلوص و تعلق کو دیکھ کر میرا دل فرحت و سرور اور تشکر و امتنان کے احساسات سے معمور ہے۔ تنظیم کے لیے دراصل بڑی سعادت کی بات ہے کہ آپ حضرات کی میزبانی اور ضیافت کا شرف اس ناچیز سمیت تمام خدام تنظیم کے حصہ میں آیا ہے۔

حاضرین کرام! آپ جانتے ہیں کہ یہ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کا دوسرا سیمینار ہے اس سے پہلے حضرۃ الامام محمد قاسم نانوتوی پر ایک سیمینار ۲۱/۲۲/۲۳/مئی ۲۰۰۰ء کو اسی شہر دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ اب یہ دوسرا سیمینار مدبر ملت، محرک و بانی تحریک تحفظ شریعت آل انڈیا

☆ سابق کارگزار صدر تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند

مسلم پرسنل لا بورڈ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کی ذات گرامی سے منسوب ہے، تنظیم کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وہ ابنائے دیوبند کی دینی، ملی اور علمی خدمات کو نہ صرف یہ کہ باہم مربوط کرنے کی سعی کرتے بلکہ ان کے کارناموں اوران کی زندگی کے مفید گوشوں سے پردہ اٹھاتے اور نسل نو کوان سے روشناس کرانے کی سعی کرے تاکہ وہ ان کی زندگی کے روشن اور تابندہ نقوش سے انسانیت اور ملت کی تعمیر وترقی، شرع اسلامی کی حفاظت وصیانت اور حکمت وحسن تدبر سے دعوت دین کا فریضہ انجام دے سکے، تنظیم نے اپنے اس مشن کے آغاز کے لیے جن وسائل کو اختیار کیا ان میں ماہنامہ ''ترجمان دارالعلوم'' سرفہرست ہے، جو تقریباً ۱۲؍۱۳؍سالوں سے پابندی کے ساتھ مسلسل دینی، دعوتی، اصلاحی، اور تدریسی حلقوں تک فکری، روحانی اور علمی غذا پہنچارہا ہے۔

اس کے کئی بیش قیمت خصوصی شمارے علمی حلقوں سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ حضرت نانوتوی کے افکار وشخصیت پر پڑھے گئے مقالات کا ضخیم مجموعہ، جس کی رسم اجراء اسی اجلاس میں ہوئی ہے، اس سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ اس ضمن میں معهد التخصص في اللغة العربية کا ذکر بھی بیجا نہ ہوگا جو ترجیحی طور پر زبان کی سطح پر فضلا کی علمی تربیت کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ تاہم اس کے توسیعی مقاصد میں دوسری اہم چیزیں بھی شامل ہیں آپ کی دعا رہی تو انشاء اللہ مستقبل قریب میں ان کی تکمیل بھی عمل میں آئے گی۔

آپ حضرات اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ملت ایک بار پھر اسی طرح انتشار اور آپسی گروہی، مسلکی، فکری، نظریاتی اور سیاسی اختلافات کی زد میں ہے جس طرح آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کے دور میں تھی۔ فکر ونظر اور عمل کے میدان میں اسے نت نئے چیلنجوں کا سامنا ہے، ایک طرف اغیار کی سازش ہے۔ وہ گھات میں بیٹھے ہمارے ایمانی وثقافتی سرمایے اور اس سرمایے کے تحفظ وبقا کی کوشش کرنے والے مراکز پر نشانہ اندازی کر رہے ہیں۔ ہمارے فکر وعمل کا رخ موڑ دینا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف بعض اپنے ہیں جو اپنی کم نظری یا دوسروں کے بچھائے ہوئے دام مکر وفریب میں پھنس کر ملت کے انتشار کا ذریعہ بن رہے ہیں۔ ایسے میں آج ملت پھر ایک بار کسی ایسے مسیحا کی تلاش میں ہے جو فروعی اختلافات سے اوپر اٹھ کر

ملت کو اجتماعی شعور دینے کلمۂ واحدہ کے اصول پر اس کو فکری اور عملی ڈگر پر لانے اور مسلمانوں کی اجتماعی اور سماجی زندگی میں کتاب وسنت کی اساس پر نئی روح پھونکنے کی کوشش کرے۔

دنیا اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کی شخصیت ملت کی اجتماعی قیادت کے باب میں بہت زیادہ مؤثر، مستحکم اور ثابت قدم رہی ہے۔ حالات کا تقاضا ہے اور اس وقت بکھری ہوئی ملت کی ضرورت ہے کہ ان کی زندگی کی عملی جدوجہد سے سبق لے کر ہندستان کے مسلم معاشرے کے انتشار کو ختم کیا جائے۔ حالات کی مناسبت سے مولانا موصوف کے اجتماعیت پسندانہ طریق عمل کو قوت کے ساتھ اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی احساس نے اس سیمینار کے انعقاد کی راہ ہموار کی ورنہ دارالعلوم اور ابنائے دارالعلوم کی تقریباً ڈیڑھ سو سالہ کتاب وسنت اور ملت کی خدمت وقیادت کی تاریخ نہ جانے اس طرح کے علمی مذاکروں کے کتنے ہی موضوعات اپنے سینے میں سمیٹے ہوئے ہے، اور جنھیں خصوصاً ہندستان میں امت مسلمہ کی تاریخ اگر فراموش کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتی۔ ضرورت ہے کہ ان موضوعات پر تحقیقات وعلمی مذاکروں کا انعقاد کرایا جائے۔ اس باب میں تنظیم کی کوششیں انشاء اللہ جاری رہیں گی۔ ہمیں آپ کے تعاون اور مخلصانہ مشورے درکار ہیں۔

اس مبارک موقع پر، جبکہ یہاں موجود ملک کی سربرآوردہ شخصیات کو آپ سے خطاب کرنا ہے، میں اپنی بات کو مختصر کرنا ضروری سمجھتا ہوں، البتہ حضرات اکابر کی موجودگی میں تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے پلیٹ فارم سے یہ ضرور عرض کرنا چاہوں گا کہ موجودہ حالات میں ہماری ذمہ داریاں پہلے کے مقابلے اور زیادہ بڑھ گئی ہیں، ملت اسلامیہ آپ کی ملی اور فکری قیادت کی راہ تک رہی ہے۔ آپ نے ماضی میں بھی سنگین سے سنگین حالات کا مقابلہ کیا ہے اور مسائل ومشکلات کے حل ڈھونڈے ہیں، آپ کو یہ فکر اور مشن حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے ملا ہے، اللہ تعالی نے آپ کو برصغیر ہی نہیں بلکہ ایشیا کے مختلف ممالک میں اور ان کے باہر براعظم افریقہ تک عزت واقبال عطا کیا ہے اور آپ کے فیض سے دنیا سیراب ہو رہی ہے۔ فکری پختگی،

یقین محکم، عمل پیہم، ثبات قدمی، صبر واستقامت اور اخلاص کے ساتھ میدان عمل میں سرگرم ہوجایئے اس نئی صدی کا شان وشوکت اور ایمانی حرارت کے ساتھ استقبال کیجئے اللہ ہمارے ساتھ ہے: ان ینصرکم اللّٰہ فلا غالب لکم وان یخذلکم فمن ذا الذی ینصرکم من بعدہ وعلی اللّٰہ فلیتوکل المؤمنون.

میں ایک بار پھر انھی جذبات اور نیک خواہشات کے ساتھ صمیم قلب سے آپ حضرات علماء اور دانشوران ملت کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ آپ نے ہماری دعوت پر سفر کی تمام تر صعوبتیں برداشت کیں، اپنے ضروری کاموں کو مؤخر کیا، اپنی ترجیحات میں تبدیلی کی۔ میں اس کے لیے آپ سب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اسی کے ساتھ ساتھ میں آپ سے یہ التماس بھی کرنا چاہوں گا کہ اگر خاطر ومدارات اور انتظام وانصرام میں آپ کوئی کمی یا کوتاہی محسوس کریں تو اس کے لیے عفوودرگزر سے کام لیں۔ ہم نے مقدور بھر آپ کے لیے سہولت وآرام کے بندوبست کی کوشش تو کی ہے لیکن بہرحال کمی یا کوتاہی عملی زندگی کی حقیقت ہے۔ اللہ تعالی سے دعا کرتا ہوں کہ ہماری مساعی کو شرف قبولیت بخشے۔ آمین یارب العالمین۔

———⊙⊙⊙———

پروفیسر مولانا قاضی زین الساجدین قاسمی ☆

کلماتِ تشکر

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین محمد وآلہ وصحبہ اجمعین ومن تبعھم باحسان ودعا بدعوتھم الی یوم الدین اما بعد!

احقر کے لیے باعث شرف وسعادت ہے کہ امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ قومی سیمینار کے مبارک موقع پر ہماری دعوت پر ملک کے مختلف گوشوں سے سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے آنے والے علماء کرام، مشائخ عظام، دانشوران، عمائدین وقائدین ملت ودیگر حاضرین کا اپنی جانب سے اور جملہ اراکین وعہدیداران تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کی جانب سے شکریہ ادا کرنے کا خوش گوار فریضہ انجام دوں۔ میں خصوصی طور پر حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مہتمم وقف دارالعلوم دیوبند دامت برکاتہم کا جنھوں نے افتتاحی اجلاس کی مسند صدارت کو رونق بخشی اور حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا بے حد شکرگزار ہوں جنھوں نے افتتاحی خطبہ میں حضرت امیر شریعت کی علمی، دینی اور ملی خدمات پر اپنے گراں قدر خیالات سے نوازا۔ حضرت مولانا نظام الدین صاحب امیر شریعت، حضرت مولانا محمد ولی رحمانی صاحب سجادہ نشین خانقاہ رحمانی مونگیر، ڈاکٹر

☆ ناظم اعلیٰ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند

عبدالحق انصاری صاحب امیر جماعت اسلامی ہند جن کے دلنواز خطبات ہمارے اس سیمینار کا قابل قدر سرمایہ ہیں۔ ہم ان تمام حضرات کے لیے اظہار تشکر کرتے ہیں جنھوں نے اس سیمینار کے انعقاد اور اس کو کامیاب بنانے کے لیے ہمارا تعاون کیا۔ من لم یشکر الناس لم یشکر الله کا یہی تقاضہ ہے کہ اللہ تعالی کا شکرادا کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ کے بندوں کا بھی شکریہ ادا کریں جن کے تعاون کے بغیر اس اجلاس کی کامیابی آسان نہیں تھی۔

حضرات! آپ سب اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ مسلمانان ہند کی سات سو سالہ تاریخ میں انیسویں اور بیسویں صدی کا زمانہ ملت اسلامیہ ہندیہ کے لیے نہایت پرآشوب اور مصائب وآلام کی ایک کربناک داستان ہے۔

تقسیم ہند ۱۹۴۷ء کے سانحہ سے قبل ایک طویل زمانہ انگریزوں کے ہندوستانی عوام اور خصوصاً مسلمانان ہند پر جبر واستبداد، ظلم وتشدد اور استعماریت کا شرمناک اور سیاہ دور ہے جس میں فرزندان اسلام کو نہ صرف یہ کہ تخت وسلطنت اور تاج حکمرانی سے محروم کر کے ان کی گردن میں غلامی کا طوق ڈال دیا گیا بلکہ ان کے مذہب، تہذیب، قانون شریعت تعلیمی اور معاشرتی نظام کو درہم برہم اور تہس نہس کرنے کی بھی انتہائی کوشش کی گئی۔ اس طرح ملت اسلامیہ پوری طرح اقتصادی، علمی، دینی، معاشرتی اور سیاسی زوال اور انحطاط کے شکنجہ میں پھنس کر رہ گئی تھی۔

یہ اللہ تعالی کا بڑا فضل وکرم ہے کہ اس کا نظام قدرت جس طرح ہر شب ظلمت کو نیر تاباں کے ذریعہ روز روشن میں تبدیلی کر دیتا ہے اسی طرح وہ اپنی شمع ہدایت کے ذریعہ اقوام وملل کو ظلمت وتاریکی سے نکال کر فوز وکامرانی کے نور سے نوازتا ہے: الله ولی الذین آمنوا یخرجهم من الظلمات الی النور چنانچہ مجدد دین حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اس عہد اضطراب وانحطاط میں وہ پیغام انقلاب لے کر نمودار ہوئی جو ایمان ویقین، اطاعت وایثار، اور اعلی اسلامی اخلاقی اقدار سے معمور تھا جس میں قرآن کریم اور سنت نبوی اور اسلامی شریعت کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق عقلی دلائل کے جدید اسلوب کے ذریعہ ان کی تدریس وترویج کی ترغیب تھی اور سب سے زیادہ یہ کہ

جذبۂ جہاد اور شوق شہادت پیدا کر کے طوق غلامی سے نجات حاصل کرنے کا عزم اس کا اہم عنصر تھا۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، حضرت شاہ رفیع الدینؒ، حضرت شاہ عبدالقادرؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ، حضرت اسماعیل شہیدؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، سرسید احمد خاںؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، علامہ اقبالؒ وغیرہ جیسی اولوالعزم شخصیات نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے پیغام کو مختلف اور متنوع میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دے کر عملی جامہ پہنانے میں زبردست کردار ادا کیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء میں اس ملک کے عوام نے آزادی کی فضا میں سانس لیا۔ یہ ایک خوشی اور مسرت کا موقع تھا لیکن تقسیم وطن کے نتیجہ میں یہ دیرپا ثابت نہ ہوسکا اور ہندوستانی مسلمانوں کو پھر سخت آزمائش اور الم ناک حادثات سے گزرنا پڑا، مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اپنے گھربار اور وطن عزیز کو ترک کر کے پاکستان جانے پر مجبور ہوئی۔ جن لوگوں نے ہندوستان کو اپنا وطن برقرار رکھنے اور یہاں ہی قیام کرنے کا فیصلہ کیا ان کو یہاں کی جارحیت پسند، فرقہ پرست مسلم دشمن طاقتوں کے ظلم وتشدد کا نشانہ بننا پڑا اور ان کو نہ صرف یہ کہ اپنی جان ومال کے تحفظ کے لیے بلکہ اپنے مذہب، تہذیب وثقافت، شریعت، تشخص، مساجد، خانقاہوں، دینی مدارس کے بقاء وتحفظ کے لیے زبردست قربانیاں دینی پڑیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان عظیم شخصیات کو خراج عقیدت پیش کریں جن کی شاندار جدوجہد، ایثار وقربانی کی بدولت جدید ہندوستان میں اسلامی شریعت، تہذیب واقدار ودینی مراکز ومدارس کے تحفظ وبقاء کا شاندار کارنامہ انجام پذیر ہوا۔

یہی وہ اسباب وعوامل ہیں جن کے لیے ہمارا یہ سیمینار منعقد ہورہا ہے جس کے ذریعہ ہم امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی دینی اور ملی خدمات کو اجاگر کر کے نہ صرف ان کو بلکہ ان کے ذریعہ ان تمام رہنمایان دین وخدام ملت کو خراج عقیدت پیش کررہے ہیں جنھوں نے تعمیر ملت کی اہم خدمت انجام دیں۔

حضرات! حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی کو خدام اسلام کی جماعت میں یہ

امتیاز حاصل ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے تعمیر ملت اسلامیہ اور اس کو عزت وعظمت کا مقام دلانے کے لیے جو جامع منصوبہ پیش کیا تھا اس کی روشنی میں، تقسیم ملک کے بعد جو مسائل پیدا ہوئے ان کے حل کے لیے جس عزم، حوصلہ اور تدبر کے ساتھ جدوجہد کی وہ جدید ہندوستان کی مسلم تاریخ کا روشن باب ہے

حضرت امیر شریعت کی ملی خدمات میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے مختلف فرقوں اور مسالک کے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع اور متحد کر کے کامن سول کوڈ چاہنے والوں کو مسلم پرسنل لا بورڈ کی طاقت ور آواز کے ذریعہ خاموش کرنا حضرت امیر شریعت کی جرأت اور عظیم قیادت کی عکاسی کرتا ہے، دارالقضاء اور امارت شرعیہ کے ذریعہ آپ نے نفاذ شریعت اور جامعہ رحمانی کے ذریعہ ترویج وتدریس علوم شرعیہ کے لیے اور خانقاہ رحمانی کے ذریعہ تزکیہ اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی تثبیت ان کے علاوہ مسلمانوں کی فلاح وبہبود اور معاشرتی اصلاح کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ نہایت قابل قدر ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اس سیمینار کی دیگر نشستوں میں جو مقالے پیش کئے جائیں گے وہ حضرت امیر شریعت کی شخصیت اور ان کی خدمات کو تفصیل کے ساتھ سمجھنے میں معاون ہوں گے۔

بڑی مسرت کی بات ہے کہ اس اجلاس میں ہماری مادر علمی اور ایشیاء کی عظیم اسلامی یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند کے اکابر وارباب حل وعقد میں اتحاد کی تجویز پیش ہوئی اور اس کا نہایت گرم جوشی اور ولولہ انگیز جذبات کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا اور متفقہ طور پر اس کی تائید کی گئی۔ حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب دامت برکاتہم نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے جو رقت آمیز تقریر کی اس نے آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگادی اور دونوں طرف کے اکابر حضرت مولانا سید اسعد مدنی اور حضرت مولانا محمد سالم قاسمی کی جانب سے جن خوشگوار جذبات کا اظہار ہوا وہ درحقیقت ہماری تنظیم اور ملت اسلامیہ کی دیرینہ آرزو کی تکمیل ہے۔ ہماری تنظیم اس پیش قدمی کے لیے ان دونوں اکابر کو مبارک باد پیش کرتی ہے۔

———— ⊙⊙⊙ ————

باب اول

حیات و شخصیت
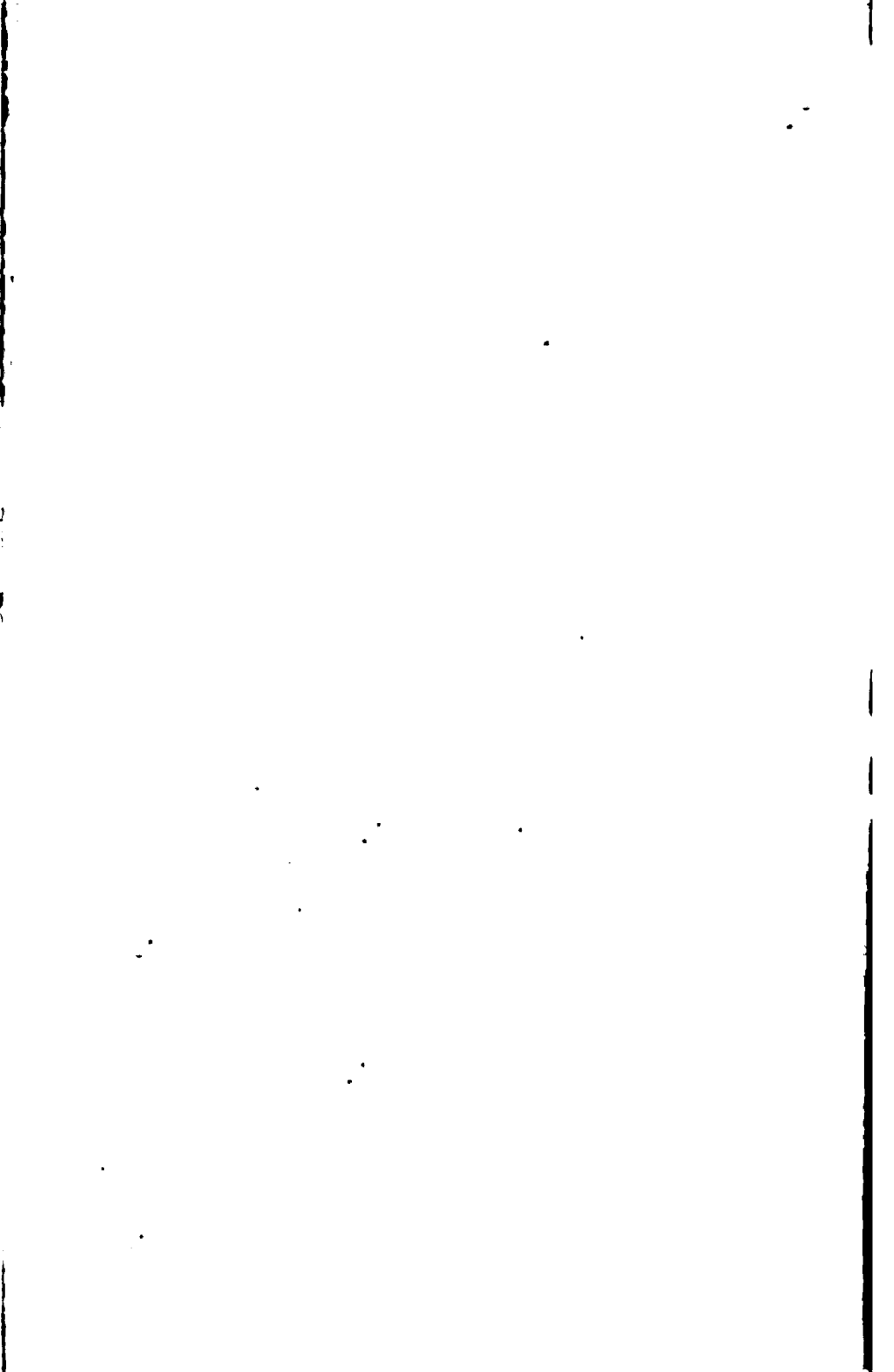
مولانا عمید الزماں کیرانویؒ ☆

حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ
کچھ یادیں —— کچھ باتیں

حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی ایسے کمالات وامتیازات کی جامع تھی جو شاذ ونادر ہی مجتمع طور پر کسی ایک شخصیت کے اندر پائے جاتے ہیں۔ ''عبقری'' اور ''نابغۂ روزگار'' جیسے الفاظ اپنی معنویت کے اعتبار سے خواہ کتنے ہی بلند ہوں، ان کے امتیازی اوصاف کی عکاسی کے لیے ناکافی محسوس ہوتے ہیں۔ ''چہار گوشہ'' اور ''ہشت پہلو شخصیت'' جیسے الفاظ بھی ان کی متنوع الجہات شخصیت کی خصوصیات کے احاطہ سے قاصر ہیں۔

حصول علم کے لیے انھوں نے حیدر آباد، لکھنؤ اور دیو بند میں قیام کیا۔ دار العلوم دیو بند میں تعلیم کے دوران شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ سے قرب حاصل ہوا اور ان کے زیر اثر ہندستان کی آزادی کے لیے جاری جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ صرف جدوجہد آزادی میں ہی حصہ نہیں لیا بلکہ تعلیم سے فراغت کے بعد انڈیپنڈنٹ پارٹی سے الیکشن لڑ کر وہ بہار اسمبلی کے رکن بھی بنے۔

☆ سابق کارگزار صدر تنظیم ابنائے قدیم دار العلوم دیو بند

تعلیم کے مختلف مراحل سے لے کر زندگی کے اس مرحلہ تک انھوں نے جو علم حاصل کیا اوران کا جن شخصیات سے سابقہ پڑا اور جو تجربات حاصل ہوئے، ان کے نتیجہ میں علمی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ محنت و جفاکشی، عزم وحوصلہ، وسعت فکر ونظر، تعصبات سے دور مسلکی اعتدال اور سیاسی سوج بوجھ کا ایک انتہائی لطیف ومتوازن امتزاج ان کی قائدانہ شخصیت کا طرۂ امتیاز بن گیا۔

سیاست ان کا اصل میدان نہیں تھا، حالاں کہ اس میدان میں بھی ان کی سرگرمیوں کا مطمح نظر سیم وزر کے حصول اور منافع دنیوی کے اکتساب کے بجائے ملک وملت کے مفادات کا تحفظ ہی تھا، پھر بھی وہ اپنے رجحان طبع کے باعث جلد ہی اس میدان سے کنارہ کش ہو گئے اور انھوں نے خانقاہ رحمانی، جامعہ رحمانی اور امارت شرعیہ کو اپنی توجہات ومصروفیات کا محور بنالیا۔

انھوں نے خانقاہ رحمانی کو تصوف وروحانیت کے مرکز کے طور پر وسعت عطا کی، جامعہ رحمانی کا از سر نو احیا کیا اور اسے اتنی ترقی دی کہ جلد ہی ہندستان کے گنے چنے چند مایۂ ناز دینی تعلیمی جامعات میں اس کا شمار ہونے لگا، امارت شرعیہ کے نظام کو وسعت بخشی اس کے تحت قضاء کے نظام کو منظم اور وسیع سے وسیع تر کیا اور اس کے ادارہ جاتی نظام کو بھی وقت کے تقاضوں کے مطابق بنایا یہاں تک کہ وہ شرعی امور کے سلسلہ میں ہندستان کا نہایت قابل اعتماد ومستند ادارہ بن گیا۔

یہ تینوں ادارے ایک طویل عرصہ تک ان کی سرگرمیوں کا مرکز بنے رہے۔ انھوں نے رات دن اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر انتہائی محنت وعرق ریزی کے ساتھ ان کی آبیاری کی۔

انھوں نے خانقاہ رحمانی کے ایک متقی وپرہیزگار بزرگ اور پیر ومرشد کے طور پر بیعت وارشاد کے ذریعہ تشنہ کامان رشد وہدایت کی روحانی تربیت کی اور ایک بڑی خلقت ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئی۔

جامعہ رحمانی میں انتظامی امور سے لے کر تصنیف وتالیف، تدریس وافتا اور خطابت

تک ہر ہر میدان میں ایک ماہر متخصص کے طور پر انھوں نے اپنا ایک الگ امتیاز قائم کیا۔

امارت شرعیہ کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو اس کو امور شریعت کا مستند مرکز و مرجع بنادیا۔ وہ تھے تو امیر شریعت رابع لیکن یہ منصب ان کے نام کا ایسا جز بنا کہ ان کے ساتھ خاص ہو کر رہ گیا اور ہمیشہ ایسا محسوس ہوا جیسے یہ منصب انھی کے لیے وضع کیا گیا تھا، یہاں تک کہ آج بھی جب مطلق امیر شریعت کہا جاتا ہے تو ذہن مرحوم ہی کی طرف متبادر ہوتا ہے۔

حضرت امیر شریعت نے اڑیسہ اور بالخصوص بہار کے اطراف واکناف میں پھیلے ہوئے شہروں قصبوں اور قریوں کے اسفار کیے اور دل کو چھو لینے والی اپنی اصلاحی تقریروں اور مواعظ حسنہ سے تبلیغ دین، روحانی تربیت اور اصلاح معاشرہ کا عظیم کام انجام دیا۔ اپنے علم کی وسعت، روحانیت کی قوت، کردار کی بلندی اور اخلاق کی کشش سے بلاتفریقِ عوام وخواص لاکھوں ارادت مندوں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔

یہ صحیح ہے کہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی براہ راست جن اداروں کے سرپرست اور منتظم ومنصرم تھے وہ مونگیر اور پھلواری شریف، پٹنہ میں واقع ہیں اس لیے قدرتی طور پر بہار اور اس کے قرب وجوار کے علاقے خصوصی طور پر ان کے جولان گاہ عمل رہے لیکن وہ شروع ہی سے ہندستان گیر سطح کے صف اول کے علماء میں بھی ہمیشہ ممتاز حیثیت کے حامل رہے۔ اور پھر ہندستان ہی کیا جلد ہی ان کی شہرت برصغیر کے ملکوں تک بھی محدود نہ رہ کر دیگر بیرونی ممالک تک پھیل گئی۔ انھوں نے مصر وسعودی عرب وغیرہ ملکوں کے دورے بھی کیے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جو آج ملت اسلامیہ ہند کا سب سے زیادہ نمائندہ مشترکہ ادارہ ہے، اس کے قیام کے پس منظر کی تفصیلات سے واقفیت رکھنے والے اہل علم ودانش سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ اس ادارہ کا قیام صحیح معنی میں جس شخصیت کا مرہون منت ہے وہ کون ہے؟ تو ان کا ایک ہی جواب ہوگا: حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ۔

حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے، اس کی تاسیس سے

لے کر تادم واپسیں، فعال جنرل سکریٹری ہی نہیں رہے بلکہ وہ انہی کی فکر کا ثمرہ تھا اور وہی اس کے روح رواں بھی تھے۔

راقم الحروف کی یہ خوش قسمتی ہے کہ زندگی کے ایک مرحلہ میں اس کو حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی کے بہت قریب رہنے اور ان کے اخلاق اور عادات واطوار کو قریب سے دیکھنے پرکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا، لیکن خوش نصیبی کا یہ زمانہ بہت ہی مختصر تھا اور یہ بات بھی بیسویں صدی کے ساتویں عشرہ کے نصف ثانی کی ہے، لیکن آج بھی اس کی یادیں تازہ ہیں۔ دراصل میں نے انہی یادوں کے حوالہ سے حضرت ممدوح پر ایک تاثراتی مضمون لکھنا شروع کیا تو نوک قلم پر بے اختیار ان کی بعض خدمات کا ذکر آ گیا۔ ان کے کارناموں کے اس سرسری تذکرہ میں صرف یہی نہیں کہ استیعاب واحاطہ نہیں ہے بلکہ ان میں سے کسی بھی کارنامہ کی تفاصیل بیان کرنے سے مکمل طور پر گریز کیا گیا ہے، کیوں کہ جن دوسرے مقالہ نگار حضرات نے اس پہلو سے مرحوم کی شخصیت سے متعلق خامہ فرسائی کے ذریعہ حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے، وہ اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے مجھ سے کہیں زیادہ اس بات کے حقدار ہیں۔

دارالعلوم دیوبند میں تعلیم کے دوران ہندستان کے جن چند ممتاز ونامور علماء کے بارے میں سننے اور جاننے کا موقع ملا ان میں حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کا ایک اہم مقام تھا۔ یوں تو دارالعلوم کی مجلس شوری کے تمام ہی ارکان معزز ومحترم تھے لیکن ان میں مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی، داعی دین حضرت مولانا محمد منظور نعمانی، حضرت مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی اور حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی رحمہم اللہ کا ایک خاص دبدبہ تھا۔ مجلس شوری کے اجلاس کے موقع پر جب ان حضرات کی آمد ہوتی تھی، طلبہ ان سے ان کے فارغ اوقات میں ملاقاتوں کی کوشش کرتے تھے۔ میری افتاد طبع اس سے بالکل مختلف تھی، لیکن چونکہ یہ شخصیات طلبہ کے حلقوں میں موضوع گفتگو بنی رہتی تھیں اس لیے میں بھی ان سے متاثر تھا اور

حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کی پر وقار شخصیت کا ایک مرعوب کن تأثر میرے دل پر بھی نقش تھا۔

دارالعلوم دیوبند میں زمانۂ تعلیم کے دوران یا وہاں ملازمت کی مختصر مدت کے دوران احقر کو حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کے ساتھ ایسی کوئی ملاقات یاد نہیں جس کو باقاعدہ ملاقات کہا جا سکے۔ دیوبند سے دہلی منتقل ہونے کے بعد میں چند سال (۱۹۶۵-۱۹۶۷ء) جمعیۃ علماء ہند کے دفتر مسجد عبدالنبی میں بسلسلۂ ملازمت مقیم رہا۔ اس زمانہ میں گنگوہ کے مولانا محمد ایوب انصاری آفس سکریٹری کی حیثیت میں جمعیۃ کے تمام داخلی انتظامی امور کے ذمہ دار تھے۔ وہ انتہائی قوی الاعصاب اور مضبوط شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی مرضی واجازت کے بغیر کسی کی مجال نہیں تھی کہ کچھ کر سکے ان کا فرمان جمعیۃ کے مرکزی دفتر کے علاوہ الجمعیۃ اخبار اور الجمعیۃ بکڈ پو جیسے ذیلی اداروں میں بھی چلتا تھا۔ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کی ریاست بہار کی سطح تک تو جمعیۃ علماء سے وابستگی رہی لیکن اس کی مرکزی مجلس عاملہ میں وہ نہیں تھے بلکہ اس میں ان کے برادر اکبر حضرت مولانا نور اللہ صاحب رکن تھے۔

حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کا شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور ان کے خانوادے سے بڑا گہرا تعلق رہا تھا، لیکن یہ وہ دور تھا جب ان کے اور حضرت مولانا سید اسعد مدنی کے درمیان کچھ دوری شروع ہو گئی تھی۔ بایں ہمہ، مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس دوران حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کا متعدد بار جمعیۃ کے دفتر میں آنا ہوا۔ اس کے علاوہ مولانا ایوب انصاری مختلف مجلسوں میں دارالعلوم میں پڑھنے کے دوران اپنے جن بے تکلف ساتھیوں کا ذکر کرتے تھے ان میں حضرت مولانا منت اللہ رحمانی بھی شامل تھے۔ اس طرح جمعیۃ کے دفتر سے وابستگی کے دوران نہ صرف یہ کہ غائبانہ طور پر حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کا تعارف ہو چکا تھا اور ان کی شخصیت کے مختلف گوشے سامنے آ چکے تھے بلکہ ذاتی طور پر بھی کئی بار شرف ملاقات حاصل ہو چکا تھا۔

۱۹۶۷ء میں جمعیۃ علماء ہند کی ملازمت ترک کر کے بی اے اور ایم اے کرنے کے لیے میں نے دہلی کالج (جس کا نام اب ذاکر حسین کالج ہے) میں داخلہ لے لیا تھا۔ عرب اسرائیل

تنازع کی تاریخ میں اس سال ایک ایسا موڑ آیا جس کے بعد اسرائیل زیادہ سے زیادہ طاقت ور اور سرکش ہوتا چلا گیا اور یہ نتیجہ تھا عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی شکست کا، جس میں اسرائیل نے اردن اور مصر وشام کے بڑے علاقوں پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس موقع پر دہلی اور بعض دوسرے شہروں میں اسرائیل کی مذمت اور فلسطینیوں اور عربوں کی تائید وحمایت میں اجتماعات اور کانفرنسیں ہوئیں۔ اسی سلسلہ کا ایک عظیم عوامی اجتماع غالباً 'تحفظ فلسطین' کے عنوان سے حضرت مولانا منت اللہ رحمانی نے انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ میں ۶/اگست ۱۹۶۷ء کو منعقد کیا تھا جس میں شام کے سفیر اور مصر اور اردن کے سفارتکاروں نے بھی شرکت کی تھی۔

اس کے کچھ دنوں بعد حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کی جانب سے کناٹ پلیس، نئی دہلی کے امپیریل ہوٹل میں ایک مختصر سے باوقار پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں راقم الحروف کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اس پروگرام میں عمائدین دہلی کے علاوہ مختلف عرب واسلامی ملکوں کے سفیروں نے شرکت کی تھی۔ سفیر شام عمر ابوریشہ صاحب جوان دنوں غالباً نئی دہلی میں ڈپلومیٹک گروپ کے ہیڈ (عمیدالسلک الدبلوماسی العربی Dean of Arab Diplomatic core) تھے، کو حضرت مولانا منت اللہ رحمانی نے فلسطینیوں اور دیگر عربوں کے ساتھ ہمدردی اور یگانگت کے اظہار کے لیے رمزی طور پر مبلغ ۱۲۷۰۰۰ ہزار روپے کا ایک چیک پیش کیا تھا۔ اس پروگرام میں احقر نے ترجمانی کے کچھ فرائض بھی انجام دیے تھے۔

سفیر شام عمر ابوریشہ (سن پیدائش ۱۹۱۰ء) عربی کے ایک بلند پایہ ادیب وشاعر تھے۔ ملاقات کے وقت یہ اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ سفارت کار بھی ہیں۔ تاہم وہ سفارت کاروں کے حلقوں میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ کسی مفکر کی طرح گہری سوچ میں استغراق کی سی کیفیت ان کے چہرے سے عیاں رہتی تھی۔ ان کے اشعار میں عظمت رفتہ کی کسک کے ساتھ بڑا انقلابی سا ولولہ وحماس ہوتا تھا اور شعر پڑھتے وقت وہ جوش میں آجاتے تھے۔

بعد میں اسی پروگرام کے نتیجہ میں راقم الحروف کی زندگی سے متعلق حالات نے ایک نیا

موڑ لیا اور میرا باضابطہ طور پر حضرت مولانا منت اللہ رحمانی سے تعلق قائم ہوگیا۔ حضرت مولانا ممدوح باصلاحیت افراد کی تلاش میں رہتے تھے، ان کو جامعہ رحمانی میں رکھ کر اپنی سرپرستی اور تربیت کے ذریعہ ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر کے ان کو جلا بخشتے تھے۔ غالباً اسی رجحان کے تحت حضرت مولانا کی نگاہ عنایت مجھ پر بھی پڑی۔ مجھ میں کوئی صلاحیت رہی ہو یا نہ رہی ہو لیکن ان کی یہ عنایت میرے لیے بہرحال انتہائی حوصلہ افزا تھی۔ حضرت مولانا کی طرف سے مجھے جو پیش کش کی گئی تھی اس میں مجھے دو طرح کا اختیار تھا: اول یہ کہ میں جامعہ رحمانی میں تدریس کی خدمت اپنے ذمہ لوں، دوم یہ کہ میں دہلی میں رہتے ہوئے جامعہ رحمانی و امارت شرعیہ سے متعلق عربی کے کام انجام دوں۔ پہلی صورت میں جو مشاہرہ تجویز کیا گیا تھا دوسری صورت میں اس کے نصف کی پیش کش تھی۔ میں ان دنوں حضرت مولانا قاضی سجاد حسین رحمۃ اللہ علیہ کے ایک قدیم شاگرد کی حیثیت میں ان کی نوازش سے مسجد فتحپوری (چاندنی چوک، دہلی) کے صدر دروازہ کے اوپر واقع کمرہ میں مقیم تھا۔ میں نے اس سلسلہ میں مولانا موصوف سے مشورہ کیا تو انھوں نے فرمایا کہ دہلی کو مت چھوڑو، اللہ تعالیٰ تمہارے لیے یہیں راہیں پیدا فرمائے گا۔ یہاں رہتے ہوئے جو خدمت سپرد کی جارہی ہے اور جس مشاہرہ کی پیش کش کی جارہی ہے اسی کو قبول کرلو۔ مختلف امور کے پیش نظر میرا رجحان بھی اسی طرف تھا، اس لیے فیصلہ کرنے میں اس سے بڑی مدد ملی، اور میں نے حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کو اس فیصلہ سے فوری طور پر مطلع کردیا۔

بعد میں استاذ محترم حضرت مولانا قاری محمد میاںؒ (استاذ مدرسہ عالیہ عربیہ فتحپوری) سے معلوم ہوا کہ حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ کے ذہن میں بھی ایک ایسی ہی تجویز تھی کہ اگرچہ میں نے جمعیۃ کی باقاعدہ ملازمت سے استعفیٰ دے دیا ہے، تاہم آزادرہ کر عربی زبان سے متعلق جمعیۃ کے کام انجام دیتا رہوں، لیکن جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ اسی انداز میں میرا رابطہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ سے ہوچکا ہے، تو انھوں نے خاموشی اختیار کرلی۔ حضرت مولانا قاری محمد میاں نے اپنے الفاظ نقل کرتے ہوئے بتایا: ''میں نے کہا: ''اب تو چڑیا اڑ چکی ہے اور جب اس کی وضاحت کی تو

ان کے (حضرت مولانا سید اسعد مدنی کے) چہرے پر ایک تاسف بھرا تاثر نظر آیا لیکن انھوں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا''۔ میں اور میرے مرحوم دوست مولانا فصیح الدین دہلوی یہ بات نوٹ کرتے تھے کہ حضرت مولانا سید اسعد مدنی رحمہ اللہ اپنے قریبی لوگوں کے سامنے بھی انفعالی کیفیات کے تحت کسی بھی غیر ضروری تعلیق وتبصرہ سے گریز فرماتے تھے۔ یہی حال حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کا بھی تھا بلکہ یہ صفت ان کے اندر بدرجۂ اتم موجود تھی۔ دراصل حلم وبردباری، تحمل وبرداشت اور سنجیدگی ومتانت کامیاب قیادت وزعامت کے تقاضوں میں سے ہیں۔ چنانچہ ہمارے اکابر ومعاصرین میں جو حضرات بھی کامیابی کے ساتھ اجتماعی مناصب پر فائز رہے ان کے اندر پائے جانے والے یہی وہ اوصاف تھے جو بفضلہ تعالیٰ ان کی کامیابی کے ضامن رہے۔

پٹنہ میں ''تحفظ فلسطین'' کانفرنس میں جو عرب سفارتکار شریک ہوئے تھے، وہ حاضرین کے جم غفیر، ان کے جوش وخروش، منتظمین کی سلیقہ مندی اور حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کے اثر ورسوخ اور مقبولیت سے بے حد متاثر ہو کر آئے تھے۔ ان کے تأثرات سن کر دوسرے متعدد عرب سفراء بھی بالخصوص سفیر سعودی عرب شیخ محمد حمد الشبیلی، حضرت مولانا منت اللہ رحمانی سے بہت متاثر اور ملاقاتوں کے بعد کافی مانوس ہو گئے تھے۔

میرے ذمہ جو کام تھا وہ بہت ہی محدود تھا... کام یہ تھا کہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کی دہلی آمد سے قبل حسب ضرورت کبھی کبھی سفیر سعودی عرب یا دوسرے کسی سفیر سے ملاقات کا وقت طے کرانا اور ملاقاتوں کے وقت ساتھ رہنا، ترجمانی کے فرائض انجام دینا، عربی میں اس سلسلہ کی ضروری خط وکتابت یا ترجمہ کرنا۔

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ ترجمانی کرنا ایک فن ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ترجمانی کرانا بھی ایک اہم فن ہے۔ ترجمانی کراتے ہوئے حضرت مولانا منت اللہ رحمانی اردو میں بولتے وقت مترجم کی طرف دیکھنے کے بجائے اصل مخاطب ہی کی طرف زیادہ تر اپنا روئے سخن رکھتے تھے۔ آواز کے زیر وبم، آنکھوں سے جھانکتی ہوئی ذہانت وفطانت، چہرے پر منعکس ہوتے

ہوئے جذبات، ان کا سراپا اور شخصیت کے تمکنت و وقار کے باعث ان کا مخاطب ہمہ تن گوش بن کر ترجمہ سننے کے لیے مجسم اشتیاق بن جاتا تھا اور بسا اوقات ترجمہ سنے بغیر ہی کسی حد تک اجمالی سا مطلب بھی سمجھ جاتا تھا۔

۱۹۵۵ء میں پہلا سرکاری حج وفد ہندستان سے سعودی عرب گیا تھا۔ اس کے سربراہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ تھے۔ انھوں نے ہی جواہر لال نہرو کو اس کا مشورہ دیا تھا۔ اس وفد کے ارکان میں جہاں حضرت مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، حضرت مولانا مسعود علی ناظم (امور اداری) دارالمصنفین (اعظم گڑھ)، علامہ المأمون ابن عبدالوہاب مدنی دمشقی پروفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جناب محمد احمد کاظمی ایڈوکیٹ ایم پی، جناب محمد مجتبیٰ ایڈوکیٹ شامل تھے، وہیں حضرت مولانا لدھیانوی کے دو صاحبزادے مولانا سعید الرحمٰن لدھیانوی اور مولانا محمد احمد لدھیانوی اور میرے برادر اکبر مولانا وحید الزماں کیرانوی بھی وفد کے ارکان تھے۔ حج کے دوران سعودی شخصیات و ذمہ داران ہی نہیں بلکہ مختلف ممالک کی اہم شخصیات کے ساتھ ملاقاتوں اور تبادلہ خیال کا موقع ملا تھا۔ برادر محترم کے بیان کے مطابق ان ملاقاتوں کے دوران زیادہ تر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ہی بولتے تھے اور مسلسل بولتے تھے اور ان کو مسلسل ترجمانی کے فرائض انجام دینے ہوتے تھے۔ برادر محترم، مخاطب کے ساتھ مولانا لدھیانوی کے طرز تخاطب کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد کہا کرتے تھے کہ اس معاملہ میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا شاید ہی کوئی ثانی ہو۔ وہ اپنے مخاطب کو اردو زبان میں بولتے ہوئے ہی مرعوب و مبہوت کر دیتے تھے۔ زبان کی اجنبیت براہ راست تأثیر میں رکاوٹ نہیں بنتی تھی۔

اس طویل جملہ معترضہ کے ذکر سے مقصد یہ بتانا ہے کہ میرے علم کی حد تک حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے بعد حضرت مولانا منت اللہ رحمانی ہی کی شخصیت تھی جو عرب مخاطبین کو زبان کی اجنبیت کے باوجود براہ راست بھی متاثر کرتی تھی۔ وہ صرف اردو ہی میں بولتے تھے۔ درمیان کلام عربی کے جملے استعمال کرنے پر قدرت کے باوجود وہ ان کا استعمال نہیں کرتے تھے غالبًا

وہ اس کو وقار کے منافی سمجھتے تھے۔ سنجیدہ گفتگو میں بیچ بیچ میں دوسری زبان کے جملوں کی پیوند کاری بسا اوقات اختلال معنی، التباس کلام اور پراگندہ فکری کا موجب بھی بن سکتی ہے۔

اس کے بالمقابل ایک دوسرا ذوقی مسلک یہ بھی ہے کہ مخاطب کی زبان پر مکمل عبور نہ ہونے اور خاص طور پر سلاست وروانی کے ساتھ بولنے کی مہارت نہ ہونے کے باوجود دوران کلام اس کی زبان میں بھی طبع آزمائی کی جائے، جیسے حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ ترجمانی کے دوران براہ راست عربی میں تکلم شروع کر دیتے تھے، بے تکلفی کے ماحول میں اس کا بھی بعض اوقات اپنا ایک لطف ہوتا تھا۔ بعض حضرات تو اپنے مخاطب کی زبان کے چند جملے بھی جانتے ہیں تو ان کو ضرور بولتے ہیں بلکہ خاص طور پر اس مقصد کے لیے کچھ ضروری جملے سیکھتے ہیں۔ اس موقع پر یاد آتا ہے کہ ۱۹۵۶ء میں اس وقت کے وزیر امور خارجہ (اور بعد میں آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے پہلے صدر) ڈاکٹر سید محمود کا کسی عرب ملک (غالبًا سعودی عرب) کے دورہ کا پروگرام بنا تو اس کے لیے انھوں نے باقاعدہ عربی میں مجاملت (Courtesy) کی ابتدائی گفتگو کے لیے کچھ ضروری جملے سیکھے۔ اس کام کے لیے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی ایما پر برادر گرامی قدر مولانا وحید الزماں کیرانوی ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر متعدد بار گئے اور ان کو حسب ضرورت عربی پڑھائی۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ جب کوئی آدمی کسی غیر ملکی کو اپنی زبان بولتے ہوئے سنتا ہے تو بہت اچھا لگتا ہے۔ اور اگر کوئی بڑا آدمی ایسا کرے تو بسا اوقات اس کا بڑا خوش گوار اثر ہوتا ہے۔ لیکن یہ عام طور پر مجاملت اور غیر رسمی قسم کی گفتگو کی حد تک ہی ٹھیک رہتا ہے۔ سنجیدہ گفتگو میں حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کا اصولی انداز ہی انسب معلوم ہوتا ہے۔

عرب سفراء سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو حضرت مولانا منت اللہ رحمانی نے ان کو بھی متاثر کیا۔ سعودی سفیر شیخ شبیلی سے تو بہت ہی گہرے مراسم ہو گئے تھے۔ دہلی تشریف آوری پر ان سے اکثر ملاقات ہوتی تھی اور چوں کہ یہ ملاقاتیں غیر رسمی بھی ہوتی تھیں اس لیے ان کے ساتھ گفتگو میں حضرت امیر شریعت بھی اپنے مذکورہ اصول پر کاربند نہیں رہتے تھے، بے تکلفی

کی بات چیت میں آپ بھی عربی میں تکلم شروع کردیتے تھے۔اس تعلق اور بے تکلفی میں خود شیخ شبلی کے اخلاق کریمانہ کا بڑا دخل تھا۔انھوں نے اخلاق کا ایک ایسا ریکارڈ قائم کیا تھا کہ اس کو آج تک کوئی نہ توڑ سکا۔ایسا سفیر نہ آج تک کوئی آیا اور نہ آنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔وہ لوگوں کے ساتھ جس اخلاق کا معاملہ کرتے تھے وہ ہر کسی کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔

حضرت امیر شریعت بھی شیخ شبلی کے اخلاق سے بہت متاثر ہوتے تھے ایک مرتبہ وہ ان کی ایک ادا سے تو بہت ہی متاثر ہوئے۔ان کی استحسان آمیز حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ سفیر صاحب ایک کالے سے چھوٹے بچے کو گود میں لیے ہوئے ہیں اور اس کو کھلا رہے ہیں اور اپنے مسکراہٹ بھرے چہرے کے ساتھ بار بار کہہ رہے ہیں: هذا الولد حصيلة الاسلام ... انه حصيلة الاسلام یعنی یہ بچہ اسلام کی دین ہے..اسلام کی کمائی ہے۔یہ بچہ دراصل ان کے ایک ملازم کا تھا جو ان کے اخلاق کریمانہ سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گیا تھا۔

لوگوں کو تحفے دینا شیخ شبلی کی ہابی تھی، وہ اتنے تحفے تقسیم کرتے تھے کہ ہر ایک کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کو سب سے زیادہ تعلق انہی سے ہے۔ایک مرتبہ شبلی صاحب نے حضرت امیر شریعت کو تحفے کے طور پر شیروانی کا کپڑا اور عطر وغیرہ پیش کیا۔اگلی بار حضرت امیر شریعت کا جب دہلی آنا ہوا تو آپ اپنے ساتھ بھاگلپوری کپڑے کا ایک پورا تھان لے کر آئے اور شبلی صاحب کو ہدیہ میں دیا۔ان کے لیے غالباً یہ پہلا موقع تھا جب کسی نے ان کو بھی جوابا ہدیہ پیش کیا تھا۔انھوں نے بار بار کہا: یا شیخ! آپ نے تو پورے کنبہ ہی کے لیے تحفہ دے دیا ہے اور اس کے بعد ان کے انداز سے یہ محسوس ہوا جیسے وہ صرف تحفہ دینے ہی کے عادی تھے، تحفہ لینے کے نہیں۔ان کی عادت (ہابی) کا محرک تو حدیث نبوی: ''تهادوا تحابوا'' ہی رہی ہوگی لیکن ''مُهْدَى اليهم'' کے عمومی طرز عمل نے ان کو تہادی (باہم ایک دوسرے کو ہدیہ دینے) کے بجائے صرف ''إهداء'' ہی کا عادی بنا دیا تھا۔

ایک مرتبہ شیخ شبلی نے حضرت امیر شریعت کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا۔اسی دن یا

دوسرے دن شام میں حضرت امیر کا واپسی کا پروگرام تھا۔ دوران گفتگو سفیر صاحب کو جب اس کا علم ہوا تو انھوں نے یہ بھی پوچھا کہ کس ٹرین سے واپسی ہوگی۔ مولانا کے کسی رفیق نے ٹرین کا نام بتادیا اور سرسری سے اس سوال کے جواب میں صحت و درستگی یا ضروری تفصیل کا خیال رکھنا چنداں ضروری نہیں سمجھا گیا کیوں کہ سفیر موصوف نے جس مقصد سے سوال کیا تھا وہ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ دوسرے دن حضرت مولانا قاضی سجاد حسین نے راقم السطور کو بتایا کہ کل شام جب وہ باہر کے ایک سفر سے دہلی کے ریلوے اسٹیشن پہنچے اور ٹرین سے پلیٹ فارم پر اترے تو دیکھا کہ وہاں شیخ شبلی اپنے کچھ سعودی سفارت کاروں اور مقامی ملازمین کے ساتھ (ان کے الفاظ میں: اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ) ٹہل رہے ہیں، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ حضرت امیر شریعت کو رخصت کرنے کے لیے آئے تھے، چوں کہ ٹرین کا نام و نمبر صحیح طور پر معلوم نہیں ہوسکا تھا، اس لیے انھوں نے جس مقصد کے لیے اسٹیشن آنے کی زحمت کی تھی وہ پورا نہ ہوسکا۔

شیخ شبلی سے حضرت امیر شریعتؒ کے لیے جب بھی وقت لیا جاتا وہ ان کو لنچ (دوپہر کے کھانے) پر مدعو کرلیتے۔ اس لنچ کے دوران کبھی کبھی بعض دوسرے سعودی ڈپلومیٹ بھی شریک ہوتے تھے۔ شیخ حسین تو اکثر شریک رہتے ہی تھے۔ چوں کہ اس طرح کی محفلیں متعدد بار ہوچکی تھیں اس لیے بعض دوسرے سعودی سفارت کار بھی حضرت امیر شریعت سے مانوس ہوگئے تھے۔ شیخ حسین کو خاص طور پر بڑا تعلق ہوگیا تھا۔ وہ باقاعدہ ڈپلومیٹ تو نہ تھے لیکن سعودی نیشنل ہونے اور عرصۂ دراز سے سعودی سفارت خانہ، نئی دہلی میں تعینات ہونے کے باعث ان کی اپنی ایک اہمیت تھی۔ ان کو اردو سیکھنے کا شوق تھا چنانچہ وہ صرف اردو سمجھتے ہی نہیں تھے بلکہ بولتے بھی تھے۔ اردو جملوں کا جب عربی میں ان کو مطلب بتایا جاتا تھا تو وہ ان کا تجزیہ کرکے ان کی بڑی دلچسپ عربی بناتے تھے اور پھر مزاحاً ان کا استعمال بھی کرتے تھے۔ مثلاً وہ کسی عربی داں اردو بولنے والے سے پوچھتے: ماھی رأس الحرارات ھذہ الأیام؟ جس سے ان کی مراد ہوتی تھی: آج کل کیا سرگرمیاں ہیں؟ ان کو معلوم تھا کہ عربی میں سر کے لیے راس اور گرمی کے لیے حرارۃ

استعمال ہوتا ہے لہٰذا سرگرمی کا ترجمہ انھوں نے راس الحرارۃ کیا اور پھر اس کی جمع راس الحرارات بنائی۔ ایسے ظریفانہ جملے وہ اکثر بے تکلف مجلسوں میں استعمال کیا کرتے تھے۔

یہ شیخ حسین کے تعلق ہی کی بات تھی کہ ایک مرتبہ انھوں نے حضرت امیر شریعت کو اپنے گھر پر مدعو کرنے کی خواہش ظاہر کی، جو قبول کر لی گئی، چنانچہ حضرت امیر شریعت علی پور میں واقع ان کے فلیٹ میں ان کی دعوت پر تشریف لے گئے۔ ایسے تمام ہی مواقع پر راقم الحروف حضرت امیر شریعت کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ دوپہر کے کھانے پر یہ خوشگوار ملاقات کافی دیر تک رہی تھی، اور مختلف ادبی علمی اور ملی مسائل زیر بحث آئے تھے۔ اس کے کچھ ہی روز بعد ان کی اذیت ناک موت نے ان کے سب ہی چاہنے والوں کو غمگین کر دیا تھا۔ ان کے کرسچین ڈرائیور نے ان کو گھر میں استعمال کئے جانے والے چاقو سے درجنوں وار کر کے قتل کر دیا تھا اور اس جنونی مجرم نے (اپنے اقبالیہ بیان کے مطابق) یہ محض اس لیے کیا تھا کہ انھوں نے اس کو کسی کام کے لیے بھیجتے وقت کار کے استعمال سے منع کر دیا تھا۔

دیگر سفراء جن سے حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی ملاقاتیں ہوتی رہیں ان میں ایک اہم نام عمر ابوریشہ سفیر شام کا بھی ہے جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔ ان سے حضرت امیر شریعت کی متعدد ملاقاتیں ہوئیں اور ایک بار انھوں نے بھی حضرت امیر کو کھانے پر مدعو کیا تھا۔ وہ بھی مولانا ممدوح سے بہت متاثر تھے۔ عمر ابوریشہ صاحب سے میں الگ سے بھی متعدد بار ملتا رہا تھا۔ ان سب ہی ملاقاتوں میں ان کے ساتھ خاص طور پر ادبی علمی و دینی موضوعات پر ہی گفتگو ہوتی تھی کیوں کہ وہ ایک بڑے ادیب و شاعر تھے اور تاریخ اسلام پر ان کی گہری نظر تھی۔

سفراء وغیرہ سے ملاقاتوں کے اس اجمالی تذکرہ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ حضرت امیر اپنے علم و فضل واخلاق اور تعمیری کردار سے صرف اپنے ہم وطنوں ہی میں مقبول و پسندیدہ نہیں تھے بلکہ سفراء کے درجہ کے غیر ملکی برادران اسلام کو بھی متاثر کرتے تھے۔ یہاں پر ایک تلخ حقیقت کی طرف اشارہ شاید بے محل نہ ہو کہ غیبت و چغل خوری جس کی اسلام میں سخت ممانعت ہے، اس

کا ارتکاب کرنے والوں کی ہمارے معاشرہ میں کمی نہیں ہے اور اس میں بھی زعما قسم کے بعض علماء اور ان کے وابستگان کا حلقہ دوسروں سے پیچھے نہیں نظر آتا۔ یہی وجہ ہے کہ جو سفراء، ملت اسلامیہ ہند کے مسائل سے دلچسپی رکھتے تھے، ہم نے ان سے ملاقاتوں کے دوران ہمیشہ محسوس کیا کہ وہ ملی مسائل سے وابستہ علماء زعماء اور قائدین کے درمیان موجود رقابت، چپقلش اور رسہ کشی کی تفصیلات سے پورے طور پر آگاہ ہیں اور ان کی یہ آگاہی کسی جستجو تحقیق وتفتیش کا نتیجہ نہیں تھی، بلکہ ایک دوسرے کے کرم فرما حضرات از خود ہی ان کو رضا کارانہ طور پر یہ ساری معلومات دوسروں کی کردار کشی کی صورت میں فراہم کرتے تھے۔ ملت کی ایک معروف شخصیت کو مطعون کرنے میں تو ان لوگوں نے حد ہی کردی تھی۔ ایسے حالات میں حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کے مثبت فکر وکردار کے علاوہ ان کا ہر قسم کے اختلاف ونزاع سے دور رہنا بھی ان کے حق میں جاتا تھا اور وہ عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

اس کے علاوہ یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ان سفراء سے ملاقات کے لیے بعض اوقات کوئی خاص ایجنڈا نہیں ہوتا تھا پھر بھی وہ بخوشی ملنے کے لیے نہ صرف وقت دے دیتے تھے بلکہ انتہائی اعزاز واکرام کا معاملہ کرتے تھے۔ اس میں حضرت امیر شریعت کی پرکشش شخصیت کے علاوہ ان سفراء کے اخلاق کو بھی دخل تھا۔ ایسی ملاقاتوں اور طویل نشستوں کا تصور بھی اب عجیب سا لگتا ہے، بلکہ یہ لگتا ہے کہ اب ایسے سفراء کی آمد کا سلسلہ ہی منقطع ہوگیا ہے۔

جب تک حضرت امیر شریعت سے میرا یہ باضابطہ تعلق رہا، اس دوران دہلی آمد کے موقع پر ان کا قیام اکثر جامع مسجد کے قریب واقع ہوٹل ناز میں ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ میری درخواست پر مسجد فتح پوری کے مین گیٹ پر واقع میری رہائش گاہ پر بھی قیام فرمایا تھا۔ اس تذکرہ کے ساتھ کھانے اور ناشتہ کے وقت کی کچھ باتیں یاد آرہی ہیں۔ کھانے میں پہلے چاول لیے جائیں یا روٹی؟ میں نے عرض کیا کہ ہماری طرف پہلے چاول کھانے کا رواج ہے۔ میرا لحاظ کرتے ہوئے مولانا کے ایک رفیق (جن کا نام اس وقت ذہن میں نہیں ہے) نے بھی ایسا ہی کرنا چاہا تو

مولانا نے ان کو ایسا کرنے سے منع کیا اور فرمایا کہ اپنا طریقہ مت چھوڑو، وہی طریقہ صحیح ہے کیوں کہ چاول کھانے میں ہاتھ زیادہ خراب ہوتا ہے، جبکہ روٹی کھانے میں ایسا نہیں ہوتا، اس لیے کھانے کے دوران ہاتھ کو دیر تک صاف رکھنے کی یہی شکل ہے۔ ناشتہ میں جب حضرت امیر دو پیالی چائے پی چکے اور تیسری پیالی پیش کی گئی تو آپ نے اس کو لینے سے فیصلہ کن انداز میں منع کر دیا۔ جب یہ بتایا گیا کہ ابھی انھوں نے دو ہی پیالی چائے پی ہے تو آپ نے فیصلہ بدل دیا اور چائے پینا شروع کر دی۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ناشتہ میں آپ ''لکل شیٔ نصاب وللشای ثلاثۃ'' پر عمل پیرا تھے ''ثلاث'' پر نہیں۔ اس چیستاں کو سمجھنے کے لیے حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے متعلق اس واقعہ کا بیان کرنا ضروری ہے جو حضرت مولانا قاری محمد میاں صاحب نے مجھ سے نقل کیا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ حضرت مدنی کے ایک میزبان نے مزید چائے نوش فرمانے کی درخواست کرتے ہوئے عرض کیا کہ ہم نے تو چائے سے متعلق آپ کا یہ مقولہ سنا ہے کہ ''لکل شیٔ نصاب وللشای ثلاث'' آپ نے فرمایا کہ یہ صحیح ہے لیکن مراد ''ثلاث مرات'' ہے ''ثلاثۃ فناجین'' نہیں، یعنی تین مرتبہ مراد ہے تین پیالی نہیں۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ کا معمول خواہ کچھ بھی رہا ہو لیکن اصل بات یہ ہے کہ اس موقع پر عدد و معدود کے نحوی قاعدہ کا پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے، ثلاث کے معدود کا جمع مؤنث ہونا ضروری ہے جبکہ فناجین واکواب جیسی جمع مذکر معدود کے لیے عدد کا مؤنث (ثلاثۃ) استعمال کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

اس زمانہ میں حضرت امیر شریعتؒ دہلی میں اپنے قیام کے دوران جب حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ اور دوسری شخصیات سے ملاقات فرماتے تب بھی بعض اوقات راقم الحروف کو حضرت کے ساتھ رہنے کا شرف حاصل ہوتا تھا، اور اس طرح ان اکابر کے باہمی احترام و مودت کے تعلقات، ملی مسائل اور علمی موضوعات پر گفتگو کی جھلکیاں دیکھنے اور سننے کو ملتی تھیں۔ ایک مرتبہ حضرت امیر شریعت نے حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے ساتھ ندوۃ المصنفین (اردو بازار، دہلی) میں کھانا تناول فرمایا، میں بھی اس موقع پر شریک طعام تھا۔ اس

نشست کے دوران دونوں کے درمیان مسائل پر گفتگو اور ظریفانہ نوک جھونک دونوں ہی سے مستفادہ کا موقع ملا۔ ایک مرتبہ حضرت امیر شریعت کو معلوم ہوا کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ دہلی میں ہیں اور نظام الدین ویسٹ میں مولانا راحت ہاشمی صاحب کے یہاں مقیم ہیں حضرت نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور نظام الدین کے لیے روانہ ہو گئے۔ نظام الدین میں جب ہماری ٹیکسی ان کے مکان کے قریب پہنچی تو وہ باہر ہی مل گئے اور انھوں نے بتایا کہ حضرت مولانا عبدالوحید صدیقیؒ (والد محترم جناب شاہد صدیقی صاحب ایم پی) جو نظام الدین ہی کے ایک مکان میں رہائش پذیر تھے، کی طبیعت خراب ہے، اس لیے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے ہیں۔ حضرت امیر شریعت نے فرمایا کہ ہم بھی وہیں چلتے ہیں، عیادت بھی ہو جائے گی اور دونوں حضرات سے ملاقات بھی۔ چنانچہ ہم لوگ حضرت مولانا عبدالوحید صدیقی صاحب کے دولت کدہ پر پہنچ گئے۔ اس مکان میں موصوف کچھ روز پہلے ہی منتقل ہوئے تھے اور یہ وہ وقت تھا جب زندگی کے اتار چڑھاؤ اور نشیب فراز سے گزر کر آخر کار ایک بار پھر ان کا تابناک دور شروع ہو چکا تھا۔ حضرت مولانا عبدالوحید صدیقیؒ کی زندگی کو مادی ومعنوی دونوں اعتبار سے عروج وزوال کی ایک سبق آموز سچی داستان سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بڑے نشیب وفراز دیکھے تھے لیکن وہ پست ہمتی کا شکار ہونے والوں میں سے نہیں تھے، وہ ایک بلند حوصلہ انسان تھے، ہمت ہارنا اُنھوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ ان جیسی غیر معمولی حوصلہ رکھنے والی شخصیات کے ان پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہے تاکہ عام طور پر مایوسی کے شکار ہماری نئی نسل کے افراد ان سے سبق لے کر مشکل حالات میں کامیابی حاصل کرنے کا حوصلہ پائیں۔

اہل علم اور ارباب فکر ودانش جب جمع ہوتے ہیں تو الاناء ینضح (یا یترشح) بما فیہ کے مصداق ان کی عام مجلسیں بھی علم وعرفان سے عطر بیز رہتی ہیں، حکمت ودانائی کی گفتگو ان کا طرۂ امتیاز ہوتی ہے۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جس محفل میں ایک طرف حضرت حکیم الاسلام ہوں

دوسری طرف امیر شریعت اور صاحب خانہ حضرت مولانا عبدالوحید صدیقی جیسا میدان علم وادب اور صحافت کا ذہین وفطین شہسوار و سیاسی مبصر ہو، وہاں سیاست علم وادب، حکمت ودانائی اور رموز شریعت سے متعلق کیسی قیمتی گفتگو کے جواہر پاروں سے اس احقر کو محظوظ و مستفید ہونے کا موقع ملا ہوگا۔

ملاقات کا وقت عصر کے بعد کا تھا۔ عیادت کی اس نشست میں گفتگو کے ساتھ مع پر تکلف لوازمات کے چائے کا دور بھی چلا، یہاں تک کہ نماز مغرب کا وقت ہوگیا اور گھر پر ہی باجماعت نماز ادا کی گئی۔ عیادت کے سلسلہ میں یوں تو یہ مسلمہ اسلامی اصول ہے کہ مریض کے پاس زیادہ دیر نہ بیٹھا جائے، ظاہر ہے کہ حضرت حکیم الاسلام اور حضرت امیر شریعت کے ذہنوں سے اس اصول کے اوجھل ہوجانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن حضرت مولانا عبدالوحید صدیقی ان بزرگوں کی اپنے گھر پر آمد سے بے حد خوش تھے اور ان کے اخلاق اور اعزاز واکرام کے اہتمام سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہو رہی تھی کہ وہ خود اس نشست کو مختصر نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ یہ بھی موصوف کا اخلاق ہی تھا اور ان بزرگوں سے ان کے تعلق خاطر کا ثبوت بھی کہ انتہائی اصرار کے ساتھ منع کرنے کے باوجود بوقت روانگی ان کو رخصت کرنے کے لیے علالت کی حالت میں بھی وہ دروازے کے باہر تک تشریف لائے۔ رخصت کے وقت صاحبزادگان میں جناب شاہد صدیقی صاحب بھی تھے اور ان سے میری سب سے پہلی ملاقات بھی وہیں پر ہوئی تھی۔ یہ بات غالباً ۶۸ء کی ہے مجھے معلوم نہیں کہ وہ اس وقت زیر تعلیم تھے یا لکچرر ہوگئے تھے بہر حال حضرت مولانا عبدالوحید صدیقی نے ان دونوں بزرگوں سے ان کے لیے دعا کرنے اور سر پر ہاتھ رکھنے کے لیے کہا تھا۔ آج جناب شاہد صدیقی صاحب کو ملک میں جو عزت وشہرت حاصل ہے اس میں ان مستجاب الدعوات شخصیات کی دعاؤں کا بھی دخل ہے۔

حضرت امیر شریعت مجھ سے بڑا گہرا مشفقانہ تعلق رکھتے تھے۔ میں اپنے مزاج کے مطابق غیر ضروری تکلفات سے کام نہیں لیتا تھا۔ ایک دفعہ کسی کام سے دو سفیروں سے ملنے کے

لیے وقت لیا گیا۔ میرے اطلاع کرنے پر حضرت امیر، سفراء کے ساتھ اپائنٹمنٹ کی رعایت سے دہلی تشریف لے آئے۔ سردی کا موسم تھا، میں نے دیکھا کہ حضرت امیر ایک پرانی سی شیروانی پہنے ہوئے ہیں۔ میں نے عرض کیا آپ کو سفراء سے ملاقاتیں کرنا ہیں، اچھی شیروانی پہن کر آنا چاہیے تھا! مجھے ڈر تھا کہ میری اس بے باکی پر بھلے ہی حضرت ناگواری کا اظہار نہ فرمائیں انقباض تو ہو ہی سکتا ہے، لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ حضرت مسکرائے اور فرمایا: ''میں دور دراز کے دیہاتی علاقوں کے دورے پر تھا، سیدھا وہیں سے چلا آرہا ہوں مونگیر جانے کا موقع نہیں تھا اور گاؤں دیہات میں ایسے ہی کپڑوں میں آرام ملتا ہے جن کی زیادہ دیکھ بھال نہ کرنی پڑے اور سفراء سے ملاقات ہے تو کیا ہوا، اصل میں تو ہم صوفی منش لوگ ہی ہیں''۔

حضرت امیر ذاتی طور پر میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ میں جب بھی کوئی درخواست کرتا اس کو بڑی اہمیت دیتے۔ دارالعلوم دیوبند کے دفتر اہتمام سے متعلق میرا ایک کام تھا۔ حضرت امیر نے اس کے بارے میں پیش کار صاحب کے نام ایک خط تحریر کر کے مجھے دے دیا۔ میرے چھوٹے بھائی نے یہ خط پیش کار صاحب کو دیا تو انھوں نے اس کو خاطر خواہ اہمیت نہیں دی۔ اس پر حضرت امیر نے حضرت مہتمم (مولانا قاری محمد طیب) صاحب کے نام اپنے خط میں مذکورہ معاملہ کی وضاحت کے ساتھ تحریر فرمایا: ''میرے خط کے ساتھ جو معاملہ کیا گیا میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا''۔ حضرت مہتمم صاحب کو جب یہ خط شام کے وقت پیش کیا گیا تو دفتر بند ہو چکا تھا انھوں نے فوری طور پر دفتر کھلوا کر مطلوبہ کام کرایا، اور حضرت امیر شریعت کو بعد میں پیش کار صاحب کے طرز عمل پر معذرت کے لیے ایک بڑا تفصیلی خط ارسال فرمایا جس کی ایک ایک سطر اس بات کا ثبوت تھی کہ حضرت مہتمم صاحب کے دل میں حضرت امیر کی بے انتہا قدر و منزلت تھی۔

اس درمیان مجھے بغیر کسی کوشش وطلب کے عرب لیگ کے دہلی آفس میں ملازمت مل گئی۔ یہ پیش کش مجھے عرب لیگ مشن نئی دہلی (بعثة الجامعة العربية بنيو دلهي) کے ڈپٹی چیف محمد وہبی عبدالعزیز کی جانب سے ہوئی تھی اور ان کا اصرار تھا کہ میں بلا تاخیر کام شروع

کردوں۔ چار سو روپے تنخواہ طے ہوئی تھی (جو جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں عرب سفراء کی ایک میٹنگ کے دوران میری ترجمانی سے متأثر ہوئے تھے) اور اس زمانہ میں (غالباً ۶۸ء میں) یہ ایک معقول تنخواہ تھی۔ چنانچہ میں نے کام شروع کردیا۔ حضرت امیر سے پیشگی مشورہ نہ کرسکا۔ یہ میری کوتاہی تھی۔ جب میں نے حضرت امیر شریعت کو اس کی اطلاع دی تو وہی ہوا جس کا مجھے خطرہ تھا۔ حضرت نے الفاظ میں تو اظہار ناگواری نہیں فرمایا لیکن چہرے اور انداز گفتگو سے شکایت آمیز انقباض میں نے نمایاں طور پر محسوس کیا۔ تاہم یہ انقباض بھی وقتی ہی ثابت ہوا۔

اسی دوران ایک مختصر سا چند ماہ کا وہ خوشگوار عرصہ بھی میسر آیا جس میں محترم مولانا محمد ولی رحمانی صاحب (سجادہ نشین خانقاہ رحمانی مونگیر) نے جو دارالعلوم دیوبند سے تعلیم کی تکمیل کرچکے تھے حضرت امیر شریعت کی خواہش کے مطابق مسجد فتح پوری کے کمرہ میں میرے ساتھ قیام فرمایا۔ مقصد یہاں رہ کر عربی ادب کی کتابوں اور عربی رسائل وجرائد کا مطالعہ کرنا تھا۔ اس زمانہ میں میرے چھوٹے بھائی فریدالزماں کیرانوی بھی اسی کمرہ میں میرے ساتھ مقیم تھے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں زیر تعلیم تھے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ حضرت امیر شریعت کے خانوادہ سے ہمارے تعلق میں مضبوطی کے ساتھ وسعت بھی پیدا ہوگئی، اس سے یہ بات بھی واضح ہے کہ محترم مولانا محمد ولی رحمانی صاحب سے میرا اتنا قریبی تعلق چالیس سال پرانا ہے۔ اہم شخصیات کے بارے میں عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ ان کے زمانۂ طالب علمی ہی سے صلاحیت واستعداد، ذہانت وفطانت اور شرافت ونجابت کے حوالہ سے ایسے آثار وقرائن نمایاں ہونے لگتے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ حال کا یہ طالب علم مستقبل کی اہم شخصیت بننے والا ہے۔ مولانا محمد ولی رحمانی صاحب نے دارالعلوم دیوبند میں جو تعلیم حاصل کی تھی اس میں پختہ صلاحیت کے ساتھ وہ اسی وقت اردو ادب کے اعلیٰ ذوق سے مالا مال ہوچکے تھے اور انتہائی سلیس دشستہ وشگفتہ زبان لکھنے میں مہارت حاصل کرچکے تھے۔ مجھے پہلی بار ان کی اس صلاحیت کا اور ساتھ ہی اس عربی کی صحیح فہم کا، جس کو ہمارے مدارس کی اصطلاح میں جدید عربی کہا جاتا ہے، اندازہ اس وقت ہوا جب

انھوں نے میری ضرورت کے تحت دو صفحے کی ایک تقریر کا ترجمہ انتہائی عجلت کے ساتھ کر کے مجھے دے دیا۔ ہوا یہ کہ درگاہ حضرت نظام الدین میں کسی عرس کی تقریب کے موقع پر عرب لیگ کے سفیر (جن کو اصطلاح میں رئیس بعثة الجامعة العربیة کہا جاتا تھا) عباس سیف النصر صاحب کو مدعو کیا گیا۔ انھوں نے کچھ معلومات حاصل کر کے اس موقع کے لیے عربی میں ایک تقریر املا کرائی اور مجھ کو اس بات کے لیے مکلف کیا کہ ان کی لکھی ہوئی تقریر کے بعد میں اس کا تحریری ترجمہ پڑھ کر سنا دوں۔

گرمی کا موسم تھا میں تین بجے کے بعد آفس سے کمرہ پہنچا، مجھے کھانا بھی کھانا تھا اور پانچ بجے سے پہلے نظام الدین پہنچنا تھا۔ مولانا محمد ولی رحمانی صاحب اس وقت آرام کر رہے تھے۔ ان کو بیدار کیا گیا اور مذکورہ تقریر کے عربی سے اردو میں ترجمہ کی درخواست کی گئی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی جب انھوں نے خلاف توقع بہت ہی کم وقت میں اس کا ترجمہ کر کے مجھے دے دیا اور مزید حیرت اس وقت ہوئی جب پڑھنے کے بعد ان کی زبان کا معیار سامنے آیا۔ بلا کسی تواضع وانکساری کے یہ ایک مبنی بر حقیقت اعتراف ہے کہ کم از کم میں اتنا اچھا عربی سے اردو ترجمہ نہیں کر سکتا تھا۔ میرے لیے اس کے بجائے اردو سے عربی میں ترجمہ کرنا نسبتاً آسان تھا۔

اس کے بعد حالات بتدریج بدلتے گئے۔ محترم مولانا محمد ولی رحمانی صاحب مونگیر چلے گئے۔ میری عرب لیگ میں مصروفیت بڑھتی چلی گئیں۔ اب میرے لیے یہ ممکن نہیں رہ گیا تھا کہ عرب سفراء سے ملاقاتوں کے دوران حضرت امیر شریعت کے ساتھ رہ کر ترجمانی کے فرائض انجام دوں۔ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی شکست کے بعد فلسطینیوں اور عربوں کے لیے ہمدردی کی جو لہر چلی تھی اس کے تحت پائے جانے والے جوش وخروش میں بھی کمی آتی چلی گئی، بہت سے سفارت کار بھی تبدیل ہو گئے اور اس طرح عرب سفراء سے حضرت امیر شریعت کی ملاقاتوں کا سلسلہ بھی برائے نام ہی رہ گیا۔ اور پھر وہ وقت بھی آیا جب آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ قائم ہوا، اور اس کے بانی جنرل سکریٹری کی حیثیت میں حضرت امیر شریعت کی مصروفیات

میں دوسرے مشاغل کے ساتھ بے پناہ اضافہ ہوگیا۔

میں اس کو اپنی شومیٔ قسمت ہی سمجھتا ہوں کہ حضرت امیر شریعت سے گہری وابستگی کا جو دور شروع ہوا تھا وہ اس شکل میں زیادہ طویل نہ ہوسکا۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کے پلیٹ فارم سے حضرت امیر کے سرگرم عمل رہنے کے دوران مجھے ان کا بالکل بھی قرب حاصل نہیں رہا۔ اگر میں یہ کہوں کہ میری مصروفیات ہی اس کا سبب تھیں تو یہ پورا سچ نہیں ہوگا۔ تعلق کی گرم جوشی کو ہلکا کرنے میں دوسرے جو عوامل بھی کارفرما تھے ان میں دارالعلوم دیوبند میں پیش آمدہ کچھ تبدیلیوں اور بعد کے ناخوشگوار واقعات کا بھی دخل تھا جن میں سے بعض سے برادر گرامی قدر مولانا وحیدالزماں کیرانوی کا بھی تعلق تھا۔ دارالعلوم کا قضیہ نامرضیہ ایک ایسا قضیہ تھا جس نے باہم شیر وشکر رہنے والے ایک ہی جماعت کے لوگوں کو مختلف خیموں میں بانٹ دیا تھا جس کی زد مختلف لوگوں کے باہمی تعلقات پر پڑی تھی اور اس سے پہلے بھی اور بعد میں بھی شخصیات کے درمیان باہمی تعلقات (جن کی زد ان کے حلقہ بگوشوں پر بھی پڑتی رہی تھی) بنتے بگڑتے رہے تھے حضرت امیر شریعت سے میرا تعلق بھی کسی نہ کسی درجہ میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

دارالعلوم کا معروف قضیہ نامرضیہ شروع ہونے سے پہلے بیسویں صدی کے ساتویں عشرہ کے اواخر میں بھی طلبہ کی جانب سے ایک اسٹرائک ہوئی تھی۔ اس وقت میرے برادر خورد ڈاکٹر معید الزماں کیرانوی دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد جامعہ طبیہ دیوبند میں داخلہ کا پروگرام بنائے ہوئے تھے۔ اسٹرائک کی پاداش میں مجلس شوریٰ کی جانب سے کچھ طلبہ کے بارے میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ان کو دورۂ حدیث کے بعد کسی اور شعبہ میں داخلہ نہیں دیا جائے گا، ان طلبہ میں پتہ نہیں ڈاکٹر معید الزماں کا نام کس نے شامل کرادیا جبکہ ان کا اسٹرائک سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ چیز ان کی افتاد طبع سے بھی بے میل تھی، وہ ہمیشہ سے ہی ہم سب بھائیوں میں ٹھنڈے مزاج کے اعتبار سے اپنا امتیاز رکھتے ہیں۔ اس واقعہ سے ہم سب لوگوں کو سخت تکلیف پہنچی تھی اور اس کے نتیجہ میں ان کو دہلی میں داخلہ لے کر طب کی تعلیم حاصل کرنا پڑی تھی۔ مجھے

خاص طور پر حیرت و تکلیف تھی کہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کے رہتے ہوئے ایسا کیسے ہوگیا؟ جب احقر کو تفصیل معلوم ہوئی تو حضرت مولانا منت اللہ رحمانی دیوبند سے مونگیر تشریف لے جاچکے تھے، میں نے اپنے تعلق کی بنیاد پر چبھتے ہوئے الفاظ میں حضرت مولانا کو شکوہ کا ایک خط لکھا۔ مجھے اپنے خط کے الفاظ یاد نہیں۔ لیکن حضرت کا جو مختصر سا جواب موصول ہوا۔ اس میں مسامحت وسیر چشمی کا وہ رنگ نہیں تھا جس کا حضرت امیر نے مجھے عادی بنادیا تھا۔ لگتا تھا کہ جواب تحریر کراتے ہوئے شان جلالی غالب تھی اصل جواب ایک ہی استفہامیہ جملہ پر مشتمل تھا اور ہر لفظ چبھتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ یہ جواب پڑھ کر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہ کے بعض جوابات کی یاد تازہ ہوگئی تھی مثلاً ایک صاحب نے حضرت تھانوی کو ان کے الزامی جواب کے جواب میں لکھا کہ ''علما کو اتنا خشک نہیں ہونا چاہیے'' حضرت تھانوی نے اس کے جواب میں لکھا: ''جہلا کو اتنا تر نہیں ہونا چاہیے''۔

اس مختصر جواب میں بھی برادر اکبر مولانا وحیدالزماں کیرانوی سے متعلق ''تبدیلی شاخ'' (بمعنی تبدیلی خیمہ) کی تعریض تھی۔ مجھے اس سے خاصی تکلیف پہنچی تھی، اس لیے بھی کہ اگر چہ ہم بھائیوں کے درمیان تعلقات اور ایک دوسرے کے مرتبہ ومقام کا پاس ولحاظ تو مثالی انداز کا رہا ہے لیکن میں ذہنی طور پر ہر معاملہ میں اپنے برادر گرامی قدر کا تابع محض نہیں تھا۔ متعدد چیزوں میں میرا ان سے اختلاف رائے رہا لیکن پھر بھی نہ احترام میں کوئی کمی آئی اور نہ تعلقات متاثر ہوئے۔

من جملہ اور اسباب کے اس تلخ واقعہ نے میری نفسیات پر خاصا ناخوشگوار سا اثر چھوڑا تھا اور بجا طور پر کہہ سکتا ہوں کہ بعد کے دنوں میں حضرت کی دہلی میں تشریف آوری کے مواقع پر میری طرف سے ملاقات کا اہتمام کرنے میں کوتاہی کے جہاں اور بھی اسباب تھے وہیں اس تلخی کو بھی دخل تھا اور اس تلخی کا بھی اثر اس وقت زیادہ ہوا جب میں نے محسوس کیا کہ پہلے حضرت کی تشریف آوری کی مجھے اہتمام کے ساتھ اطلاع دی جاتی تھی مگر اس کے بعد یہ سلسلہ منقطع کردیا

گیا۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرے ساتھ حضرت امیر کا مشفقانہ تعلق ایسا کمزور نہیں تھا کہ وقتی تلخیاں اس کو ختم کر سکیں۔ تلخیاں اور شکوے تعلق ہی سے تو ناشی ہوتے ہیں، اجنبیوں اور رسمی تعلق رکھنے والوں کے درمیان کب اس کی نوبت آتی ہے؟ چناں چہ ایک مرتبہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی جب دہلی تشریف لائے تو میں ان کی قیام گاہ پر ویسٹرن کورٹ میں جا کر ملا۔ حضرت بہت خوش ہوئے اور وہی سابقہ شفقت کا معاملہ فرمایا اور میں اندر ہی اندر شرمسار ہوتا رہا۔ مجھے ملاقاتوں کے عدم اہتمام پر شرمندگی کا احساس تو ہمیشہ رہا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنی اس کوتاہی کے ازالہ کی خاطر خواہ کوشش نہیں کی تھی اور اس سلسلہ کے دراز ہونے کے نتیجہ میں احقر کی حالت اس معاملہ میں ایک عادی خطا کار کی سی ہوگئی تھی۔ حضرت مولانا سے جب بھی اتفاقیہ ملاقات ہوتی وہ اتنی محبت وشفقت اور گرم جوشی سے پیش آتے کہ میں اپنی کوتاہی پر پانی پانی ہو کر رہ جاتا۔ میں اس سلسلہ میں تین واقعات نقل کر کے افکار پریشان پر مشتمل بھولی بسری یادوں پر مبنی اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

—— دارالعلوم ندوۃ العلماء کا جب پچھتر سالہ جشن تعلیمی (۱۹۷۵ء میں) منایا گیا اس وقت میں سعودی سفارت خانہ میں سروس کر رہا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کی جانب سے جو وفد اس میں شرکت کے لیے بھیجا گیا اس کا ایک رکن احقر بھی تھا۔ چوں کہ اس موقع پر وہاں عالم عرب کی بڑی بڑی شخصیات کا آنا طے تھا، اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ حضرت مولانا معراج الحقؒ اور دیگر جلیل القدر اساتذۂ کرام پر مشتمل وفد میں ایک ایسا شخص بھی رہے جو وقت ضرورت ترجمانی کے فرائض انجام دے سکے۔ برادر گرامی حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی کسی عذر کے سبب شریک نہیں ہو سکتے تھے۔

حضرت مولانا منت اللہ رحمانی بھی دیگر شخصیات کی طرح اس جشن تعلیمی میں شریک تھے۔ اس اجلاس کے دوران بھی حضرت مولانا نے حسب روایت میرے ساتھ ہر ہر موقع پر غیر

معمولی خورد نوازی کا معاملہ کیا۔ اس سلسلہ کا ایک واقعہ تو یہ ہے کہ ایک صبح مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی ندویؒ بحیثیت میزبان اپنے مہمانوں سے حال چال دریافت کرنے کے لیے ان کی قیام گاہوں پر ملاقاتیں فرمارہے تھے۔ میں اپنی قیام گاہ سے جب حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کی قیام گاہ پر پہنچا تو اس وقت حضرت مولانا علی میاں صاحب حضرت امیر شریعت کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ یہ ایک بڑا ہال کمرہ تھا جس میں چند پلنگ بچھے ہوئے تھے داخلہ کے دروازہ کی جانب حضرت مولانا علی میاں کی پشت اور حضرت امیر شریعت کا مواجہ تھا، حضرت کی نگاہ جیسے ہی مجھ پر پڑی تو زور سے پرتپاک انداز میں فرمایا: ''آیئے مولانا آیئے تشریف لایئے'' حضرت مولانا علی میاں صاحب نے یہ سمجھ کر کہ کوئی بڑی شخصیت آئی ہے مڑکر بڑے اہتمام سے دیکھا بلکہ پوچھا بھی کہ کون صاحب ہیں؟ جب معلوم ہوا کہ آنے والا ایک طالب علمانہ حیثیت کا حامل ہے تو ان پر وہی فطری ردعمل ظاہر ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ اس میں قصور تو حضرت امیر شریعت ہی کا تھا، ذرہ نوازی کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جس پلنگ پر تشریف فرما تھے اسی پر اپنے پاس مجھے بٹھانے کے لیے جگہ بنائی۔ یہ ذرہ نوازی کتنی بھی بے محل ہو لیکن میرے لیے اس میں بہرحال بڑا اعزاز تھا۔ پھر ندوہ میں قیام کے دوران اکثر اہم موقعوں پر حضرت امیر نے مجھ کو بتاکیدا اپنے ساتھ ہی رکھا۔ آنجہانی ہیم وتی نندن بہوگنا (جو اس وقت یوپی کے چیف منسٹر تھے) نے اپنے یہاں شرکاء اجلاس کو جو عشائیہ دیا تھا اس میں بھی حضرت نے مجھے اپنے ساتھ ہی رکھا۔

— لکھنؤ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی کتاب ''المرتضیٰ'' کی رسم اجراء کا اہتمام ڈاکٹر یونس نگرامیؒ نے کیا تھا اس میں حضرت امیر شریعت نے بھی شرکت فرمائی تھی اور مولانا محمد ولی رحمانی صاحب نے حضرت کی طرف سے (جن کی طبیعت کچھ ناساز تھی) کچھ بیان بھی کیا تھا۔ ڈاکٹر یونس نگرامی مرحوم نے مجھے بطور خاص اس میں شرکت کے لیے مدعو کیا تھا۔ دہلی سے اس میں شرکت کے لیے سفارت خانہ میں میرے رفیق کار مولانا سید محمود الحسن ندوی اور مولانا خالد حسنی

ندوی بھی آئے تھے۔ سعودی سفیر فؤاد صادق مفتی صاحب نے مجھ سے حضرت مولانا علی میاں صاحب کو سلام و پیغام تہنیت پہنچانے کے لیے کہا تھا۔ بعد نماز ظہر مجھے اس کا موقع ملا، جیسے ہی سفیر موصوف کا پیغام میں نے ختم کیا میرے رفیق محترم مولانا محمود الحسن ندوی سلام و دعا کے لیے پہنچ گئے اور حضرت سے احقر کی نیاز مندانہ ملاقات میں حارج ہو گئے، کیوں کہ پھر حضرت انھیں سے مخاطب رہے۔ میں جیسے ہی پلٹا تو کچھ فاصلہ پر حضرت امیر شریعت کو کھڑے ہوئے دیکھا اور جوں ہی نگاہیں چار ہوئیں تو میں ان کی طرف لپکا لیکن موصوف کا یہ بڑا پن ہی تھا کہ انھوں نے میرے ان تک پہنچنے کا انتظار نہیں کیا بلکہ وہ بھی میری طرف بڑھے اور حضرت نے حسب عادت انتہائی گرم جوشی سے معانقہ فرمایا اور دیر تک خیریت اور دیگر احوال دریافت فرماتے رہے اور میں یہ سوچ کر کہ کس قدر تعلق ہے حضرت کو مجھ سے، ان کے تئیں اپنی محبت و عقیدت میں بے پناہ اضافہ محسوس کرنے لگا۔

—— اگست ۱۹۹۰ء میں کویت پر صدام حسین کے حملہ کے بعد سعودی عرب سمیت دوسرے پڑوسی ملکوں کو بھی عراق سے خطرہ محسوس ہونے لگا تھا اور اس کا ایک اسکڈ میزائل سعودی عرب کے علاقہ میں بھی گرا تھا، اس پس منظر میں ایوان غالب نئی دہلی میں تحفظ حرمین شریفین کے عنوان سے ایک کانفرنس منعقد کی گئی تھی۔ اس کانفرنس کے انعقاد کا اہتمام حضرت مولانا احمد علی قاسمی نے کیا تھا اور حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی اس میں بطور خاص مدعو کیے گئے تھے۔

کانفرنس کے اختتام پر ہال سے باہر نکلنے والوں میں حضرت امیر شریعت بھی تھے احقر نے جیسے ہی ان کو دیکھا تیزی سے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا لیکن حضرت نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حسب عادت پوری گرم جوشی کے ساتھ معانقہ فرمایا۔

بادی النظر میں یہ چیزیں غیر حساس قارئین کی نظر میں معمولی بلکہ لایعنی ہو سکتی ہیں، لیکن اگر غور کیا جائے اور دوسرے بعض رفتہ اور موجودہ اکابر کے طرز عمل کے ساتھ ان کا موازنہ کیا جائے تو نمایاں فرق محسوس ہوگا اور ان کی اہمیت سے اغماض ممکن نہیں ہوگا۔ اخلاق کی یہ پرکشش

ادائیں ہرایک کے بس کی بات نہیں۔ اور یہی بسا اوقات لوگوں کے تئیں کسی کے تعلق میں مودت واخلاص کی کسوٹی بھی ہوتی ہے، جو شخصیتیں حقیقتاً بہت بڑی ہوتی ہیں ان کا بڑا پن بھی مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ عظمت و بڑائی کوئی لبادہ نہیں جس کو اوڑھ کر آدمی بڑا بن جائے، اس کا تعلق نفس سے ہے۔ اس کا دارومدار شرافت وتواضع پر ہے۔ لوگوں کے ساتھ تواضع اصل میں تواضع للہ ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ومن تواضع لله رفعه الله.

''المرتضیٰ'' کی رسم اجراء کے موقع پر لکھنؤ میں نیاز حاصل ہونے کے دوران بھی محسوس ہوا تھا کہ حضرت کافی کمزور ہو چکے ہیں اور ایوان غالب، نئی دہلی میں جب دیکھا تو اس کا دوبارہ شدت سے احساس ہوا اور پھر یہ آخری ہی ملاقات ثابت ہوئی، اس کے کچھ ماہ بعد ہی ۱۹/ مارچ ۱۹۹۱ء میں آپ اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ انا لله وانا اليه راجعون۔

حضرت امیر شریعت اپنے عالمانہ اور قائدانہ اوصاف ممیزہ کے علاوہ اخلاق کریمانہ کی جس بلندی پر فائز تھے وہ بہت ہی اونچا مقام ہے۔ اس میں ''انک لعلی خلق عظیم'' کے مخاطب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی جھلک ملتی ہے اور یہ مقام مکمل اتباع سنت کے نتیجہ میں ہی میسر آسکتا ہے۔

علم کی گہرائی، فکر ونظر کی وسعت، مسائل کی سوجھ بوجھ، حکمت ودانائی، تحمل وبرداشت اور اخلاق کریمہ یہ سب وہ لوازمات امارت وقیادت وسیادت ہیں جو حضرت امیر کے اندر بدرجۂ اتم موجود تھے، فی زمانہ ایسے اوصاف وکمالات کی جامعیت میں دور دور تک بھی حضرت امیر کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔

———⊙⊙⊙———

پروفیسر ڈاکٹر سید محمد اجتبا ندویؒ ☆

امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی شخصیت کے عناصر ترکیبی

شخصیت سازی الٰہی عطیہ بھی ہے اور تربیت وفن بھی، عطیۂ خداوندی سے اگر کوئی انسان سرفراز ہوتا ہے تو تربیت، ماحول، وراثت، روایت واقدار اس میں نکھار و جمال اور زیبائی و دل ربائی کی شان پیدا کردیتی ہیں۔

حضرت امیر شریعت رابع مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی شخصیت کے جمال ونکھار میں بھی کچھ ایسا ہی پیش آیا، ان کا بابرکت خانوادہ جو علم وعمل، کردار واخلاق کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا، اسے ہمارے ملک کے ایک عظیم مردم گر وسحر انگیز آستانۂ معرفت وآگہی، تربیت ودلبری سے فیضیابی کا شرف بھی حاصل ہوگیا، گنج مرادآباد کے گنجینۂ احسان وسلوک حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے خانوادہ کے گل سرسبد حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کو بیعت واجازت حاصل تھی'' تذکرہ حضرت شاہ فضلِ رحمٰن گنج مرادآبادیؒ'' میں مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''یوں تو اس دنیا میں خدا کا دیا سب کچھ ہے لیکن اگر اس بھرے بازار میں'' ایک

☆ سابق استاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵ و سابق صدر شعبہ عربی وفارسی الہ آباد یونیورسٹی۔

درد و محبت ہی کی ''دکان'' نہیں جہاں سے قلب کی حرارت اور عشق کی دولت مل سکتی ہے تو پھر دنیا ایک قمار خانہ اور زندگی محض ''سود و سودا مکر و فن'' ہے اور اس میں وہی زیادہ کامیاب ہوگا جو اس فن میں طاق ہوگا:

من کی دنیا من کی دنیا، سوز و مستی، جذب و شوق
تن کی دنیا تن کی دنیا، سود و سودا مکر و فن

اس زندگی کی اور اس باغ ہستی کی ساری بہار اور سارا وقار اور اس دنیا کا سارا ہنگامہ وجود اسی ''درد و محبت'' کے دم سے ہے۔ اس کے بغیر یہ محفل سونی اور یہ گھر بے چراغ ہے۔ ''خرمن کائنات'' میں یہی ایک کام'' کا دانہ ہے اگر یہ نہیں تو پھر سب خس و خاشاک ہے''

اس کے بعد رقم طراز ہیں:

''مولانا (فضل رحمٰنؒ) کی زندگی میں یہ جوہر (درد و محبت) بہت نمایاں ہے اس کے واقعات آج بھی اپنی سادگی کے باوجود دلوں پر تیر و نشتر کا کام کرتے ہیں، درد و محبت، جذب و مستی کے ساتھ اتباع سنت، احترام شریعت اور حدیث نبوی کے ساتھ عشق کا جیسا نمونہ ان کی زندگی میں ملتا ہے وہ اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔'' (ص ۱۰-۱۲)

مزید فرماتے ہیں:

''باوجود اس سادگی و بے تکلفی کے جو مولانا کی زندگی مین نمایاں تھی۔ آپ کی صحبت میں اتنی کیفیت، آپ کی نسبت باطنی میں قوت اور کلام میں ایسی دل آویزی تھی کہ بجلی کی طرح اثر کرتا تھا اور حسب استعداد مدت تک اس کا اثر رہتا تھا۔'' (ص ۴۳)

مولانا رحمانیؒ کے والد بزرگوار حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ اسی ''درد و محبت'' کے فیض یافتہ تھے، اور اپنی کتاب ''ارشاد رحمانی'' میں فیض و تاثیر کے متعدد واقعات رقم کئے ہیں۔ ایک

جملہ ملاحظہ ہو:

''فیضانِ صحبت سے مجھے اس وقت نیم بے خودی سی تھی۔''

مولانا محمد علی مونگیریؒ کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس دولت سے نوازا تھا، ان میں حضرت شیخ مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی وہ تمام متنوع نورانی صفات و اخلاق عالیہ، فہم و فراست، آگہی و دانشوری، حب الٰہی اور معرفت خداوندی، توسع، فراخ دلی اور اعتدال پسندی جلوہ گر تھی، حضرت امیر شریعت مولانا رحمانی رحمہ اللہ کا بچپن اسی نورانی ماحول میں گزرا، تعلیم کا آغاز ہوا تو ایسے اساتذہ کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیے جو اپنے دور کے ممتاز علماء تھے، اعلیٰ تعلیم کے لیے ہندوستان کی دو عظیم دانش گاہوں میں قیام کیا، دارالعلوم ندوۃ العلماء جو انھیں کے عظیم والد بزرگوار کا قائم کردہ تھا، جہاں علم و دانش کے ساتھ تربیت کا بڑا منظم و مستحکم نظم تھا، اس وقت تک وہ اساتذہ اور مربی موجود تھے، جنھوں نے مولانا محمد علی مونگیری رحمہ اللہ سے براہ راست کسب فیض کیا تھا، آخر میں دارالعلوم دیوبند میں تعلیم کی تکمیل کے لیے تشریف لے گئے تو تعلیم کے ساتھ بزرگوں و اساتذہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ جیسی شخصیت کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد وطن واپس ہوئے تو ایسا روحانی و ربانی ماحول ملا جس نے اس جوہر تابدار کو مزید روشن و تابناک بنا دیا، یہی وہ عناصر تھے جنھوں نے حضرت امیر شریعت رابع مولانا منت اللہ رحمانی رحمہ اللہ کی شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کیا اور امت مسلمہ کی قیادت و رہنمائی کے لیے راہیں ہموار کردیں، امیر شریعت کی حیثیت سے نہ صرف بہار و اڑیسہ میں دعوت و اصلاح کے انتظامات کیے بلکہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی اس کے اثرات رونما ہوئے۔

راقم سطور کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں طالب علمی اور اس کے بعد تدریسی ذمے داریوں کے دوران زیارت کا شرف حاصل ہوا اور صرف ایک بار مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کے دفتر میں براہ راست گفتگو کا موقع ملا۔ بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری رحمہ اللہ سے عقیدت و محبت ہی کا نتیجہ تھا کہ حضرت امیر شریعتؒ سے ادب ملحوظ رکھتے ہوئے چند الفاظ ادا کیے، اطمینان بخش جوابات اور محبت آمیز لب و لہجہ نے بے حد متاثر و گرویدہ بنا دیا، مختصر سی

گفتگو میں ان کی دل آویز شخصیت کے وہ تمام عناصر ایسے رونما ہوئے کہ ان کے نقوش آج بھی تازہ ہیں۔ اس کے بعد ممبئی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل کے موقع پر محترم جناب انوار علی خاں سوز صاحب کے ہمراہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے حاضری ہوئی۔ بورڈ کی تشکیل کی تائید میں چند الفاظ بھی ادا کرنے پڑے، اس موقع پر حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ سے شرف ملاقات تو کم مگر حسن انتظام، تعقل و تدبر، درد و سوز، کردار و اخلاق، انتھک محنت و فعالیت کے مناظر دیکھے جن سے ان کی غیر معمولی صلاحیت، اخلاص، اور قائدانہ توازن و اعتدال کا اندازہ ہوا۔ یہ ان کی شخصیت کا بڑا نمایاں عنصر تھا۔ پہلی بار قریب سے سب کچھ دیکھنے کی عزت حاصل ہوئی، ملک میں ملت اسلامیہ جن شدید ترین آزمائشوں اور چیلنجوں سے گزر رہی تھی، چند ہی برس کے بعد دو ایک واقعات ایسے رونما ہوئے جنھوں نے مسلمانوں کو خوف و یاس سے ایسا دوچار کر دیا کہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں ان کے پایۂ استقامت میں لرزش نہ پیدا ہو جائے، ایسے میں حضرت مولانا رحمہ اللہ نے اپنے بزرگ و قریب ترین رفقاء کے ساتھ اسے ایک اہم دینی فریضہ سمجھتے ہوئے بڑے حوصلہ و تڑپ اور ولولہ و درد و عزم کے ساتھ ہندوستان گیر پیانہ پر رہنمائی کا کام انجام دیا بہار واڑیسہ میں امیر شریعت کے منصب پر فائز ہونے کے بعد انھوں نے جس نظم وضبط، اور خوبی وسلیقہ سے امارت کا دائرہ وسیع کیا، قضاء، افتاء اور اصلاح عام کے لیے وسیع ترین شعبے قائم کیے تھے اس نے ان کی حسن کارکردگی اور صلاحیت سے نہ صرف متاثر کیا تھا بلکہ مسلمانوں کی اکثریت میں اعتبار و اعتماد پیدا کر دیا تھا، چناں چہ جب انھوں نے مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کی تجویز پیش کی تو ہر جانب سے ان کی تجویز کی پرزور تائید کی گئی اور تمام حلقوں نے متفقہ طور سے اس میں شریک ہونے کی مسرت وخوشی کا اظہار کیا، یہ ان کی ہی شخصیت کا کمال تھا، جس میں وہ تمام عناصر جلوہ گر تھے جو امت کے اتحاد و اعتماد کے لیے ضروری ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ انھیں عناصر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اس خطرہ کو سمجھنے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ذہانت، وسیع مطالعہ، حقائق

کے ادراک، امیر شریعت کے فرائض کی وسعت و نزاکت کو سمجھنے، اکثریتی فرقہ کے رجحانات اور مجالس قانون ساز کے اختیارات کی وسعت کا ادراک کرنے اور اخبارات و مضامین، تقاریر و بیانات اور مجلسی گفتگوؤں کے ذریعہ اس قریبی خطرہ کو محسوس کرنے کی صلاحیت کی ضرورت تھی، جو ہر قائد اور عالم کو آسانی سے میسر نہیں ہوتی، اس کے لیے ذہانت، مطالعہ کی وسعت، خطرہ کے ادراک کے ساتھ توفیق الٰہی کی بھی ضرورت ہے، اور بعد کے واقعات اور تجربہ نے ثابت کردیا کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانیؒ کو اس دولت سے نوازا تھا، ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ۔'' (پرانے چراغ سوم: ص ۱۲۰)

حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ نے مسلم پرسنل لا بورڈ کے پلیٹ فارم سے اور اس کے سکریٹری جنرل کے طور پر ملک میں اس بحرانی دور میں جو تاریخ ساز کارہائے نمایاں انجام دیے ان کے اثرات ہمیشہ نمایاں رہیں گے اور وہ اسلامیانِ ہند کے لیے عملی نمونہ اور زندہ جاوید قدوہ بھی ہیں، انھوں نے ایسی مستحکم بنیادیں عطا کردیں کہ جس سے اس فلک بوس عمارت کو متزلزل کرنا آسان نہ ہوگا، انھوں نے اسی نقشہ و خطوط کو اپنایا جس کا تجربہ وہ خود بڑے آزمائشی دور میں امارت شرعیہ کے سلسلے میں کرچکے تھے، انھوں نے شب و روز کی محنت، انتھک کوشش، مردم شناسی، مردم گری اور آہ سحر گاہی، حکمت و دانش، بصیرت اور روشن ضمیری کے ذریعے اسے عملی شکل عنایت کردی، جو روز بروز ترقیوں و کامرانیوں سے ہم کنار ہے۔

حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی یہ جرأت و دانشوری، بصیرت و جاں سوزی اپنے ملک تک ہی محدود نہ تھی اس لیے کہ پورا عالم اسلام بلکہ پورے عالم انسانیت کو وہ اپنا وطن سمجھتے تھے اور اس کی فلاح و صلاح بھی ان کے پیش نظر رہتی تھی اس لیے جب بھی ان کی ملاقات بیرونِ ملک کی شخصیتوں، سفیروں اور مردان کار سے ہوتی یا خود متعلقہ مسائل کے بارے میں تبادلۂ خیال کے لیے ان سے ملتے تو اسی درد و سوز کے ساتھ اپنا پیغام پہنچاتے، اور تعمیری فکر و حسن خلق کی دعوت دیتے، انھوں نے مصر کی ایک کانفرنس میں شرکت کی، بڑا فکر انگیز مقالہ پیش کیا جس میں ان کی

گہری بصیرت وآگہی کے ساتھ درد وتڑپ اور سوز دروں نمایاں تھا، عرب ممالک خصوصاً حجاز کے سفر بھی ہوئے، تمام تر مواقع پر ان کی شخصیت کے یہ روشن پہلو جلوہ گر رہے، وہ اپنی بات کو بڑے سلیقہ، لطف ونرمی، دانائی ودل سوزی مگر جرأت، پختگی، طاقت اور زور وجزم کے ساتھ پہنچاتے، جس میں ان کی ہمہ گیر وہمہ جہت، وجیہ وباوقار شخصیت کے عناصر نمایاں ہوتے، مخاطب پورے طور سے متاثر وہم نوا، ہمہ تن گوش ہوتا۔

حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ کی یہی وہ امتیازی خصوصیات تھیں جن کی بنا پر وہ ہمیشہ یاد کیے جاتے رہیں گے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ☆

حضرت امیر شریعت کے تشکیلی عناصر اور معاصرین میں ان کے امتیازات و تشخصات

ہم جیسوں کے لئے سعادت و برکت ہی نہیں بلکہ اعزاز و افتخار کا باعث ہے کہ ان حقیر آنکھوں کو ایسی چیدہ اور برگزیدہ ہستیوں کو دیکھنے، ان سے ملنے اور بعضوں سے قریب رہنے کا شرف حاصل رہا ہے، جو اب تاریخ کے زریں نقوش کی حیثیت رکھتی ہیں، اور جن کے نام اور کام پر جبین احترام خم ہو جاتی ہے، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ، حضرت مولانا قاضی زین العابدین سجاد رحمہم اللہ اور نہ جانے کیسے کیسے خزینہ ہائے علم و معرفت اور گنجینہ ہائے صدق و صفا کا سایہ پچھلی نصف صدی میں امت اسلامیہ ہند پر سایہ فگن رہا، گویا فکر و نظر اور علم و عمل کی ایک کہکشاں تھی، جو ہندوستان کی جبین ناز پر سجائی گئی تھی، لیکن ان بزرگوں میں اس حقیر کو سب سے زیادہ جن کی قربت اور لطف و عنایت حاصل رہی، جن کی فکر کو قریب سے سمجھنے، جن کی عملی زندگی کو صبح و شام اور شب و روز دیکھنے اور ملی مسائل کے سلسلہ میں جن کے نہج اور طریقہ کار کو ایک حد تک اپنے اندر جذب کرنے اور

☆ ناظم: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد و جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

اسے مشعل راہ بنانے کی سعادت میسر آئی، وہ شخصیت امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تھی۔

ان میں بلا کی ذہانت وذکاوت تھی، ان کی زبان اور دل ایک دوسرے کے رفیق تھے، وہ زبردست قوت فیصلہ کے مالک تھے، اور ان کے یہاں فیصلہ اور اس پر عمل کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہوتا تھا، وہ علم اور معرفت، جرأت اور حکمت عملی، اظہار حق اور حسن اخلاق کا حسین امتزاج تھے۔ قول وفعل کی ہم آہنگی اور کردار وعمل کی پختگی نے ان کو خداداد رعب اور وقار سے نوازا تھا، اور اس حقیر نے جتنے بزرگوں کو دیکھا، بلا استثناء اس بات کا تجربہ ہوا کہ لوگوں پر مولانا کا جو رعب پڑتا، اس کی کوئی مثال نہیں تھی، لیکن جوں جوں ان سے قربت ہوتی، محبت بڑھتی جاتی اور ان کا رنگ جمال نقش محبت کو گہرا کرتا جاتا، ان کی اصابت رائے مسلم تھی اور ان کی مدلل اور پر وقار گفتگو کے بعد بحث ومناقشہ کی گنجائش کم ہی باقی رہتی تھی۔ چنانچہ اس وقت ذہن پر ان یادوں کا تلاطم سا ہے جو حضرت امیر شریعت کی نسبت سے جگ بیتی نہیں بلکہ آپ بیتی ہے، لیکن چوں کہ موضوع متعین ہے، اس لیے ابھی اس کا موقع نہیں۔

شخصیت کی تشکیل

شخصیت کی تشکیل میں ماحول، تعلیم اور اس کی آئیڈیل شخصیات کا بنیادی حصہ ہوتا ہے۔ لیکن کسی شخص کی امتیازی صلاحیت اور فکر میں سب سے زیادہ حصہ شخصیات ہی کا ہوتا ہے، کیوں کہ انسان کی فطرت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ وہ عملی نمونہ سامنے رکھ کر اپنے آپ کو اس کے سانچے میں ڈھالے، اسی لئے کتاب اللہ کے ساتھ خدا نے رجال اللہ بھی بھیجے، پیغمبر اسلام ﷺ کو اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا، (الاحزاب:۲۱) اور اسی کا نتیجہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی ایک نگاہ ذرہ کو آفتاب بنادیتی تھی، اور اسی بنیاد پر شرف صحابیت، ولایت اور قرب الٰہی کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ امیر شریعت حضرت مولانا رحمانیؒ کی شخصیت کی تشکیل میں اس موروثی اور خاندانی ماحول کا بھی اثر ہے جو حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ جیسے خزینہ معرفت کے سلسلے کا خاص رنگ ہے، جس

میں طریقت و معرفت اور اتباع سنت کو نہ صرف ایک دوسرے سے بعد نہیں، بلکہ وہ ایک دوسرے کے لوازم میں سے ہیں، پھر حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کے اندر اخذ و قبول کی جو صلاحیت تھی، اس نے اس رشتہ کو دو آتشہ کر دیا، اور آپ کا بچپن حضرت مونگیریؒ کے سایۂ شفقت میں گزرا، والد ماجد اور برادرِ اکبر کے زیرِ تربیت اسی ماحول میں آپ کی پرورش ہوئی، پھر تعلیم میں بھی دو اہم درس گاہوں دیوبند اور ندوہ کی نسبت آپ کے اندر جمع ہے۔ دیوبند نے آپ کی فکر کو گہرائی اور علم میں غواصی عطا کی، اور ندوہ کی وسیع الفکری، فراخ قلبی اور زبان و بیان کی خوش سلیقگی کو نمایاں طور پر آپ کی شخصیت میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔

آپ کی شخصیت کی تشکیل میں آپ کے اساتذہ اور خاص کر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا بڑا حصہ ہے، آپ کا سیاسی مسلک وہی تھا، جو حضرت مدنیؒ کا تھا، اور زمانۂ طالب علمی ہی سے آپ قافلۂ حسینی کے رکن رکین بن چکے تھے، آپ کی روحانی تربیت حضرت مولانا محمد عارف صاحب ہرسنگھ پوریؒ کی رہین منت ہے جو حضرت مونگیریؒ کے خلیفہ تھے، اور جنھوں نے براہِ راست حضرت شاہ فضل رحمٰن سے بھی کسبِ فیض کیا تھا، لیکن آپ کی فکر و نظر اور دینی اور ملی مسائل کے سلسلے میں سوچنے کے طریقے اور منہج پر گہری چھاپ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی تھی، حضرت مولانا سجاد صاحبؒ ایک ایسی شخصیت تھے جن کے رگ و پے میں ملت کا درد سمایا ہوا تھا، وہ ایسے چراغ تھے جو ہر آن امت کے لیے پگھل رہا ہو، جسے دین کے لیے کھونا پانے سے زیادہ عزیز اور جسے خدا کی خوشنودی کے لئے کانٹوں کا بستر پھولوں کی سیج سے زیادہ لذیذ محسوس ہوتا تھا، وہ ایک ایسے بالغ نظر، زمانہ شناس، مخلص اور صاحب بصیرت عالم اور قائد تھے کہ ان کے معاصرین میں ان تمام اوصاف و خصوصیات کا ایسا امتزاج کم ہی مل پائے گا، وہ دیوبندی الفکر عالم تھے، لیکن دوسری خانقاہوں کے بزرگوں سے بھی ان کے رابطے پوری طرح استوار تھے، وہ میکدۂ تصوف کے قدح خوار اور فقہ حنفی کے متبع اور پیرو کار تھے، لیکن علماء اہل حدیث کے درمیان بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور انھیں بھی اپنے ساتھ لے کر چلتے تھے، وہ جمعیۃ علماء کے بانیوں میں تھے اور کانگریسی تھے لیکن وہ مسلمانوں کے قومی مفادات اور اسلامی

تشخصات کو ہر جگہ بالا رکھتے تھے، اور اس سلسلے میں کسی رواداری کے بالکل قائل نہ تھے، وہ سلطان اور سلطان گر تھے، لیکن درویشی کا تاج ان کے زیب سر رہتا تھا، سلطان ایسے کہ بہار میں وزارت قائم کی، اور درویش ایسے کہ جیب میں ٹم ٹم کا کرایہ بھی ندارد، وہ اپنے عہد میں اس اسوۂ ابراہیمی کا نمونہ تھے کہ: إِنَّ صَلَاتِي وَ نُسُكِي وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الانعام: ۱۶۳)

حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کے مزاج و مذاق، طریقۂ عمل اور سیاسی و فقہی مسلک پر فکر سجاد کا اتنا گہرا اثر ہے اور اس کا تعلق اتنا عمیق اور مضبوط ہے، جیسے گلاب کی پتیوں میں اس کی خوش بو، مولانا رحمانیؒ ۱۹۳۳ء میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، ماہ دو ماہ گزرے ہوں گے کہ ۱۵ / جنوری ۱۹۳۴ء کو بہار میں ایک ہلاکت خیز زلزلہ آیا، یہ زلزلہ اتنا شدید تھا کہ عرصہ تک لوگ اسی کے حوالہ سے سن و سال کا تذکرہ کیا کرتے تھے، مونگیر بھی اس زلزلہ کی زد میں تھا، حضرت مولانا سجادؒ کا بے قرار دل شب و روز زلزلہ کے متاثرین کی خدمت میں سرگرم عمل تھا، اس کام میں مولانا رحمانیؒ نے بڑے جذبہ و حوصلہ کے ساتھ حصہ لیا اور یہی ملاقات[1] آپ کے فکر سجاد سے وابستہ ہونے کا سبب بنی۔

حضرت مولانا سجاد صاحب جمعیۃ علماء بہار کے صدر تھے، انھوں نے ۱۹۳۵ء میں آپ کو جمعیۃ علماء کا جنرل سکریٹری نامزد فرمایا۔ پھر ۱۹۳۶ء میں ہندو مسلم تناسب کی بنیاد پر الیکشن ہوا، مولانا سجاد نے اس موقع سے مسلم انڈپینڈنٹ پارٹی قائم فرمائی۔ اس پارٹی میں جو امیدوار کھڑے کیے گئے، ان میں حضرت مولانا رحمانیؒ بھی تھے اور وہ اس شان سے کامیاب ہوئے کہ فریق مخالف کی ضمانت بھی ضبط ہوگئی، اس کے بعد ہمیشہ مولانا رحمانی ملی سیاسی میدان میں مولانا سجاد کے متبع اور رفیق رہے، مسلم انڈپینڈنٹ پارٹی کا ترجمان ہفت روزہ ''الہلال'' آپ ہی کی ادارت میں نکلتا تھا، مولانا سجاد صاحب کی ہدایت پر آپ نے اوقاف پر ٹیکس لگانے کے سلسلے میں وہ تاریخی تقریر فرمائی جو آپ کے فقہی ذوق، سلیقۂ اظہار اور جرأت کا بہترین نمونہ ہے۔ آپ کا یہ عظیم الشان خطاب ''مسلم پرسنل لا، زندگی کی شاہراہ'' میں شریک اشاعت ہے، پھر تو مولانا رحمانی مولانا سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی آخری سانس تک ان کے ساتھ لگے رہے اور بالآخر ان

ہی کے لیے یہ بات مقدر ہوئی کہ وہ گلشن سجاد کو ایک نئی زندگی عطا کریں۔ اور اسے بہار بردوش چھوڑ کر اس دنیا سے جائیں۔ مولانا سجاد صاحب سے مولانا رحمانی کی محبت اور تعلق وتاثر کا اندازہ ان مضامین سے لگایا جاسکتا ہے جو انھوں نے مولانا سجاد صاحب پر لکھے ہیں، جس کے ایک ایک لفظ سے محبت کی خوشبو آتی ہے اور جس کے ایک ایک حرف میں احترام وعقیدت کی خوش رنگی نمایاں ہے۔

امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کو جو باتیں اپنے معاصر علماء سے ممتاز کرتی ہیں، ان میں خاص طور پر چھ نکات کا ذکر کیا جاسکتا ہے:

جرأت وہمت

(۱) ان کا سب سے نمایاں وصف ان کی جرأت وہمت ہے، جو سلف وصالحین کی عزیمت کے واقعات کی یاد تازہ کرتی تھی۔ آپ کی یہ ادائے فرزانہ زمانہ طالب علمی ہی سے قائم تھی۔ ۱۹۳۲ء میں آپ تحریک آزادی کے ایک جلوس کی قیادت کرتے ہوئے چاندنی چوک دہلی میں گرفتار کیے گئے اور لاٹھی چارج میں زخمی بھی ہوئے۔ سہارن پور میں آپ نے تحریک آزادی کی قیادت فرمائی اور چار ماہ اس کی پاداش میں قید کی سزا پائی، جیل میں کھانا نہایت ہی گھٹیا اور رہائش کا انتظام انتہائی تکلیف دہ تھا، حضرت مدنیؒ کی سفارش پر ڈپٹی جیلر حبیب اللہ نامی شخص نے خصوصی رعایت کی پیش کش کی۔ مگر آپ نے تنہا اپنے لیے اس رعایت کو قبول کرنے سے معذرت کی اور فرمایا: یہ بری بات ہوگی کہ میں تنہا اچھا کھاؤں اور میرے تمام ساتھی جیل کے کھانے پر گزارہ کریں، صرف اتنی خواہش ہے کہ ہاف پینٹ میں اتنے کپڑے لگا دیے جائیں کہ گھٹنے ڈھکے رہیں، اور نماز درست ہو۔ لیکن جنگ آزادی کی ان صعوبتوں کا کوئی صلہ لینے کے لئے آپ کبھی روادار نہیں ہوئے۔ آزادی کے بعد اعلان ہوا کہ جو لوگ انگریزوں کے عہد میں جیل بھیجے گئے تھے، انھیں وظیفہ ملے گا۔ مگر آپ نے کبھی اس جانب توجہ نہیں فرمائی۔ مالک رام کے حسبِ روایت مولانا کو پدم وبھوشن جیسا اعلیٰ قومی اعزاز حکومت نے دینا چاہا، مگر آپ نے اس

سے معذرت کردی، عام طور پر بڑے بڑے لوگ بھی اہل اقتدار کی چوکھٹوں تک رسائی کے لیے بے چین رہتے ہیں، لیکن مولانا رحمانی بہت ہی بے نیاز اور مستغنی دل رکھتے تھے، وہ اپنے غریب اور غیر معروف مریدین و متوسلین کی جھونپڑیوں کو اپنا مسکن بناتے تھے، اور اہل اقتدار کے قصور و محلات سے گریزاں رہتے تھے کیوں کہ مولانا کی طبع حوصلہ مند کا مسلک یہ تھا کہ:

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

۱۹۷۱ء میں جب بنگلہ دیش بنا، اس وقت مسلمانوں پر پریشانی کی کیفیت تھی، اور بنگلہ دیش کے اردو بولنے والے مسلمانوں کے بارے میں زبان کھولنا گویا اپنے آپ پر پاکستان نواز ہونے کی تہمت لگانے کے مترادف تھا، مولانا رحمانی نے اس موقع پر ایک تفصیلی مکتوب اس وقت کی وزیر اعظم آنجہانی اندرا گاندھی کے نام لکھا، آپ نے اپنے مکتوب میں تحریر فرمایا:

"بنگالی ہوں یا غیر بنگالی، سب انسان ہیں اور ان میں سے کسی کے ساتھ ظلم اور قتل و خوں ریزی کا معاملہ انسانیت کے لیے شرم ناک ہے، اس لیے میں آپ سے وزیر اعظم ہونے کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک اچھا انسان ہونے کے ناطے اپیل کرتا ہوں کہ آپ ان مظالم کے خلاف مؤثر کارروائی کریں..."

اسی طرح کا ایک مکتوب آپ نے شیخ مجیب الرحمٰن بانی بنگلہ دیش کے نام بھی تحریر فرمایا۔

افغانستان میں جب روس نے مداخلت کی اور نہتے افغانی بھائیوں کی مدد کے لئے جنرل ضیاء الحق مرحوم اٹھ کھڑے ہوئے، تو ایک تو عالمی سطح پر روس کی ہندوستان سے قربت اور دوسری طرف پاکستان سے کشیدہ تعلقات کے پس منظر میں جہاد افغانستان کے بارے میں ہندوستان کے لوگوں کو زبان کھولنے میں تامل ہوتا تھا، مولانا رحمانی نے اس سلسلے میں بھی مسلمانانِ ہند کو للکارا اور انھیں اپنے واضح موقف کے اظہار کی دعوت دی، آپ نے اپنے بیان میں فرمایا [illegible]

[illegible] "افغانستان کے مسلم عوام کی مجاہدانہ جدوجہد ایک انسانی اور اسلامی مسئلہ ہے، [illegible]

واقعات نے جو رخ لیا ہے، اس نے افغانستان کو دنیا کے نقشہ پر سوالیہ نشان بنا دیا ہے... ہندوستان کے مسلمانوں نے انسانی حقوق کی حفاظت اور اسلامی اخوت کی بنیاد پر دنیا بھر کے مسلمانوں سے برابر دلچسپی لی ہے، اور انھوں نے مختلف زمانے میں عالمی حالات کے پیش نظر اپنی متفقہ رائے ظاہر کی ہے پر بڑی بڑی تحریکیں چلائی ہیں، افغانستان کے حالیہ حالات کا مطالبہ ہے کہ کم از کم مسلمانانِ ہند (جو بہت بڑی انسانی طاقت ہیں) کی متفقہ رائے دنیا کے سامنے آ جائے، اور دنیا کو یہ معلوم ہو کہ ہندوستان کے کروڑوں انسان افغانستان کے مسئلہ کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔"

مولانا رحمانیؒ کی جرأت وعزیمت کا جو واقعہ کبھی بھلایا نہیں جا سکے گا، وہ ایمرجنسی ۱۹۷۶ء کا ہے، جب جمہوریت معطل کردی گئی تھی، اور سنجے گاندھی کے حکم پر پورے ملک میں جبری نس بندی کی جا رہی تھی، فضا ایسی تھی کہ اسٹیج پر شیر کی طرح للکارنے والے مقررین کی زبان بھی بدل گئی تھی اور خوشامد کا عام ماحول تھا۔ ان حالات میں آپ نہایت استقامت کے ساتھ اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ ۱۷، ۱۸/اپریل ۱۹۷۶ء کو دہلی میں آپ نے مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کیا، جس جگہ میٹنگ ہوئی، پولیس نے اس کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا، ہر طرف خوف وہراس کی فضا تھی، جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ سابق صدر مسلم لیگ نے اس موقعے پر کہا:

"علماء نے ہمیشہ ملت کو سنبھالا ہے، آج ملت پر پھر سخت وقت آ گیا ہے، ہمیں امید ہے کہ علمائے کرام روایتی بصیرت اور استقامت کے ساتھ پھر ملت کی صحیح قیادت فرمائیں گے۔"

مولانا رحمانی علیہ الرحمہ نے اس کے جواب میں فرمایا:

"بلاشبہ علماء نے ملت کو ہمیشہ سنبھالا ہے، اور آج بھی انشاء اللہ ملت کی صحیح قیادت کا فریضہ انجام دیں گے، چاہے کچھ بھی ہو ہم ملت کا سودا نہیں کریں گے

گے۔ آپ کے علم میں آنا چاہیے کہ دہلی کا سفر شروع کرنے سے پہلے ہم اپنے
گھر میں یہ کہہ کر آئے ہیں کہ اگر اللہ کو منظور ہوگا تو ہم واپس آئیں گے۔"

بعض اہل علم حالات اور مصلحت کے تحت عزل وغیرہ کی نظیر کو سامنے رکھ کر کسی قدر نرم پہلو اختیار کرنا چاہتے تھے، لیکن مولانا رحمانی نے پوری قوت سے اس سے اختلاف کیا، اور باتفاق رائے نس بندی کے حرام ہونے کی تجویز پاس ہوئی، اور اسے پوسٹر اور ورقیہ کی صورت میں پورے ملک میں پہنچایا گیا، کیوں کہ اخبارات اس کی اشاعت کا جوکھم مول لینے کو تیار نہیں تھے۔ اس زمانے میں مولانا خطوط کے جواب میں بھی یہ ورقیہ لوگوں کو بھیجا کرتے تھے، بار بار انٹلی جنس کے لوگ آتے تھے، لیکن آپ کے اثرات اور عوامی مقبولیت کی وجہ سے حکومت کو ہمت نہ ہوئی کہ آپ کو گرفتار کرلے۔ ایمرجنسی کے موقع پر آپ کی جرأت و ہمت اور حوصلہ مندی کی داد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نے مدینہ منورہ سے خصوصی مکتوب تحریر فرما کر دی اور آپ کے لیے حرم شریف میں اپنی دعاؤں کا ذکر کیا، خود مولانا نے اس حقیر کو یہ مکتوب دکھایا۔

تحفظ شریعت اور مسلم پرسنل لا کے سلسلے میں آپ نے ہمیشہ اپنے جرأت مندانہ موقف کا اظہار کیا۔ اور کبھی اس سلسلے میں لچک اختیار نہیں کی، آپ نے ایک موقع پر فرمایا:

"میں اس کے لیے تیار ہوں کہ ہماری گردنیں اڑا دی جائیں، ہمارے سینے چاک کردیے جائیں، مگر ہمیں یہ برداشت نہیں کہ مسلم پرسنل لا کو بدل کر ایک غیر اسلامی لا ہم پر لاد دیا جائے۔ ہم اس ملک میں ایک باعزت قوم اور مسلم قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔"

بابری مسجد کے سلسلے میں آپ کی خدمات کا ذکر تو آگے آئے گا، لیکن اس سلسلے میں آپ کی جرأت واستقامت سے متعلق ایک واقعہ کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جب اڈوانی جی کی رتھ یاترا اور دوسرے لفظوں میں "کاروانِ نفرت وفساد" آخری مرحلہ میں تھا تو وزیر اعظم وی پی سنگھ نے مسلمان اور ہندو مذہبی قائدین کی ایک خصوصی نشست بلائی۔ مسلمان علماء کو بہار ہاؤس میں ٹھہرایا گیا اور ہندو مذہبی قائدین کو آندھرا ہاؤس میں۔ اس گفتگو کے اصل محرک جناب یونس

سلیم گورنر بہار اور جناب کرشن کانت گورنر آندھرا پردیش تھے، اور ایک ایسا فارمولہ پیش کیا گیا، جس کی رو سے مسجد کی موجودہ جگہ نہ مسجد رہے نہ مندر، البتہ بقیہ اراضی پر مندر تعمیر ہو جائے، یہ تجویز کانچی کے شنکراچاریہ کی طرف منسوب تھی، اور کچھ لوگ پوری طرح اس کے حق میں ذہن بنا کر آئے تھے، ایک بزرگ تو اس کی وضاحت کرتے ہوئے بار بار روتے تھے اور ہر بار جب ایک خاص موقع پر آتے تو ان پر ''گریہ'' طاری ہو جاتا، ان کے اس بیان سے متاثر ہو کر اچھے خاصے لوگ بھی پگھلنے سے لگے۔ مولانا رحمانی نے پوری صورتِ حال کو سمجھا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو تو مسجد نہیں مل پائے گی لیکن مسجد کے چاروں طرف مندر ہو جائے گا اور دیر وسویر مسجد بھی مندر بنا دی جائے گی، اس سناٹے میں مولانا رحمانی کی آواز گونجی کہ ''اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم طشت میں سجا کر انھیں مسجد حوالہ کر دیں۔'' اس وقت اندازہ ہوا کہ وہ اظہار حق کے معاملے میں نہ معاندین سے ڈرتے تھے، نہ محبین کے تعلق کو سدراہ ہونے دیتے تھے۔

بابری مسجد ہی کے مسئلہ میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا ایک وفد وزیر اعظم چندر شیکھر سے ملا، وزیر اعظم دوران گفتگو بول اٹھے: ''ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے ایک ہی بھنگ کے کنویں سے پانی پی لیا ہے'' گویا انھوں نے ظالم اور مظلوم کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا۔ مولانا رحمانی سے یہ بات برداشت نہ ہو سکی، انھوں نے بہت ہی تیکھے لب و لہجہ میں چندر شیکھر جی سے پوچھا: ''چندر شیکھر جی! کہیں حکومت نے تو بھنگ نہیں پی رکھی ہے وہ کیوں اپنا فرض ادا کرنے سے غافل ہے۔'' بے چارے وزیر اعظم سٹ پٹا سے گئے، اور کھسیا کر کہنے لگے کہ ہاں ہم تو اپنا فرض ادا کریں گے۔

فرقہ وارانہ فسادات کے موقع پر آپ نے ہمیشہ نہ صرف ریلیف پر توجہ دلائی، بلکہ مسلمانوں کو اس بات کے لیے بھی للکارا کہ وہ آپ اپنی حفاظت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور اس کے لیے اپنے آپ کو تیار کریں۔ چنانچہ ۱۹۶۷ء کے فسادات کی لہر کے موقع پر امارت شرعیہ نے جو بیان جاری کیا، جس میں سب سے پہلا دستخط مولانا رحمانی کا ہے، اس کا ایک پیراگراف اس طرح ہے:

مسلمانوں کو مخاطب کر کے دوسری بات یہ کہنی ہے کہ زندگی خدا کا عطیہ ہے، اور اس کی بقاء وتحفظ ہر شخص کا انسانی اور قانونی حق ہے، جو لوگ مسلمانوں سے ان کا یہ حق چھین لینا چاہتے ہیں وہ انسانیت کی عدالت میں مجرم ہیں، اور مسلمانوں کو دنیا کے تمام قوانین کی رو سے اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی جان و مال، عزت وآبرو پر کئے جانے والے حملہ کا مضبوط اور مستحکم دفاع کریں، اس لئے ہم مسلمانوں سے کہنا چاہتے ہیں کہ موجودہ حالات سے ہراساں نہ ہوں، اور ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر لمحہ تیار رہیں اور اس سلسلے میں مؤثر اور مناسب تدابیر اختیار کریں۔"

یہ پیغام آپ نے بار بار اور پوری قوت کے ساتھ مسلمانانِ ہند کو دیا، اڈوانی جی کی رتھ یاترا کے موقع پر جب فسادات کا سلسلہ شروع ہوا تو اس وقت آپ نے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"آپ اس ملک میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں، ملک کی تاریخ کو نیا رُخ دے سکتے ہیں، بشرطیکہ آپ اس کے لیے آمادہ ہوں، اتنی سی بات یاد رکھئے کہ ایک بہت بڑی تعداد کا مزاج تخریبی بن چکا ہے، اسے توڑ پھوڑ، شکست وریخت سے خاص دلچسپی ہوگئی ہے، اگر آپ اس صورتِ حال کی اصلاح کرنا چاہیں تو اس کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہوگا کہ آپ خود بھی مضبوط ہوں، اپنی قوت جمع کریں، شر پسند، فتنہ پرور اور شہری زندگی کے امن وسکون کو برباد کرنے والوں کے مقابل مضبوط اور بہترین دفاع کے لئے تیار ہوں، آپ کی اپنی قوت اور دفاعی صلاحیت وہ بنیادی چیز ہے جس کے ذریعے آپ اپنی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں، آپ مرنا سیکھیں، بزدلوں کو ہر روز اور ہر صبح وشام موت آتی رہتی ہے، جواں مرد ایک بار اور صرف ایک بار مرتا ہے، میں آپ سے صرف یہ کہوں گا کہ آپ دوسروں پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیں، خدا سے لو لگائیں

اوراپنے مستحکم دفاع کے لئے تیار رہیں...موجودہ صورتِ حال میں فرقہ واریت
اورنسل کش حملوں کا علاج میرے خیال میں یہی ہے کہ مظلوموں کو چاہئے کہ وہ
اپنا دفاع کریں، یہ آپ کا قانونی حق ہے، جسے کوئی بھی طاقت آپ سے چھین
نہیں سکتی۔"

اس جرأت مندانہ اور حوصلہ افزا پیغام کو آپ نے بار بار اُمت اسلامیہ تک پہنچایا، ان کے حوصلے بلند کئے، اوران کو اپنی قوت مدافعت میں اضافے کی دعوت دی۔

ہندوستان میں ماضی قریب میں جو ممتاز مسلمان دانشور گزرے ہیں، ان میں ایک اہم نام جناب ہاشم علی اختر مرحوم کا ہے، وہ مسلمانوں کو خاص طور پر مذہبی رواداری کی دعوت دیتے تھے اور یہ رواداری ایسی ہوتی تھی، جس میں رواداری کی سرحدیں مداہنت سے جاملتی تھیں، وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں وائس چانسلر بھی رہے، اسی زمانے میں سرسید ہال میں سیرت کا پروگرام ہوا۔ وائس چانسلر خود جلسہ کے صدر تھے، مولانا تقی امینی نظامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مولانا رحمانی مہمان خصوصی تھے۔ اخیر میں وائس چانسلر کا صدارتی خطبہ ہوا، جس میں وحدت ادیان کی دعوت تھی اور علماء کو جی بھر کر مطعون کیا گیا تھا، مولانا رحمانی سے یہ بات برداشت نہیں ہوسکی۔ انھوں نے ناظم جلسہ سے تھوڑا سا وقت مانگا، مولانا امینی کو تو تردد تھا لیکن طلبہ کے اصرار پر وقت دیئے بغیر چارہ نہیں تھا، مولانا رحمانی نے پندرہ منٹ بہت ہی مدلل جوابی اور تردیدی خطاب کیا، آپ نے فرمایا:

"دین ایک ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد
رسول اللہ ﷺ سب کی بنیادیں ایک ہی ہیں، سبھوں کا دین ایک ہے، لیکن
مختلف قسم کے دین ایک نہیں ہوسکتے، بت شکنی اور بت سازی ایک ساتھ نہیں
چل سکتی، دونوں میں سے کوئی ایک ہی عقیدہ قبول کیا جاسکتا ہے، وحدت ادیان
ایک سیاسی نعرہ ہے، وہ ملک کی سیاسی ضرورت ہوسکتی ہے، سچائی اور دین داری
سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

یہ تو چند واقعات ہیں، ورنہ جن لوگوں کو مولانا رحمانی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے، وہ اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ان کی زندگی سراپا جرأت وحوصلہ مندی اور عزیمت سے عبارت تھی، کوئی شخص حق اور سچائی کے خلاف کوئی بات ان کے سامنے کہہ دے، اور مولانا اس پر خاموش رہ جائیں، یہ ممکن نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا جس تنظیم میں شامل ہوتے ان کی رائے کا وزن محسوس کیا جاتا۔ کیوں کہ ان کی رائے بے لاگ، بے لوث اور خلوص اور سچائی پر مبنی ہوتی، چاہے مسلم پرسنل لا بورڈ کا اجلاس ہو، دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ ہو یا کوئی اور مجلس ہو۔ ہر جگہ مولانا رحمانی کی رائے حرفِ آخر بھی جاتی، اور دلیل ومعقولیت اور وقار کی وجہ سے ان کی رائے آنے کے بعد کسی کو زبان کھولنے کا یارا کم ہی ہوتا۔

حکمت اور حسن تدبیر

(۲) اکثر جرأت وہمت کی فراوانی حکمت ومصلحت اور حسن تدبیر کے ہم دوش نہیں رہ پاتی، لیکن مولانا رحمانی نے اپنی شخصیت میں آب وآتش اور شعلہ وشبنم کو جمع کرلیا تھا، وہ کسی مسئلہ پر بہت گہرائی سے سوچتے، اپنے معتمد رفقاء سے بار بار مشورہ کرتے، اپنی رائے پر تنقید کو کھلے دل سے سنتے اور جو بات مناسب ہوتی پوری سیر چشمی کے ساتھ اسے قبول کرتے اور حکمت وتدبیر کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔

انھوں نے مسلم پرسنل لا بورڈ کا دائرۂ کار محدود رکھا، بار بار لوگوں نے آواز اٹھائی اور ملت کے بعض حساس مسائل بہت ہی زور وشور کے ساتھ اٹھائے گئے، بعض سیاسی قائدین نے سیاسی نوک جھونک بھی بورڈ کے پلیٹ فارم سے کرنے کی کوشش کی، لیکن مولانا رحمانی کا احساس تھا کہ بورڈ کے دائرۂ کار کو محدود رکھنے میں ہی اس کا بقاء اور تحفظ ہے، چنانچہ آپ نے ہمیشہ ایسی کوششوں کی شدت سے مخالفت کی، اور بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ مولانا کا نقطۂ نظر مبنی بر صواب تھا۔ بورڈ کے بعض ارکان جذباتی فیصلہ کی طرف مائل رہتے تھے، لیکن مولانا رحمانی ایسے مسائل میں ملت کے مجموعی نفع ونقصان کو ملحوظ رکھتے ہوئے سنجیدہ اور دوررس فیصلے کیا کرتے تھے،

اور ایسے جذباتی فیصلوں سے بھی گریز کرتے تھے جو اُمت کے لیے خودکشی کے مترادف ہوں۔

خود بورڈ کے قیام میں بریلوی مکتب فکر کو ساتھ لینے کے لیے آپ نے جس ایثار، بے نفسی اور حسن تدبیر سے کام لیا، وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی مرحوم کے شاگرد اور خلیفہ مفتی محمد برہان الحق صاحب مرحوم کے یہاں حضرت مولانا رحمانی، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کو ساتھ لے کر گئے، اور جہاں چپلیں رکھی جاتی تھی اس کے قریب ہمارے یہ دونوں بزرگ ــــ جو خود بڑی نسبت کے حامل تھے ــــ بیٹھ گئے اور انھیں بورڈ میں شرکت پر آمادہ کیا، یہی تواضع اور بچھاؤ تھا، جس نے مولانا مفتی محمد برہان الحق صاحب علیہ الرحمہ کو موم بنا کر رکھ دیا، اپنے بزرگوں کی اس بے نفسی اور امت کی سربلندی کے لیے اپنے آپ کو خاک بلکہ خاکستر بنا کر پیش کرنے کا مزاج دیکھ کر آنکھیں نم ہوتی ہیں اور بلا اختیار زبان پر آتا ہے:

اولئک آبائی فجئنی بمثلهم

اذا جمعتنا یا جریر المجامع

ایمرجنسی کے درمیان ۱۹۷۶ء میں آل انڈیا ریڈیو کے نمائندہ مصطفیٰ علی اکبر نے حضرت قاری صاحبؒ کا نس بندی کے موضوع پر انٹرویو لیا اور اسے کاٹ چھانٹ کر اس طرح پیش کیا کہ بہ ظاہر اس سے خاندانی منصوبہ بندی کی تائید کا پہلو ابھرتا تھا، اور پھر اسے کئی دنوں تک بار بار نشر کیا جاتا رہا،، اس موقع پر بعض حضرات بہت پرجوش تھے اور بعض مخلصین بھی مخالفانہ رجحان کے حامل ہو گئے تھے، حضرت امیر شریعت نے اپنے رفقاء سے مشورہ کیا اور فرمایا کہ اس وقت کوئی مخالفانہ بیان بورڈ کے موقف کو بھی کمزور کرے گا اور اس سے حلقۂ دیوبند کی ساکھ کو بھی نقصان پہنچے گا، اس لیے آپ نے حضرت قاری صاحب کو ایک شکوہ آمیز مخلصانہ خط لکھا اور ان سے خواہش کی کہ وہ اس سلسلے میں ایک وضاحتی بیان تحریر فرمائیں، پھر خود قاری صاحب کے اس بیان کی ایسی تشریح و توضیح فرمائی کہ بورڈ کے موقف اور قاری صاحب کے اس بیان میں کوئی تضاد باقی نہ رہے، یہ بیان چار صفحات میں شائع کیا گیا اور ملک کے کونہ کونہ میں اسے بھیجا گیا، اس حسن تدبیر سے بڑا اچھا اثر مرتب ہوا، اور بہت سی غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔

ایمرجنسی ختم ہونے کے فوراً بعد رانچی میں بورڈ کا اجلاس عام منعقد ہوا، یہ بہت ہی بھرپور اور نمائندہ اجلاس تھا، اس اجلاس میں عہدہ داروں کا انتخاب بھی ہونا تھا، حضرت امیر شریعت بجا طور پر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو بورڈ کی صدارت کے معزز ترین عہدہ کا اہل جانتے تھے، لیکن اس وقت ہمارے بہت سے اکابر زندہ تھے، اس لیے مختلف شخصیتوں کی موجودگی اور کسی قدر حضرت قاری صاحب کے انٹرویو کے پس منظر میں بعض حضرات کا رجحان حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف تھا، چنانچہ بورڈ کے ایک مؤقر اور فعال رکن نے حضرت قاری صاحب کی خدمات کو سراہتے ہوئے مولانا علی میاں صاحب کا نام پیش کیا، اور کہا کہ اس طرح لوگ محسوس کریں گے کہ امت اسلامیہ ہند بانجھ نہیں ہے، مولانا رحمانی نے فوراً مائک اپنے ہاتھ میں لیا، چند جملے حضرت مولانا علی میاںؒ کی لیاقت وصلاحیت اور مقام ومرتبہ کے بارے میں کہے اور فرمایا کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اس عہدہ کے پوری طرح اہل ہیں، لیکن مجھے خوب اندازہ ہے کہ خود مولانا علی میاں صاحب اس کو قبول نہیں فرمائیں گے، اور وہ اس وقت کسی تبدیلی کے حق میں نہیں ہوں گے، اور اس کے بعد مولانا ندوی کو اظہار خیال کی دعوت دی، مولانا ندوی نے اس موقع سے بڑا تاریخی جملہ ارشاد فرمایا کہ: جب کشتی بھنور میں ہو تو ناخدا بدلے نہیں جاتے، اس لیے میرے خیال میں حضرت قاری صاحبؒ کو ہی اس عہدۂ جلیلہ پر فائز رہنا چاہیے، بس بات ختم ہوگئی اور حضرت قاری صاحبؒ باتفاق رائے صدر منتخب ہوگئے۔

قضیۂ دارالعلوم کے بعد جو بورڈ کے عہدیداران کا انتخاب ہوا، تو اس وقت بھی مولانا رحمانی نے قاری صاحب کا نام پیش فرمایا، اور ایک نجی مجلس میں کہا کہ حلقۂ دیوبند نے قاری صاحب کی جو ناقدری کی ہے اس کے بعد اگر بورڈ کے عہدۂ صدارت میں کوئی تبدیلی ہوئی تو یہ ان کی مظلومیت میں اور اضافے کا سبب ہوگا، مولانا رحمانی اس بات پر بہت متاسف تھے کہ دارالعلوم کے ابتداء قیام سے اب تک امت مسلمۂ ہند کی قیادت دیوبند کے ہاتھ میں رہی ہے، حضرت قاری صاحبؒ کے بعد اندیشہ ہے کہ قیادت کی باگ دیوبند کے ہاتھ میں نہیں رہ پائے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے دفتر کے سلسلے میں بہت سے معزز ارکان کی رائے تھی کہ اسے

بمبئی میں رکھا جائے، لیکن مولانا رحمانی دہلی کو مرکز بنانا چاہتے تھے، کیوں کہ دہلی پورے ملک کا دل ہے، اور اس کی دھڑکنوں کی آواز ملک کے کونے کونے تک پہنچ جاتی ہے، مولانا رحمانی نے اس بات کو اتنی قوت کے ساتھ پیش کیا کہ بالآخر تمام لوگوں نے اسی رائے کو قبول کیا، ارکان بورڈ کے انتخاب میں وہ ہمیشہ مختلف حلقوں کی نمائندگی اور بورڈ کے مفادات کو پیش نظر رکھتے تھے، یہ ان کی حکمت وتدبیر ہی کا کرشمہ ہے کہ مردہ ادارے ان کے حوالے ہوئے اور انھوں نے اس ادارہ کو ایک نئی زندگی اور عزت ووقار سے ہمکنار کیا۔

امت کی اجتماعیت کی فکر

(۳) مولانا کا تیسرا نمایاں وصف تھا: اُمت اسلامیہ کی وحدت واجتماعیت کو ہر قیمت پر قائم رکھنا اور اس کے لیے پوری جدوجہد اور انتھک کوششیں کرنا، یہ وصف انہیں اپنے مربی اور اپنی آئیڈیل شخصیت حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ سے ورثے میں ملا تھا، وہ بار بار کہتے تھے کہ مسلمانوں کو مشترک مسائل پر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر جدوجہد کرنا چاہیے، چنانچہ فرماتے ہیں:

> ''یہ بات میں نے بار بار کہی ہے اور پھر آج اسے دہرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ کم از کم کچھ مسائل ایسے ضرور ہونے چاہئیں جن پر سارے ملک کے مسلمان ایک نقطۂ نگاہ سے سوچیں اور اس کے لیے مشترکہ جدوجہد کریں اور اگر ابھی سے پورے ملک میں مسلم رائے عامہ تیار نہیں کی گئی اور ان کو نظم واجتماعیت کے رشتوں میں باندھ کر ہرنا گہانی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہیں کیا گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ ایک وقت آئے گا جب ہمارے لیے اپنی تاریخی غلطی پر افسوس کرنے کا موقع بھی نہیں رہے گا۔''

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی وفات کے بعد جب جمعیۃ علماء میں قیادت کی لڑائی شروع ہوئی اور اس سلسلے میں دوفریق کھل کر ایک دوسرے کے مدمقابل آگئے تو اس وقت مولانا رحمانی نے دونوں فریق کے درمیان صلح کرانے کی انتھک کوشش کی اور جب محسوس کیا کہ یہ

فاصلہ دریا کے کناروں کا فاصلہ بن چکا ہے، جنھیں پاٹنا ممکن نہیں ہے تو دونوں فریق سے علیحدہ ہو گئے، آپ کے بعض پرجوش رفقاء جو جمعیۃ سے وابستہ تھے، اس مسئلہ میں شدید رویہ اختیار کرنے کی طرف مائل تھے، لیکن مولانا نے انھیں سمجھایا کہ دین کے بہت سارے کام ہیں، اور کام کرنے والوں کی کمی ہے، آپ دین کی خدمت کا کوئی دوسرا میدان منتخب کرلیں۔

اسی طرح جب دیوبند کا قضیہ نامرضیہ شروع ہوا، جس میں مولانا رحمانی کا جھکاؤ حضرت قاری صاحبؒ کی طرف تھا، تو انھوں نے اس قضیے کا حل نکالنے اور فریقین کے درمیان صلح کرانے کی انتھک کوششیں کیں، خاص اس مقصد کے لیے دو مہینے سے زیادہ دہلی میں قیام فرمایا، اور آخر وقت تک اس کے لیے کوشاں اور بے چین رہے، مولانا اس موقع سے دو باتوں کا خاص طور سے ذکر فرماتے تھے، ایک یہ کہ اس سے بحیثیت مجموعی علماء دیوبند کی بے وقاری ہوگی، اور قوم وملت پر دیوبند کے جو اثرات ہیں اسے دھکا لگے گا، دوسرے وہ حضرت قاری صاحب کے بارے میں کہتے تھے کہ اس وقت وہ فکر دیوبند کے سب سے بڑے ترجمان اور نمائندہ ہیں اور اپنے ہی حلقہ کی طرف سے ان کو بے آبرو کرنے کی کوشش محسن کشی کے مترادف ہے۔

وہ فکر ونظر میں پوری طرح دیوبند اور اکابر دیوبند کی امانت کے امین تھے، لیکن امت کے مشترک مسائل کے لیے تمام مکاتب فکر کو ساتھ لے کر چلتے تھے، انھوں نے امیر شریعت بننے کے بعد اپنے ابتدائی بیانات ہی میں بار بار اس بات کو واضح فرمایا کہ امارت شرعیہ کسی ایک مسلک کی نمائندہ نہیں ہے، بلکہ یہ پوری امت مسلمہ کی نمائندہ ہے، انھوں نے پٹنہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام سے پہلے ۱۹۶۳ء میں مسلم پرسنل لا کانفرنس طلب کی اور اس میں جمعیۃ علماء اور جماعت اسلامی کے نمائندوں کو بھی مدعو کیا، پھر اسی فکر کو آگے بڑھاتے ہوئے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی بنیاد رکھی۔

انھوں نے وحدت امت کے تصور کو ہندوستان تک محدود نہیں رکھا بلکہ عالم اسلام سے بحیثیت مسلمان ہم آہنگی کا اظہار کیا، اور انھیں بھی آپسی اتحاد کی تلقین فرمائی، ۱۹۶۷ء میں آپ نے عظیم الشان ''تحفظ فلسطین کانفرنس'' منعقد کی، اسرائیلی جارحیت کے خلاف ہندوستانی

مسلمانوں کے جذبات عالمی قوتوں تک پہنچائے اور حکومت ہند سے بھی اس سلسلے میں منصفانہ موقف اختیار کرنے کی اپیل کی، اس موقع پر آپ نے عربوں کی بڑھتی ہوئی قوم پرستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور اس سے بچنے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

''اسلام نے رنگ ونسل کے فرق کو مٹا کر، ملک ووطن کے امتیاز کو ختم کر کے ہم کو اور آپ کو ایک جسم کے مختلف اعضا بنا دیا ہے، خونی رشتے ٹوٹ سکتے ہیں، لیکن ہمارا اور آپ کا تعلق ختم نہیں ہو سکتا، تاریخ کے اس نازک موڑ پر قدرت نے جو ذمے داری آپ پر ڈالی ہے اس سے عہدہ برآ ہوئیے، حالات اگرچہ انتہائی نازک ہیں لیکن ہم مایوسی کو کفر سمجھتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ اللہ پر اعتماد سب سے بڑی طاقت ہے، اگر ہم اس کا نام لے کر آگے بڑھیں گے تو ناموافق حالات کو بھی سازگار بننا پڑے گا۔''

اسی طرح افغانستان کے مسئلہ پر آپ نے مسلمانوں کو متوجہ کیا کہ وہ اسلامی اخوت کی بنیاد پر روسی مظالم کے خلاف اپنی آواز بلند کریں۔

مولانا رحمانی وحدتِ امت کی جو بات کہا کرتے تھے، وہ محض ایک وقتی مصلحت اور وقتی جذبات کا مظہر نہیں تھے، بلکہ یہ آپ کی فکر ونظر کا حصہ تھا، اور آپ پورے شعور اور یقین کے ساتھ اس کے داعی اور ترجمان تھے، اور پوری بصیرت کے ساتھ فروعی اختلاف میں مسامحت اور پہلو تہی اختیار کرنے کے قائل تھے، چناں چہ مؤتمر عالم اسلامی کے اجلاس ۱۳۸۲ھ منعقدہ جامع ازہر میں پیش کردہ اپنے مقالہ میں فرماتے ہیں:

''دینی اختلافات کی بڑی وجہ اُمور مجتہد فیہا اور فقہی جزئیات وفروع میں غیر معمولی شدت اور تعصب بھی ہے، ان فروعی مسائل کے ساتھ ہم نے وہی معاملہ کیا جو اُمور منصوصہ کے ساتھ ہونا چاہیے تھا، دنیا میں ایسے علاقے بھی ہیں جہاں دوسری فقہ پر عمل کرنے والوں کے پیچھے نمازیں ادا کرنے سے انکار کیا گیا ہے، ایسے مقامات بھی موجود ہیں جہاں دوسرے مسلک والوں کے داخلہ پر

مسجدیں دھلوائی گئی ہیں کہ ان کے داخلہ سے مسجد ناپاک ہوگئی، ان اختلافات کی بنیاد پر مسلمانوں نے مسلمانوں سے جدال وقتال کیا ہے، کاش ان کی نظر حضرت امام مالک کے اسوہ پر ہوتی کہ جب خلیفہ مہدی اور خلیفہ ہارون نے امام سے چاہا کہ موٴطا امام مالک کی نقلیں کرا کے مختلف اسلامی ریاستوں میں بھیج دیں اور حکم دیں کہ اسلامی ممالک میں اسی پر عمل کیا جائے تو اگرچہ امام مالک کو موقع تھا کہ وہ اپنے مسلک کو عالم اسلامی میں حکومت کے سہارے پھیلا دیں، لیکن امام نے ایسا نہیں کیا، بلکہ یہ جواب دیا کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین رسول اللہ ﷺ سے دین لے کر دنیا میں پھیل گئے اور انھوں نے سنت رسول کی بنیاد پر ہی اپنے اپنے طریقوں سے دین کو پھیلایا اور اس پر عمل کیا، تو پھر ہم کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ دین کو ایک ہی طریقہ میں محصور کر دیں اور صحابۂ کرام کے پھیلائے ہوئے طریقوں کو ختم کر دیں، جب کہ ان مسالک وطرق کی بنیاد بھی قرآن وسنت ہی پر ہے...''

مولانا ان اختلافات کو اہمیت دینے اور نزاع وجدال کا باعث بنا لینے کے نقصانات پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ان فروعی مسائل کو غیر معمولی اہمیت دینے کا سب سے برا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے علماء اور اصحاب فتاویٰ کی نظر دین کی ابدی بنیادوں اور عالم گیر اصولوں سے ہٹ کر فروع پر آ گئی اور اصل دین مستور ہوگیا، جس پر نجات انسانی کا مدار ہے، اور چھوٹے چھوٹے مسائل نے اس کی جگہ لے لی، جس سے وحدت اسلامیہ کو غیر معمولی نقصان پہنچا، اُخوت اسلامی پارہ پارہ ہوگئی اور وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ اور وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا کا اعلان بے معنی ہوگیا۔''

مولانا اپنے ایک مقالہ ''مسلکی عصبیت اور دعوت'' میں اس موضوع پر روشنی ڈالتے

ہوئے فرماتے ہیں:

''جامع ترمذی کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے وہ سینکڑوں مسائل ہیں، جن میں حضرات صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین میں اختلاف رہا ہے، لیکن یہ اختلاف ان میں باہمی تفریق، انتشار، فرقہ بندی اور تحزب کا ذریعہ نہ بنا اور نہ کوئی کسی کی تکفیر کرتا اور نہ کوئی کسی پر طنز و تعریض کرتا...اس اختلاف سے اُمت نے اپنے اندر گھٹن اور تنگی محسوس نہیں کی، حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ جن کی خلافت، خلافت راشدہ کہلاتی ہے، انھوں نے حضرات صحابہؓ کے اختلاف پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا، جسے زرقانی نے نقل کیا ہے: **ماسرنی لو ان اصحاب محمد لم یختلفوا لم تکن رخصۃ** (شامی: ۱/۶۳) یعنی حضرات صحابہ میں اختلاف نہ ہونے پر مجھے خوشی نہیں ہوتی، کیوں کہ ان کا اختلاف رخصت و گنجائش کا سبب ہے۔''

مولانا نہ صرف جلسوں اور کانفرنسوں کے پلیٹ فارم پر اور تقریر کے اسٹیج اور زبان و قلم سے اس کی دعوت دیتے تھے بلکہ جہاں کہیں سفر فرماتے، اگر وہاں دو مسلمان گروہوں، خاندانوں یا اشخاص کے درمیان کوئی اختلاف ہوتا تو اسے بھی حل کراتے۔

وسیع الفکری و فراخ قلبی

(۴) اجتماعیت کے لیے وسیع الفکری اور سیر چشمی مطلوب ہوتی ہے، مولانا رحمانی کی زندگی کا ایک امتیازی پہلو فقہی مسالک فتاویٰ اور جماعتوں اور تنظیموں کے معاملہ میں فراخ قلبی اور وسیع النظری بھی ہے، کیوں کہ اس کے بغیر کوئی شخص امت کو اجتماعیت اور وحدت کی لڑی میں پرو نہیں سکتا، ہم لوگوں کی طالب علمی کا زمانہ تھا، حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کے حسب ہدایت النادی الادبی کا افتتاحی اجلاس منعقد ہوا۔ دار العلوم کے معزز ارکانِ شوریٰ مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا منظور نعمانی، قاضی زین العابدین سجاد مرحوم وغیرہ شریک اجلاس تھے اور صدر مجلس

مولانا رحمانی تھے، عربی ادب کے ایک استاد نے افتتاحی خطاب کرتے ہوئے کچھ ایسی بات کہہ دی، جس سے قاسمی ندوی آویزش کا اظہار ہوتا تھا اور خاص طور سے اس بات پر توجہ دلائی کہ ندوی فضلاء اپنے نام کے ساتھ ندوی لکھنے کا اہتمام کرتے ہیں اور فضلاء دیوبند نسبت قاسمی کے اظہار کا اہتمام نہیں کرتے، مولانا رحمانی نے اپنے صدارتی خطبے میں اس پر نکیر کی، اور درس گاہی اور جماعتی وسیع القلبی کے سلسلے میں اکابر دیوبند کے اسوہ کو خاص طور سے پیش کیا، اور فرمایا کہ ایسی چیزوں میں ہمیں وسعت نظر سے کام لینا چاہیے کہ یہی ہمارے اکابر کا اسوہ ہے، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

مولانا رحمانی کی خواہش رہتی تھی کہ اختلاف رائے کے باوجود مختلف مسالک اور جماعتوں کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بیٹھنے کی صلاحیت پیدا کریں، آزادی کے بعد دربھنگہ میں دینی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی، اس میں جماعت اسلامی کے افراد بھی شریک تھے اور جمعیۃ علماء بھی اس کانفرنس میں مدعو تھی۔ مولانا رحمانی وغیرہ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جمعیۃ علماء کو اس میں شریک ہونا چاہیے، لیکن بہار میں جمعیۃ علماء کے بعض ذمے دار اس کے سخت مخالف تھے، آخر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب صدر جمعیۃ علماء کا فیصلہ ہوا کہ جمعیۃ کو اس کانفرنس میں شریک ہونا چاہیے۔

امارت شرعیہ کے زیر اہتمام ۳۱ر مارچ تا ۲ر اپریل ۱۹۷۸ء کو جامعہ رحمانی مونگیر میں ''مدارسِ اسلامیہ کنونشن'' منعقد ہوا، اس کنونشن میں پورے ہندوستان سے تعلیمی اداروں کے نمائندے شریک تھے، دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء، مظاہر علوم سہارنپور، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جماعت اسلامی ہند، جماعت اہل حدیث، بہار مدارس اکزامینیشن بورڈ، دینی تعلیمی کونسل اترپردیش، انسان اسکول کشن گنج بہار، وغیرہ مختلف درس گاہوں، جماعتوں کے مختلف علاقوں کے نمائندے ایک دوسرے کے دوش بدوش رونق افروز تھے، اور انھوں نے مشترک طور پر کچھ تجاویز طے کیں۔

مسائل فقہیہ میں بھی مولانا کی فکر یہ تھی کہ جہاں ضرورت ہو وہاں بدلے ہوئے حالات کے پس منظر میں اجتہادی آراء میں تبدیلیوں کو قبول کرنے کی گنجائش ہے، البتہ جو مسائل منصوص ہیں، ان میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ مولانا نے اپنے مقالہ ''مسلم پرسنل لا'' ـــــ جو اسلامک

اسٹڈیز سرکل علی گڑھ کے سیمینار منعقدہ ۱۰-۱۴/ستمبر ۱۹۶۹ء میں پیش کیا گیا۔ میں اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

''دوسری قسم ان مسائل کی ہے، جن کے احکام فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں، لیکن آج کے بدلے ہوئے حالات کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ اول الذکر مسائل کو شریعت کے اصول کی روشنی میں حل کرنا ہوگا، اور ثانی الذکر مسائل میں مصالح و حکم شرعی کی رعایت کرتے ہوئے اور نصوص کی روح کو محفوظ رکھتے ہوئے نئے حالات کے مطابق حکم کا استخراج کرنا پڑے گا، یہ دوسری قسم کے مسائل جن پر اپنے اُصول اجتہاد کے پیش نظر مجتہدین نے اپنی رائے ظاہر کردی ہے، لیکن آج کے بدلے ہوئے حالات کا تقاضا کچھ اور ہے اور موجودہ دور میں ان جوابات پر عمل دشوار نظر آتا ہے، ایسے مسائل کے حل کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کسی خاص فقہی مکتب فکر کی پابندی سے قطع نظر کر کے دوسرے مسلمہ فقہی مکاتب فکر میں اس کا جواب تلاش کیا جائے، اگر کسی اور فقہی مسلک میں اس کا جواب مل جاتا ہے تو اسے قبول کرلیا جائے، جیسا کہ ''زوجۃ مفقود الخبر'' کے معاملے میں علماء احناف نے حنفی مسلک چھوڑ کر مذہب مالکی اختیار کیا اور اسی پر فتویٰ دیا...''

افسوس کہ مولانا کے فتاویٰ ابھی تک تشنۂ ترتیب ہیں، لیکن مولانا کے جو چند فتاویٰ اس وقت میرے سامنے ہیں، ان سے مسائل فقہیہ میں مولانا کی سوچ کا اندازہ ہوتا ہے، جانور کو ذبح کرنے سے پہلے برقی جھٹکے کے ذریعے دو تین منٹ کے لیے بے ہوش کرنے کے سلسلے میں مولانا کی رائے تھی کہ یہ جھٹکا اس انجکشن کی طرح ہے، جو آپریشن سے پہلے عضو کو بے حس کرنے کے لیے لگایا جاتا ہے، جس سے چیر پھاڑ کی تکلیف کم سے کم محسوس ہوتی ہے، اور ذبح سے پہلے نیز ذبح کے وقت ایسا نظم کرنا، جس سے جانور کو کم تکلیف پہنچے مستحسن ہے۔

پوسٹ مارٹم کے سلسلے میں مولانا کی رائے ہے کہ تعلیم کی غرض سے بھی یہ جائز ہے، اس سلسلے میں آپ نے ان فقہی جزئیات سے استدلال کیا ہے، جن میں جنین کی زندگی بچانے کے

لیے مردہ عورت کا پیٹ شق کرنے کی اجازت دی گئی ہے، نیز اس جزئیہ سے بھی جس میں ایسی میت کا پیٹ شق کرنے کی اجازت دی گئی ہے، جس نے دوسرے کا مال جیسے ہیرا وغیرہ نگل لیا ہو، پھر آپ نے اس قاعدہ کا ذکر کیا ہے کہ اگر دو ضرر میں سے ایک ناگزیر ہو جائے تو نسبتاً شدید ضرر کے ازالہ کے لیے کم تر درجہ کے ضرر کو گوارا کیا جاسکتا ہے۔ پھر ان جزئیات اور فقہی قاعدہ کی روشنی میں مولانا نے اپنی رائے اس طرح ذکر کی ہے:

> ''میڈیکل کالج میں چند مردوں کی نعش پر عمل جراحی کے باعث چوں کہ سینکڑوں زندہ مریضوں کی جان بچتی ہے، اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ایک بچہ کی جان بچانے کے لیے ایک نعش پر عمل جراحی بلا اختلاف جائز ہو، اور سینکڑوں جان بچنے کے لیے چند نعشوں پر عمل جراحی جائز نہ ہو۔''

ائمہ اور حفاظ کے حالات کے پس منظر میں حضرت امیر شریعت کا رجحان حفاظ کو تراویح کے سلسلے میں جو نذرانہ دیا جاتا ہے، کسی حیلہ اور حوالہ کے بغیر اس کے جواز کا تھا، چنانچہ اس سلسلے میں اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''تراویح کے سلسلے میں جو صورت حال ہے، اس سے ہم نظری اور فرضی طریقوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے، بلکہ ہمیں واقعہ اور عملی صورتوں پر غور کرنا ہوگا، ہمارے خیال میں واقعی شکل وہی ہے، جس کا نقشہ اوپر کھینچا گیا، اس لیے ہماری رائے ہے کہ تراویح میں قرآن سنانے سے متعلق بھی وہی توسع پیدا کیا جائے، جو تعلیم قرآن، تعلیم حدیث، تعلیم فقہ، امامت، اذان و اقامت کے متعلق کیا گیا ہے۔''

ان آراء سے اختلافِ رائے کیا جاسکتا ہے، لیکن اس سے بہر حال یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسائل فقہیہ پر وہ زمانہ و حالات کو سامنے رکھتے ہوئے وسیع تناظر میں غور کیا کرتے تھے، نئے مسائل کے حل کے سلسلے میں ان کا اپنا نقطۂ نظر یہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، مدینہ کے فقہاء سبعہ اور امام ابوحنیفہؒ کی طرح اس دور کے مسائل میں اجتماعی اجتہاد کرنا چاہیے، آپ نے اپنے رسالہ ''مسلم پرسنل لا'' میں اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

''آج جب کہ استخراج احکام کی ضرورت ہے اور دوسری طرف بہت سے لوگ جدید مسائل پر ایسی رائیں دے رہے ہیں جو کتاب وسنت سے متعارض ہیں اور اپنی پشت پر اُصول شرع سے کوئی استناد نہیں رکھتیں، جس سے سخت گمراہی اور فتنہ کا خطرہ ہے، ایسے حالات میں کسی خاص فرد کو تو یہ فرض سونپ دینا درست نہیں، لیکن علماء اور اصحاب نظر کی ایک جماعت جو دین کے متعلق ضروری علوم میں پوری مہارت رکھتی ہو اور اس کی نگاہ زمانہ حال اور اس کی ضروریات، ملک کے تمدنی وثقافتی معاملات پر گہری ہو، نیز تاریخ اسلام، فقہ اسلامی کے مختلف ادوار اور ان کے تاریخی عوامل پر نگاہ ہو، جو مختلف مراحل میں قانون پر اثر انداز ہوئے ہوں، ایسے لوگ جمع ہوں اور کتاب وسنت، آثار صحابہ، اجماع متقدمین اور اجتہاد فقہاء کو سامنے رکھ کر اپنی پوری صلاحیتیں اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ صرف کریں، تو امید ہے کہ ان مسائل کا حل نکل سکے گا اور ہم اس ذمے داری سے عہدہ برآ ہو سکیں گے، جو شریعت خداوندی کی طرف سے موجودہ حالات میں ہم پر عائد ہوتی ہے۔'' (مسلم پرسنل لا، زندگی کی شاہراہ:۱۰۶)

مولانا نے اپنے ایک اور علمی وتحقیقی مقالہ '' قانون شریعت کے مصادر اور نئے مسائل کا حل'' میں کتاب وسنت، اجماع وقیاس استحسان، مصالح مرسلہ اور احکام فقہ کے اخذ واستنباط میں عرف وعادت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے زیادہ واضح الفاظ میں اجتماعی اجتہاد کا تصور پیش کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

''یقیناً آج ایسے اشخاص کا دستیاب ہونا جن میں اجتہاد کے شرائط اور مجتہد کے اوصاف پائے جاتے ہوں، ناممکن معلوم ہوتا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اجتہاد اور قیاس کا حق اشخاص کے دائرہ سے نکال کر جماعت کو دیا جائے اور علماء واصحابِ نظر کی ایک مجلس بنائی جائے، جس کا ہر رکن علوم اسلامیہ کا ماہر ہو، نیز ان کی نظر عصر حاضر اور اس کی ضروریات، عرف عام اور ملک کے تہذیبی اور

ثقافتی معاملات پر گہری ہو، سائنٹفک ترقیاتی اور ثقافتی انقلاب نے جو گہرے اثرات انسانی زندگی اور اس کے گردوپیش پر ڈالے ہیں، ان سے بھی وہ پورے طور پر آگاہ ہوں۔" (مسلم پرسنل لا، زندگی کی شاہراہ: ۱۴۹)

مولانا کو اپنے اس خواب کی تعبیر اس وقت بچشم سر دیکھنے کا موقع ملا جب اسلامک فقہ اکیڈمی کا پہلا فقہی سیمینار" جامعہ ہمدرد کے کنونشن ہال" میں منعقد ہوا تھا، اس سیمینار میں افتتاحی خطبہ مولانا رحمانی کا تھا، اس موقع پر آپ نے فرمایا کہ زندگی میں یہ دوسرا موقع ہے جس نے مجھے سب سے زیادہ مسرور وشادمان کیا ہے[ع]، پھر مجموعہ قوانین اسلامی کی ترتیب جس کے محرک اور نگراں آپ ہی تھے، میں بھی مولانا کی اس فکر کا عکس واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

جہاں ملی اور فقہی مسائل میں مولانا رحمانی کا ذہن وسیع اور قلب فراخ تھا، وہیں دینی مدارس کے نصاب ونظام کے بارے میں وہ ایک متوازن نقطۂ نظر رکھتے تھے، چنانچہ انھوں نے جامعہ رحمانی کا نصاب مرتب کرنے کے لیے تدریسی تجربہ کے حامل اساتذہ اور اصحاب نظر علماء کا ایک اجتماع ۱۹۵۴ء میں طلب فرمایا، اور نصاب میں توازن کے ساتھ بعض تبدیلیاں فرمائیں، چنانچہ ابتدائی پانچ درجات میں سرکاری پرائمری نصاب کے ساتھ قرآن کریم، دینیات اور مفتاح القرآن وغیرہ کو شامل نصاب رکھا گیا، پھر پرائمری اور شعبۂ عربی کے درمیان درجہ ششم رکھا گیا، جس میں پرائمری مکمل کرنے والے اور حفاظ طلبہ کا داخلہ لیا جاتا ہے، اس جماعت میں فارسی کی ابتدائی کتابیں، اردو املا، فقہ، سیرت، تاریخ اور ریاض الصالحین کا ترجمہ شامل نصاب ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ جو طلبہ حفظ مکمل کرکے آگے تعلیم جاری نہیں رکھ سکیں یا عربی جماعت میں شریک ہونے کے بجائے اسکول میں جانا چاہیں، وہ دین کی بنیادی باتوں سے واقف ہوجائیں۔

شعبۂ عربی میں مولانا کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ بنیادی طور پر مروجہ درس نظامی ایک بہتر نصاب ہے، اور علوم اسلامی سے متعلق جو کتابیں اس میں شامل ہیں، انھیں برقرار رکھا جائے، البتہ جلالین وبیضاوی سے پہلے پورے متنِ قرآن کا ترجمہ اور اس سے پہلے حضرت مولانا عبد الصمد رحمانی کی تیسیر القرآن پڑھادی جائے، تاکہ قرآن مجید کی مفردات وتراکیب پر طلبہ کی نظر

ہوجائے... البتہ منطق وفلسفہ کے بارے میں آپ کی رائے تھی کہ اسے مصطلحات کی واقفیت تک محدود رکھا جائے، نیز نحو وصرف اور معانی و بیان میں ایسی کتابیں شامل کی جائیں، جن میں پیچیدہ تعبیرات اور لفظی بحثیں کم ہوں، اور فن پر زیادہ توجہ دی گئی ہو، بحمداللہ جامعہ رحمانی مونگیر کا نصاب اسی تصور پر مبنی ہے۔ دورۂ حدیث کے بارے میں آپ کی رائے تھی کہ اسے ایک سال کے بجائے دو سال میں پڑھایا جائے تاکہ ''تو چل میں آیا'' کی کیفیت پیدا نہ ہو، اور حدیث کے تمام اہم مباحث کو طلبہ ہضم کرسکیں، افسوس کہ یہ کوشش اب تک تشنۂ تکمیل ہے۔

طریقۂ تعلیم میں بھی مولانا بعض تبدیلیوں کے قائل تھے، دارالعلوم دیوبند میں درجہ بندی کے قیام میں بھی مولانا کی کوشش کا بڑا دخل ہے، حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ نے مدارس کے نصاب ونظام کے سلسلہ میں مولانا رحمانی کی فکر کو تفصیل سے اور بہتر طور پر پیش فرمایا ہے۔ (دیکھئے ہفت روزہ نقیب پھلواری شریف، پٹنہ کا امیر شریعت رابعؒ نمبر) غرض کہ مولانا رحمانی نہ غیر متوازن تبدیلی کے قائل تھے، اور نہ جدید نافع کے قبول کرنے سے گریزاں۔

تحفظ شریعت کی سعی بلیغ

(۵) امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کا سب سے بڑا کارنامہ اور اپنے معاصر علماء کے درمیان ان کا امتیاز وتشخص ہندوستان میں تحفظ شریعت کی کوشش ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ مولانا رحمانی کے اس مزاج و مذاق میں حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ کی تربیت اور صحبت کا بڑا اثر ہے۔ برطانوی عہد میں مولانا محمد سجاد صاحبؒ وہ شخصیت ہیں کہ شریعت اسلامی کی تنفیذ وتحفظ میں ان کا حصہ سب سے نمایاں رہا ہے، قانونِ انفساخ نکاحِ مسلم، قاضی بل اور کاظمی بل وغیرہ کی ترتیب اصل میں ان ہی کے زرخیز دماغ کی پیداوار ہے۔ مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں شریک تھے، لیکن ان کا کہنا تھا کہ سوراج تو آج نہ کل مل کر ہی رہے گا، مگر مسلمانوں کو چاہیے کہ آزادی سے پہلے اپنے مذہبی حقوق کا تحفظ کرلیں۔ مولانا سجاد

صاحب کی فکر و نظر کے بارے میں خود مولانا رحمانی فرماتے ہیں:

''پارٹی کے قیام کے دوران میں مولانا سے تفصیلی گفتگو کے مواقع آئے، اس وقت میں نے محسوس کیا کہ مولانا مسلمانوں اور ہندوستان کے تمام مسائل پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے غور فرمایا کرتے تھے، مولانا کا ایمان تھا کہ اسلامی نظام حکومت و زندگی ہی بنی نوع انسان کے دینی و دنیاوی فلاح کا ضامن ہوسکتا ہے، چناں چہ وہ ہر مسئلہ کو اسی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ وہ ہندوستان کی آزادی کے اس لئے خواہاں تھے کہ اسلام غلامی کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ وہ سرمایہ پرستی کے اس لیے مخالف اور کمزوروں اور غریبوں کے حامی تھے کہ اسلام کے مقرر کردہ نظام کے ذریعے غربت کو خوش حالی اور کمزوری کو قوت سے بدلا جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں مولانا کا یہ نظریہ ہی ان کی بڑی خصوصیت تھی جس میں وہ شاید منفرد تھے۔''

مولانا نے آگے اس بات پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ مولانا سجاد صاحب چاہتے تھے کہ مسلم پرسنل لا کو پورا قانونی تحفظ حاصل ہو جائے، (دیکھئے حیات سجاد: ۱۴۰-۱۴۲)۔ چنانچہ مولانا رحمانی یوں تو آزادی سے پہلے بھی اس عہد کے اکابر علماء کے ساتھ مل کر قانونِ شریعت کے تحفظ کی مہم میں شریک رہے، لیکن آزادی کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ آپ ہی اس تحریک کے اولین محافظ و قافلہ سالار رہے۔ آزادی سے پہلے جب مولانا رحمانی بہار اسمبلی کے رکن تھے تو مختلف مسائل پر آپ نے آواز اٹھائی، اور خاص کر اوقاف کے مسئلہ پر مفصل خطاب فرمایا۔ پھر اس مسئلے کے حل کے لیے جب مولانا آزادؒ مولانا سجاد صاحبؒ سے ملاقات کے لیے پٹنہ تشریف لائے تو مولانا سجاد صاحبؒ نے اپنی گفتگو میں مولانا رحمانی کو بھی شامل رکھا۔

دستور ہند میں بنیادی حقوق کے تحت اقلیتوں کو مذہبی آزادی دی گئی ہے، جس میں مذہب پر عقیدہ، مذہب پر عمل اور مذہب کی تبلیغ کی آزادی شامل ہے، اس کے ساتھ رہنما اصول کے تحت ایک دفعہ یہ بھی رکھ دی گئی کہ بہ تدریج تمام شہریوں کے لیے یکساں قوانین نافذ کرنے کی

کوشش کی جائے گی، یہ دفعہ مسلم پرسنل لا پر ایک لٹکتی ہوئی تلوار ہے۔ آزادی کے بعد حکومت کے حلقوں اور اس کے پروردہ نام نہاد دانشوروں کی طرف سے یکساں سول کوڈ کی آواز بلند ہونے لگی، اور حکومت کی طرف سے اس موقف کی طرف جھکاؤ کا کھلا اظہار اس وقت ہوا جب متبنی بل پیش کیا گیا، اس صورتِ حال نے تمام مسلم تنظیموں کو بے چین کر دیا، لیکن اس موقع سے بہت پہلے ۱۹۶۳ء میں کل جماعتی اجلاس مولانا رحمانی ہی نے امارت شرعیہ کے زیر اہتمام پٹنہ میں طلب کیا، جس میں جمعیۃ علماء کی طرف سے مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور جماعت اسلامی کی طرف سے مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی شریک ہوئے، اس کو مسلم پرسنل لا بورڈ کا تخم اول بھی کہا جا سکتا ہے۔

پھر آپ ہی نے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب سے دار العلوم دیوبند میں مسلم پرسنل لا کے موضوع پر ایک خصوصی اجتماع رکھنے کی خط کے ذریعہ خواہش کی، حضرت قاری صاحب کو ابتداء دار العلوم میں اس کام کو انجام دینے میں تامل تھا، لیکن مولانا سے تفصیلی تبادلۂ خیال کے بعد انشراح ہوگیا اور زیادہ وسیع سطح پر ایک خصوصی اجلاس طلب کیا گیا، پھر دار العلوم کے اسی اجتماع کی تحریک پر دسمبر ۱۹۷۲ء میں وہ عظیم الشان کنونشن منعقد ہوا، جس کے بارے میں حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ صاحب نے فرمایا کہ اگر آج ہندوستان کے کسی بھی کونے میں کسی قابل ذکر مسلمان عالم یا قائد کے بارے میں پوچھا جائے تو جواب یہی ہوگا کہ وہ بمبئی کے اس کنونشن میں ہیں، یہیں بورڈ کے باضابطہ قیام کی تجویز منظور ہوئی، اور اگلے اجلاس حیدر آباد میں بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی، جس میں باتفاق رائے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کو صدر اور امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی کو جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا، اسی پس منظر کی وجہ سے حضرت مولانا علی میاںؒ نے مولانا رحمانی کو بورڈ کا بانی و جنرل سکریٹری قرار دیا ہے۔

بورڈ کو پہلی کامیابی اس وقت حاصل ہوئی جب دسمبر ۱۹۸۰ میں پارلیمنٹ میں متبنّٰی بل پیش ہوا، لیکن مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا، ایمرجنسی ۷۶-۱۹۷۵ء میں نس بندی کے خلاف آپؒ نے جو جرأت مندانہ آواز بلند کی وہ ہماری تاریخ عزیمت کا ایک روشن باب ہے،

اکتوبر ۱۹۷۸ء میں الہ آباد ہائی کورٹ کے لکھنؤ بنچ نے مساجد و مقابر کے سلسلے میں ایک ایسا فیصلہ لیا، جس کے تحت کارپوریشن کو لکھنو کی دو مسجدوں اور قبرستان اور جے پور کی ایک مسجد کو ایکوائر کرنے کی اجازت حاصل ہوگئی۔ اس سلسلے میں آپ نے بورڈ کے پلیٹ فارم سے بڑی کاوشیں کیں، حکومت نے ایکوائر کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور مسجدیں اور قبرستان مسلمانوں کو واپس مل گئے۔ پھر شاہ بانو کیس کے نتیجہ میں تحفظ شریعت کی جو تحریک شروع ہوئی، وہ حضرت مولانا علی میاں صاحب کی سرپرستی اور حضرت مولانا رحمانی کے زیر انتظام ملک کے کونہ کونہ میں پہنچ گئی، اور اسی کے نتیجے میں قانون تحفظ حقوق مسلم مطلقہ خواتین ۱۹۸۶ء پاس ہوا۔ افسوس کہ اس قانون کی تعبیری لغزشوں کی وجہ سے عدالتیں قانون کے منشاء و مقصد کے مغایر فیصلے کر رہی ہیں۔

اپریل ۱۹۸۰ء میں انکم ٹیکس کا ایسا قانون لایا جا رہا تھا کہ اوقاف کی آمدنی کے ساتھ پوری موقوفہ جائداد پر انکم ٹیکس عائد ہو جاتا۔ مولانا رحمانی نے اس سلسلے میں بڑی کوششیں کیں، اور دو ہفتہ مسلسل دہلی میں قیام فرمایا، جس کے نتیجے میں اوقاف کی جائیدادیں اس سے مستثنیٰ قرار پائیں، بابری مسجد کے سلسلے میں آپ کی کاوشیں ہمیشہ آب زر سے لکھی جائیں گی۔ ۱۹۹۰ء کا زمانہ وہ ہے جس میں بابری مسجد کے مسئلہ کو لے کر فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑکنے لگی، اور بابری مسجد کے سلسلے میں ایکشن کمیٹی کے تین ٹکڑے ہو گئے، اور بوالہوسوں کا ایک گروپ اس بات کے بہانے تلاش کرنے لگا کہ حکومت اور فرقہ پرست طاقتوں سے مسجد کا سودا کر لیا جائے، اس سلسلے میں علماء کانپور کا ایک وفد پھلواری شریف آیا اور امارت شرعیہ کے دوسرے ذمے داروں کے ساتھ مل کر مولانا رحمانی کی خدمت میں حاضر ہوا، بورڈ نے اس وقت تک اپنے آپ کو بابری مسجد کے معاملہ سے الگ رکھا تھا، لیکن ان نازک حالات میں ۳/ دسمبر ۱۹۹۰ء کو دہلی میں ایک خصوصی اجلاس طلب کیا گیا، یہ ایک بے مثال اجتماع تھا، اور اس میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ مسجد ہمیشہ کے لیے مسجد ہے، اور اس میں بت رکھ دینے کی وجہ سے اس کی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

بورڈ کا ایک بڑا کارنامہ جو مولانا رحمانی کی خصوصی نگرانی میں انجام دیا گیا "مجموعہ

قوانین اسلامی'' کی ترتیب ہے، جس کی تدوین میں ملک کے مؤقر ترین علماء اور فقہاء شریک رہے، اس طرح یہ فتاویٰ عالمگیری اور مجلۃ الاحکام العدلیہ (ترکی) کے بعد غالباً ایک منفرد نوعیت کی کوشش ہے۔ مولانا رحمانیؒ نے اس کا خاکہ مرتب فرمایا پھر پورے ملک کے اہل علم سے رائیں حاصل کی گئیں اور چند منتخب علماء کی متعدد نشستیں خانقاہ رحمانی میں منعقد ہوئیں، جن میں مولانا رحمانی بنفس نفیس شریک رہتے۔

مسلم پرسنل لا کے موضوع پر اردو زبان میں جو لٹریچر مرتب ہوا ہے، اپنی معنویت، فکری گہرائی، مسئلہ کی وضاحت اور تفہیم کے اعتبار سے مولانا رحمانی کے رسائل ان میں بنیادی حیثیت کے حامل ہیں، اور مسئلہ کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے بہت ہی کافی ووافی ہیں، ہمیں رحمانی فاؤنڈیشن مونگیر اور اس کے بانی وذمے دار حضرت مولانا محمد ولی رحمانی صاحب کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے ان نو رسائل کو ''مسلم پرسنل لا، زندگی کی شاہراہ'' کے نام سے ایک جگہ شائع کردیا ہے۔

تحفظ شریعت کی تحریک ہی کا ایک حصہ آپ کے عہد امارت میں نہ صرف بہار بلکہ ہندوستان کے متعدد صوبوں میں نظام قضا کی توسیع بھی ہے، آپ جب بہار کے چوتھے امیر شریعت منتخب ہوئے اور بحیثیت امیر کتاب الاحکام پر پہلا حکم لکھا تو اس میں سب سے پہلے نظام قضا ہی کا ذکر تھا کہ تمام اضلاع میں دار القضاء قائم ہوں اور قضاۃ کی تربیت کا مناسب انتظام کیا جائے، چناں چہ آپ کے عہد امارت میں تین تربیت قضاۃ کیمپ منعقد ہوئے، دو تو خانقاہ رحمانی مونگیر میں جس میں علماء بہار شریک تھے اور اس وقت حضرت مولانا شاہ عون احمد قادریؒ قاضی شریعت تھے اور تیسرا جولائی ۱۹۸۷ء میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی نگرانی میں جس میں بیرون بہار کے علماء کی بھی خاصی تعداد شریک تھی، بہار کے علاوہ آسام، دیوبند، مالیگاؤں، لکھنؤ، بنگلور، حیدرآباد، اورنگ آباد وغیرہ میں کہیں امارت اور اس کے تحت نظام قضاء اور کہیں صرف نظام قضا کا قیام عمل میں آیا، ان سب میں آپ کی سعی اور تحریک کو خاص دخل تھا۔

قضا کے موضوع پر جو لٹریچر مرتب ہوا اس میں بھی مولانا رحمانی کی تحریک کا بڑا دخل ہے، آپ ہی کے دور امارت میں جناب مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم نے رہنمائے دار القضاء مرتب کیا،

فسخ وتفریق کی صورتوں پر حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی نے اپنی مختصر مفید کتاب ''کتاب الفسخ والتفریق'' تالیف فرمائی۔ قضا کے موضوع پر اردو کے کتب خانہ میں کوئی کتاب موجود نہیں تھی، آپ کے ایماء پر حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ نے ''اسلامی عدالت'' جیسی عظیم الشان کتاب تالیف فرمائی، جو ۷۳۹ دفعات پر مشتمل ہے، اور جس کا ایک سے زائد عربی ایڈیشن بھی بیروت سے شائع ہوکر عالم عرب میں مقبولیت حاصل کر چکا ہے، اس کتاب کی رسم اجراء کے لیے ۱۸ر دسمبر ۱۹۸۸ء کو غالب اکیڈمی میں خصوصی اجلاس رکھا گیا، جس کی صدارت حضرت امیر شریعتؒ نے فرمائی۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں شریعت اسلامی کے تحفظ کی جو بھی تاریخ لکھی جائے گی، مولانا رحمانی کے ذکر کے بغیر وہ ناقص و ناتمام ہوگی، اور آزاد ہندوستان میں اس سلسلہ کی سعی جمیل جب بھی مرتب کی جائے گی تو اس کے سرنامہ میں مولانا رحمانی کا نام نامی ہوگا۔

افرادسازی ومردم گری

(۶) مولانا رحمانی کے جس آخری نمایاں اور امتیازی وصف کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ ہے افرادسازی اور مردم گری، انھوں نے خشت وسنگ کی تعمیر سے زیادہ رجال کار کی تعمیر پر توجہ دی، اور لوح وقرطاس کی تالیف سے بڑھ کر افراد واشخاص کی تصنیف فرمائی۔ حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ جو خود بھی اپنے عہد کے ذہین ترین فضلا میں سے تھے، ان کو ہلال سے بدر منیر، مولانا ہی کی تربیت، صحبت اور حوصلہ افزائی نے بنایا، اور انھوں نے مولانا رحمانی کے مزاج، ان کی خصوصیات کو اس طرح اپنے آپ میں جذب فرمایا کہ جیسے مولانا رحمانی مولانا سجاد صاحب کے عکس جمیل تھے، اسی طرح قاضی صاحب مولانا رحمانی کی فکر کا پرتو۔

حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب دامت برکاتہم جو اپنی اعلیٰ ظرفی، اصابت رائے، تدبر، برد باری اور لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیت میں ایک خصوصی اور امتیازی حیثیت کے حامل ہیں، ان کے مزاج ومذاق اور طور وطریق میں بھی مولانا رحمانی کا رنگ پوری طرح نمایاں ہے، حضرت مولانا سید محمد ولی رحمانی نہ صرف اپنے والد کے نسبی جانشین ہیں، بلکہ

جرأت وحوصلہ مندی، زبان وقلم میں وضاحت و بے ساختگی، معاملہ فہمی، اپنے عہد کے مسائل کے سلسلے میں شعور وبصیرت کے اعتبار سے بھی اپنے والد اور مربی کے وارث ہیں۔

پھر جامعہ رحمانی پر نظر اٹھائیے کہ مولانا کی توجہ سے کیسے کیسے اساتذہ پیدا ہوئے اور تدریس کے میدان میں امتیازی مقام حاصل کیا، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس حقیر نے جامعہ رحمانی میں جن اساتذہ سے کسب فیض کیا، قریب قریب وہ سبھی حضرات کسی نہ کسی ممتاز دینی درس گاہ میں شیخ الحدیث کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان میں بعض تو وہ ہیں جو ذرہ تھے، اور مولانا کی نظر کیمیا اثر نے انھیں اس میدان کا آفتاب بنا دیا، ایک صاحب کتب خانہ کے ذمے دار کی حیثیت سے مدرسہ میں بحال کئے گئے، لیکن بتدریج وہ مدرسہ کے مقبول ترین اساتذہ میں شمار کئے جانے لگے۔ افسوس کہ انھیں یہ ترقی راس نہیں آئی، اور نہایت ہی ناشائستہ اور ہنگامہ خیز طریقے پر وہ مدرسہ سے علاحدہ ہوئے۔

اسی طرح جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، آپ نے قضاۃ کی تربیت پر خصوصی توجہ دی، اور آپ کی اس توجہ کا ثمرہ ہے کہ پورے ملک میں پچیسوں تربیت یافتہ قضاۃ اس وقت موجود ہیں، مسلم پرسنل لا بورڈ کے پلیٹ فارم سے بھی آپ نے بہت سی صلاحیتوں کو ابھارنے اور انھیں نکھارنے کی بے حد کوشش فرمائی۔

افراد سازی ایک مستقل فن ہے، بڑی ریاضتوں اور کاوشوں کا فن، اس میں محنت کی بھی ضرورت ہوتی ہے، تحمل و بردباری کی بھی، اور خلاف طبیعت باتوں کو سہنے کی بھی، کیوں کہ افراد سازی کا عمل ایسے ہی لوگوں پر نافذ ہو سکتا ہے، جن میں قبول کرنے کی صلاحیت بھی ہو اور جو لوگ ذی صلاحیت ہوتے ہیں، ان میں بے چوں و چرا تسلیم ورضا کی کیفیت نہیں ہوتی، رائے اور سوچ کا اختلاف بھی پیدا ہوتا ہے اور اختلاف کو انگیز کرنا وسعت ظرف اور فراخی قلب کا طالب ہے، مولانا رحمانی میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود تھی، اس لیے وہ اس کوہ کنی میں کامیاب ہو سکے، یہ وہ چند پہلو ہیں جو اپنے معاصرین اور رفقاء میں مولانا رحمانی کی شناخت اور پہچان کا درجہ رکھتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت مولانا رحمانی علیہ الرحمہ اس عہد کی نابغہ روزگار شخصیتوں میں

تھے، وہ اپنے والد کی آہِ سحرگاہی اور نالۂ نیم شبی، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے دل دردمند اور فکر ارجمند، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے جذبۂ جہاد اور جرأت حق، دیوبند کی علمی بصیرت، ندوہ کی فکری وسعت، موروثی اعلیٰ ظرفی اور خوش خلقی کا ایسا حسین سنگم تھے، اور تعلیم و تدریس، ادب وصحافت، سیاست وقیادت، تزکیہ وارشاد اور دعوت وعزیمت کی مختلف جہتیں اس طرح ان کی شخصیت میں جمع ہوگئی تھیں کہ گویا ایک شخصیت کئی شخصیتوں کا مرکب ہو، اور ایک ہی پھول رنگ وبو کے تنوع کے اعتبار سے گلدستہ بن گیا ہو۔

———— ⊙⊙⊙ ————

نوٹس از مرتب:

۱۔ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے حضرت مونگیریؒ سے بیعت کی تھی اور خانقاہ رحمانی میں ان کی آمد ورفت پہلے سے تھی، حضرت مولانا سجادؒ نے حضرت مونگیریؒ کو امیر شریعت کے منصب کے لیے آمادہ کرنا چاہا تھا۔ وہ تیار نہیں ہوئے اور حضرت مولانا بدرالدین علیہ الرحمہ سجادہ نشین خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کو امیر شریعت بنانے کا مشورہ دیا اور اس مشورہ کا احترام کیا گیا۔ امارت شرعیہ کے کاموں میں شروع سے خانقاہ رحمانی شریک رہی۔

۲۔ اس سے پہلے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مجلس تحقیقات شرعیہ کے قیام کے وقت بھی آپ نے بڑی خوشی کا اظہار فرمایا تھا، میری معلومات کے مطابق مجلس تحقیقات شرعیہ کی تحریک بھی حضرت مولانا رحمانی کے مکتوب بنام حضرت مولانا علی میاں صاحب سے ہوئی تھی اور اس کے ابتدائی اجلاس (منعقدہ یکم ستمبر ۱۹۶۳ء، ندوۃ العلماء) کی صدارت بھی آپ نے ہی کی تھی۔ تفصیل کے لیے دیکھئے ہفت روزہ نقیب اور ندائے ملت۔

۳۔ جس کے متن کی تسوید وترتیب میں مولانا رحمانی نے نمایاں حصہ لیا۔ (عمید الزماں کیرانوی)

مولانا عزیز الحسن صدیقی غازی پوری ☆

حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ
مزاج و انداز

اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کا انتقال رمضان کی ایک مبارک رات میں عین حالت نماز میں ہوا تھا۔ یہ خبر بجلی بن کر دل و دماغ پر گری تھی اور ہوش و حواس کو معطل کر گئی تھی مگر ذرا دیر بعد انتقال کے وقت کی کیفیات معلوم ہوئیں تو دل کو قرار ہی نہیں آیا بلکہ ہم ان کی موت پر رشک بھی کرنے لگے۔ مولانا نے زندگی بھی قابل رشک گزاری اور موت بھی قابل رشک پائی۔

مولانا بڑے باپ کے بیٹے ہی نہیں تھے خود بھی بڑے تھے مگر بڑ پن کا پندار ان کو چھو کر بھی نہ گزرا تھا، ان کا قد اتنا اونچا تھا کہ دیکھنے والوں کی ٹوپیاں گر گر جاتی تھیں مگر سادگی و تواضع کا یہ حال کہ اپنے چھوٹوں سے بھی جھک کر ملتے تھے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ان کی بے نفسی و تواضع سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ کا بیان ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''اس سلسلے میں ایک واقعہ لطیفہ کے طور پر بیان کیا جاتا ہے، جس سے مولانا کی مزاجی کیفیت، بے نفسی اور تواضع کا کسی قدر اندازہ ہوسکتا ہے۔ ایک مرتبہ دہلی کے قیام میں اپنی قیام گاہ (حافظ کرامت صاحب کی کوٹھی، واقع نظام الدین) سے ہم دونوں راجیو جی سے ملنے کو نکلے، راقم کے ہاتھ میں کچھ فائلوں اور کاغذات کا ایک بنڈل تھا، مولانا نے بلا تکلف میرے ہاتھ سے اس طرح لے لیا گویا وہ ایک رفیق ہیں اور میں اصل نمائندہ اور وفد کا رہنما تھا، مولانا مجھ سے عمر

☆ مہتمم مدرسہ دینیہ، غازی پور (یوپی)

اورعلم وفضل میں بڑے ہی تھے، پھران کی نسبت پدری میرے لیے قابل احترام تھی، میں نے کہا کہ مولانا! یہ بتایئے کہ اگر حضرت مولانا سید محمد علی صاحب مونگیریؒ اور مولانا سید عبدالحی صاحبؒ ساتھ ہوتے تو یہ پلندہ کون لیتا؟ میرا اشارہ اس طرف تھا کہ یقیناً یہ مولانا سید عبدالحی صاحب ہی اپنے ہاتھ میں رکھتے جو حضرت مونگیریؒ سے کم عمر تھے اوران کو اپنا بڑا اور بزرگ سمجھتے تھے۔

مولانا نے برجستہ جواب دیا، جس کو مولانا محمد علیؒ کہتے ہیں۔''

ایسے تھے مولانا رحمانی۔ خیال فرمایئے، مولانا آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری ہی نہیں ہیں امیر شریعت اور پیر طریقت بھی ہیں، شاگردوں اور مریدوں کی فوج بھی رکھتے ہیں مگر مزاج پر ترفع وتمکنت کے بجائے تواضع وانکسار کا رنگ غالب ہے۔ ان کے مزاج میں خاکساری وفروتنی نہ ہوتی تو پی ایم ہاؤس جاتے ہوئے اس طرح فائل اور کاغذات کا پلندہ نہ سنبھال لیتے۔ اس واقعہ سے حضرت مولانا علی میاںؒ کی مزاجی کیفیت اور سادگی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے عہدے کو معیار نہیں بنایا بلکہ عمر کے پیمانے سے ناپا۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں کا بالعموم یہی حال رہا ہے۔ وہ گردن سیدھی کر کے نہیں بلکہ جھکا کے چلتے تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کا لباس اتنا معمولی اور سادہ ہوتا تھا کہ عام آدمی ان کو پہچان بھی نہیں پاتا تھا، مولانا مدنیؒ اپنے مریدوں کا جوتا اٹھالیا کرتے تھے۔ حکیم وصی احمد صاحب گورکھپوری ان کی خدمت میں بیعت کرنے کے خیال سے پہنچے تو خود بیعت لینے کے بجائے مولانا تھانویؒ کی خدمت میں بھیج دیا۔

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰنؒ پارلیمنٹ کے ممبر تھے مگر موجودہ ممبران پارلیمنٹ پر ان کو قیاس نہیں کیا جاسکتا، وہ زبردست عالم دین اور اعلیٰ درجے کے مصنف وادیب تھے مگر ۱۹۴۷ء کے پرآشوب زمانے میں سب طرف سے نگاہ پھیر کر انھوں نے جس انداز میں مظلوموں کی نصرت وحمایت اور چارہ سازی وغم گساری کی وہ انھیں کا حصہ تھا، ان کے پاس ایک کھٹارا سی جیپ تھی، جس پر وہ پارلیمنٹ ہاؤس بھی جاتے اور پریسیڈنٹ ہاؤس اور پی ایم ہاؤس بھی۔ جیپ کیا

تھی زلزلہ اور بھونچال تھی۔ جب چلتی تھی تو زمین لرزنے لگتی تھی، اس کے کل پرزوں کے شور سے راہ گیر ٹھٹھک کر رہ جاتے تھے اور ڈرائیور کو ہارن بجانے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑتی تھی۔ مولانا چاہتے تو ایک اچھی سی گاڑی فائنانس کرا لیتے مگر وہ جس صف کے آدمی تھے اس کا حال کچھ ایسا ہی تھا۔ راقم کے والد مولانا ابوالحسن صدیقی (م ۱۹۶۷) جنگ آزادی کے سپاہی تھے مگر انھوں نے پولٹیکل پنشن قبول نہیں کی تھی۔ یہ ان لوگوں کی باتیں ہیں جنھوں نے اللہ کے لیے تواضع اختیار کی۔ دین کی، انسانیت کی اور ملک وملت کی بے لوث خدمت کی تو اللہ نے ان کے درجات کو بھی بلند کر دیا۔ مولانا منت اللہ رحمانیؒ اسی جماعت کے فرد فرید تھے۔

مولانا عبدالحمید اعظمی مرحوم جمعیۃ علماء کے مشہور کارکن تھے، جمعیۃ علماء اتر پردیش کے ریاستی دفتر میں آفس انچارج رہ چکے تھے، وہاں سے علٰیحدگی کے بعد کچھ عرصے تک امارت شرعیہ بہار سے وابستہ رہے۔ غالباً اس وقت تک جمعیۃ علماء اور امارت میں دراڑ نہیں پڑی تھی اور دونوں ادارے تقریباً ایک ہی سمجھے جاتے تھے، ان میں آپسی میل جول قائم تھا اور دونوں گویا کہ ایک ہی طرز کے ادارے سمجھے جاتے تھے۔ امارت شرعیہ کے مرکز میں قیام کے دوران مولانا اعظمی کو امیر شریعت کا قرب حاصل ہوا، محاسن کھلے اور سمجھنے بوجھنے کا موقع ملا۔ ایک موقعے پر اعظمی صاحب نے راقم سے بتایا کہ مولانا رحمانی کارکنوں کی بڑی قدر کیا کرتے تھے۔ اعظمی صاحب کے پاس گرم کپڑے نہیں تھے اور سردی کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ مولانا رحمانیؒ نے اپنی جیب خاص سے گرم شیروانی کا کپڑا خرید کر ان کو دیا۔ مولانا رحمانیؒ امیر شریعت اور شیخ طریقت تھے، بڑے رہ نما تھے، ان کا اپنے سے چھوٹے اور ایک دفتری کارکن پر اس درجہ مہربان اور شفیق ہونا یقیناً ان کا بڑپن تھا، ان کی عنایت تھی اور کرم تھا۔ اس ایک واقعہ سے مولانا کے مزاج اور طریق کار کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا انداز ''اندازِ خسروانہ'' نہیں بلکہ ''انداز خادمانہ'' تھا۔ آج اس انداز اور اس ڈھب کے لوگوں کو دنیا ڈھونڈ رہی ہے مگر ان کا سراغ نہیں ملتا:

اب انھیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

مدارسِ دینیہ جن کو فی زمانہ Out of Date کہا جا رہا ہے کچھ اسی قسم کے افراد تیار کیا

کرتے تھے مگر افسوس کہ ان کے تاریخی کردار کو مسخ کرنے کی منظم کوششیں کی جارہی ہیں، سرکاری ایجنسیاں اس کام میں لگی ہوئی ہیں کہ مدارس ہوا کے رخ پر چلنا شروع کردیں۔ لارڈ میکالے کا تعلیمی فلسفہ بروئے کار لایا جائے، جس طرح کالجوں میں سرکاری مشنری کے لیے کل پرزے تیار ہوتے ہیں، مدارس اپنی خصوصیات سے محروم ہوجائیں اور اس کارگاہ سے ملک وملت کے بے لوث خادموں کی کھیپ نکلنا بند ہوجائے۔ جس دن یہ کام ہوگیا اسی دن جبین اقتدار پر پڑی شکنیں آپ سے آپ مٹ جائیں گی اور حکومت کے سارے خدشات بھی دور ہوجائیں گے۔ وزارت تعلیم کی فکرمندی اور تشویش اور اس کی انگیخت پر ہماری یونی ورسٹیوں میں مدارس کے رول اور مدارس کی اصلاح کی خاطر ہونے والے سیمیناروں (جن میں مدارس کو جانے کون سی ثقافت اور کون سے اقدار کے فروغ کی تلقین کی جاتی ہے) کا سلسلہ بھی موقوف ہو جائے گا۔ ان بے چاروں کو مولویوں کا غم کھائے جارہا ہے، یہ سب مل کر کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح مولویوں کا ''جیون استر'' اونچا ہوجائے۔ وہ ڈاکٹر اور انجینئر بن جائیں، کاریگر اور مستری بن جائیں، بجلی کی لائنیں درست کریں، موٹر وائنڈنگ کا کام کریں، کنوؤں کی بورنگ کریں، کھاد کے کارخانے چلائیں مگر منبر ومحراب کو چھوڑ دیں، مسلمانوں کو دینی مسائل بتانا اور فتوے دینا بھول جائیں، اعلائے کلمۃ الحق کا فریضہ ترک کردیں، جس طرح روس میں زبردستی مار مار کے ان کو درست کیا گیا اور ان کا منصب چھین کر دو چار سرکاری مولویوں کو شیخ الاسلام کی پدوی دے دی گئی تاکہ وہ سرکار کے اشارے پر کبھی کبھی زبان کھولا کریں ہندوستان میں بھی ایسا ہی ہونے لگے۔

ہندوستان میں ایسا اس لیے نہیں ہوسکتا کہ ہمارے بزرگوں (جنھوں نے برادرانِ وطن سے قدم سے قدم ملا کر نہیں بلکہ ان سے آگے بڑھ کر ملک کی آزادی کی لڑائی لڑی تھی اور قیادت کی تھی) نے اپنے قول وعمل سے ثابت کردیا ہے اور تاریخ اس پر گواہ ہے کہ ان کی چھاؤنیاں اور ان کے مرکز عمل جن کو دنیا ''مدرسوں'' کے نام سے جانتی ہے اور جن میں آج بھی دین کی بچی کھچی فوج کے سپاہی رہتے ہیں کبھی اپنے کردار کا سودا نہیں کرسکتے۔

اب ہمیں اطمینان ہے کہ ہماری قومی حکومت اس بات کو سمجھ چکی ہے۔ آزاد ہندوستان

میں شمس العلماء کا خطاب نہیں دیا جاتا، پنڈت نہرو کے زمانے میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کو "پدم وبھوشن" کا خطاب دیا جانے لگا تو آپ نے اس کو فوراً واپس کر دیا اور فرمایا "آزاد ہندوستان کے حکمرانوں کو انگریزوں کی نقالی نہیں کرنی چاہیے اور آپ نے اپنے طرز عمل سے خادمان دین وملت پر واضح کر دیا کہ انھیں ملک وملت کی بے غرض خدمت کرنی چاہیے اور صلہ وستائش کی تمنا نہیں کرنی چاہیے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ کا ایک قول

آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزادؒ جب دارالعلوم دیوبند کی زیارت کو تشریف لے گئے تو آپ نے دارالعلوم کے طلبہ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا:

"آپ کا منصب ومقام سرکاری ڈگریوں کا محتاج نہیں ہے آپ اپنے بزرگوں کے نقوش قدم پر چلتے رہیں اور دین وملت کی خدمت کرتے رہیں۔"

یقیناً مولانا کی شخصیت ایک پالیسی ساز رہی ہے، صحیح معنوں میں آپ رہنما تھے۔ آپ نے ملک کو، حکومت کو اور مدارس دینیہ کو ایک صحیح راستہ دکھایا تھا مگر افسوس کہ لوگ اس سے بھٹک رہے ہیں، حکومت نے بھی حدود سے تجاوز کیا ہے اور بعضے اربابِ مدارس بھی دنیا کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگے ہیں۔

اندازِ کار

امیر شریعت ثالث بہار واڑیسہ مولانا شاہ قمرالدین صاحب کا جب ۱۹۵۷ء میں انتقال ہو گیا تو حضرت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی رحمۃ اللہ علیہ بہ اتفاق آراء امیر شریعت رابع منتخب کر لیے گئے۔ وہ اس منصب عالی کے لیے موزوں ترین شخص تھے۔ آنے والے زمانے میں انھوں نے اپنی قائدانہ صلاحیت، معاملہ فہمی، سیاسی سوجھ بوجھ اور خدمات سے ثابت کر دیا کہ اس پرآشوب دور میں ان کا انتخاب ہر طرح موزوں اور برمحل تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ملک کو آزاد ہوئے محض دس سال کا عرصہ گزرا تھا، ملک تقسیم ہو کر

آزاد ہوا تھا اس لیے فضا ناہموار تھی، فرقہ وارانہ فسادات جاری تھے، مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ تھا، وہ سر پر پیر رکھ کر خوابوں کی جنت کی طرف بھاگے جا رہے تھے اور راستوں میں مارے جا رہے تھے۔ ملک جن حالات میں آزادی کی نعمت سے ہم کنار ہوا تھا اور تقسیم کا زہر جس طرح سرکاری مشنری میں سرایت کر چکا تھا اور اکثریتی فرقہ کا ذہن جس طرح مسموم ہو چکا تھا اس کے اثرات نمایاں تھے، فرقہ پرست مسلمانوں کو یرغمال سمجھنے لگے تھے، ان کے حقوق پر ڈاکے ڈالے جا رہے تھے، انھیں دوسرے درجے کا شہری سمجھا جا رہا تھا اور سب سے گھناؤنی چیز جو دیکھنے میں آ رہی تھی یہ تھی کہ تعلیمی اداروں میں ایسا نصاب تعلیم اور ایسی گندی تاریخ پڑھائی جا رہی تھی اور آج بھی پڑھائی جا رہی ہے جس کو پڑھ کر ہمارے بچے مسلمانوں سے، مسلمانوں کے کردار سے اور مسلمانوں کے دین سے نفرت کرنے لگیں۔ پنڈت نہرو نے ڈاکٹر تارا چند سے جو تاریخ لکھوائی تھی، وہ حکومت کی فولادی الماریوں میں سماگئی، بشمبھر ناتھ پانڈے اور پنڈت سندر لال کی لکھی ہوئی تاریخ کو فراموش کر دیا گیا۔

ظاہر ہے کہ ملک کی فضا اور ماحول کو مسموم ہونا تھا سو ہوا، نفرت کی دیواریں کھڑی ہونی تھیں سو ہوئیں، اسلامی شریعت اور عائلی قوانین پر حرف گیری کی جانے لگی، مذہبی آزادی، ملی تشخص اور شعائر اسلام پر کھلے و بند حملے ہونے لگے، ایسے نازک دور میں علمائے حق کا جو گروہ سینہ سپر ہو کر سامنے آیا اس میں مولانا منت اللہ رحمانی بھی تھے، جنھوں نے ایک طرف امارت شرعیہ کو مؤثر اور فعال بنایا اور جگہ جگہ دار القضاء کا تقرر کیا اور مسلمانوں کو سرکاری عدالتوں کے بجائے شرعی عدالتوں کی طرف رجوع کرنے پر آمادہ کیا اور بطور خاص اصلاح معاشرہ کی تحریک شروع کی تو دوسری طرف ۱۹۷۲ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ قائم کر کے ملک و ملت کو ایک نئی جہت سے متعارف کرایا۔ بہ قول حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ:

> ''مولانا منت اللہ صاحب کے دور امارت کا اصل کارنامہ اور تاریخی کردار 'آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ' کا قیام ہے، جس کی ۲۷، ۲۸ر دسمبر ۱۹۷۲ء کو بمبئی میں تشکیل ہوئی اور جس کے صدر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب، مہتمم

دارالعلوم دیوبند منتخب ہوئے جو اس اہم ملی منصب و قیادت کے لیے موزوں ترین شخصیت تھے اور جن کو زیادہ سے زیادہ اعتماد و احترام عام حاصل تھا اور مسلمان فرقوں، جماعتوں اور تنظیموں کی اس میں ایسی نمائندگی ہوئی جو کم کسی نمائندہ ادارہ اور جماعت میں ہوتی ہے۔" (پرانے چراغ حصہ سوم، صفحہ ۱۲۱)

ہندوستانی حکومت اور مسلم پرسنل لا

ہندوستان سیکولر جمہوریہ ہے، اس کے دستور و آئین میں ملک میں بسنے والی تمام قوموں، مذہبوں اور مذہبی اکائیوں کے معتقدات اور جذبات و احساسات کا لحاظ رکھا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ دستور کی دفعہ ۴۴ (جس میں یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی گنجائش موجود ہے اور علما کے اعتراض کے باوجود وزیر اعظم پنڈت نہرو نے اس کو باقی رکھا تھا) کے ہوتے ہوئے حکومت مسلم پرسنل لا کو بہر حال تسلیم کرتی ہے اور حکومت کی جانب سے ہمیشہ یہی کہا جاتا رہا ہے کہ جب تک مسلمان اس میں ترمیم کی خواہش نہیں کریں گے، ترمیم نہیں ہوگی حالاں کہ ماضی میں سپریم کورٹ حکومت ہند کے سامنے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کے لیے قانون سازی کی تجویز پیش کر چکا ہے۔

۱۹۷۲ کے آس پاس بنگلہ دیش کے ایک انگریزی اخبار نے لکھا تھا کہ دنیا کے بیشتر مسلم ملکوں میں مسلم پرسنل لا میں ترمیمات ہوگئیں مگر ہندوستان وہ واحد غیر مسلم ملک ہے جہاں حکومت مسلم پرسنل لا میں ترمیم کے لیے تیار نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی حکومت پر مسلم علماء کا اتنا اثر اور دباؤ ہے کہ وہ ترمیم نہ کرنے پر مجبور ہے۔

یہ تیس سال پہلے کا حال تھا، اب ایسا نہیں ہے، اسی کے بعد حکومت اور فرقہ پرست طاقتوں نے علماء کی طاقت کو توڑنا شروع کر دیا اور چن چن کر ہمارے ایک ایک قلعہ کو نشانہ بنایا تاکہ تخریبی منصوبوں کو روبہ عمل لایا جاسکے۔

نگاہ اٹھا کر دیکھئے ہمارا کون سا قلعہ اور چھاؤنی ایسی ہے جس کی فصیلیں محفوظ ہیں، قلعوں کی دیواریں ٹوٹتی ہیں تو انتشار پیدا ہوتا ہے، فوج کے سپاہی تتر بتر ہو جاتے ہیں۔ طاقت کمزور ہوتی ہے۔ کیا اس وقت یہی کیفیت نہیں ہے؟ ہمارے بہترین دماغوں کو خریدا جارہا ہے،

متاع لوح وقلم چھینی جارہی ہے، خون دل کے سوا بچا کیا ہے؟ اب ہمیں اسی میں انگلیاں ڈبوکر اپنی داستان الم رقم کرنی ہے۔

جولوگ ابھی مسند اقتدار سے محروم ہوئے ہیں اگر کچھ دن اور رہ گئے ہوتے تو یقیناً رہی سہی کسر بھی پوری کردیتے اور دستور کا تیاپانچا کرڈالتے مگر ہمارا یہ سمجھنا کہ تلوار ہمارے سروں سے ہٹ گئی ہے کسی طرح درست نہ ہوگا۔ عدالتوں کا رخ بدل رہا ہے۔ ہماری مائیں اور بہنیں غیر مسلم وکلاء سے درخواستیں لکھوا کر عدالتوں میں داخل کررہی ہیں۔ زلیخا کے رٹ پر سپریم کورٹ سالیسٹر جنرل کو نوٹس دیتا ہے، جس میں تین طلاق کہہ کر تعلقات توڑنے کے رواج پر پابندی لگانے کی بات کہی جاتی ہے۔

زلیخا بی فرماتی ہیں کہ اکثریتی فرقے کے میرج کوڈ ۱۹۵۵ء کے مطابق کثرت ازدواج اور قانون سے ہٹ کر طلاق دینے پر پابندی ہے اس لیے مسلمان کو کثرت ازدواج کی روایت اور قانون سے ہٹ کر طلاق کی اجازت دینا آئین کی دفعات ۱۴، ۱۵، ۲۱ر کے منافی ہے۔ ایسی کتنی ہی زلیخائیں ہیں جو عدالتوں سے غیر شرعی فیصلے کروا کر خوش ہورہی ہیں، وزیر اعظم پنڈت نہرو نے اسلامی قوانین سے استفادہ کرتے ہوئے ہزاروں سال سے ستائی جانے والی ''سیتاؤں'' اور ''ساوتریوں'' کو ہندو کوڈ بل پاس کرا کے راحت کا احساس دلایا، پنڈت اٹل بہاری باجپئی تو یہ کہیں کہ ہندوؤں میں شادی بیاہ کے موقعے پر عورت کچھ اس طور پر مرد کے حوالہ کردی جاتی ہے جیسے ایک آدمی جانور خرید کر لے جاتا ہے جب کہ اسلام میں نکاح کا ایک معاہدہ ہوتا ہے جس کے فریقین پابند ہوتے ہیں مگر افسوس کی بات ہے کہ آج مسلم خواتین اسلامی شریعت کو ''بازیچۂ اطفال'' بنانا چاہتی ہیں اور پرسنل لا کے مسئلے کو تفریح کا موضوع سمجھ رہی ہیں اور پرائے شگون ناک کٹوانے کے لیے تیار ہیں۔

گھر کا چراغ ہی گھر کو جلا رہا ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم شرعی قوانین کو خود اپنے ہاتھوں سے توڑ رہے ہیں، ہماری گھریلو زندگی شریعت کے دائرے میں گزر رہی ہے نہ ہم اپنے معاشرے کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے کو تیار ہیں۔ اسلام دشمنوں، بددینوں گمراہوں اور فرقہ پرستوں نے

پرسنل لاء پر مشترکہ وار کیا ہے اور صرف بدنہاد لوگ ہی نہیں بہت سے سادہ لوح لوگ بھی سازش کا شکار ہورہے ہیں حالاں کہ ان کو دنیوی واخروی خسران کے سوا کچھ ہاتھ آنے والا نہیں ہے۔

مسلم پرسنل لا کی تحریک کو پروان چڑھانے اور مختلف مسلکوں اور اداروں کے ذمے داروں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کا جو کام مولانا منت اللہ صاحب رحمانیؒ نے انجام دیا تھا اور ۱۹۸۶ء میں آں جہانی راجیو گاندھی کی دلچسپی اور مداخلت سے جو مسلم مطلقہ ایکٹ پارلیمنٹ سے منظور کرایا جاسکا تھا اس کے پیچھے مولانا رحمانی کی متوازن قیادت کار فرما تھی۔ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

''مسلمانوں میں اصلاح معاشرہ کی ہمہ گیر تحریک اور تعمیری، اصلاحی وفکری وعملی جدوجہد اور اس کے اثرات، مسلم پرسنل لا بورڈ کے وہ عظیم الشان جلسے جو بمبئی، کلکتہ، بنگلور، رانچی، حیدرآباد اور کانپور میں ہوئے اور جن کی ہندوستان کی قریبی تاریخ میں نظیر ملنی مشکل ہے، اس پورے سلسلہ کی اور اس کے دوررس اثرات میں جو عرصہ سے کسی تحریک میں دیکھنے میں نہیں آئے تھے۔ مولانا (منت اللہ رحمانی) کے تعمیری ذہن، حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر، دماغی توازن اور مقصد سے اتفاق رکھنے والے تمام عناصر سے مخلصانہ تعاون، ان کی قدر دانی، ان سے کام لینے کی صلاحیت اور ان کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے اور ان کے حسب مرتبہ سلوک و معاملہ کرنے کی فکری و مزاجی قابلیت کا بھی بڑا دخل ہے۔'' (پرانے چراغ حصہ سوم صفحہ ۱۲۲)

وائے افسوس کہ مسلم خواتین اسلامی دارالقضاء کے بجائے سرکاری عدالتوں کا رخ کر رہی ہیں اور ان قوانین کا سہارا لے رہی ہیں جن کی زد اسلامی شریعت پر پڑتی ہے اور عدالتیں مسلم مطلقہ ایکٹ ۱۹۸۶ء کی ان دیکھی کر رہی ہیں۔ دوسری طرف خود مسلمان اپنی ہی تنظیم پرسنل لا بورڈ کو بے اثر بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس طرح ہم سب مل کر اپنے بزرگوں کی روحوں کو تکلیف پہنچا رہے ہیں۔ اسلامی شریعت اور مسلمانوں کے دشمن خود مسلمانوں کے ہاتھوں ان کے پرسنل لا کو ڈائنامائٹ کرانا چاہتے ہیں۔

ابھی ۱۲،۱۳ ؍فروری ۲۰۰۵ءکو راجستھان کی راجدھانی جے پور میں آر ایس ایس کے زیر اہتمام جو ''نیشنلسٹ مسلم کونشن'' ہوا ہے، اس میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے اندر حب الوطنی پیدا کرنے، یکساں سول کوڈ کے نفاذ، گائے کے ذبیحہ پر مکمل پابندی اور مسلم خواتین میں بیداری لانے اور انھیں ان کے حقوق سے آگاہ کرنے کی غرض سے ایک ملک گیر مہم شروع کی جائے گی اور یہ مہم نیشنلسٹ مسلمانوں کے منچ کی نگرانی میں چلائی جائے گی۔ تاکہ یہ باور کرایا جاسکے کہ مسلمان خود یکساں سول کوڈ کا نفاذ چاہتے ہیں۔

یہ کونشن جے پور کے مسلم مسافر خانہ میں پولیس کے پہرے اور کڑی نگرانی میں ہوا، مسافر خانہ کے اردگرد دفعہ ۱۴۴ بھی نافذ تھی۔ کچھ لوگوں نے احتجاج کیا تو گرفتار کیے گئے۔ اس اجلاس کو کامیاب بنانے میں راجستھان کی سرکاری مشنری بھی استعمال ہوئی۔ آر ایس ایس کے سربراہ سری سدرشن بھی شریک ہوئے۔ بھاجپا کے سینئر لیڈر عارف بیگ بھی شریک ہوئے۔ خواتین کے نیشنل کمیشن کی ممبر محترمہ نفیسہ حسین اور آر ایس ایس کے سہہ سمپرک پرمکھ اندریش کمار بھی موجود تھے۔ خبر ہے کہ رچناتمک سوچ رکھنے والے وحید الدین خاں صاحب بھی اس کونشن میں تشریف لانے والے تھے مگر ناسازی طبع کی وجہ سے عین وقت پر ان کی آمد کا پروگرام کینسل ہوگیا۔ البتہ ان کا پیغام پڑھ کر سنایا گیا جس میں موصوف نے مسلمانوں کو مثبت سوچ اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

کونشن میں شرکاء کی تعداد بہت محدود تھی اور بند کمرے میں اس کا اجلاس ہورہا تھا۔ الغرض ملک کا فرقہ پرست ٹولہ پوری قوت اور تیاریوں کے ساتھ مسلم پرسنل لا کو اور مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کو Damage کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ہم یہ بھی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ مختلف حلقوں کی طرف سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی طاقت کو منتشر کرنے کی جو کوششیں ہورہی ہیں اور نئے نئے بورڈوں کا جو ''گٹھن'' ہورہا ہے، اس کے پیچھے مسلمانوں کے دشمنوں کا پورا پورا ہاتھ ہے۔

نفیسہ حسین جیسی خواتین کیا ہمیں یہ بتانے کی زحمت کریں گی کہ اسلام نے عورتوں کو جتنی نعمتیں دے دی ہیں، اس سے زیادہ کوئی دوسرا کیا دے دے گا؟ اس نکتے پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ نکاح تو علمائے دین سے پڑھوایا جاتا ہے مگر نزاع کی صورت میں مسلم مرد و خواتین ہندو عیسائی

اور سکھ وکلاء کے چیمبر اور سرکاری عدالتوں کا چکر کاٹنے لگتی ہیں۔ زلیخا بی اور نفیسہ حسین کیوں نہیں سوچتیں کہ ان کے نکاح پڑھانے والے عالم مفتی و قاضی تو ان کے دشمن ٹھہرے اور آر ایس ایس کا قاتل ٹولہ جس نے ان کی بہنوں اور ماؤں کی آبروریزی کی ان کا دوست کیسے ہوگیا۔

جن لوگوں نے نئے نئے ناموں سے پرسنل لابورڈ بنالیے ہیں ان سے ہم کہیں گے کہ وہ امریکی مسلمانوں سے سبق حاصل کریں اور دین و شریعت کے دشمنوں کو بتادیں کہ ہم الگ الگ ہوتے ہوئے بھی ایک ہیں۔

امریکی مسلمانوں سے سبق لینے کی ضرورت

امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد ۶ ملین ہے۔ وہاں ان کی چار بڑی تنظیمیں ہیں۔ ان چاروں تنظیموں کے سربراہوں پر مشتمل ''اسلامک شوریٰ کونسل آف نارتھ امریکہ'' (نارتھ امریکہ سے مراد امریکہ و کناڈا ہے) قائم ہے۔ اس کونسل کے فیصلوں میں اتفاق پایا جاتا ہے۔ اس کونسل نے Alert Network قائم کررکھا ہے۔ جب کسی اخبار یا ٹی وی میں اسلام یا مسلمانوں کے خلاف کوئی مواد شائع ہوتا ہے تو یہ نٹ ورک محض ۲۴ گھنٹوں میں اس کی اصلاح کروادیتا ہے مگر کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مسلمانوں کی تعداد ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۱۳ کروڑ ہے لیکن ۱۵ سے ۲۰ کروڑ بتائی جاتی ہے، اس طرح کی کوئی تنظیم نہیں ہے۔

امریکہ کی چار بڑی مسلم تنظیموں میں مکمل یکسانیت اور اتحاد ہے اور سربراہوں کی مشترکہ کونسل بھی قائم ہے مگر ہمارے ملک میں سوائے انتشار کے کچھ نہیں ہے۔ اس صورت حال پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔

مولانا منت اللہ رحمانی کی روح ہم سے سوال کرتی ہے کہ کیا ہم اسی طرح دست و گریبان رہیں گے یا اپنے بچاؤ کی، دین کے تحفظ کی اور اسلامی شریعت کو اپنے معاشرے میں نافذ کرنے کی کوئی منظم کوشش بھی کریں گے۔ اس سوال کا جواب ہمیں اپنے عمل سے دینا ہے اور جلد دینا ہے، اور اگر ہم نے اس سے پہلوتہی کی تو ہم خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماریں گے۔ فرقہ پرست جو ہندوستان میں نازی ازم کے نقیب ہیں، اب فساد پھیلانے کے بجائے نفاق پھیلانے میں لگے

ہوئے ہیں، وہ ہماری صفیں الٹ دینا چاہتے ہیں اس لیے ہمیں ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

راقم نے موضوع کو سامنے رکھ کر حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کے مزاج وانداز پر آپ کے سامنے جو گفتگو کی ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ ہم ان کی شخصیت وکردار کے روشن آفتاب سے کچھ کرنیں مانگ کر اندھیری راہوں میں بچھالیں جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔

جی چاہتا ہے ''رابط وضبط کا آئین نو مرتب ہو'' خفا ہونے اور روٹھنے کا سلسلہ موقوف ہو، کوئی تو ہو جو آکر ''تعمیر تازہ'' کی نوید سنائے۔ اب نہ شیخ الہند اور شیخ الاسلام آئیں گے نہ حکیم الاسلام اور حکیم الامت پیدا ہوں گے، نہ علامہ اقبال اور مجاہد ملت کی آمد ہوگی، نہ سید سلیمان ندوی اور مولانا علی میاں آئیں گے۔ نہ بریلوی مسلک کے پیشوا مولانا احمد رضا خاں تشریف لائیں گے نہ حالی واکبر پیدا ہوں گے۔ بلکہ ہمیں خود اپنے ماضی وحال پر نظر کرنی ہوگی اور لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا۔

صدر پرسنل لا بورڈ مولانا سید محمد رابع حسنی کے متوازن بیان نے فضا میں ہمواری اور اعتدال پیدا کیا ہے، انھوں نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ بورڈ اپنے طریقہ اور موقف سے نہیں ہٹا ہے، اس میں سبھی طبقات کی نمائندگی موجود ہے اور اب بھی دروازے کھلے ہوئے ہیں پھر دروازے کے باہر شور وغوغا کیسا۔

مسلمانو! صف بستہ ہو جاؤ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد نہ بناؤ، دیکھو وقت بڑا نازک ہے اور کل سے زیادہ نازک ہے، عراق ہو کہ ایران، فلسطین ہو کہ افغانستان ہر جگہ تم پیسے جا رہے ہو، یہ کیا بات ہے کہ دوسرے بھی تمھیں پیسیں اور تم خود بھی آپس میں ایک دوسرے کا گلا کاٹتے پھرو۔ ہمیں خود اپنے درد کا مداوا کرنا ہوگا۔ اگر ملت اسلامیہ ہندیہ نے حالات سے سبق لیا اور اپنی صفوں کو درست کرلیا تو مولانا منت اللہ رحمانی کے لیے یہ بہترین خراج عقیدت ہوگا اور ان کی خدمات کا اعتراف بھی۔ تب ہی ہم یگانہ کا یہ شعر پڑھتے ہوئے آگے بڑھ پائیں گے:

خضر منزل اپنا ہوں، اپنی راہ چلتا ہوں
میرے حال پر دنیا کیا سمجھ کے ہنستی ہے

⊙⊙⊙

انجینئر شاہ محمد صدیقی (ایڈووکیٹ)

مولانا منت اللہ رحمانی: مزاج و مذاق اور طریقۂ کار

''کون کہتا ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے؟ اسلام تو دراصل اخلاق سے پھیلا ہے''

یہ الفاظ تھے پروفیسر ڈاکٹر رام جی سنگھ، اس وقت کے ممبر پارلیامنٹ اور صدر شعبہ گاندھین تھاٹ (Gandhian Thought) بھاگل پور یونیورسٹی کے جو انھوں نے پندرہویں صدی ہجری کی آمد کے استقبال کے سلسلے میں جنوری ۱۹۸۰ء میں شہر مونگیر میں حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کی سرپرستی میں ادارہ پندرہویں صدی ہجری کمیٹی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے تین نشستوں پر مشتمل دو روزہ عظیم الشان اجلاس کی پہلی نشست میں اپنے خطبہ صدارت کے دوران جید علمائے کرام، دانشوران شہر، اعلیٰ حکام اور سامعین کے ہجوم سے بھرے ٹاؤن ہال کے میدان میں خطاب کرتے ہوئے بانگ دہل کہا تھا اور اپنے موقف کی دلیل میں مثالیں اور ثبوت بھی پیش کیے۔

یہ بات روز روشن کی طرح سچ ہے کہ اسلام میں فرائض خمسہ کے بعد سب سے زیادہ ترجیح اعلیٰ اخلاق کو دی گئی ہے، جس کی تعریف، توصیف، توثیق اور تاکید کے جملے قرآن کریم اور احادیث کے صفحات مقدسہ پر بکھرے پڑے ہیں، خود حضور اکرم ﷺ کی سیرت اعلیٰ اخلاق کا بے نظیر نمونہ ہے۔

اعلیٰ اخلاق کا انحصار کسی بھی شخص کے انفرادی مزاج اور اس کے کام کرنے کے انداز پر

ہوتا ہے۔ مزاج وانداز دراصل اخلاق کی بنیاد، کردار کا محور اور کامیابی کا زینہ ہیں۔

حضرت امیر شریعت کے مزاج میں ایک طرف عاجزی، انکساری، استقلال، صبر و تحمل اور رواداری کے عناصر بدرجہ اتم موجود تھے تو دوسری طرف خدمت خلق، فروغ دین اور حب الوطنی کا جذبہ ان کے بحر دل میں تا حیات موجزن رہا۔

دنیا کی ہر عظیم شخصیت کے پیچھے اس کی اپنی قابلیت اپنا مزاج اور کام کرنے کے اپنے انداز کا دخل ہوتا ہے۔ حضرت امیر شریعت کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ ہر معاملے کی خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، پہلے شناخت (Identification) کرتے تھے پھر اس کی پوری چھان بین (Examination) کر کے اس کی تہہ تک پہنچتے تھے اور پھر حالات کی روشنی میں اس کا تجزیہ (Analysis) کر کے اپنی رائے قائم کرتے تھے اور پھر اسی رائے کو بحال (Install) کرانے کے لیے بیبا کی کے ساتھ بے خوف وخطر کار بند ہو جاتے تھے۔

حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ ایک زمانہ ساز شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی علمی و دینی قابلیت اور خدمات کا اعتراف صرف صوبہ بہار واڑیسہ یا ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں کیا گیا۔ ان کی دانشوری، دور اندیشی اور رہبری کی صلاحیت (Quality of Leadership) نے ان کو اپنے ملک اور غیر ممالک کی اِنی گنی شخصیتوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ وہ بلاشبہ ایک جید عالم دین، ایک معروف و مقبول ترین رہبر اور ایک نباض زمانہ فلسفی تھے۔

حضرت امیر شریعت ہر کام میں مشورہ کو مقدم رکھتے تھے۔ حالاں کہ خود ان کی ذاتِ گرامی علم کا سرچشمہ اور تجربات کا مخزن تھی لیکن پھر بھی وہ ہر معاملے میں لوگوں سے مشورہ کر لیا کرتے تھے۔ مشورہ میں بعض اوقات وہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کو بھی موقع دیتے تھے۔ ان کی باتوں کو سنتے تھے۔ اور اگر کوئی کام کی بات نکل آتی تو اس کو پوری اہمیت دیتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ ذی علم اور عام لوگوں میں یکساں طور پر مقبول تھے۔ ہر آدمی سمجھتا تھا کہ وہ حضرتؒ کے سب سے زیادہ قریب ہے۔ حسن اتفاق سے خاکسار کو بھی حضرتؒ کی شفقت کا شرف حاصل رہا ہے۔ مجھے

یاد ہے کہ ایک دفعہ جاڑے کی سرد رات میں صبح کی اذان سے قبل ایک آدمی کو میرے گھر بھیج کر مجھے بلوایا۔ جامعہ رحمانی سے متعلق ایک اہم معاملے میں مجھ سے میری رائے دریافت کی، میں حیران رہ گیا۔ کہاں حضرت کی مدبرانہ شخصیت، اور کہاں میری رائے؟ میری جھجک کو بھانپتے ہوئے انھوں نے میرے کاندھے پر اپنا دست مبارک رکھتے ہوئے دوبارہ میری رائے طلب کی۔ میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اللہ کا فضل تھا کہ حضرتؒ مسکرائے اور فرمایا ''میرا بھی یہی خیال تھا۔''

حضرت امیر شریعت چھوٹے سے چھوٹے کام کو بھی مناسب اہمیت دیتے تھے، کام کرنے اور صلاحیت رکھنے والے لوگوں کی پوری پوری حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ذرے کو آفتاب بنانے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ ایک واقعہ یاد آتا ہے، خانقاہ رحمانی کے احاطے میں ایک پرائمری اسکول چلتا ہے، جامعہ اور اسکول میں لمبی تعطیل تھی۔ اسی درمیان ضلعی وظیفہ (District Merit Scholarship) کے امتحان کی نوٹس آئی۔ امتحان چار دنوں بعد ہونا تھا۔ ایک طالب علم کافی ذہین تھا، اس امتحان میں اس کے کامیاب ہونے کی پوری امید تھی۔ اس بات کا پتہ حضرت کو تھا۔ لیکن وہ لڑکا چھٹی پر اپنے گھر پورنیہ گیا ہوا تھا۔ حضرت نے نوٹس دیکھنے کے فوراً بعد ایک شخص کو بلایا اور ڈیڑھ سو روپے اس کے حوالے کیے اور اس لڑکے کو پورنیہ جا کر لانے کا حکم دیا۔ میں حیران تھا کہ اگر اس لڑکے کو وظیفہ مل بھی گیا تو سال بھر میں صرف چھیانوے روپے ملیں گے جب کہ حضرت نے ڈیڑھ سو روپے خرچ کر دیے۔ میں نے اپنی بات حضرت سے کہی۔ حضرت نے مسکراتے ہوئے فرمایا ''روپے بڑی چیز نہیں ہیں۔ اگر یہ لڑکا کامیاب ہو گیا تو اس کا حوصلہ بڑھے گا۔ علم حاصل کرنے کی طرف اس کے قدم بڑھیں گے اور کون جانے کل وہ ایک کامیاب عالم دین، ڈاکٹر، انجینئر یا ریسرچ اسکالر بن جائے؟''

حوصلہ بڑھانے کی بات پر مجھے اپنا ہی ایک واقعہ یاد آ گیا۔ حضرت مولانا محمد ولی رحمانی صاحب دامت برکاتہم، سجادہ نشیں خانقاہ رحمانی کویت کے سفر سے واپس لوٹ رہے تھے۔ اساتذہ اور طلبہ جامعہ رحمانی نے اُن کے اعزاز میں ایک شاندار استقبالیہ اجلاس کا اہتمام جامعہ

کے احاطے میں کیا تھا۔ اس جلسے میں شہر کے دانشوروں اور اعلیٰ حکام کے علاوہ پٹنہ اور دیگر جگہوں سے علمائے کرام اور صحافی حضرات بھی شرکت کی غرض سے تشریف فرما تھے۔ جلسہ دو بجے دن میں شروع ہونا تھا، تقریباً بارہ بجے حضرت نے مجھے بلایا اور فرمایا ''نظامت تم کو کرنی ہے'' میں نے سمجھا شاید وہ یوں ہی کہہ رہے تھے کیوں کہ اس کے پہلے کسی جلسے کی نظامت تو کیا میں لاؤڈ اسپیکر پر کبھی بولا بھی نہیں تھا۔ میں مسکرایا اور دیگر لوگوں کے ساتھ بیٹھا رہا۔ دس پندرہ منٹ بعد حضرت نے پھر فرمایا ''تم ابھی تک گئے نہیں؟''

''میں ...اور نظامت؟'' میں نے گھبرائی سی آواز میں کہا ''پٹنہ سے تو فلاں صاحب آئے ہیں بہتر ہوتا...''

''کیا میں اُن کو نہیں جانتا؟'' حضرت نے تھوڑی تلخی کے ساتھ سوال کیا۔ پھر مسکرائے اور پوچھا ''خوف لگتا ہے؟''

''جی!'' میں نے جواب دیا۔

''نظامت تم کو ہی کرنی ہے...میں دعا کروں گا'' حضرت نے فرمایا۔

بہر حال حضرت کا حکم بجالانا پڑا، نظامت میں نے کی۔ اللہ کے کرم اور حضرت کی دعا سے وہ جلسہ اور میری نظامت دونوں ہی بے حد کامیاب رہی اور اب جلسوں میں خطابت اور مشاعروں کی نظامت میرا مشغلہ بن گیا ہے۔ گونگے کو زبان مل گئی۔ شاعر نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

حضرت امیر شریعت اپنے مخالفین سے کبھی ناراض یا ناامید نہیں ہوتے تھے۔ ہمیشہ ان کو بھی ساتھ لے کر چلنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے کسی مخالف سے کبھی انتقام لینے کی نہیں سوچی بلکہ ان کو اپنی تحریک میں ان کی قابلیت کے مطابق ذمے داری سونپ کر اُن کی ہمت افزائی فرماتے، اُن کا حوصلہ بڑھاتے اور ان کے دل سے بغض دور کرنے کی ہر ممکن سعی کرتے تھے۔

حضرت مولانا نظم وضبط (Discipline) کے بڑے پابند تھے اور یہی وجہ تھی کہ خانقاہ

ہیں، دفتر مسلم پرسنل لا بورڈ میں جامعہ رحمانی میں اور امارت شرعیہ میں ہر کام نظم وضبط کی پابندی کے ساتھ ہوا کرتا تھا، جس کی وجہ سے یہ ادارے دن دونی رات چوگنی ترقی کرتے رہے۔ دوسرے اداروں میں حضرت کے ان اداروں کے نظم وضبط کی مثال دی جاتی ہے۔

حضرت امیر شریعتؒ کو بلا کی قوتِ ارتکاز (Power of Concentration) حاصل تھی جس کا نمونہ خطوں کے جواب لکھواتے وقت نظر آتا تھا۔ حضرتؒ ایک ساتھ سات آٹھ خطوط کا جواب لکھواتے۔ سات آٹھ کاتبوں کو الگ الگ جگہ، الگ لوگوں کے الگ الگ موضوع پر آئے خطوط کا جواب ایک ساتھ لکھواتے لیکن کیا مجال کہ ایک جملہ موضوع سے ہٹ جائے یا ایک لفظ نامناسب یا ناہموار ہو؟ یہ حضرت کے ساتھ اللہ کی بڑی دین تھی۔

حضرت امیر شریعتؒ ایک بیدار مغز قائد، ایک نڈر رہنما اور ایک قابل قدر معمارِ ملک و ملت تھے۔ انھوں نے ملک کی جنگ آزادی میں ایک جاں باز کمانڈر کی طرح حصہ لیا۔ آپ نے ساتھ ہی ساتھ خانقاہ رحمانی کی آب یاری بھی کی۔ حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کا قائم کردہ یہ دینی اور روحانی مرکز جو ایک پودے کی شکل میں تھا، حضرت امیر شریعت کی توجہ سے ایک تناور درخت میں تبدیل ہو گیا، جس کی جڑیں اور شاخیں ملک بھر میں دور دور تک پھیل گئیں۔ آزادی کے بعد آپ نے جامعہ رحمانی پر خصوصی توجہ دی۔ آزادی سے پہلے جامعہ رحمانی ایک چھوٹے سے عام مدرسے کی شکل میں تھا۔ حضرتؒ کی کاوش نے اس کو آج کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آج جامعہ رحمانی کا شمار ملک کے چند مدارس اسلامیہ میں کیا جاتا ہے۔ اس کی حیثیت ایک یونیورسٹی کی ہے۔ یہاں بیرون ممالک سے بھی طلباء علم دین حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں۔ آج اس منبع علم وعرفاں کے فارغین ہزاروں علماء وحفاظ کرام ملک و بیرون ملک میں علم دین کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔ حضرتؒ جب امارت شرعیہ کے سربراہ ہوئے تو امارت کا نقشہ ہی بدل گیا۔ امارت کے ایک چھوٹے سے مکان کی جگہ اب ایک عالیشان ''امارت کمپلیکس'' پھلواری شریف (پٹنہ) میں درخشاں ہے جس کے احاطے میں امارت کا جدید طرز کے دفاتر کے علاوہ ماڈرن اسٹائل کا اسپتال، ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ اور الیکٹرانک سینٹر ان کے خواب کی تعبیریں

ہیں، جورات دن خدمت خلق میں مصروف ہیں۔

خانقاہ رحمانی، جامعہ رحمانی اور امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے علاوہ حضرتؒ کا تعلق آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ سے بھی تھا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ پرسنل لا بورڈ کا قیام حضرتؒ ہی کی فکر کا نتیجہ ہے۔ حضرتؒ بورڈ کے بانی جنرل سکریٹری تھے۔ انھوں نے بورڈ کے تحت ملک کے تمام علماء کرام و مسلم دانشوروں کو ایک پلیٹ فارم پر لاکر جمع کر دیا اور بورڈ کی کارکردگی کو اس قدر موثر بنایا کہ بہت قلیل مدت میں بورڈ ملک بھر میں ملت اسلامیہ کا سب سے اہم ستون بن گیا۔

مذکورہ چاروں اداروں کا تدریجی جائزہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ حضرت امیر شریعت ایک غیر معمولی تنظیمی صلاحیت رکھتے تھے اور وقت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے مناسب اور فعال طریقہ کار اختیار کرتے تھے اور اس پر پوری تختی سے کار بند ہوتے تھے اور لوگوں کا اعتماد حاصل کرتے تھے۔ اور یہی اعتماد ان اداروں کی تحریکوں کی کامیابی کا ضامن ہوا کرتا تھا۔ منصوبہ بندی کے ساتھ عمل پیرا ہونا اُن کے طریق کار کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو تھا۔ وہ جس کام کو شروع کرتے تھے اس کو تکمیل کے مرحلے تک پہنچا کر ہی دم لیتے تھے۔

حضرت امیر شریعتؒ نے دین کے معاملے میں کسی قسم کا سمجھوتہ کبھی برداشت نہیں کیا۔ اس کا ثبوت ۱۹۷۴ء کے ایمرجنسی کے دوران ملتا ہے۔ ملک میں ایمرجنسی نافذ کی گئی تو خاندانی منصوبہ بندی کا پرچار شدت سے کیا جانے لگا۔ علمائے کرام پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ قرآن واحادیث کا حوالہ دیتے ہوئے خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں فتاویٰ جاری کریں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس زمانے میں ملک کے مایۂ ناز علمائے کرام کے بھی قدم لڑکھڑا گئے اور خاموشی میں ہی عافیت سمجھی گئی، بعضوں نے حمایت میں فتوے بھی دیے۔ لیکن اس پرآشوب دور میں بھی مجاہد ملت حضرت امیر شریعتؒ ایک چٹان کی طرح ثابت قدم رہے اور ایک کتابچہ ''خاندانی منصوبہ بندی'' کے نام سے اردو ہندی اور انگریزی میں شائع کروا کے ملک کے طول وعرض میں تقسیم کرایا۔ اس کتابچہ میں خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف بیباکانہ طور پرآواز بلند کی گئی۔ سرکار نے اس کتاب

کی اشاعت کے بعد حضرتؒ سے پوچھ تاچھ بھی کی لیکن آپ بلاخوف وخطرحق کی آواز بلند کرتے رہے۔

حضرت امیر شریعت ایک دردمند دل رکھتے تھے۔اُن کے لیے قوم کا درد ان کے اپنے درد سے کہیں زیادہ اہم ہوا کرتا تھا۔۱۹۸۹ء کے بھاگلپور اور مونگیر کے فرقہ وارانہ فسادات کے بعد اجڑے ہوئے لوگوں کی آبادکاری اور تقسیم ریلیف کے سلسلے میں دن دن بھر کئی کئی دنوں تک بلکہ ہفتوں اور مہینوں تک سفر کرتے رہے اور آخرکار امارت شرعیہ کی تحویل سے کروڑوں کی رقم خرچ کرکے بھاگلپور کے دیہی علاقوں اور جھاجھا وغیرہ میں مخصوص منصوبے کے تحت سینکڑوں خانماں برباد مسلمانوں کی آبادکاری کے کام کو تکمیل کے مرحلے تک پہنچایا۔فساد میں مہلوکین کے رشتہ داروں کو ایک ایک لاکھ روپے کی رقم سرکار سے دلوائی۔

مونگیر کے ۱۹۸۸ء کے زلزلے سے متاثر ہونے والے ۲۵ مساجد کی مرمت اور کچھ کی ازسرنو تعمیر کے لیے انھوں نے مرکزی تعمیر مساجد کمیٹی کی تشکیل کی،جس کے صدر حضرت مولانا محمد ولی رحمانی مدظلہ منتخب ہوئے۔اس کمیٹی کے تمام مساجد کا انجینئروں کے ذریعے سروے کرایا اور پھر رپورٹ کے تحت ان کی مرمت یا ازسرنو تعمیر کی گئی۔

آپ بیشتر مسجدوں میں خود تشریف لے گئے۔وصال سے صرف دو دن پہلے ان کو چک ہاشم کی مسجد کے افتتاح کے سلسلے میں تشریف لے جانا تھا۔چار بجے دن کا وقت مقرر تھا۔میں حاضر ہوا۔حضرت مہمانوں سے مل رہے تھے۔حضرتؒ کو جوں ہی میری آمد کی خبر ملی انھوں نے مہمانوں سے ملنا بند کردیا اور کپڑے بدل کر تیار ہوگئے،مجھے اندر بلوایا۔

''مجھ کو ایک سو دو ڈگری بخار ہے۔ناک میں بھی کافی درد ہے۔کیا ایسی حالت میں مجھے جانا چاہیے؟'' انھوں نے اپنا داہنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے قدرے نقاہت کے ساتھ کہا۔میں نے ہاتھ چھوا،کافی گرم تھا،چہرے پر بھی علالت کا نمایاں اثر تھا۔

''میرا خیال ہے کہ آپ تشریف نہ لے جائیں۔'' میں نے کہا

''لیکن میں نے وعدہ کیا ہے۔'' حضرت نے فرمایا۔

''آپ کا جانا'' اس حال میں'' مناسب نہیں'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے ... آپ اور مولانا محمد علاء الدین صاحب ندوی چلے جائیں اور تمام مقتدیوں سے میرا اسلام کہہ دیں اور یہ بھی کہیں کہ اگر زندگی رہی تو منت اللہ جلد ہی حاضر ہوگا۔''

کون جانتا تھا کہ دین کا یہ سنگی ستون، حکیم وقت، قائد ملت، محسن ملک، معمار قوم، مصلح معاشرہ، منبع علم و عرفان صرف دو دنوں بعد ہمیں اپنے منفعت بخش سائے سے محروم کر دے گا؟ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

اللہ تعالیٰ حضرت امیر شریعتؒ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور جنت میں ان کے مدارج کو بلند فرمائے۔ (آمین)

مولانا غیاث الاسلام رحمانی ☆

حضرت امیر شریعتؒ
کچھ یادیں ـــ کچھ باتیں

علم وعمل، فکر ونظر، زہد وورع، جرأت وعزیمت اور جہد مسلسل کا نام ہے۔ حضرت امیر شریعت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ناموراور مشہور لوگوں سے جتنی قربت بڑھتی ہے اتنی ہی ان کی کشش کم ہوتی جاتی ہے، لیکن حضرت امیر شریعتؒ کا معاملہ بالکل الگ تھا، ان سے جتنی قربت بڑھتی اتنی ہی عقیدت میں اضافہ ہوتا جاتا، یہ ان کی عظمت، للّٰہیت اور اخلاص کی بڑی نشانی تھی۔

حضرت امیر شریعتؒ سے احقر کا کم وبیش دس سالہ شاگردانہ اور نیازمندانہ تعلق رہا ہے اور حضرتؒ کو بہت قریب سے دیکھنے اور خدمت میں رہنے کی سعادت حاصل رہی ہے۔

حضرت کی عظیم شخصیت ہمہ جہت تھی، جامعہ رحمانی، خانقاہ رحمانی، امارت شرعیہ اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود، حضرتؒ جامعہ کے طلبا کا بڑا خیال رکھتے تھے، ان کی اخلاقی، ذہنی اور فکری تربیت کا خاص اہتمام فرماتے تھے۔ تربیت کا انداز بڑا پیارا ہوتا تھا، جو کچھ سمجھاتے تھے وہ ذہنوں پر نقش اور دلوں میں پیوست ہوجاتا تھا۔

ایک دفعہ میں فجر کی نماز پڑھ کر باہر نکلا ہی تھا کہ آواز آئی، مولوی غیاث! ادھر آیئے،

☆ کوآرڈی نیٹر میسکو حیدرآباد (آندھراپردیش)

یہ حضرتؒ کی بارعب مگر پر شفقت آواز تھی۔ جامعہ رحمانی میں یہ طریقہ ہے کہ فجر کی نماز کے بعد اساتذۂ کرام اور طلبا تھوڑی دیر تلاوت قرآن کرتے ہیں، پھر دعا ہوتی ہے۔ اس دن میں تلاوت قرآن کے بغیر مسجد سے نکل آیا تھا، حضرتؒ کی طلبی پر کچھ گھبراہٹ بھی ہو رہی تھی، سوال ہوا، آپ نے آج تلاوت نہیں کی؟ میں خاموش رہا، پھر حضرتؒ نے بڑے خاص انداز میں فرمایا: ''میرے عزیز قرآن پڑھا کیجیے، قرآن سے رشتہ جوڑیے، یہی اصل ہے اور اسی میں کامیابی ہے۔'' حضرتؒ کی ایک ایک بات میرے وجود میں سما گئی، آج میں حیدرآباد کے ایک باوقار اور ممتاز ادارہ ''میسکو'' میں مصروف بکار ہوں، اور ہدف یہ ہے کہ امت کے نونہال (خاص طور پر انگلش میڈیم اسکولوں میں زیر تعلیم) قرآن کی زبان کو جانیں اور سمجھ کر تلاوت کرنے والے بنیں، آج جب میں سوچتا ہوں تو بے ساختہ حضرتؒ کی مؤثر اور مقبول نصیحت یاد آتی ہے۔

دورۂ حدیث میں ہماری جماعت کو یہ سعادت حاصل تھی کہ مؤطا امام مالکؒ کا درس حضرت دیا کرتے تھے، فرماتے تھے کہ: ''آپ طلبا کو سمجھنا چاہیے کہ آپ حدیث رسول اللہ ﷺ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، ادب واحترام کے ساتھ پڑھئے، اور حدیث میں جو پیغام ہے، جو نصیحت ہے، اس کو قبول کیجیے، روح حدیث پر نظر ہونی چاہیے۔'' حضرتؒ کے ان ارشادات میں بڑی گہری معنویت تھی، عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ ''حدیث'' کو ''فقہ'' کی زبان میں پڑھایا جاتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذہن، فقہی مسائل اور اس کی باریکیوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور حدیث کی جو تاثیر اور افادیت ہوتی ہے اس سے پڑھنے والا محروم رہ جاتا ہے۔

حضرتؒ ہمیشہ طلبا کی حوصلہ افزائی فرمایا کرتے تھے اور زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرتے رہنے کی ترغیب دیا کرتے تھے، اور اس بات سے بھی متفق نہیں تھے کہ صرف انھی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے جو اپنے افکار کے مطابق ہوں، حضرتؒ کا احساس یہ تھا کہ اگر یہ ڈر ہو کہ دوسرے مسالک وافکار کی کتابیں پڑھنے سے اپنا مسلک یا نظریہ بدل جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنا مسلک یا نظریہ کمزور ہے۔ پھر تو اس کو بدل ہی جانا چاہیے، دراصل حضرتؒ کا خیال یہ تھا کہ اپنے مسلک اور نظریہ کی بنیاد ٹھوس اور مضبوط ہو تا کہ کوئی دوسرا نظریہ نہ اس کو ہلا سکے اور نہ بہا کر لے

جا سکے۔

حضرت امیر شریعتؒ ہر ایک کی بات پوری توجہ کے ساتھ سنتے تھے، بات کرنے والا چاہے بڑا ہو یا چھوٹا۔ پھر مناسب جواب دیا کرتے تھے، جامعہ رحمانی کے سالانہ اختتامی جلسہ میں دورہ حدیث کے طلبا کو اپنے تاثرات بیان کرنے کا موقع دیا جاتا ہے، گزرے ہوئے دنوں کے تاثرات کو میں نے قلم بند کر لیا تھا، جس میں خوش گوار احساسات بھی تھے اور تلخ یادیں بھی، ان میں سے بعض باتوں کا تعلق انتظامیہ سے بھی تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت امیر شریعتؒ مسند صدارت پر جلوہ افروز تھے، جب میں نے اپنے تاثرات بیان کرنا شروع کیے تو ''ارباب انتظام'' کے چہرے شکن آلود ہو گئے، مگر حضرت امیر شریعتؒ نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ سماعت فرمائے، اور پھر اپنے خطاب میں تعریف و توصیف کرتے ہوئے فرمایا۔ عزم و حوصلہ اور ہمت و جرأت بڑی اچھی بات ہے، اظہار رائے کی آزادی ہونی چاہیے اور فرمایا: آپ عزیز نے جن باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے، ان کا خیال رکھا جائے گا۔

حضرتؒ نے ''جامعہ رحمانی'' کو خون دل سے سینچا تھا، ایک خطاب میں آپ نے فرمایا تھا ''جامعہ رحمانی میرا سب سے قیمتی اثاثہ ہے، کل قیامت میں اللہ تعالیٰ اگر مجھ سے پوچھے کہ ''کیا اعمال لے کر آئے ہو؟ تو میں بصد ادب عرض کروں گا کہ ''جامعہ رحمانی'' میرا عمل ہے، اور یہی لے کر حاضر خدمت ہوا ہوں۔'' حضرتؒ کی زندگی جہد مسلسل سے عبارت تھی، ہم ناچیزوں سے فرمایا کرتے تھے ''کام کرتے رہیے، کام ہی انعام ہے۔'' ۱۹۷۳ میں تمام مذہبی جماعتوں کے نمائندوں، علما اور ارباب فکر و نظر نے آپ کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا جنرل سکریٹری منتخب کیا تھا۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کے محرک اول آپ تھے، اور یہ بات میں پورے اعتماد و یقین کے ساتھ لکھ رہا ہوں، میں ان دنوں ''جامعہ رحمانی'' میں تدریسی خدمات انجام دیا کرتا تھا، ماہنامہ صحیفہ کی بھی ذمے داری تھی، خالی اوقات میں اکثر و بیشتر حضرت امیر شریعتؒ کی خدمت میں رہتا تھا، حضرت خطوط کے جوابات لکھواتے، دوسرے کئی حضرات کی طرح میں بھی خطوں کے

جوابات اور اہم تحریریں لکھا کرتا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کا معاملہ اور مسئلہ کچھ اس طرح اٹھا تھا کہ ممبئی کے اخبارات میں بعض نمائشی مسلمانوں کے تبصرے شائع ہوئے جو اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف تھے اور ممبئی کی عدالت نے بعض ایسے فیصلے دیے جو براہ راست مسلم پرسنل لا میں مداخلت تھے، پھر یہ بحث کلکتہ کے اخبارات تک منتقل ہوگئی۔ ''آزاد ہند'' نے اپنے نوٹ کے ساتھ ان خبروں کو شائع کیا، میں نے خاص طور پر حضرت کی توجہ اس خبر کی طرف مبذول کرائی، اخبار پڑھ کر حضرتؒ بہت دیر تک خاموش اور متفکر رہے، پھر آپ نے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند (اس وقت قاری صاحب قدس سرہ باحیات تھے) کے نام طویل خط لکھوایا، جس میں ہوا کا رخ دیکھتے ہوئے خواہش کی گئی تھی کہ دارالعلوم دیوبند سے اور آپ کی سرپرستی میں ایک ایسی تحریک اٹھنی چاہیے، جس کا مقصد مسلم پرسنل لا کا تحفظ ہو۔

حضرت قاری صاحب کا جواب جلد ہی آگیا تھا، جس میں آپ نے اپنی پسندیدگی اور خوشی کا اظہار فرمایا تھا کہ: میں اس عمر میں اس عظیم کام کو بہ حسن وخوبی انجام نہیں دے سکتا ہوں اور دارالعلوم میں اس طرز کی خدمت کا مزاج نہیں ہے۔ آپ کو میری طرف سے اختیار ہے آپ جس کام کو جس طرح مناسب سمجھتے ہیں انجام دیں۔

حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ کو بھرپور اندازہ تھا کہ یہ کام جس قدر اہم ہے اسی قدر مشکل بھی۔ مختلف مسالک اور افکار کے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لیے وہ کوئی عظیم مرکز چاہتے تھے۔ حضرت نے اجازت کے بعد حضرت قاری صاحب قدس سرہ کی طرف سے ایک تفصیلی مراسلہ امت کے علما، اکابرین اور دانشوروں کے نام لکھوایا اور میں نے اس مراسلہ کو اسٹینسل پیپر پر لکھ کر سائیکلو اسٹائل پر چھاپا، اور مونگیر سے وہ مراسلہ پوسٹ کیا گیا۔

اس طرح یہ طے پایا کہ دارالعلوم دیوبند میں ایک اجتماع اس مقصد کے لیے منعقد ہو۔ ملک کے گوشہ گوشہ سے اس کی تائید ہوئی، پہلا منتخب اجتماع دیوبند میں ہوا، پھر عظیم الشان کنونشن

ممبئی میں منعقد ہوا۔ ''مسلم پرسنل لا بورڈ'' کا قیام عمل میں آیا، تمام ذمہ داروں کا انتخاب ہوا اور حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ جنرل سکریٹری منتخب ہوئے اور تاحیات رہے۔ اس پلیٹ فارم سے بھی آپ نے امت کی بڑی خدمت انجام دی، اور طویل عرصہ تک اس ادارہ کے اخراجات کو اپنے جیب خاص سے ادا کرتے رہے، جاننے والے اس کو بہ خوبی جانتے اور سراہتے ہیں۔

آپ کی جرأت و بیباکی، قوتِ فیصلہ، ذہن رسا اور طریقۂ کار کے شعور و سلیقہ نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں، قانون تبنیت ہو یا یونیفارم سول کوڈ، شاہ بانو کا مقدمہ ہو یا قانون نفقۂ مطلقہ، ہر معاملہ کو بورڈ کے تمام ارکان کو ساتھ لے کر اور سب کے مکمل تعاون سے آپ نے جس طرح انجام دیا وہ ایک تاریخی کارنامہ ہے۔

حضرتؒ باتوں اور وعدوں پر نہیں بلکہ عمل اور خدمات پر یقین رکھتے تھے، وہ ہمیشہ امتِ مسلمہ کی خدمت کے لیے کمربستہ اور سرگرم عمل رہے اور نام و نمود سے دور۔ حضرت باصلاحیت، ذہین، سرگرم عمل عالم دین ہی نہیں بلکہ ایک صاحب دل بزرگ بھی تھے۔ آپ کے دست حق پرست پر لاکھوں افراد نے بیعت کی، اور توبہ و استغفار کے ذریعے اپنی عاقبت درست کی۔ آپ بڑے خدا ترس، عبادت اور تہجد گزار بزرگ تھے۔ آخری چار سالوں میں رقت قلب کا یہ عالم تھا کہ قرآن سنتے یا پڑھتے تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ اپنے ملنے جلنے والوں سے کہا کرتے۔ دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ خاتمہ بالخیر کرے۔ یقیناً یہ دعائیں قبول ہوگئی ہوں گی۔ ماہِ رمضان المبارک اور تراویح کی نماز پڑھنے کے عالم میں اس دارِ فانی سے کوچ کرنا، مولانا کی سعادت اور نیک انجامی کی واضح علامت ہے، حضرتؒ کی زندگی اس طرح مختلف الجہات تھی کہ اس کا احاطہ اس مختصر سے مضمون میں مشکل ہے، آپ کے عظیم کارنامے امت مسلمہ کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

مولانا محمد سعید الرحمٰن شمس ☆

حضرت امیر شریعتؒ کی عزیز نوازی
گاؤں سے سرینگر تک کے تجربات

بیسویں صدی عیسوی میں جن نابغۂ روزگار اور عظیم ہستیوں نے جلوہ گہ ہند کو رونق بخشی اور انتہائی مخدوش حالات میں دین اسلام، شریعت اسلامی اور ملت اسلامیہ ہندیہ کے دفاع کا فریضہ پوری ایمانی قوت، جرأت، ہمت اور عزم و استقلال کے ساتھ انجام دیا ان میں ایک نمایاں اور ممتاز نام مخدوم و محترم حضرت امیر شریعت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کا ہے:

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میری نطق نے بوسے میری زباں کے لیے

واقعہ یہ ہے اور اس سے کوئی ذی شعور انکار نہیں کرسکتا کہ دور حاضر میں ہندوستانی مسلمانوں کو جن چیلنجز اور مسائل کا سامنا ہے ان میں بلاشبہ اسلامی شریعت کا تعارف و ترویج، مسلم عائلی قوانین اور اسلامی اقدار و ثقافت کا تحفظ ملت اسلامیہ کے اہم اور بنیادی مسائل ہیں۔

حضرت امیر شریعتؒ نے مذکورہ مسائل کے حل کے لیے جو گراں قدر اور تاریخ ساز خدمات انجام دی ہیں وہ ہماری دینی و ملی تاریخ کا ایک درخشندہ باب ہے۔

☆ مدیر: ''نصرۃ الاسلام'' جموں و کشمیر

حضرت امیر شریعتؒ حقیقی معنوں میں شریعت کے امیر تھے، ایک ہمہ جہت اور بھرپور شخصیت کے حامل قائد تھے، جن کی ملت کے تمام چھوٹے بڑے مسائل اور معاملات پر بڑی گہری اور دوررس نظر تھی۔ وہ بیک وقت ایک قدآور دینی وملی رہنما، ایک جید اور مقتدر عالم دین، ایک فعال ومتحرک شخصیت اور نباض فطرت انسان تھے۔ انھوں نے پوری جرأت اور دیانت کے ساتھ داخلی وخارجی رکاوٹوں اور دشواریوں کے باوجود اپنے منصبی فرائض پوری تندہی اور بیدار مغزی کے ساتھ انجام دیے۔

میرے مقالے کا عنوان روایتی انداز سے بالکل ہٹ کر اور اچھوتا ہے اور جب اس عنوان پر میں کچھ روشنی ڈالنا چاہتا ہوں تو خیالات اور تاثرات کا ایک ہجوم ہے اور میں حیران ہوں کہ بات شروع کروں تو کہاں سے؟ والد صاحبؒ کی بات یاد آتی ہے کہ راقم آثم کا نام حضرت امیر شریعت ہی کا تجویز کردہ ہے، بچپن سے ہی اگرچہ امیر شریعت کی خصوصی توجہ رہی لیکن اپنی حرماں نصیبی اور کم ظرفی کہ جو زمانہ سیکھنے اور سمجھنے کا تھا ضائع کیا اور اب اس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں ہے۔

امیر شریعتؒ کو ہوش وخرد سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے قریب سے اپنے علاقہ کی معروف مرکزی درس گاہ مدرسہ احمدیہ کاشی باڑی کے عظیم الشان سالانہ جلسہ دستار بندی کی مبارک تقریب میں دیکھا، اس وقت میری عمر بمشکل تیرہ چودہ سال تھی۔ اپنے گھر کے مدرسہ امیر الاسلام گوتی میں استاذ مربی حضرت مولانا محمد ذاکر حسین صاحبؒ دربھنگوی کی نگرانی میں زیر تعلیم تھا۔ اسی عمر میں نعت خوانی اور شعر وشاعری سے خاصی دلچسپی ہو چلی تھی اور الحمد للہ آواز بھی موزوں اور مناسب تھی۔ مدرسہ احمدیہ کاشی باڑی کے جلسہ عام میں صدر المدرسین استاذ الاساتذہ حضرت اقدس مولانا محمد عزیز الرحمٰن صاحبؒ (خلیفہ مجاز شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ) نے حضرت امیر شریعت، مولانا سید اسعد مدنی، مولانا محمد تسلیم رحمانی (نائب ناظم جامعہ رحمانی مونگیر) اور دیگر مدعو علماء کی شان میں ایک زوردار استقبالیہ نظم کہی تھی، حضرت کی استقبالیہ نظم احقر کو ہزاروں کے مجمع میں ترنم کے ساتھ پڑھنے کا موقع ملا۔ سامعین اور حاضرین سے تو داد ملی

ہی۔ حضرت امیر شریعتؒ اور اسٹیج پر ذمے دار علماء نے بھی خاصی حوصلہ افزائی فرمائی۔ حافظہ میں ابتدائی بعض اشعار محفوظ ہیں۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

ہے مژدہ حضرت منت یہاں تشریف لائے ہیں
شریعت کے امیر کارواں تشریف لائے ہیں
حسینی علم کے حامل، دعا سجادؒ کے دل کی
علی کے لال، فخر خانداں تشریف لائے ہیں
زباں سے کوثر و تسنیم کے چشمے ابلتے ہیں
طریق حق دکھاتے ہیں، جہاں تشریف لائے ہیں
خلف نازاں ہے جن کے عزم و ہمت، سرفروشی پر
سنانے کو سلف کی داستاں تشریف لائے ہیں

حضرت امیر شریعتؒ ملک کے سینکڑوں چھوٹے بڑے تعلیمی، ملی، سماجی اور اصلاحی اداروں اور انجمنوں کے بنیادی رکن اور سرپرست ہونے کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کی سب سے اہم اور بااختیار کمیٹی یعنی مجلس شوریٰ کے اہم ترین رکن تھے اور دارالعلوم کے جملہ تعلیمی اور انتظامی امور و معاملات میں آپ کی صائب رائے اور مشورے کو زبردست قوت اور اہمیت حاصل تھی۔ ۱۹۷۸ء میں راقم اپنی شدید خواہش اور والد مرحوم کی ایماء و اجازت (کہ ان کے اور لڑکے جدید اعلیٰ تعلیم سے آراستہ تھے لیکن وہ مجھے خصوصیت سے دینی تعلیم دلوانا چاہتے تھے) اور خاندان کے دیگر اکابر اور بزرگوں سے مشورہ کے بعد دارالعلوم دیوبند کا سفر کیا۔ دارالعلوم کے مبلغ اعلیٰ حضرت مولانا سید ارشاد صاحب کے علاوہ حضرت مولانا سید اسعد مدنی سے سابقہ تعارف کے سبب مراسلت اور مکاتبت بھی تھی اور ان حضرات کی بھی خواہش تھی کہ راقم دیوبند آئے۔ دیوبند آگیا مگر یہاں سخت امتحانی ضابطوں، محدود داخلوں اور بعض جدید قوانین کے تحت داخلہ میں دشواریاں ہونے لگیں۔ خوش قسمتی سے انھی دنوں شوریٰ کا اجلاس چل رہا تھا اور دیگر ممبران سمیت حضرت

امیر شریعت بھی اجلاس میں شرکت کے لیے تشریف لا چکے تھے، مجھے اچانک خبر مل گئی اور قیام گاہ مہمان خانہ میں حاضر ہوا۔ اگر چہ اساتذہ اور طلبہ کی خاصی بھیڑ تھی لیکن حضرت امیر شریعتؒ کی نظر جوں ہی پڑی پہچان گئے۔ حیران ہوئے اور اپنے پاس بٹھایا۔ احقر نے دارالعلوم آنے کی غرض و غایت اور داخلے میں حائل مشکلات عرض کیں۔ امیر شریعت کے پہلو میں حضرت مولانا ارشاد احمد صاحب کے علاوہ دارالعلوم کے قدیم و ممتاز استاذ حضرت مولانا محمد حسین صاحب بہاریؒ بھی تشریف فرما تھے، مولانا ارشاد صاحبؒ نے میری پرزور وکالت اور حمایت کی۔ امیر شریعتؒ نے اسی وقت مولانا بہاری کو میرے داخلے کے تعلق سے خصوصی حکم دیا۔ اور الحمد للہ حضرت امیر شریعت کی توجہ سے احقر کا معاملہ ترجیحی بنیادوں پر حل کیا گیا۔ اس لحاظ سے دارالعلوم میں اس کم سواد کا داخلہ اور اپنی بساط کے مطابق نامور اساتذہ سے فیض و استفادہ حضرت امیر شریعت ہی کا رہین منت ہے۔

چار سالہ قیام دارالعلوم کی مدت میں کئی مرتبہ شوریٰ اور عاملہ کی مجلسوں میں شرکت کے لیے حضرت امیر شریعتؒ دیوبند تشریف لائے اور مجھے ملاقات، زیارت اور خدمت میں حاضر رہنے کا موقع ملا۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت مولانا زین العابدین میرٹھیؒ، داعی دین حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ، محقق زماں حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ اور حضرت امیر شریعتؒ کے مابین دینی علمی ارتباط، باہمی احترام و اکرام، ذہنی و فطری ہم آہنگی اور مجالس میں مختلف النوع موضوعات پر ان اکابرین ملت کی گفتگو کی بعض جھلکیاں بھی دیکھنے اور سننے کو ملیں۔

قیام کشمیر

اگست ۱۹۸۱ء کے وسط میں ملازمت کے تعلق سے جب مستقل طور پر میں کشمیر میں رہنے لگا اور یہاں حضرت شہید ملت میر واعظ کشمیر مولوی محمد فاروق صاحبؒ کی قیادت اور رفاقت

میں دینی وعلمی کام کرنے کا موقع ملا، تو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے جلسوں اور میٹنگوں میں ملک کے مختلف حصوں اور مرکزی مقامات خاص طور پر دہلی کا سال میں کئی کئی بار سفر ہوتا اور ان مجلسوں اور نشستوں میں حضرت امیر شریعتؒ سے زیارت اور ملاقات کا شرف حاصل رہتا۔ کشمیر سے سرما کی تعطیل میں جب جب وطن یعنی بنگال کے سفر کا موقع ملتا تو قدرتی طور پر اپنے علاقے میں ان دنوں دینی جلسوں اور سیمناروں کا جیسے موسم ہوتا، اکثر و بیشتر عوامی اور دینی جلسوں میں امیر شریعتؒ کی صدارت میں احقر کو خطاب کرنے کا موقع ملتا۔

جنوری و فروری ۱۹۸۸ء میں حضرت امیر شریعتؒ نے ہمارے علاقے کا دورہ فرمایا تھا، اس آخری تفصیلی دورہ کے دوران راقم کو طویل ترین رفاقت اور خدمت کی سعادت حاصل رہی۔ اس موقع سے حضرت امیر شریعتؒ میرے آبائی گاؤں گوتی بھی تشریف لائے، برادر اکبر جناب حفیظ الرحمٰن نیر ایم اے میرے بڑے بہنوئی جناب ڈاکٹر عین الحق پانجی پاڑہ، جناب ڈاکٹر اسیر الدین بستہ وغیرہ نے خصوصیت سے حضرت امیر شریعتؒ سے فیض اٹھانے کی کوشش کی، ہر شب مختلف مقامات پر مختلف دینی عنوانات پر احقر کا خطاب ہوتا، حضرت توجہ سے سنتے، مناسب اصلاح فرماتے اور مشورے دیتے، سفر کے اختتام پر راقم جب چھٹیاں گزار کر کشمیر لوٹا تو حضرت کی خدمت میں خط لکھا جو جواب حضرت نے عنایت فرمایا اسے یہاں نقل کرنے کو جی چاہتا ہے کہ یہ مکتوب گرامی اصلاحی بھی ہے اور فکر انگیز بھی:

عزیز مکرم مولوی سعید الرحمٰن شمس وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محبت نامہ ملا، الأمور کلها مرهونة بأوقاتها اب آپ کی ذمہ داریاں بے حد بڑھ گئی ہیں۔ بنگال میں بھی اور کشمیر میں بھی، کشمیر جا کر کچھ زیادہ آزادی آپ میں آ گئی ہے۔ آپ کو اسے قابو میں کرنا ہوگا۔ سب سے پہلی بات نماز کا پورا اہتمام، آپ ماشاء اللہ عالم دین ہیں۔ آپ کے لیے صرف نماز پڑھ لینا کافی نہیں ہے۔ آپ کو نماز پورے اہتمام سے پڑھنی ہوگی کہ اس اہتمام کو دیکھ کر دوسرے لوگ متاثر ہوں، مجھے یقین ہے کہ آپ اس کی طرف پوری توجہ کریں

گے اور خط کے ذریعے مجھ سے آپ ایک طرح کا عہد کریں گے اس کے سوا وہ تین ہلکے پھلکے وظیفے جو میں نے بتلائے ہیں، اس کی پابندی کریں گے۔ تعداد کم ہے لیکن اس میں اصل چیز توجہ الی اللہ ہے، بس یہ خیال کہ دربارِ الٰہی میں حاضر ہیں۔ انشاء اللہ آپ جلد ترقی کریں گے۔ اس راہ میں بھی ذہین آدمی جلد ترقی کرتا ہے۔

شادی کا فرض بھی آپ کو انجام دے لینا چاہیے اور جلد۔ وہ حدیث تو آپ کے سامنے ہوگی۔ یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءة فلیتزوج فانه اغض للبصر و احصن للفرج الخ اور آپ کو کفو کے مسئلہ پر بھی غور کرنا چاہیے۔ فقہاء نے کفو کی اہمیت بلا وجہ نہیں بتلائی، کفو کی لڑکیاں دیکھی بھالی ہوتی ہیں۔ ان کے ساتھ نباہ سہل اور آسان ہے۔ میں ان شاء اللہ آں عزیز کے لیے برابر دعا کرتا رہوں گا۔

مولوی عبدالرحمٰن سلمہ اللہ سلام کہتے ہیں۔ مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب زید مجدہم اس وقت خانقاہ میں موجود ہیں۔ انھوں نے کہلایا ہے کہ میری خصوصی دعا لکھ دی جائے۔ خدا آں عزیز کو تبلیغ و دعوت پر قائم و دائم رکھے۔ گھر میں سبھوں سے فرداً فرداً سلام و دعا کہہ دیں۔

والسلام

منت اللہ رحمانی

بہر حال یہ تھی مختصر روداد میرے گاؤں سے سرینگر تک کے سفر کی، اگر غور کیا جائے تو وطن مالوف گاؤں سے از ہر ہند مادر علمی دار العلوم دیوبند میں احقر کی حاضری اور داخلہ اور پھر دیوبند سے کشمیر جنت نظیر تک کے سفر اور دوران قیام یہاں استحکام اور یکسوئی کے ساتھ شہید ملت میر واعظ مولوی محمد فاروق صاحبؒ کی رہنمائی اور سرپرستی میں علمی و دینی کاموں کی انجام دہی دراصل یہ سب کچھ حضرت امیر شریعتؒ ہی کا فیضان ہے۔

کشمیر میں قیام کے دوران حضرت امیر شریعتؒ اپنی خوردنوازی کے سبب کہنا چاہیے کہ برابر مجھ گنہگار کی روحانی اور علمی سرپرستی فرماتے رہے اور وقتاً فوقتاً اپنے اصلاحی مکتوبات سے خبر گیری کرتے رہے۔ ظاہر ہے میری طرح معلوم نہیں ہزاروں طالبان علوم ہوں گے جن کی سرپرستی آپؒ کرتے رہے۔

آج ہندوستان ہی نہیں برصغیر بلکہ عالم اسلام کی سطح پر حضرت امیر شریعتؒ کی طرح کی دینی وفقہی بصیرت، دقت نظر، بالغ نظری، سیاسی و دینی پختگی، قیادت اور شعور کی کمی بری طرح محسوس کی جارہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند سے بلندتر فرمائے اور ہم سب کو ملت اسلامیہ کو امیر شریعتؒ کے دینی، ملی، اصلاحی اور دعوتی مشن کی آبیاری اور تکمیل کی توفیق دے۔ آمین۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

مولانا جنید احمد بنارسی ممبئی

مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کے تعلقات ہم عصر علماء سے

مولانا ایک بہت بڑے بزرگ باپ، قطب زمانہ حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے بیٹے اور جید علماء، فضلاء، مولانا لطف اللہ اور مولانا نور اللہ کے بھائی اور مولانا محمد ولی رحمانی کے باپ تھے۔ مولانا رشتوں کے لحاظ سے اور اپنے والد ماجد کی بزرگی کے باب سے ہندوستان کے عموماً اور صوبہ بہار اور یوپی کے لحاظ سے خصوصاً قابل احترام تھے، مولانا کی موروثی وجاہت اکثر علمائے ہند کی توجہ کا مرکز رہی۔

چناں چہ انھوں نے جس میدان میں قدم رکھا۔ اور جس عنوان سے بھی لوگوں کو دعوت دی۔ خواص، علماء فحول اور اعیان نے اس پر لبیک کہا، پھر بہار اور اڑیسہ ہی نہیں بلکہ سارے ملک کے مسلمانوں نے ان کا ساتھ دیا۔ میرے والد ماجد مولانا محمد اسحاق بنارسی تھے، جن کے بغیر ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۳ء تک بہار کی کسی انجمن، کسی ادارے اور کسی مدرسے کا دینی، مذہبی اور اصلاحی جلسہ کم ہی ہوتا تھا، جس کے سبب بہار سے ان کا مضبوط رشتہ تھا، ساتھ ہی ساتھ مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کے برادر بزرگ مولانا لطف اللہ سے میرے والد کے محبانہ ومخلصانہ تعلقات تھے، چناں چہ یہی تعلقات وسیع تر ہوتے گئے اور مولانا لطف اللہؒ صاحب کے انتقال کے بعد

مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے اس تعلق کو آخر زندگی تک نبھایا۔

۱۹۵۵ء میں جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے مولانا حفظ الرحمٰن کی دعوت پر ایک دینی تعلیمی کنونشن ممبئی میں منعقد ہوا تھا، جس میں ہندوستان بھر کے تمام علماء اور دانشور موجود تھے، اور ان میں اکثر کا قیام صابو صدیق مسافر خانہ میں تھا، میرے والد کی رہائش بھی وہاں سے چند قدم پر الکریم منزل میں تھی، چناں چہ علماء کی آمد ورفت وہاں بھی رہتی تھی اور کچھ کا قیام بھی وہاں تھا۔

میرے والد مولانا منت اللہ رحمانی کے پاس گئے، ساتھ میں میں بھی تھا۔ مولانا رحمانی علیہ الرحمہ نے مجھ سے بھی گفتگو کی اور تعلیم کے بارے میں دریافت فرمایا۔ وہ مشفقانہ انداز آج تک مجھے یاد ہے۔ اس وقت مولانا امیر شریعت نہیں تھے، لیکن ان کی مجلس اور اندازِ جلوس وقیام اور ان کے مصاحبین کی وجہ سے مجھے ان پر کسی امیر ہی کا گمان ہوا تھا۔

۱۹۵۷ء میں مولانا قمر الدین پھلواریؒ کی رحلت کے بعد امیر شریعت رابع کی حیثیت سے مولانا رحمانی علیہ الرحمہ کا انتخاب ہوا۔ اور وہ تاحیات امیر شریعت بہار واڑیسہ رہے۔ اور بڑی شان سے ان کا دورِ امارت گزرا جس کی تفصیلات امارت کے کارناموں اور روداد میں مل سکتی ہیں، ان کے دورِ امارت کا شاہکار مسلم پرسنل لابورڈ کا قیام ہے۔ حضرت مولانا علی میاںؒ نے اپنی کتاب ''پرانے چراغ'' میں یہی تحریر فرمایا ہے کہ مولانا کے دور امارت کا اصل کارنامہ اور تاریخی کردار آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کا قیام ہے۔

۱۹۵۹ میں اپنے والد کے ساتھ میں بہار کے دورہ پر گیا یہ دورہ میرے لیے تجرباتی اور والد مرحوم کے لیے حسب عادت خطابتی، ساتھ ہی ساتھ تجارتی بھی تھا، سارے دورہ میں خطابت کی شان بان غالب رہی۔ تجارتی گفتگو صرف تاجروں سے ہوتی تھی اور اس کا دائرہ محدود تھا۔ کشن گنج جانے کے لیے ہم لوگ کٹیہار اسٹیشن پر تھے کچھ لوگوں کو بھاگ دوڑ کرتے دیکھا تو معلوم ہوا کہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی امیر شریعت بہار واڑیسہ ویٹنگ روم میں موجود ہیں، وہاں مولانا سے میرے والد کی ملاقات ہوئی تو دوران گفتگو یہ طے ہوا کہ کشن گنج کا تو جلسہ کل رات کو ہے، آج کی شب بارسوئی کے پاس کسی جگہ پر جلسہ ہے، (نام یاد نہیں ہے) وہاں کے جلسے میں

میرے ساتھ شرکت کر لیجیے اور پھر کل کشن گنج چلے جایئے گا۔ مولانا نے کچھ اس انداز محبت وتمنا سے یہ فرمایا کہ فوراً میرے والد تیار ہو گئے۔ چناں چہ کٹیہار سے دو تین اسٹیشن کے بعد رات کے سات آٹھ بجے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری۔ یہ چھوٹی لائن کی گاڑی تھی۔ آج سے ۴۶ سال پہلے کی بات ہے۔ اب تو وہاں کی بڑی بات ہے، بڑی لائن اور تیز رو گاڑیوں کی بہتات ہے، ہمارا ڈبہ سکنڈ یا انٹر کلاس کا جو بھی تھا وہ پلیٹ فارم سے باہر ٹھہرا۔ ہم لوگوں کے ساتھ سامان زیادہ تھا، سب سامان اتروا کر میرے والد سب سے آخر میں گاڑی سے اترے ادھر داعیان جلسہ کی طرف سے امیر شریعت کا استقبال پرشور نعروں سے ہو رہا تھا۔ ہر ایک حیران کہ مولانا آگے نہیں بڑھ رہے ہیں۔ جب میرے والد اترے تو اس کیفیت و انداز کو بیان کرنے میں مجھے تامل نہیں کہ مولانا رحمانی نے فرمایا آیئے مولانا۔ اور میرے والد کو ساتھ لے کر چلے، وہاں موجود لوگوں نے دیکھا کہ شیروانی میں ملبوس اور سگریٹ کا کش لیتے ہوئے ایک صاحب تشریف لائے، جن کے انتظار میں مولانا رحمانی کھڑے تھے آنے والوں کے مزاج اور گمان سے یہ بات ذرا ہٹ کر تھی۔ بہر حال ایک دراز قد شخص جو غالباً منتظمین جلسہ میں سے تھے، میرے پاس آئے اور دریافت کیا کہ یہ کون مولانا صاحب ہیں، جب ان کو میرے جواب سے معلوم ہوا کہ یہ مولانا محمد اسحاق بناری ہیں۔ وہ مجھ سے بغیر کچھ کہے کودتے پھاندتے سب سے آگے چلے گئے اور نعرہ امیر شریعت کے بعد ایک ''نعرۂ حیدری'' کی طرح نعرہ ''مولانا بناری'' کا لگایا، داعیان کو حیرت کہ بن بلائے ایک نعمت مل گئی۔ یہاں صرف یہ اظہار مقصود ہے کہ مولانا اپنے ہم عصروں اور ہم مشربوں کا کس قدر خیال فرماتے تھے، خیر رات کا جلسہ تھا، جلسہ جمانے کے لیے میری بھی تقریر ہوئی، تقریر کے ساتھ نعت پھر جانی پہچانی عوامی تقریر سے لوگ محظوظ ہوئے۔ اس کی کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں، البتہ دس، پندرہ منٹ کی تقریر کے بعد جب میں آیا تو مولانا نے شاباشی دی اور فرمایا کہ ماشاء اللہ بہت اچھی تقریر کرتے ہو، میرے لیے یہ سند تھی۔ تقریر میری کیا تھی، مولانا کی تشجیع تھی۔ یہ ان کی بڑائی تھی کہ اپنے دوست کے بیٹے کی پذیرائی کی۔

میرے والد ماجد ۱۹۶۱ سے بلڈ پریشر کے سبب بہت ضروری اسفار ہی کیا کرتے تھے،

چناں چہ سفر بہار کم ہوتا گیا اوران کا قیام بھی بنارس کے بجائے ۱۹۵۲ء سے ممبئی میں زیادہ رہا،اس لیے بہار کے جلسوں میں شرکت بھی کم رہی۔لیکن امیر شریعت رابع سے مراسلت رہی۔خصوصاً کسی خاص آدمی کو بنارسی ساڑیوں کی ضرورت ہوتی تو مولانا ضرور میرے والد کے پاس اپنے تعارفی خط کے ساتھ اس کو بھیجتے۔بہ ظاہر یہ معمولی باتیں ہیں،لیکن بہت اہم ہیں۔تعلقات کی قدروں کو نہ نبھانے والوں کے لیے ان میں نصیحت ہے۔

مسلم پرسنل لا کے سلسلے میں مولانا کا سفر بنارس ہوا، میرے گھر پہ تشریف لائے۔ میرے والد کے اضمحلال ونقاہت وعلالت کو دیکھ کر فرمایا کہ مولانا کہیں اور ملاقات ہوتی تو میں آپ کو پہچان نہیں سکتا تھا۔مولانا کی اور میرے والد کی غالباً یہ آخری ملاقات تھی، کیوں کہ میرے والد کا انتقال جنوری ۱۹۸۶ء میں اور مولانا کا انتقال ۱۹۹۱ء میں ہوا۔میرے والد سے مولانا منت اللہ علیہ الرحمہ کے تعلقات میں عزیمت اور محبت کے بہت سے پہلو ہیں۔

مولانا سے میری آخری ملاقات مکہ معظمہ میں فجر بعد صحنِ حرم میں باب الملک کی طرف ہوئی، جہاں مولانا تشریف فرما تھے،ساتھ ہی مولانا محمد ولی رحمانی بھی تھے۔جانے والے چلے گئے اب یادیں ہیں باتیں ہیں،کاش لوگ ایسے لوگوں کے کارہائے نمایاں سے سبق لیں۔اور قوم وملت کا کچھ کام کر کے دکھائیں۔ کل من علیہا فان باقی رہے نام اللہ کا۔

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

——— ⊙⊙⊙ ———

باب دوم
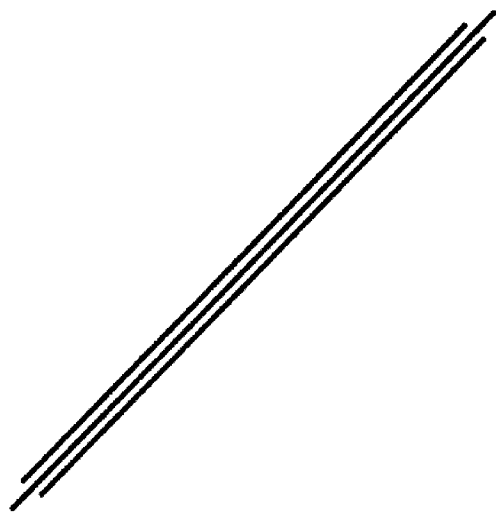
افکار وخیالات
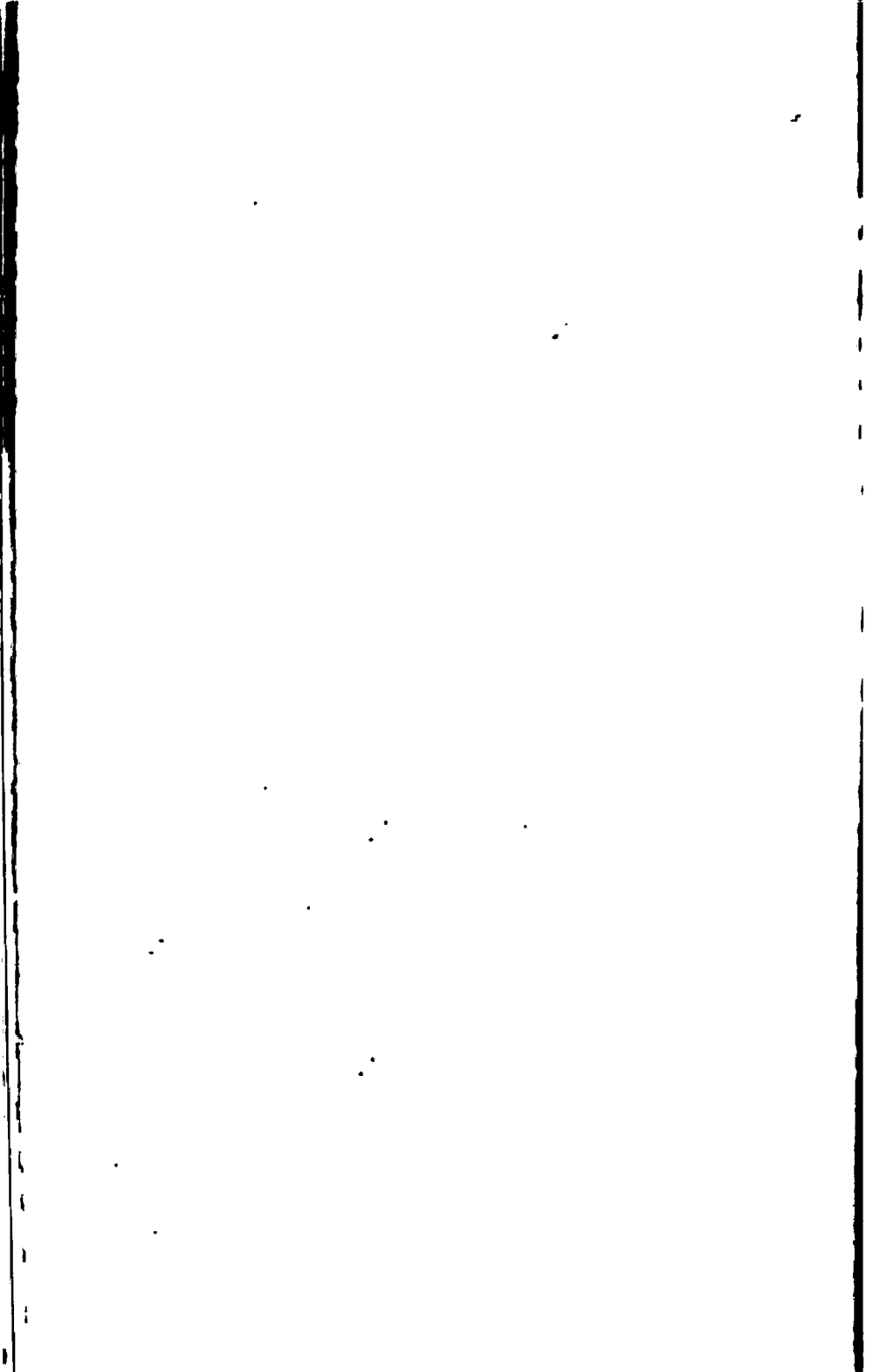
مولانا محمد برہان الدین سنبھلی ☆

حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ
بحیثیت ایک باحمیت عالم وفقیہ

ہندوستان جیسے وسیع وعریض اور مردم خیز ملک کے (حال و ماضی قریب کے) ممتاز ترین، بیدار مغز، بالغ نظر، بے باک اور علمی وفقہی حیثیت سے نمایاں علماء کی اگر مختصر سے مختصر فہرست تیار کی جائے تو اس میں بھی ایک نہایت روشن ونمایاں نام حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ (امیر شریعت رابع بہار واڑیسہ، اول جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ وسجادہ نشیں خانقاہ رحمانی، مونگیر) کا شامل ہوگا۔ سب واقف کار جانتے ہیں کہ مولانا جیسی ہمہ صفت موصوف شخصیت کی زندگی وکمالات کے تمام پہلوؤں پر گفتگو کرنا کسی مقالہ میں تو کیا، مختصر کتاب میں بھی آسان نہیں، اس لیے سامعین کی رعایت اور سیمیناروں میں ملنے والے محدود وقت کا لحاظ کرتے ہوئے موصوف کا صرف علمی وفقہی حیثیت کا ہی کچھ ذکر وتذکرہ کرکے اس مبارک مجلس کو آراستہ کرنا پیش نظر ہے۔ (واللہ ولی التوفیق)

مگر سب سے پہلے سیمینار منعقد کرنے والوں کی مردم شناسی، بالغ نظری اور ذوق کی بالیدگی کی نہ صرف داد دینا ضروری ہے بلکہ شکرگزاری بھی، کہ انھوں نے ایک ایسی شخصیت کو موضوع سیمینار بنانے کے لیے منتخب کیا جس پر بہت پہلے بہ کثرت سیمینار ہوگئے ہوتے تو بھی

☆ استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (یوپی)

تعجب نہ ہوتا کیوں کہ آں مخدوم سے بعض بہت کم مرتبہ لوگوں پر ایک نہیں کئی کئی سیمینار ہو چکے ہیں۔اس لیے حیرت بھی تھی اور دل بار بار سوال کرتا تھا کہ اگر کسی شخصیت کی عظمت وقدر شناسی کا اظہار سیمینار ہی سے ہوتا ہے تو پھر مولانا رحمانی علیہ الرحمہ سے اب تک کیوں صرف نظر کیا جاتا رہا؟ خدا کرے ''دیر آید درست آید'' کا مصداق یہ سیمینار ثابت ہو۔

یہاں شاید یہ بتا دینا نامناسب نہ ہوگا کہ مولانا مرحوم کی پوری زندگی عملی جدو جہد اور سعی مسلسل سے عبارت تھی، اس لیے یکسوئی کے ساتھ تصنیف وتالیف کا زیادہ موقع نہ مل سکا، البتہ بہ کثرت علمی و دینی اور دعوتی کانفرنسوں اور اجتماعات میں صدر نشیں بنائے جانے کی بنا پر کثیر تعداد میں بڑے وقیع وعمیق خطبہ ہائے صدارت سے (تحریری وزبانی ارشادات وہدایات سے) مستفید کرنے کے مواقع ملے، خوش قسمتی سے سب تو نہیں مگر ان کا معتد بہ حصہ کتابی شکل میں منظر عام پر آ گیا، جس سے طویل عرصہ تک فائدہ اٹھائے جانے کا سامان فراہم ہوگیا (فالحمد لله علی ذلك) راقم کو وہ سب قیمتی ذخیرہ تو نہیں، بس اس کا قلیل حصہ دستیاب ہوسکا، یہاں اسی کی کچھ جھلکیاں پیش کر کے سعادت حاصل کرنے کی ایک حقیر کوشش کی جارہی ہے۔(والله الموفق)

اس موقع پر سب سے پہلے راقم اپنا وہ تاثر ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہے جو مسلم پرسنل لا سے متعلق شرعی قوانین کی تدوین (جو بعد میں ''مجموعۂ قوانین اسلامی'' اور ''اسلامی قانون متعلق مسلم پرسنل لا'' کے نام سے شائع ہوکر ہاتھوں ہاتھ لیا گیا) کے موقع پر فقہی بحث ومباحثہ کے دوران قائم ہوا، چوں کہ راقم کو اس مبارک اور اہم علمی کام میں حصہ لینے کا موقع از اول تا آخر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی عنایت اور حسن ظن کی وجہ سے حاصل رہا۔اس لیے براہ راست بحث میں شرکت کے مواقع ملے۔

اس طرح کے کاموں کا جنھیں عملی تجربہ ہے۔ان سے یہ مخفی نہیں کہ اس میں کتنی ژرف نگاہی، وسعت علمی اور دقت نظری کی ضرورت ہوتی ہے کہ ایک ایک لفظ پر علم وفکر اور دقت و وسعت نظر کا گویا امتحان ہوتا ہے۔اور موزوں قانونی الفاظ کے انتخاب میں بحث ومباحثہ کرتے ہوئے بسا اوقات گھنٹوں (اور کبھی تو کئی کئی دن) صرف ہوجاتے ہیں۔مولانا اپنی کبرسنی، اعذار و

مشغولیات کے باوجود کئی کئی گھنٹے ایک نشست میں تشریف رکھتے اور شرکاء کی پوری رہنمائی کرتے جس سے اندازہ ہوتا کہ موصوف کا علم نہ صرف مستحضر اور تازہ ہے بلکہ نظر بڑی دقیق ہے، جس سے پیش آنے والی مشکلات کا حل بہ آسانی نکل آتا اور شرکاء کو خوش گوار حیرت بھی ہوتی کہ طویل عرصہ سے درس وتدریس کا مشغلہ نہ ہونے کے باوجود اس درجہ جزئیات کا استحضار اور ان پر ایسی ذہنی گرفت ہے کہ درس وتدریس میں بالفعل لگے ہوئے لوگوں کی بھی کم ہوتی ہے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ قائم ہونے سے پہلے مولانا موصوف کی دیگر میدانوں سے کہیں زیادہ امارت شرعیہ جولان گاہ رہی۔ چنانچہ مولانا کی صلاحیتوں، خواہ وہ علمی ہوں یا عملی کا اظہار بھی زیادہ تر اسی پلیٹ فارم سے ہوا۔ چونکہ امارت شرعیہ کا اصل موضوع اتحاد واتفاق کی دعوت اور دینی احساس و بیداری اور تنظیم ہے اس لیے مولاناؒ کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے، جس میں یہ دعوت پیش نہ کرتے ہوں، چنانچہ عید الفطر کے موقع پر ایک خطبہ دیتے ہوئے کیا خوب باتیں ارشاد فرمائیں، آپ بھی سماعت فرمائیں:

> دراصل یہ ایک ساتھ روزہ رکھنے کا حکم اور ایک دن خوشی منانے کا حکم اس لیے دیا گیا کہ اجتماع واتحاد کی روح پیدا ہو اور ہم اتحاد وتنظیم کے ساتھ رہنا سیکھیں، ہمارا افتراق دور ہو، یہ حکم دیا... کپڑے بدل کر، نہا دھو کر خوش بو لگا کر نکلیں، اس سے جہاں مسرت وخوشی اور باہمی اتحاد کی ترغیب دی گئی وہیں اس کی روح یہ بھی ہے کہ ہماری ہر خوشی کا احساس دوسروں کو بھی ہو ورنہ جہاں تک دوگانہ ادائے شکر کا تعلق ہے اس کے لیے اچھا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ بند کمروں میں پورے خشوع و خضوع کے ساتھ دو رکعت پڑھ کر اس ذات کا شکر ادا کیا جائے جس نے تیس روزوں کی توفیق دی، اسی طرح مسرت وخوشی کے لیے ایک دن متعین کیا گیا ورنہ مناسب تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ لوگ اپنی اپنی سہولتوں کے پیش نظر خوشیاں منا لیتے، گلے مل لیتے اور قربانیاں کرلیا کرتے۔ اگر آپ غور کریں تو عیدین ہی کیا، اسلام کے تقریباً تمام ارکان میں یہ دو چیزیں آپ کو ضرور ملیں گی ایک اتحاد و

تنظیم دوسرے ایثار وقربانی...''

عیدین ہر سال ہم لوگ مناتے ہیں مگر اس سے ملنے والے ایک اہم سبق کو ہم بھول چکے ہیں جس کا ذکر دردوسوز بھرے انداز میں یوں فرماتے ہیں:

''ہم نے ایک اہم سبق کو یاد نہیں رکھا جو کسی بھی جماعت کے لیے نہایت ضروری اور بے حد اہم ہے۔ ہم نے اتحاد و تنظیم ایثار وقربانی کو اپنے ذہنوں سے کھرچ کر نکال دیا۔''

آخر میں کس قدر موثر انداز میں پیغام دیا:

''بھائیو! عیدین ہمیں دو عظیم سبق دیتی ہیں، اتحاد و تنظیم کا، ایثار وقربانی کا، اگر ہم نے یہ دو سبق عملی زندگی میں نافذ کر لیے اور ضرورت سے زیادہ غور وفکر چھوڑ دیا تو یقیناً کامیابی ہمارے قدم چومے گی اور اگر ہم نے ان دونوں کو نہ اپنایا تو پھر خدا ہی حافظ ہے۔''

(''حضرت امیر شریعت آپ سے مخاطب ہیں'' صفحہ ۳۵-۳۷، نامی رسالہ سے ماخوذ)

دینی حمیت

مولانا مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے دیگر کمالات کے ساتھ حمیت دینی سے بھرپور حصہ عطا فرمایا تھا، ایک اقتباس ملاحظہ ہو!

''جان کا محفوظ رہ جانا ہی مقصد نہیں ہے یہ زندگی تو ختم ہونے ہی کے لیے ہے آج نہ سہی کل ختم ہونا ہے۔ ہم اس ملک میں ایک باعزت قوم اور مسلم قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ میں اس کے لیے تیار ہوں کہ ہماری گردن اڑادی جائے۔ ہمارے سینے چاک کر دیے جائیں، مگر ہمیں یہ برداشت نہیں ہے کہ مسلم پرسنل لا کو بدل کر ایک غیر اسلامی لا ہم پر لادا جائے۔''

(ایضاً ص: ۳۲، ۳۳)

یہی وہ جذبہ تھا جس نے مولانا کو ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' جیسی عظیم ومفید تحریک

کے قیام میں قائدانہ رول ادا کرنے اور اس کے قیام کے بعد اس کے لیے تن من دھن کی بازی لگانے پر آمادہ کیا (مولانا کی زندگی کا ایک مستقل باب ہے جس پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ایک اور موقع پر (دینی تعلیمی کونسل کا افتتاحی خطبہ دیتے ہوئے) فرمایا:[۱]

''ملازمتیں دے کر مسلمانوں کا پیٹ بھرا جا سکتا ہے...لیکن میں واضح طریقہ پر کہنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے پاس پیٹ اور جسم کے سوا کچھ اور بھی ہے جو ان مادی چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے، وہ ان کا دین اور دین سے پیدا ہونے والے تہذیبی امتیازات اور ان کا ملی وجود ہے، مسلمان بھوکا رہ سکتا ہے لیکن وہ اپنے کامل وجود کو برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا، اپنی اولاد کے متعلق اس کی یہ خواہش بالکل حق بہ جانب ہے کہ اس کے اعتقادات اور دینی تصورات اولاد تک منتقل ہوں، انسان کا یہ فطری حق ہے کہ (اچھا) باپ اپنی اولاد کو علم وفکر میں بھی اپنے ہی جیسا بنائے، یہ حق کوئی اس سے چھین نہیں سکتا...قوم وملت جسم وجان اور اشخاص وافراد کے برباد ہونے سے ختم نہیں ہوتی ہاں کسی قوم کا علم وفکر اور اس کی تہذیب ومعاشرت اس سے چھین لی جائے اور اس کا ذہن ہی بدل دیا جائے تو وہ امت اپنا وجود کھو بیٹھتی اور ختم ہو جاتی ہے۔''

پھر اپنی بات کو مدلل کرتے ہوئے کتنی مؤثر وعجیب مثالیں دے کر فرماتے ہیں:

''تاشقند وسمرقند بخارا وترمذ وغیرہ میں بڑے بڑے ائمہ، اولیاء اللہ، فقہاء اور مایہ ناز محدثین گزرے ہیں۔ان کی اولاد ونسل کو (بالکلیہ) ختم نہیں کیا گیا ان کی نسلیں آج بھی موجود ہوں گی لیکن نظام تعلیم ایسا نافذ کیا گیا جس نے ان محدثین اور فقہاء کی نسلوں کے ذہن بدل دیے اور ان سے ان کا علم وفکر جس پر ان کی تہذیب قائم تھی چھین لیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان اکابرین دین کی اولادیں اور نسلیں اپنا ملی وجود کھو بیٹھیں۔''

اسی خطبہ میں مومنانہ انداز سے فرمایا:

''امت محمدیہ کا ہر فرد جس طرح اپنے بچوں کے لیے...خوراک وپوشاک کا نظم کرتا

ہے ...ٹھیک اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ بچوں کی دینی تعلیم وتربیت کی ضرورت کو محسوس کرنا ہوگا کہ اس کے بغیر ہماری اولاد اور نسل کا وجود باقی نہیں رہ سکتا۔'' (نقوش تاباں، ص:۶۷تا۷۰)

علمی وفقہی حیثیت کی آئینہ دار تحریریں

مولانا نے علم کی فضیلت و برتری کا بھی (اپنے ''مدارس اسلامیہ کنونشن'' میں پیش کردہ ایک خطبہ کے اندر) بڑے ہی علمی اور فکری انداز میں اثبات کیا ہے۔ اس کا بہت مختصر (جستہ جستہ) حصہ سماعت فرمائیں:

''علم ہی وہ بنیادی جوہر ہے جس نے انسان کو اس کائنات میں خداوند قدوس کی خلافت و نیابت کے شرف سے مشرف کیا، جس نے آدم کو مسجود ملائک بنایا۔ تو پھر انسان اس کمال سے کیسے غفلت برت سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب سے آخری نبی ﷺ جن کو ختم نبوت کا عظیم الشان مرتبہ دیا گیا، ان کا معجزہ جو تمام معجزات کا خاتم ہے قرآن پاک ہے جو دراصل علمی معجزہ ہے...علم کی فضیلت و شرافت کے لیے یہ بات کیا کم ہے کہ وہ خود خدائے وحدہ لاشریک کی ذاتی صفت ہے۔ اس لیے حضور اقدس ﷺ نے اس شخص کو قابل رشک قرار دیا جسے اللہ نے دین کے علم سے سرفراز فرمایا اور وہ اس علم کی اشاعت میں مشغول ہے۔ علماء کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا فضیلت ہوسکتی ہے کہ وہ وارثان رسول قرار دیے گئے۔''

اس کے بعد کس قدر اہم اور مفید تنبیہ فرماتے ہیں:

''رسول کی وراثت کا یہ شرف اپنے ساتھ ذمے داریوں کا ایک بوجھ بھی ان کے دوش پر ڈالتا ہے...ضروری ہے کہ دین کا یہ علم محض رضائے خداوندی کے حصول کو اپنا مطمح نظر بنا کر طلب کیا جائے۔ جو علم، اللہ کے لیے نہیں بلکہ محض مباحثہ کی محفلوں میں اپنا سکہ جمانے، دوسرے علماء پر اپنی بڑائی کے اظہار اور جاہ کی

طلب کے لیے حاصل کرے گا اس کا علم اسے جہنم میں پہنچائے گا (اعاذنا اللہ منہ)۔"

اسی خطبہ میں (علم و علماء کی فضیلت کے ساتھ) مولانا کے تفقہ کی گہرائیاں بھی دیکھی جا سکتی ہیں، مثلاً دیکھیے کیا عجیب بات فرماتے ہیں:

"ایسے علماء جو شب و روز تعلیم دین اور تبلیغ کی خدمت میں مشغول ہیں اور یکسو ہو کر اس عظیم الشان فریضے کی ادائیگی میں اس طرح لگے ہوئے ہیں کہ ان کے لیے اپنی معاشی ضروریات کے حصول کے لیے علیحدہ سے کوئی کام کرنا ممکن نہیں، کیا ان علماء کے تعلق سے امت پر بھی کوئی ذمے داری عائد ہوتی ہے یا نہیں؟ فقہ اسلامی کا یہ اصول ہے کہ جس شخص کے مفاد میں کوئی اپنے اوقات وقف کردے اس شخص پر اس کا نفقہ واجب ہوتا ہے۔ اسے "وجوب نفقة للاحتباس" کا عنوان دیتے ہیں۔ یہ علماء کسی فرد خاص کے مفاد کے لیے نہیں بلکہ پوری امت کے مفاد اور ان پر عائد فرض کفایہ کی ادائیگی میں مشغول و محبوس ہیں۔ بلاشبہ ان علماء کی کفالت بہ حیثیت مجموعی امت پر عائد ہوتی ہے، مدارس اور اداروں کے ذمے داروں کو اور صاحب خیر مسلمانوں کو یہ دیکھنا ہوگا کہ ان (علماء) کے متعلقین کی کفالت کا کیا نظم ہے؟ پھر خصوصیت کے ساتھ اس دور میں جب کہ معمولی انسانوں کا معیار زندگی بلند سے بلند تر ہوتا جارہا ہے۔ کل تک جو چیزیں تحسینیات اور تزئینیات کے کھاتے میں تھیں آج ضروریات زندگی کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔ ایسے وقت میں ہماری یہ اولین ضرورت ہے کہ قرآن وسنت اور علوم دین کے اس "خزانۂ عامرۃ" کی حفاظت و صیانت پر ماموران علماء کی ضروریات کی کفالت پوری وسیع النظری اور فراخ حوصلگی کے ساتھ کریں۔ تاکہ یہ علماء بے نیاز اور یکسو ہو کر اپنے کاموں میں مشغول رہیں آیت (للفقراء الذین احصروا) سے بعض محققین نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ وہ غیور و خوددار علماء جو کار دین میں مشغول ہوجانے کے باعث کسب معاش

کے لیے اوقات فارغ نہیں کر پاتے ان کا حق ہے کہ امت مسلمہ ان کی ضروریات کی کفالت کرے۔''

اس کے بعد مولانا علماء (خاص طور سے ذمے دارانِ مدارس) کو بڑی ہی قیمتی اور گراں قدر نصائح بھی فرماتے ہیں، اس کا یہاں کچھ بھی ذکر نہ کرنا بڑی ناقدری ہوگی:

''ہماری یہ ذمے داری بھی ہے کہ ہم طلبہ کو علوم دینیہ میں کامل بنائیں۔ (ان کی) عملی، ذہنی اور اخلاقی تربیت اس طرح کریں کہ وہ امت کی سیادت وقیادت کی باگ ڈور مستقبل میں اپنے ہاتھوں میں لے سکیں ان میں جرأت اور حق گوئی ہو، غیرت اور خودداری ہو، اپنے منصب کی عظمت کا ادراک ہو۔ وہ نہ کسی قوت کے سامنے جھکیں نہ انھیں کوئی ترغیب وتحریص راہِ حق سے کج ہونے دے۔''

اس موقع پر مولانا ایک بہت چبھتا ہوا سوال بھی کرتے ہیں:

''آج کا دور معروضی مطالعہ کا دور کہا جاتا ہے۔ کیا ان حالات میں ہماری یہ ذمے داری نہیں ہے کہ ہم اس انقلابی عہد میں اسلام کی لازوال تعلیمات کو جدید اسلوب میں پیش کرنے کے لائق ہو سکیں، کیا ہمارے لیے یہ ضروری نہیں کہ علماء کا طبقہ وقت کی نئی کروٹوں سے آشنا اور ارشاد ربانی: لیظھرہ علی الدین کلہ کے مطابق اظہارِ دین کے فریضہ کی انجام دہی کے اہل علماء پیدا کریں۔''

اسی خطبہ کے آخر میں فرماتے ہیں:

''ہمیں غور کرنا ہوگا کہ موجودہ عہد کے تقاضوں کو سمجھنے والے باشعور علما اور جدید عہد کے پیدا کیے ہوئے سوالات کا جواب دینے کی استعداد رکھنے والے فضلا، ہم کیسے پیدا کر سکتے ہیں؟ ہمیں (اپنا) حساب لینا ہوگا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی امانت، آنے والی نسلوں تک پہنچانے کا حق ادا کر رہے ہیں یا نہیں؟ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ جزوی اور فروعی مسائل میں باہم دست وگریباں ہونا اسلام کے حق میں مفید ہے یا مضر؟''

اور اس غزل کا گویا ''بیت القصید'' یہ حصہ ہے:

''ہمیں اس بات کا جائزہ لینا ہوگا کہ ہمارے یہ مدارس جو ایک مقصد کی خاطر،

کام کرنے والے مختلف ادارے ہیں باہم مربوط اور منظم ہوکر دین کی صحیح
خدمت انجام دے سکتے ہیں یا انتشار، بدنظمی اور خودرائی کا مظاہرہ کرکے؟''

جیسا کہ اوپر ذکر آیا، مولانا علیہ الرحمہ کا اصل میدانِ کار بالخصوص مسلم پرسنل لا بورڈ قائم ہونے سے قبل، امارت شرعیہ رہا اس لیے فطری بات ہے کہ ان کی فکری ہی نہیں علمی وعملی جولانیاں زیادہ تر اسی کے اردگرد نظر آتی ہیں، چناں چہ قضاۃ کی تیاری اوران کے لئے رہنما خطوط تیار کرنے سے لے کر، دارالقضاء کے قیام اوران کے نظم وانصرام تک سارے پہلوؤں پر مولانا کی بیش قیمت ہدایات جوایک طرح کا علمی وفقہی سرمایہ بھی ہیں، مفصل ومدلل انداز میں ملتی ہیں۔اب ذرا اس گلستان کی بھی تھوڑی دیر سیر کرلیجئے!

مولانا نے ایک خطبہ میں منصب قضاء کی اہمیت وضرورت بلکہ اس کا وجوب قرآن کریم کی آیات کریمہ، سنن نبویہ اور آثارِ صحابہ سے مدلل ومبرہن کرنے کے بعد خیرالقرون ومابعد کے قضاۃ کی ایک طویل فہرست ذکر فرمائی (صحابہ میں) حضرت عمرؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، عبادۃ بن الصامتؓ وغیرہم (تابعین وتبع تابعین میں) قاضی شریح، سلیمان بن ربیعہ سے لے کر امام ابو یوسفؒ تک کوئی ایک درجن ممتاز قاضیوں کے اسمائے گرامی تحریر فرماتے ہوئے لکھا کہ: ''امام ابو یوسفؒ نے شرق سے غرب تک اسلامی مملکت میں شعبۂ قضاء کو پھیلا دیا۔'' اس کے بعد مولانا نے مملکت اسلامیہ کے مختلف حصوں بشمول عرب وعجم و یورپ (اسپین) کے تقریباً ایک درجن ممتاز قاضیوں (مع اُن کے مقامات) کے نام بیان کرکے گویا مختصر تاریخ القضاء والقضاۃ ہی رقم فرمادی۔ یہی نہیں قاضی کے منصب کی اہمیت اوراس کی احتیاطوں سے متعلق بھی خاصی تفصیلات پیش کردیں کہ جسے قضاۃ کا دستورالعمل کہنا بے جا نہ ہوگا! قاضی سے متعلق ضروری ہدایات کی بابت مولانا کے قلم سے نکلی چندسطریں ملاحظہ فرمائیں:

''اسلام نے عدل وانصاف کو صرف مسلمانوں کے ہی درمیان ضروری قرار نہیں دیا بلکہ ساری مخلوقات کے لیے عدل وانصاف کا حکم ہے جس کی حیرت میں ڈالنے والی مثالیں قرونِ اولیٰ (خیرالقرون) میں ملتی ہیں...''

اس کے بعد نہایت اہم بات یہ تحریر فرمائی:

''بعض باتیں اور صفتیں ایسی ہیں جن سے قاضی کو بہر حال پاک ہونا چاہیے... اس میں سب سے اہم اور بنیادی چیز رشوت ہے... ہر زمانہ میں رشوت کی مختلف شکلیں نکلتی رہتی ہیں، صرف روپے دینا ہی رشوت نہیں ہے۔ اس زمانہ کی ڈالیاں اور پارٹیاں دینا بھی رشوت ہے... لالچ وطمع بھی قاضی کے لیے سم قاتل ہے۔ امام سرخسیؒ نے لکھا ہے کہ جب حضرت علیؓ ایک قاضی کا امتحان لینے لگے تو سوال فرمایا ''قضاۃ'' کی صلاح کس طرح ممکن ہے؟ قاضی نے جواب دیا ''ورع'' کے ذریعہ (اس کے بعد) حضرت علیؓ نے پوچھا اس کا فساد کیا ہے؟ قاضی نے جواب دیا ''طمع'' اس جواب پر حضرت علیؓ نے اس قاضی کو (گویا پاس کر دیا اور) مخاطب کر کے فرمایا قضاء تیرا حق ہے۔''

اسی خطبہ کے آخر میں مولانا نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اہم اور مفصل خط کا بھی تذکرہ کیا ہے جو قضاء کے باب میں ایک تفصیلی ہدایت نامہ کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ جس پر اسلامی اصول قضاء کی پوری عمارت کھڑی ہے۔ چناں چہ اس کے بارے میں تمام ممتاز فقہاء اور اہل بصیرت علماء کا فیصلہ ہے کہ: ''ھذہ الرسالۃ اصل فی ما تضمنتہ من اصول القضاء'' (۱۵۹-۱۶۷)

یوں تو اس موضوع سے متعلق کہنے اور لکھنے کے لیے اور بھی بہت سی باتیں ہیں مگر سیمیناروں کے عام مزاج کے لحاظ سے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

⊙⊙⊙

حواشی:

۱۔ یہ اقتباس اور آنے والے تمام اقتباسات ''نقوش تاباں'' سے ماخوذ ہیں جو حضرت امیر شریعت کے تحریری خطبات کا مطبوعہ مجموعہ ہے۔

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی ☆

اصلاحِ معاشرہ مولانا رحمانی کے فکر و عمل کے آئینے میں

بات خاصی پرانی ہے مگر ایسا لگتا ہے جیسے کل کی بات ہے۔ اس واقعے سے حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا ایک بڑا روشن اور اہم رُخ سامنے آتا ہے۔ اس لیے اس کا تذکرہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ ۱۳۷۶ھ (۱۹۵۶ء) میں دار العلوم دیو بند کے دورۂ حدیث سے فراغت ہوئی تو والد محترم قاری جلیل الرحمٰن عثمانیؒ (۱۳۲۵-۱۴۱۶ھ/۱۹۵۵ء) نے فتویٰ نویسی کی تربیت کے لیے دار الافتاء دار العلوم دیو بند کے صدر مفتی حضرت مولانا مفتی مہدی حسن شاہ جہاں پوری کے سپرد کر دیا۔ حضرت مفتی صاحب کا تلمیذانہ تعلق حضرت دادا صاحب مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ (۱۲۷۵ھ-۱۳۴۷ھ) سے تھا۔ اس نسبت سے بھی حضرت مفتی صاحب خصوصی توجہ اور شفقت کا معاملہ فرماتے تھے۔ میرے سپرد یہ خدمت ہوئی کہ دار الافتاء میں آنے والے استفسارات اور سوالات کو دیکھوں اور ان کو پڑھ کر موضوع کے اعتبار سے الگ الگ کر کے رکھوں۔

☆ مفتی اعظم پنجاب (مالیر کوٹلہ)

اس زمانے میں جماعت اسلامی کی مخالفت بڑی شدت سے چل رہی تھی اور بہت سارے سوالات جماعت اسلامی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی کتابوں کے بارے میں آتے تھے۔ مجھے چوں کہ مولانا کی کتابوں اور جماعت سے کوئی واقفیت نہ تھی اس لیے میں بڑا حیران ہوتا تھا کہ یہ کون شخص اور کون سی جماعت ہے، جس کی اتنی مخالفت ہو رہی ہے۔

ایک روز میں نے اس کے بارے میں حضرت مفتی صاحب سے دریافت کیا تو انھوں نے مختصر طور پر کچھ باتیں بتائیں اور ان کے رد میں جو کتابیں لکھی گئی تھیں، ان کو پڑھنے کے لیے کہا۔ میں نے وہ کتابیں بھی پڑھیں مگر یہ خیال آتا رہا کہ جب یہ صاحب زندہ ہیں تو ان کے بارے میں خود انھی سے کیوں نہ پوچھا جائے جیسا کہ حضرت تھانویؒ کا طریقہ تھا کہ اگر کوئی شخص حیات ہے تو اس کے عقیدہ اور فکر کے بارے میں خود اسی سے دریافت کرنے کی ہدایت فرماتے تھے۔ مفتی صاحب کا رعب بہت زیادہ تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ ان کی اصل کتابوں کو دیکھا جائے اور خود ان سے ہی ان کے عقائد کے بارے میں دریافت کیا جائے۔ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر سچ بات یہ ہے کہ میری تسلی نہیں ہوئی۔

مولانا سید منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ مجلس شوریٰ دارالعلوم دیو بند کے ممبر تھے اور مجلس شوریٰ میں مختلف شعبوں کے لیے کچھ ذیلی کمیٹیاں بنی ہوئی تھیں۔ دارالافتاء کمیٹی کے ایک ممبر مولانا رحمانی صاحبؒ بھی تھے۔ مجلس شوریٰ میں شرکت کے لیے مولانا تشریف لائے تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور صورتِ واقعہ ان کے سامنے بیان کی۔ مولانا نے میری پوری بات توجہ سے سنی اور اس سے مجھے بہت حوصلہ ملا۔ مولانا نے کہا کہ دارالافتاء کمیٹی کی میٹنگ بھی ہونے والی ہے اور میں یہ مسئلہ اس کمیٹی میں اٹھاؤں گا۔ چناں چہ مولانا نے یہ مسئلہ کمیٹی میں پیش کیا اور یہ طے پایا کہ مولانا مودودیؒ کے افکار و عقائد کے متعلق خود انھی سے خط و کتابت کر کے دریافت کیا جائے۔ ایک سوال نامہ تیار ہوا مگر اس کو دارالعلوم دیو بند کی طرف سے بھیجنے کے لیے غالباً مفتی مہدی حسن صاحبؒ متفق نہیں ہوئے اور وہ سوال نامہ دارالعلوم کے بجائے امارتِ شرعیہ بہار کی

طرف سے مولانا مودودیؒ کو بھیجا گیا اور انھوں نے اس کا جواب بھی دیا جو رسائل و مسائل حصہ چہارم میں چھپا ہوا موجود ہے۔

اس واقعے سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ مولانا رحمانی ہر چھوٹے کی اور ہر چھوٹی بڑی بات پر پوری توجہ فرماتے تھے اور اس کے تعلق سے صرف زبانی بات نہیں ہوتی تھی بلکہ عملی قدم بھی اٹھاتے تھے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو فرد اور معاشرے کی اصلاح میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ زبان سے زیادہ عمل مؤثر ہوتا ہے اور مولانا رحمانی رحمۃ اللہ علیہ ایک عملی انسان تھے اور خود عمل میں پہل کرتے تھے۔

☆ ۱۹۸۹ء میں راقم الحروف کو مولانا کے ساتھ ادائیگی حج کی سعادت حاصل ہوئی۔ مولانا اس وقت کافی ضعیف ہو چکے تھے اور چلنے پھرنے میں بھی بہت دشواری ہوتی تھی لیکن دو باتیں ایسی دیکھنے میں آئیں، جن کی وجہ سے مولانا کے ساتھ ایک عقیدت مندانہ اور نیاز مندانہ تعلق محسوس ہونے لگا۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنے ساتھیوں کا خود اپنے سے زیادہ خیال رکھتے تھے کہ کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ دوسری بات یہ کہ ارکانِ حج کی ادائیگی کے اہتمام اور حرمین شریفین کی حاضری۔ ان سب چیزوں میں وہ بڑے مستعد رہتے تھے اور کبر سنی کے باوجود تازہ دم رہتے تھے اور یہی دراصل عملی اصلاح کا وہ پہلو ہے جو ہر دور میں سب سے زیادہ مؤثر اور دیرپا رہا ہے۔

☆ مسلم پرسنل لا بورڈ قائم ہوا تو مولانا رحمانی اس کے سب سے پہلے جنرل سکریٹری ہوئے لیکن وہ روایتی قسم کے جنرل سکریٹری نہیں تھے بلکہ ہر ایک ممبر کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے۔ اس کے باوجود کہ میری حیثیت ان کی اولاد کی طرح سے تھی وہ برابر اپنے قلم سے خط لکھا کرتے تھے، خود بھی ایکٹیو رہتے اور دوسروں کو بھی ابھارتے رہتے۔ اس کے لئے طریقہ ان کا یہ تھا کہ جس شخص کو مسلم پرسنل لا کی رکنیت کے لیے منتخب کرنا ہوتا اسے مدعوئے خصوصی کے طور پر پرسنل لا بورڈ کی میٹنگ میں بلاتے تھے۔ دیکھتے تھے کہ دلچسپی ہے یا نہیں اور اس میں کس درجے کی صلاحیت ہے؟ پھر اس

کورکن بناتے تھے اور پھر عاملہ میں شامل کرتے تھے۔ اس طرح ایک ایک قدم زینے کی سیڑھیوں کی طرح چڑھتا ہوا وہ شخص بورڈ کا ایک فعال حصہ بن جاتا تھا۔

☆ بورڈ کا ایک اہم اور بنیادی کام معاشرے کی اصلاح ہے ـــــ یہ کام بڑا مشکل بھی ہے اور ہمہ جہتی بھی ـــــ مولانا نے معاشرے کی اصلاح کے لیے آسان زبان میں بہت سی کتابیں اور پمفلٹ ترتیب دیے اور مختلف زبانوں میں ان کو شائع کرایا۔ طلاق کے سلسلے میں لوگوں میں بڑی غلط فہمی ہے، 'طلاق کا صحیح طریقہ' لکھ کر آپ نے بتایا کہ ضرورت ہو تو طلاق کس طرح دی جائے؟
فیملی پلاننگ کے سلسلے میں تو واقعہ یہ ہے کہ مولانا مرحوم نے ایک طرح سے جہاد کیا ہے۔ کسی خطرہ کی پرواہ کیے بغیر صاف صاف باتیں بتائیں اور دلائل سے سمجھایا کہ اسلام کیوں اس کو پسند نہیں کرتا اور کن خصوصی حالات میں اس کی گنجائش ہے۔ ان کا وہ مضمون بڑا جامع، مفید و مؤثر اور آج بھی تر و تازہ ہے۔ معاشرے کی اصلاح کے سلسلے میں یہ ان کا بڑا کام ہے۔

☆ حضرت مولانا رحمانی بڑی دوررس نگاہ رکھتے تھے، انھوں نے بورڈ کے دائرۂ کار کو عائلی قوانین کے تحفظ تک محدود رکھا۔ عائلی قوانین کے تحفظ میں ایک بیرونی تحفظ تھا اور دوسرا اندرونی۔ بیرونی تحفظ یہ تھا کہ حکومت مسلم پرسنل لا میں کسی طرح سے کوئی مداخلت نہ کر سکے ـــــ کوئی قانون پارلیمنٹ کے ذریعے یا عدالتی فیصلوں کے ذریعے ایسا نہ آنے پائے، جس سے مسلم پرسنل لا متاثر ہوتا ہو ـــــ لے پالک (متبنیٰ بل) سے مسلمانوں کو مستثنیٰ رکھنے میں بورڈ کو بڑی کامیابی ملی ـــــ اسی طرح شاہ بانو کے مشہور مقدمہ میں زیر دفعہ CRPC, 125 کے ذریعے عدالت کا فیصلہ مسلم پرسنل لا سے ٹکراتا تھا ـــــ بورڈ نے اس کے خلاف تحریک چلائی۔ پورے ملک میں بڑے بڑے اجتماعات ہوئے۔ لوگوں کو بتلایا گیا کہ اسلام کا عائلی قانون کیا ہے؟ یہ تحریک صرف دفعہ 125 کے خلاف ہی نہ تھی بلکہ معاشرے کی اصلاح کا ایک بڑا ذریعہ بنی اور یہ

اندرونی طور پر خود اپنے معاشرے کو اسلامی اقدار و قوانین کے مطابق ڈھالنے کی تحریک تھی۔

مولانا کی فکر یہ تھی کہ لوگوں میں شریعت کی عظمت، اس کی افادیت اور مسائل کے حل کرنے میں شریعت اسلامیہ کی قوت و صلاحیت کا احساس پیدا ہو، وہ اسلام کے مطابق مرنا جینا سیکھیں، اسلام کے مطابق زندگی گزاریں ـــــ دشواریوں کا حل اسلام کے قوانین میں تلاش کریں۔

اس سلسلے میں مولانا لکیر کے فقیر قسم کے عالم نہ تھے بلکہ ان کا ذہن بڑا براق و روشن تھا۔ چناں چہ ہر وہ صورت جس میں نکاح اپنے مقصد میں ناکام ہو وہ اس نکاح کو باقی رکھنے کے حق میں نہ تھے ـــــ امارت شرعیہ کے دار القضاء کے فیصلوں میں، قاضیوں کی تربیت میں ان کا یہ ذہن صاف جھلکتا تھا۔

ان کا ایک عظیم کارنامہ مسلم پرسنل لا کی دفعہ وار تدوین ہے، جس کا مجموعہ ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ تزکیہ نفس و تربیتِ اخلاق میں خانقاہوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے، خانقاہ مجددیہ سرہند کی تحریک نے جلال الدین محمد اکبر کی پھیلائی ہوئی لادینیت کو دینداری سے بدل دیا، مولانا رحمانی علیہ الرحمہ نے خانقاہ رحمانی کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کا زبردست کام کیا۔ بہار کے ایک بہت بڑے حصے میں فکر و عقیدے کا انقلاب اسی خانقاہ کا فیض ہے۔ ایک طرف وہ امیر شریعت کی حیثیت سے شریعت کے پاسبان تھے تو دوسری طرف روحانی قدروں کے امین۔

در کفے جام شریعت در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن

آج وہ نہیں ہیں بڑا خلا معلوم ہوتا ہے ـــــ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، مفتی عتیق الرحمٰنؒ، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ، مولانا ابواللیث اصلاحیؒ

اور مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ ایک پورا سلسلہ تھا، ان علماء کا جن کا وزن تھا، وقار تھا، سرمایۂ ملت کے نگہبان تھے۔ روشن دل، روشن فکر۔ اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنی رحمتیں برسائے اور ہمیں ان کے راستہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

سیّد حامدؒ ☆

امیر شریعت کی حکمت و بصیرت

اس نامہ سیاہ کو امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی کی زیارت کا شرف ایک سے زیادہ بار حاصل ہوا، دینی تعلیمی کانفرنس کے دو اجلاس میں اور مجلس مشاورت کی بعض نشستوں میں۔ ہر مرتبہ حضرت امیر شریعت کی تابندہ شخصیت، ان کی سوجھ بوجھ، بصیرت اور حکمت عملی سے متاثر ہو کر لوٹا، ان کی آنکھوں میں ذہانت کی غیر معمولی چمک تھی، محسوس ہوتا تھا کہ مسائل کتنے ہی اہم اور پیچیدہ کیوں نہ ہوں، مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے ذہن کی گرفت میں آئے بغیر نہ رہیں گے۔ کوئی ایسا بزرگ درمیان میں ہو تو جلد گھبرا جانے والے دلوں کو طمانیت حاصل ہوتی ہے، حوصلہ فراہم ہوتا ہے۔

امیر شریعت مذکورؒ نے زندگی صرف مدرسہ اور خانقاہ میں نہیں گذاری۔ انہوں نے آزادی کی لڑائی میں حصہ لیا اور اسیر فرنگ بھی رہے۔ انہوں نے مجلس قانون ساز کی رکنیت بھی حاصل کی۔ سیاست کے رنگ ڈھنگ لاکھ نا قابل ستائش سہی لیکن اس سے مفر بھی نہیں، اور صالح افراد اگر سیاست میں داخل ہوں گے تو اسے سدھاریں گے، سنواریں گے ہی۔ بہر کیف اس وقت ہمیں ایسے علماء کرام کی شدید ضرورت ہے جو دین پر عبور رکھنے کے علاوہ موجودہ دنیا کے حوادث و کوائف اور تقاضوں سے واقف ہوں۔ جو ملت کو اس کے خطرات سے آگاہ کر سکیں اور جو ان حملوں کا جو اسلام پر ہجوم کر رہے ہیں، دفاع، استدلال، حکمت عملی اور حسن ارتباط کے ساتھ کر سکیں۔

☆ سابق چانسلر ہمدرد یونیورسٹی و سابق وائس چانسلر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی

حضرت امیر شریعتؒ کے متعلق یہ روایت معتبر اور مشہور ہے کہ وہ جرأت حق گوئی کیلئے ممتاز تھے۔ اعلانِ حق میں انہوں نے کبھی تامل اور تکلف سے کام نہیں لیا۔

فقہ کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کی تشریح خود انہیں کرنے دیجئے۔ اپنی کتاب ''سفر نامہ مصر و حجاز'' میں انہوں نے اپنا وہ مقالہ جس کا عربی ترجمہ مؤتمر عالم اسلامی میں پیش کیا گیا بطور ضمیمہ کے شامل کیا ہے۔ اس مقالہ سے اقتباس درج ذیل ہے۔ ہر چند کہ مؤتمر عالم اسلامی کا یہ اجلاس ۱۳۸۴ھ میں جامع ازہر کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا۔ مذکورہ مقالہ کی افادیت اور معنویت ابھی تک برقرار ہے:

''دینی اختلافات کی بڑی وجہ امور مجتہد فیہا اور فقہی جزئیات و فروع میں غیر معمولی شدت اور تعصب بھی ہے، ان فروعی مسائل کے ساتھ ہم نے وہی معاملہ کیا جو امورِ منصوصہ کے ساتھ ہونا چاہیئے تھا۔ دنیا میں ایسے علاقے بھی ہیں جہاں دوسری فقہ پر عمل کرنے والوں کے پیچھے نمازیں ادا کرنے سے انکار کیا گیا ہے۔ ایسے مقامات بھی موجود ہیں جہاں دوسرے مسلک والوں کے داخلہ پر مسجدیں دھلوائی گئی ہیں کہ ان کے داخلہ سے مسجد ناپاک ہو گئیں، ان اختلافات کی بنیاد پر مسلمانوں نے جدال و قتال کیا ہے۔ کاش ان کی نظر حضرت امام مالکؒ کے اسوہ پر ہوتی کہ جب خلیفہ مہدی اور خلیفہ ہارون نے امام سے چاہا کہ مؤطا امام مالک کی نقلیں کرا کے مختلف اسلامی ریاستوں میں بھیج دیں اور حکم دیں کہ اسلامی ممالک میں اسی پر عمل کیا جائے تو گرچہ امام مالک کو موقع تھا کہ وہ اپنے مسلک کو عالم اسلامی میں حکومت کے سہارے پھیلا دیں لیکن امام نے ایسا نہیں کیا، بلکہ یہ جواب دیا کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین رسول اللہ ﷺ سے دین لے کر دنیا میں پھیل گئے اور انہوں نے سنت رسول کی بنیاد پر ہی اپنے اپنے طریقوں سے دین کو پھیلایا اور اس پر عمل کیا، تو پھر ہم کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ دین کو ایک ہی طریقہ میں محصور کر دیں اور صحابۂ کرام کے پھیلائے ہوئے طریقوں کو ختم

کردیں جب کہ ان مسالک وطرق کی بنیاد بھی قرآن وسنت ہی پر ہے۔...''

''ان فروعی مسائل کو غیر معمولی اہمیت دینے کا سب سے بڑا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے علماء اور اصحاب فتاویٰ کی نظر دین کی ابدی بنیادوں اور عالم گیر اصولوں سے ہٹ کر فروع پر آ گئی اور اصل دین مستور ہو گیا جس پر نجاتِ انسانی کا مدار ہے اور چھوٹے چھوٹے مسائل نے اس کی جگہ لے لی۔ جس سے وحدت اسلامیہ کو غیر معمولی نقصان پہنچا، اخوت اسلامی پارہ پارہ ہو گئی اور وما ارسلناك الا رحمة للعالمين اور وما ارسلناك الا كافة للناس بشيراً و نذيراً کا اعلان بے معنی ہو گیا۔''

''دنیا مادی ترقی میں بہت آگے جا چکی ہے، انسانی فکر کی بلندی اور ایجادات نے اور اس سے پیدا شدہ نئے تمدن نے بہت سے جدید مسائل پیدا کر دیئے ... مستقبل مزید نئے مسائل ہمارے سامنے لائے گا۔ ظاہر ہے کہ ان مشکلات کا حل اور ان مسائل کا جواب نصوص شرعیہ پر فکر اور ان سے مسائل کا استنباط کئے بغیر نہیں دیا جا سکتا۔ شرعی اصولوں کو سامنے رکھ کر مسائل کا استخراج کرنا ہوگا اور نئی باتوں کا جواب دینا ہوگا ورنہ امت مسلمہ ہر پیش آنے والی چیز کو قبول کرتی جائے گی....''

''اس مشکل کا یہ حل کہ فقہائے اسلام کی مدوّنہ فقہ کو ہر مسلمان کے لئے عام کر دیا جائے اور جس مسئلہ میں جون سی فقہ مشکل کو حل کرتی ہو اسے اختیار کر لیا جائے۔ ہمارے خیال میں اس طریق کار سے ہماری دقتیں حل نہ ہوں گی۔ آج بھی ایسے مسائل ہیں جن میں تمام فقہاء کی فقہ خاموش ہے اور زمانہ کی ترقی اور انقلاب کی رفتار اتنی تیز ہے کہ اگر آج ہم کو مشکلات کا حل کسی نہ کسی فقہ میں مل جاتا ہے تو کل یقیناً نہیں ملے گا اور تمام فقہ ساکت نظر آئے گی۔ اسلئے اگر اسلام ہر زمانہ اور ہر مکان کیلئے ہے اور قیامت تک کے لئے ہے۔ اور اگر محمد رسول اللہ ﷺ

کی بعثت عالمگیر ہے، اور آپ کی لائی ہوئی کتاب رہتی دنیا تک کے لئے نور اور
ہدایت ہے تو اجتہاد کا دروازہ کھولنا ہوگا۔ اس کے بغیر ہماری مشکلات کا حل شاید
نہ ہو سکے۔ لیکن ہاں یہ دروازہ اس طرح نہ کھولا جائے کہ دین میں ہماری ذاتی
رائے اور شخصی رجحانات داخل ہو جائیں۔''

ایک کلیدی اہمیت رکھنے والے موضوع پر مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے مقالہ کے اقتباس کو دانستہ طویل کر دیا گیا ہے۔ اس سے قارئین کو نہ صرف ان کی بیدار مغزی اور صلابت فکر کا اندازہ ہوگا بلکہ اسلوب نگارش کی آہٹ بھی مل جائے گی۔ ان کے طرزِ تحریر کے بارے میں شاید آگے چل کر کچھ کہا جائے، افسوس ہے کہ اس واضح موقف پر کوئی عملی اور مؤثر پیش رفت نہیں ہو پائی۔ مذکورہ موضوع کو خیر باد کہنے سے پہلے راقم السطور یہ عرض کرنا چاہے گا کہ اس طرزِ فکر کا انعکاس ہمارے دینی مدارس کے نظامِ تعلیم میں پورے طور سے ہونا چاہیئے۔ ان کے طلبہ کو جدید دنیا کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات سے آگاہی فراہم کی جائے اور طرزِ تدریس میں مسائل پر غور وفکر کے لئے معقول گنجائش نکالی جائے یہ کام سہل نہیں، اسی لئے ضرورت ہے اس پر پورا دھیان دینے کی، اور جلد دھیان دینے کی، ورنہ زمین پاؤں کے نیچے سے نکل جائے گی۔

مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے مسلکی عصبیت کے خلاف زیادہ صراحت کے ساتھ علمِ جہاد اپنے مقالہ ''مسلکی عصبیت اور دعوت'' میں جو مرکز اسلامی حیدرآباد کے زیر اہتمام منعقدہ سیمینار (یک تا ۳ر اگست ۱۹۸۶ء) میں پڑھا گیا بلند کیا ہے:

''جامع ترمذی کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سیکڑوں مسائل ہیں جن
میں حضرات صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین میں اختلاف رہا ہے، لیکن یہ
اختلاف ان میں باہم تفریق، انتشار، فرقہ بندی اور تحزب کا ذریعہ نہ بنا۔ اور نہ
کوئی کسی کی تکفیر کرتا اور نہ کوئی کسی پر طنز و تعریض کرتا۔''

''اس اختلاف سے امت نے اپنے اندر گھٹن اور تنگی محسوس نہیں کی۔ حضرت عمر
ابن عبدالعزیزؒ جن کی خلافت خلافتِ راشدہ کہلاتی ہے، انہوں نے حضرات

صحابہؓ کے اختلاف پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا (زرقانی نے نقل کیا ہے)۔

ماسرنی لو ان اصحاب محمدﷺ لم یختلفوا لم تکن رخصۃ (شامی ۶۳۔ج۔۱) ''یعنی حضرات صحابہ میں اختلاف نہ ہونے پر مجھے خوشی نہیں ہوتی کیونکہ ان کا اختلاف رخصت وگنجائش کا سبب تھا۔۔۔''

ایک فرمان میں آپ لکھتے ہیں کہ ''ان اختلافات کی وجہ سے دین میں بڑی وسعت پیدا ہوگئی۔ میں دین کی راہ میں اس کو بڑی غیر معمولی چیز سمجھتا ہوں، وہ بڑی ناپسندیدہ حالت ہوتی کہ اس قسم کے مسائل میں لوگ کسی ایک ہی پہلو پر سمٹ جاتے۔''

مشہور محدث اور فقیہ حضرت سفیان ثوریؒ تو ان لوگوں کو ٹوک دیا کرتے تھے جو ائمہ مجتہدین کے فقہی اختلاف کو اختلاف کے نام سے موسوم کرتے اور فرماتے کہ ''بھائی یوں کہا کرو کہ علماء نے مسلمانوں کے لئے یہ گنجائش اور فراخی دین میں پیدا کی''

مولانا رحمانیؒ نے اس گفتگو کا لبّ لباب پانچ لفظوں کی سرخی میں قلم بند کر دیا ہے۔ ''اختلاف نہیں نزاع مذموم ہے۔'' والدین کو چاہیئے کہ بچوں کو اختلاف کرنے کے آداب سکھائیں۔ تہذیب دراصل نام ہی ہے بغیر نزاع کے اختلاف کرنے کا۔ اس کلیہ کا اطلاق دینی امور کے علاوہ دنیوی امور پر ہوتا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارا معاشرہ بدقسمتی سے اختلاف رائے کو بغاوت یا عداوت یا کدورت سمجھنے لگتا ہے۔ ایسا معاشرہ سیال اور رواں دواں رہنے کے بجائے منجمد ہو جاتا ہے جہاں ضرب لگی ٹوٹ گیا اس کے برعکس اگر پانی رواں ہے تو اس پر لاکھ وار کیجئے لاکھ ضربیں لگایئے، کوئی اثر نہیں ہوگا بلکہ چھینٹے ضرب لگانے والے پر ہی پڑیں گے۔ ہماری شومئی قسمت دیکھئے کہ ہمارے پاس اختلاف کا ظرف ہی نہیں رہا۔ کوئی شخص برملا ہم سے اختلاف کرے تو ہم اس کے درپے آزار ہو جائیں گے اور اگر اس کی سکت اور اتنی خصومت نہیں رکھتے تو دل میں اس کے خلاف غبار لیکر بیٹھ جائیں گے۔ یہ بات ہندوستانی مسلمانوں تک محدود نہیں ہے۔ یہاں ہندو اور سکھ بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں لیکن مسلمانوں کے یہاں یہ رنگ

زیادہ گہرا ہے۔ ہندوستان ہی کو موردِ الزام کیوں ٹھہرایا جائے مشرقِ وسطیٰ کے باشندے بھی شاید تابِ اختلاف میں تنگ ظرف واقع ہوئے ہیں۔ شیخ ابراہیم ذوق نے مقطع میں جب یہ کہا تھا ''اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے'' تو کیا عجب کہ ان کے مافی الضمیر میں وہ اختلافات بھی رہے ہوں جو انسانوں کے درمیان عقائد وافکار کے علاوہ روزمرہ کے روابط میں رونما ہوئے ہیں۔ مغربی ممالک نے گذشتہ پانچ صدیوں میں جو محیر العقول ترقیاں کی ہیں ان کی ایک بڑی وجہ اختلافات کی کھلے دل سے پذیرائی ہے۔ اختلاف کیجئے لیکن اسے نزاع میں نہ بدلنے دیجئے، اس میں شخصیات کو نہ لائیے، اسے مسائل اور افکار سے آگے نہ بڑھنے دیجئے، اختلاف سے فکر اور تحقیق کو پَرِ پرواز فراہم کیجئے، اسے پاؤں کی بیڑی نہ پہنائیے۔

مولانا سجاد میموریل اسپتال کی تقریب افتتاح کے موقع پر امیر شریعتؒ نے فرمایا:

> ''اسلام نے انسانی خدمت اور رفاہی کاموں کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ سادگی اور قناعت پسندی کی تعلیم دی ہے۔ ایثار اور قربانی اور دوسروں کے کام آنے کے جذبہ کو سراہا ہے۔ اس نے تعلیم دی ہے کہ اپنے آپ پر بوجھ پڑے تب بھی دوسروں کی خاطر ایثار وقربانی سے کام لو (یؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ) جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے بڑے بلیغ انداز میں سمجھایا ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء (مشکوٰۃ) زمین والوں پر تم رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔ ایک موقع پر اس سے آگے بڑھ کر حضور ﷺ نے فرمایا کہ ساری مخلوق خدا تعالیٰ کی اولاد ہے، اور خدا کی اولاد کے ساتھ جو بندہ بھی اچھا معاملہ کرے گا وہ خدا سے قریب ہوگا (الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ) راستے میں پڑے کانٹے اور پتھر اگر کسی نے اس نیت سے ہٹا دیئے کہ کسی مسافر کو ٹھوکر نہ لگ جائے، کسی راہ گیر کے قدم زخمی نہ ہو جائیں تو یہ نہ صرف ثواب کا کام ہے بلکہ اسے ایمان کا حصہ قرار دیا گیا ہے۔''

''ملت و مذہب کے فرق سے دور اسلام نے پڑوسیوں کو بڑی اہمیت دی ہے۔
جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے پڑوسیوں کی اہمیت کچھ اس طرح بیان فرمائی اور
ان کے خیال رکھنے کا ایسا حکم دیا کہ بعض صحابہ کو یہ شبہ ہونے لگا کہ کہیں پڑوسیوں
کو بھی جائداد میں حصہ دار نہ بنا دیا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ مسلمانوں کے
شایانِ شان نہیں ہے کہ وہ پیٹ بھر کر کھالیں اور ان کا پڑوسی بھوکا رہے (لیس
المومن الذی یشبع و جارہٗ جائع الی جنبہ (مشکوٰۃ)۔''

غور فرمایئے کہ کیا ہم نے آنحضرتؐ کی ان ہدایات کو یاد رکھا ہے، کیا ان کی جھلک ہمارے اعمال و افعال اور برتاؤ میں نظر آتی ہے۔ آپ دو ایک مثالیں دے دیں گے لیکن سوال تو یہاں صرف یہ ہے کہ آیا رسول کریمؐ کی امت ہمسایہ کا خیال دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے زیادہ رکھتی ہے، کیا آڑے وقت میں وہ ان کے کام آتی ہے، کیا ان کی مدد کرتے وقت اس کے ذہن نشین یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم حضور کی ہدایت پر عمل کر رہے ہیں۔ اخلاق کی دنیا میں فصل و موسم کی کوئی قید نہیں لیکن کیا ہم بڑھتے ہوئے دن کے ساتھ اپنے سمٹے ہوئے دلوں کو بڑا نہیں کر سکتے، انہیں اتنی وسعت نہیں دے سکتے کہ بنی نوعِ انسان کی محبت ان میں سما جائے اور جب کبھی ہمارے علم میں کسی پر بپتا پڑے، ہمارا دل دکھی ہو جائے اور اگر وہاں تک ہماری دسترس ہے تو بساط کے مطابق ہمارا ہاتھ دستگیری کے لئے بڑھ جائے۔ بابری مسجد کو ظالموں نے شہید کر دیا۔ اس سے بڑھ کر ظالم کون جو عبادت گاہ کو مسمار کر دے۔ لیکن اس ظلم کا بدلہ ہم بے گناہوں پر ظلم کر کے نہیں لے سکتے اور نہ عام ہندوؤں کے خلاف دل میں کدورت رکھ سکتے ہیں کہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔

حیرت اور دکھ کی بات ہے کہ ہندوستان میں جتنی قومیں بستی ہیں ان میں رفاہ عام اور خدمت خلق کے کاموں سے جتنی کم دلچسپی مسلمانوں کو ہے کسی قوم یا فرقہ کو نہیں۔ اور یہی ہمارے ادبار کا ایک بڑا سبب ہے۔

مولانا منت اللہ رحمانیؒ کا طرزِ تحریر سلجھا ہوا، سلیس اور دروبست سے لیس ہے۔ ان کے

یہاں دعویٰ اپنی دلیل کے ساتھ آتا ہے۔ اسی لئے ان کی بات ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ بعض خیالات کو وہ روز مرہ کی زبان میں بڑی صفائی کے ساتھ ادا کر جاتے ہیں۔ simultaneous translation کے لئے دیکھئے کتنے اچھے الفاظ ڈھونڈ نکالے: ''ہر کیبن پر ترجمہ کرنے والے اور والیاں بیٹھی ہیں اور عربی، انگریزی اور فرانسیسی تین زبانوں میں ہاتھ کے ہاتھ ترجمہ ہوتا جارہا ہے۔''

منظر کشی کی ایک مثال بھی دیکھتے چلئے: ''عجیب منظر ہے کالے، گورے، سرخ سفید سب ہی جمع ہیں... ایک پر ایک صاحب فضل وکمال موجود ہیں، یہ افریقہ کے شیخ الاسلام ہیں جن کے ہاتھ پر سترہ لاکھ عیسائیوں نے اسلام قبول کیا، یہ فلسطین اور لبنانِ شمالی کے مفتی اعظم ہیں، یہ سوڈان کے قاضی القضاۃ ہیں، یہ روس کے مفتی بابا خانوف ہیں، یہ لیبیا کے محکمۂ شرعیہ کے رئیس ہیں، یہ انڈونیشیا کے مذہبی امور کے ذمہ دار ہیں، یہ جاپان کے نومسلم ہیں، یہ ہالینڈ سے آئے ہوئے بھائی ہیں۔'' دیکھئے پیرایۂ بیان ایک پورا منظر آنکھوں کے سامنے لے آیا۔

کہیں کہیں زیرِ لب تبسم کا سا انداز ہے۔ ''ان (مشہور قاری، قاری عبدالباسط عبدالصمد صاحب) پر مصافحہ کرنے والوں کا ہجوم ہے۔ خیر کچھ دیر کے بعد ان سے جا کر ملا۔ اس وقت میرا وہی حال ہوا جو رقص کے بعد اپنے پیروں کو دیکھ کر مور کا ہوا کرتا ہے۔ ازہر کا فاضل، مصر کا مشہور حافظ وقاری، لیکن اسے بھی ریش و بروت سے کوئی دلچسپی نہیں۔'' قارئین نے یہ بھی محسوس کیا ہوگا کہ مولانا جہاں ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں وہاں بھی زبان کو تلخ یا درشت نہیں ہونے دیتے۔

نرم زبانی اور زیرِ لب تبسم کی ایک اور مثال دیکھتے چلئے:

ذکر امام شافعیؒ کے مزار کا ہے۔ ''لوگ خود بھی ہاتھوں اور منہ سے جالی کو چومتے ہیں اور اپنے بچوں کو بھی ''تبرک'' کے لئے لاتے ہیں اور جالی سے چمٹا دیتے ہیں۔ یہ بھی دیکھا کہ بہت سے لوگ پرچیاں لکھ کر جالی میں ڈالتے ہیں۔ خیر میں نے فاتحہ پڑھی، جب چلنے لگا تو ایک صاحب تشریف لائے، لمبا کرتا، تُرکی ٹوپی

پہنے، کندھے پر ایک قیمتی شال، صاحب سلامت کے بعد کہنے لگے ''الفاتحہ۔''
عرض کیا گیا کہ ہم لوگ تو فاتحہ پڑھ چکے ہیں تو پھر فرمایا، ''البرکۃ۔'' میں تو اس
اصطلاح کو بالکل سمجھ نہ سکا۔ لیکن ہمارے رفیق و رہنما نے جیب سے چند قرش
نکال کر اُن کے حوالے کئے تو معلوم ہوا کہ ''البرکۃ'' کے معنی انعام و بخشش کے
ہیں، مگر یہ اصطلاح صرف مزارات پر ہی سننے میں آئی۔''

''.......(حکومت نے) امامت کے لئے فاضل ازہر کی شرط لگا کر فضلائے
ازہر کی بے روزگاری کو بھی ایک حد تک دور کر دیا ہے۔''

دینی تعلیم کے فارغین کے لئے بیروزگاری کے مسئلہ سے ہم بھی دوچار ہیں اور یوں تو عصری تعلیم کے منتہی بھی روزگار کی طرف سے یکسو نہیں ہیں۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ پہلی صورت میں امکانات زیادہ بعید ہیں۔

عربوں کے اخلاق کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''عربی زبان میں ملنے جلنے کے متفرق مواقع اور باہمی تعلقات کے ہر موڑ کے
لئے الفاظ موجود ہیں، جب کوئی ملنے والا آئے گا تو اہلاً و سہلاً کہہ کر خیر مقدم
کریں گے، اس کے آنے پر مبارکباد دیں گے، بار بار کیف الحال کہہ کر خیریت
پوچھیں گے۔ اسے یقین دلائیں گے کہ تم تو اپنے گھر ہی میں آئے ہو.... اگر
آپ نے کوئی چیز دی یا کوئی کام کر دیا تو ''شکراً'' کہہ کر شکریہ ادا کریں گے۔
اور اگر آپ نے کسی بات پر شکراً کہا تو ''العفو'' کے لفظ سے اس کا جواب دیں
گے۔'' اور اگر آپ نے پانی پیا تو ھنیأ کہیں گے اور نئے کپڑے پہنے جب بھی
اس کے مناسب دعائیہ جملے استعمال کریں گے۔ غرض ہر موقع کے لئے عربوں
کی زبان میں الفاظ و جملے موجود ہیں جنہیں وہ برابر استعمال کرتے ہیں اور جس
سے محبت اور تعلق کا اظہار ہوتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ مسافر عربوں میں پہنچ کر اپنے کو
اجنبی محسوس نہیں کرتا۔''

اجتماعی نفسیات کی رمز شناسی آپ نے دیکھ لی۔ انفرادی نفسیات سے واقفیت اور کردار شناسی ایک صاحب کی بابت اس جملہ سے ظاہر ہوتی ہے: ''سمجھدار اور ذہین نوجوان ہیں مگر طبیعت میں انفعال زیادہ معلوم ہوتا ہے''۔ کوئی اور ہوتا تو کہتا کہ پیش قدمی یا Initiative کا فقدان ہے۔

امارت شرعیہ کی آبیاری جس طرح مولانا منت اللہ رحمانی نے کی وہ ان کی ملی خدمات کی طویل فہرست میں نشانِ امتیاز رکھتی ہے۔ اس طرح بہار کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد مقدمہ بازی کی بُرائیوں اور تباہ کاریوں سے محفوظ ہوگئی، اسلام کے قریب آگئی اور دین کی ساکھ اپنوں اور بیگانوں کی نگاہ میں قائم ہوگئی۔ یہ نظام ایسا ہے کہ ہر ریاست میں دہرایا جاتا لیکن ہر نظام ایک لائق، دیانت دار اور صاحب نظر سربراہ کا تقاضہ کرتا ہے۔ امارت شرعیہ کی توجہ اس طرف زیادہ زور کے ساتھ دی جانی چاہیئے۔

ان سطور کو پایاں تک پہنچانے کے لئے راقم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کے تعزیتی پیغام سے نقل قول کرے گا۔

> ''اللہ تعالیٰ نے علم و اخلاص، عزم وقوت ارادی، اصابت رائے، توازن واجتماعیت کی ان کی ذات میں ایسی متعدد خصوصیتیں پیدا کر دی تھیں جن کا ایک شخصیت میں بہت مشکل سے اجتماع ہوتا ہے۔ راقم سطور نہ صرف بہ حیثیت صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ (جس کے وہ بانی اور حقیقتاً روح رواں تھے) اور نہ صرف بہ حیثیت ندوۃ العلماء کے ناظم کے (جس کے ان کے عالی مرتبت پدر بزرگوار حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ بانی ومحرک تھے) اور خود مولانا مرحوم اس کے سالہا سال سے ممتاز رُکنِ انتظامی چلے آرہے تھے...... ''پوری ملت کو اس حادثہ (وفات امیر شریعتؒ) پر تعزیت پیش کرتا ہے۔''

⊙⊙⊙

شمس الرحمٰن فاروقی ☆

حضرت امیر شریعت کا ''سفر مصر و حجاز''

مسلمانوں نے جن فنون کو ایجاد کیا یا کثرت سے اختیار کیا، ان میں سفر نامہ بھی ہے۔ آج کل جس طرح کے سفر ناموں کا چلن ہے ان کا مقصد معلومات سے زیادہ تفریح بہم پہنچانا ہوتا ہے۔ جن ممالک یا مقامات کے سفر کا حال آج کل کے سفر ناموں میں درج ہوتا ہے ان کے علمی اور سیاسی حالات سے سفر نامہ نویس بہت کم سروکار رکھتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اب سفر ناموں کا مقصد علمی کوائف بیان کرنا نہیں، بلکہ ہلکی پھلکی معلومات اور ذاتی تاثرات اور شخصی حالات بیان کرنا ہوتا ہے۔ دوسری یہ وجہ بھی ہے کہ زیادہ تر مسافروں کو ان علوم وفنون سے واقفیت کیا، دلچسپی بھی نہیں ہوتی جن کا ممالک غیر میں چرچا ہے۔ لہٰذا سفر نامہ بھی ایک طرح کا افسانوی بیانیہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کا مرکزی کردار خود سفر نامہ نگار ہوتا ہے۔ گذشتہ پندرہ بیس برس میں ایسے سفر نامے کثرت سے لکھے گئے ہیں۔ ابن انشاء کا سفر نامہ ''چلتے ہو تو چین کو چلئے'' آج کل کے غیر رسمی، ذاتی تاثراتی سفر ناموں کا مثالی نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ احتشام حسین کا سفر نامہ ''ساحل اور سمندر، تھوڑا بہت علمی رنگ لئے ہوئے ہے اس میں صاحب سفر نامہ کی متانت اور شرافت نمایاں ہے۔ اگر چہ یہ سفر نامہ موجودہ فیشن کے سفر ناموں سے پہلے کا ہے لیکن اس میں بھی تاریخی اور سیاسی معلومات بہت زیادہ نہیں ہیں۔ مسلمانوں نے جس قسم کے سفر نامے لکھے ان کا

☆ (مشہور نقاد، ادیب) ایڈیٹر ماہنامہ ''شب خون'' الہ آباد

مقصد سیاسی، علمی اور تاریخی جغرافیائی معلومات فراہم کرنا تھا۔ خود صاحب سفرنامہ کے ذاتی تاثرات اور دلی کوائف کا ذکر ان سفرناموں میں کم ہی تھا۔ انیسویں صدی آتے آتے جب مغرب کا غلبہ بلاد اسلامیہ پر بڑھنے لگا تو ایسے سفرنامے لکھے گئے جن میں مغربی ممالک کا حال اس غرض سے لکھا گیا کہ ہمارے یہاں کے لوگوں کو وہاں کے حالات کا براہ راست علم ہو سکے۔ پھر بھی سیاسی و علمی پہلوان سفرناموں میں نظر انداز نہ ہوتا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں لکھنؤ کے ابوطالب اصفہانی نے مغرب کا سفر کیا اور ''مسیر طالبی'' بزبان فارسی لکھی۔ اس کے کئی سال بعد یوسف علی کمبل پوش نے بلادِ مغرب کا سفرنامہ اردو زبان میں تحریر کیا۔ ان تمام لوگوں میں جنہوں نے اٹھارہویں صدی کے اواخر یا انیسویں صدی کے اوائل میں یورپ کا براہ راست مشاہدہ کیا اور اپنے مشاہدات کو تحریر کیا سب سے اہم نام آتا ہے سید علی شیرازی کا جس نے ناصرالدین شاہ قاچار کی طرف سے برطانیہ میں سفارت کے فرائض انجام دیئے اور اپنے سفر وحضر کے حالات ''حیرت نامہ سفراء'' میں لکھے سید علی شیرازی کا انداز پرانے مسلمان سفرنامہ نویسوں کا ہے کہ اس کی دلچسپی سیاسی معاملات ملکی و مالی انتظامات، فوجی حالات اور سائنسی ترقی کے علائم و امثال سے ہے۔ اس سفرنامے کو ترکی، فرانس اور برطانیہ کے تاریخی مصادر میں بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔

آزادی کے بعد برصغیر ہندوپاک سے لوگوں کی کثیر تعداد نے مغرب اور مشرق کے ممالک کا سفر کرنا شروع کیا۔ تجارت، ملازمت، تعلیم کے علاوہ ان اسفار کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ لوگ جو غیر ممالک میں جا کر رہ گئے تھے انہوں نے اپنے لوگوں کو پھر اپنے ثقافتی تشخص کے نمائندوں یعنی شاعروں، موسیقاروں وغیرہ کو اپنے یہاں بلوانا شروع کیا۔ اس طرح ممالک غیر میں اردو کانفرنس، مشاعرہ، ادیبوں کے جشن کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس طرح کے آنے جانے کا لازمی نتیجہ یہ بھی تھا کہ سفرنامے لکھے گئے اور اب بھی لکھے جا رہے ہیں۔

تیسری دنیا کا بڑا حصہ عرب یا عربی بولنے والا، یا اسلامی تمدن کے زیر اثر ہے۔ پٹرول کی سیاسیات اور سرد جنگ، ان دونوں وجوہ سے تیسری دنیا کے ممالک کو دنیا کے سیاسی نقشے پر نئی

اہمیت حاصل ہوئی۔ عرب قومیت اور اسلام سے دلچسپی کے عروج کے باعث بھی مسلمان ملکوں اور غیر مسلمان ملکوں کے درمیان نئے رابطے قائم ہوئے۔ اس تعلق کی بناء پر اہل اسلام کے علماء کے مابین مراسلت و مکالمت بڑھی اور باہم دگر ملنے جلنے کی غرض سے سفر بھی بڑھے۔ محتاط اندازہ بھی کیا جائے تو بھی اس نتیجے میں کوئی شک نہیں کہ گذشتہ تیس برس میں جتنے غیر ملکی سفرار دو والوں نے اور مسلمانوں نے کئے ہیں وہ اس سے پہلے کی ڈیڑھ صدیوں کے سفر کے برابر ہیں۔ اس وقت ہندو پاک میں شاید ہی کوئی مسلمان گھر ہو جس کا کوئی رکن غیر ممالک میں نہ ہو یا جس کے روابط غیر ملک میں رہنے والے کسی شخص سے نہ ہوں۔

حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کا پہلا سفر جو ملک کے باہر ہوا وہ حکومت مصر کی دعوت پر ۱۹۶۴ء میں پیش آیا تھا۔ اس زمانے میں غیر ملکی اسفار کی وہ ریل پیل نہ تھی جو آج ہے۔ لیکن اس سفر کی اصل اہمیت اس وجہ سے ہے کہ حکومت مصر نے جدید مسائل دینیہ کی تحقیق اور ان پر فکر و غور کیلئے عالم اسلامی کانفرنس بلائی تھی اور دنیا کے تقریباً تمام ملکوں سے علمائے اسلام اس میں شریک ہوئے تھے۔ حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، اور مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ نے اس مؤتمر میں ہندوستان کی نمائندگی کی تھی (افسوس کہ آج تینوں مرحوم ہو چکے ہیں)۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جمال عبدالناصر کی قیادت میں تمام عرب دنیا کو مجتمع کرنے کی کوشش ہو رہی تھی۔ سعودی عرب سے جمال عبدالناصر کے تعلقات کشیدہ تھے اور اس لئے بھی جمال عبدالناصر نے کی کوشش تھی کہ اس وقت انہیں عرب دنیا کا سربراہ مان لیا جائے۔ اخوان المسلمون کی طاقت مصر میں کمزور پڑ چکی تھی اور اخوان کو کچلنے میں جمال عبدالناصر نے جو سختی اور درشتی برتی تھی اس کے باعث عامۃ المسلمین میں جمال عبدالناصر کے بارے میں رائے اچھی نہ تھی۔ مصر میں اس وقت جمال عبدالناصر کی کم و بیش شخصی حکومت پورے شباب پر تھی۔ اور اس بنا پر بھی غیر عرب دنیا کے مسلمانوں کو ان سے خاصی مایوسی ہو چلی تھی کہ یہ شخصی حکومت اسلام اور انصاف کی بڑی حد تک نفی کرتی تھی۔ ایسے وقت میں جمال عبدالناصر کی طرف سے مؤتمر اسلامی کا انعقاد سیاسی مصلحتوں سے خالی نہ تھا۔

امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ اگر چہ سیاسی میدان سے دور دور تھے لیکن جس تہذیب اور روایت کے وہ پروردہ تھے اس کے اہم پہلوؤں میں یہ بھی تھا کہ سیاسی شعور کو پختہ اور روشن رکھا جائے اور مذہب اور سیاست دونوں میں اللہ کی مرضی کو مقدم رکھا جائے حضرت امیر شریعت کا سفر سیاسی سفر نہ تھا، اور یہ بات ان کے اخلاقِ حسنہ سے دور بھی تھی کہ وہ ایسے موقعہ پر مصر کے سیاسی نظم ونظام کے بارے میں کوئی تبصرہ کریں۔ لیکن مصر کے سیاسی حالات کے بارے میں کوئی بات نہ کہنا بھی غیر مناسب تھا کہ وہ ایک آزاد شخص تھے اور اسلامی روایات حریت کا پورا پاس رکھتے تھے۔ ان کا سفرنامہ بعنوان ''سفر مصر وحجاز'' پہلی بار ۱۹۶۴ء ہی میں، اور دوسری بار ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ اس میں ان کی زیادہ تر توجہ کانفرنس کے حالات پر رہی لیکن انہوں نے مصر کے سیاسی حالات اور جمال عبدالناصر کی شخصی حکومت پر رائے زنی بھی اشاروں میں کی اور یہ بات صاف ظاہر کردی کہ وہ اس طرز حکومت کو مستحسن نہیں سمجھتے۔ چنانچہ ''مصر کا نیا دستور'' عنوان کے تحت (صفحہ ۱۵۵) فرماتے ہیں کہ جمال عبدالناصر نے ''دستور کی تمام دفعات سنائیں جنہیں پارلیامنٹ نے منظور کیا اور غالباً منظور کرنے کے سوا ان کے لئے کوئی چارہ بھی نہ تھا۔'' یعنی دستور بنایا حکومت کے اہل کاروں نے اور منظور کیا صدر مملکت نے، لیکن اس پر رسمی طور پر مقننہ کی مہر بھی لگادی گئی یا لگوادی گئی۔ اگلے صفحہ پر فرماتے ہیں کہ یہ آئین اسلامی تو نہیں ہیں لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے بہت مایوس کن بھی نہیں ہیں، اور معلوم ہوتا ہے کہ مصر جمہوریت کی راہ اختیار کرے گا۔ گویا حضرت مولانا نے یہ بات واضح کردی کہ مصر کا موجودہ طرز حکومت جمہوری نہیں ہے۔ افسوس کہ اس سفرنامے کے بعد جو تیس برس تقریباً گذرے ہیں ان میں نہ صرف مصر بلکہ کسی بھی اسلامی ملک میں جمہوریت کا بول بالا نہ ہوسکا۔

حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے اس سفرنامے میں مصر کی تعلیم اور طرز تعلیم پر مفصل گفتگو کی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے جزئیات کو بھی خاصی اہمیت دی ہے۔ مثلاً الازہر کے طالب علموں کے لئے جو ہاسٹل انہوں نے دیکھے ان میں غسل خانے اور بیت الخلاء کس طرح کے تھے، اس کا بھی انہوں نے ذکر کیا ہے۔ خاص کر اس بنا پر کہ اس میں استدبار قبلہ کا مسئلہ بھی آجاتا

ہے۔ چونکہ فقہ شافعی میں استقبال واستدبار قبلہ کی کراہت کھلے میدان میں ہے بند جگہ پر نہیں، اس لئے الازہر کے ہاسٹل میں جو بیت الخلاء ہیں ان میں استقبال واستدبار قبلہ کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ اسی طرح حضرت مولانا نے داڑھی کے متعلق مصری علماء کا اجتہاد پیش کیا ہے۔ ہم لوگوں کے عقیدے میں تو حلق لحیہ حرام ہے لیکن مصری کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ کے وہ افعال جو انہوں نے عرب رسم ورواج کے مطابق فرمائے، ہمارے لئے حجت وسنت نہیں ہیں یعنی داڑھی رکھنا، لمبا کرتا پہننا، بکری کا اگلا دست اور کدو کی ترکاری پسند کرنا وغیرہ، یہ سب عربی رسم ورواج ہیں اور ان کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ نے جواب دیا کہ نبیؐ تو ہر وقت نبی ہوتا ہے، اور پھر داڑھی کے لئے تو رسولؐ نے خاص طور پر ہدایت کی ہے۔ بحث کے باوجود نہ مصری قائل ہوئے اور نہ حضرت مولانا۔

''سفر مصر وحجاز'' کا سب سے دلکش پہلو حضرت مولانا کا اسلوب اوران کے کردار کی سادگی ودیانت ہے۔ نثر ایسی لکھنا جو بڑے بڑے الفاظ سے تقریباً عاری ہو، جس میں کسی قسم کی لفاظی اور عبارت آرائی نہ ہو، اور جو تمام مسائل کو بہ وضاحت ادا کر سکے، آسان کام نہیں۔ خاص کر ہمارے روایتی قسم کے علماء سادہ اردو لکھنے سے گریز کرتے ہیں لیکن حضرت مولانا نہایت دل نشیں، چھوٹے چھوٹے جملوں پر مبنی اور بے تکلف لیکن متین نثر لکھتے ہیں۔ اسی طرح حضرت کے مزاج کی سادگی اور دیانت داری بھی فقرے فقرے سے عیاں ہے۔ انہیں یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں کہ میں اس سفر سے پہلے ہوائی جہاز پر کبھی نہیں بیٹھا تھا اور مجھے چکر متلی وغیرہ کا خوف بھی تھا۔ فرماتے ہیں (صفحہ۲۲):

> ''میرے لئے زندگی میں یہ پہلی پرواز تھی۔ بہت کچھ لوگوں سے سن رکھا تھا کہ چکر آتا ہے، متلی ہوتی ہے، نیچے جھانکنے سے خوف معلوم ہوتا ہے۔ ان معلومات کے پیش نظر جیسے ہی جہاز زمین سے بلند ہوا، میں نے تسبیح ہاتھ میں لی اور آنکھیں بند کر لیں۔''

یہ حال پٹنہ سے بنارس تک رہا۔ بنارس سے جب اڑے تو اوسان بحال تھے:

''میں نے ہر طرف دیکھنا شروع کیا۔ نہ چکر ہے نہ متلی، نہ کوئی خوف، میرے خیال میں تو ہوائی جہاز کا سفر بڑا ستھرا سفر ہے۔ نہ گرد و غبار، نہ دھواں، نہ حرکت، اطمینان سے بیٹھے بیٹھے پڑھیے لکھیے۔ نیچے جھانکیے تو نہایت خوش نما منظر سامنے۔''

دیکھیے اس سادگی میں بھی عالمانہ شان کیا خوبصورتی سے ہویدا ہے کہ ہوائی جہاز میں آرام کے ساتھ ساتھ لکھنے پڑھنے کا بھی خیال آیا۔ اسی طرح برٹش کمپنی کے بڑے جہاز کے بارے میں فرماتے ہیں (صفحہ ۲۵):

''جہاز کی ظاہری ہیئت اور اندرونی حصے کا جمال دونوں بس اللہ کی قدرت کا نمونہ تھیں۔''

ہوائی جہاز میں ادائے صلوٰۃ کا مسئلہ بھی اسی سادگی اور علمی شان سے طے ہوا ہے۔ ہر بات نہایت خوبصورت اسلوب سے کہی گئی ہے۔ کہیں کہیں خفیف سی خوش طبعی اور مزاح بھی موجود ہے۔ بالکل نہیں لگتا کہ ہم اتنے بڑے عالم اور مقتدائے زمانہ سے ہم کلام ہیں۔ روانی اور شستگی کا دریا ہے کہ آہستہ آہستہ رواں ہے۔ تکلف اور تصنع کی جگہ بے تکلفی اور شیرینی کا دور دورہ ہے۔ غرض کہ یہ چھوٹی سی کتاب معلومات اور دینی روشنی کے ساتھ ساتھ ادب کا لطف بھی رکھتی ہے۔ یہ ادبی لطف بھی اسلامی طریقہ تعلیم کا فیض ہے کہ یہاں علم اور ادب اکثر یکجا رکھے گئے ہیں۔

⊙⊙⊙

مولانا مفتی عبداللہ مظاہری☆

حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے تعلیمی نظریات

امیر شریعت رابع و جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ کو اللہ پاک نے اپنے فضل خاص سے جن امتیازات وخصوصیات سے نوازا تھا، ان خصوصیات نے انھیں ہم عصروں میں نہایت ممتاز، بزرگوں کی نظروں میں محبوب و معتمد اور چھوٹوں کی نگاہوں میں بزرگ ومحترم بنادیا تھا۔

ایک ایسا شخص جس نے ایک طرف روحانی وخانقاہی بزم سجا رکھی ہو اور دوسری طرف اس کی اجتماعی تحریک اور کوششوں سے پارلیمنٹ کوئی بل واپس لینے پر مجبور ہو، آزاد ہندوستان میں ایسے صاحب تقویٰ، مدبر اور وسیع النظر عالم بہت کم ہوئے ہیں۔ سچ ہے:

لیس علی اللہ بمستنکر

ان یجمع العالم فی واحد

مولانا کی زندگی جہد مسلسل سے عبارت تھی۔ مجھے جبری نسبندی کے خلاف مہدیان دہلی میں منعقد ایک میٹنگ میں حضرت مولانا کی زیارت وملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا جہاں مظاہر العلوم کی طرف سے حضرت مولانا مفتی عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی معیت میں حاضر ہوا تھا۔ مولانا کا باوقار چہرہ اور غیرت وحمیت سے بھرپور مدبرانہ گفتگو اچھی طرح یاد ہے۔

تعلیم سے خاص تعلق

حضرت امیر شریعتؒ نے ایک سرگرم زندگی گزاری۔ وہ بہار اسمبلی کے ممبر بھی رہے اور

☆ مہتمم جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ (گجرات)

مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے پورے ملک کے دورے اور وزرائے اعظم سے ملاقاتیں بھی کرتے رہے۔ لیکن ان سب نشاطات و ہنگامہ خیزیوں کے باوجود علم و تحقیق سے ہمیشہ ان کا رشتہ قائم رہا، بنیادی طور پر وہ علمی خانوادے کے چشم و چراغ تھے، علمی ماحول میں ان کی پرورش و پرداخت ہوئی تھی، ٹھوس علمی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اس لیے تعلیم اور نظام تعلیم ان کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ چناں چہ فراغت کے بعد آپ کی سب سے پہلی تصنیف جو منظر عام پر آئی وہ بھی تعلیم کے تعلق سے تھی۔ اس کا نام تھا "تعلیمی ہند"۔ اس کتاب میں آپ نے زمانۂ قدیم سے بیسویں صدی کے ربع اول تک کی تعلیمی حالت کی تاریخ دلائل و شواہد کی روشنی میں ذکر کی ہے اور ہندوستان میں تعلیمی انحطاط کا ذکر کرنے کے ساتھ ان زیادتیوں اور مظالم کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے جو تفصیلی کی راہ سے انگریزوں نے اسلامیان ہند پر ڈھائے تھے۔

نظریات میں توازن اور اعتدال

حضرت مولانا رحمانیؒ نے ملک کی دو عظیم دینی و فکری دانش گاہوں ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دارالعلوم دیوبند سے کسب فیض کیا تھا۔ آپ بانیٔ ندوہ قطب عالم حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کے لائق فرزند اور شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے تلمیذ رشید تھے۔ دینی علوم میں مہارت کے ساتھ عصری علوم سے بھی واقفیت رکھتے تھے اس لیے تعلیمی نظریات کے حوالے سے آپ کی فکر میں ایک خاص قسم کا اعتدال اور توازن نظر آتا ہے۔ قدیم کی صالحیت کے ساتھ جدید کی نافعیت کے بھی معترف تھے۔ آئندہ سطور میں بعض نظریات پیش کیے جارہے ہیں جن سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔

نصاب تعلیم کے سلسلے میں مولانا کی رائے

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ اس سلسلے میں مولاناؒ کا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا کا نظریہ یہ تھا کہ مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم میں تبدیلی ہونی چاہیے۔ تبدیلی دو طرح کی ہو۔ ایک تو موضوعاتِ درس میں تبدیلی، وہ مضامین جو اصلا دینی مضامین نہیں ہیں وقت اور زمانہ کے تقاضوں کے مطابق انھیں داخل درس کیا گیا تھا، اب آج کے عہد کے تقاضوں کے مطابق ان قدیم موضوعات کو محض ضرورت اور بنیادی تعارف کی حد تک برقرار رکھتے ہوئے ان کی جگہ عصری مضامین کو دی جائے، جن کی آج ضرورت ہے مثلاً منطق قدیم اور فلسفۂ قدیم کو اصلاحات اور بنیادی مسائل کے تعارف کی حد تک برقرار رکھا جائے اور جدید فلسفہ، سائنس، عمرانیات، معاشیات وغیرہ اردو زبان میں حسب ضرورت انگریزی اور ہندی کو مدارس کے نصاب میں ایک خاص حد تک توازن برقرار رکھتے ہوئے متعارف کرایا جائے تا کہ جدید عہد کے علماء اپنے عہد اور عصر کے مسائل و قضایا سے واقف اور ان کو حل کرنے کے اہل ہوں۔ لیکن کسی طرح بھی وہ درس نظامی کی خصوصیات اور دینی علوم سے متعلقات موضوعات میں ترمیم کے لیے تیار نہیں تھے بلکہ اصرار کے ساتھ ان کی رائے یہ تھی کہ قرآن کے مطالعہ اور درس کا حصہ بڑھایا جانا چاہیے۔'' (امیر شریعت نمبر، ص: ۲۷، ۲۸)

قرآنیات پر خصوصی توجہ

یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ مدارس دینیہ میں علوم آلیہ مثلاً نحو، منطق و فلسفہ پر جس قدر توانائیاں صرف کی جاتی ہیں اتنی توجہ اساسی دینی علوم مثلاً قرآن و حدیث کی طرف نہیں دی جاتی۔ تفسیر کے تعلق سے ہمارے یہاں صرف جلالین داخل نصاب ہے۔ اس کے بعد بیضاوی ہوتی ہے، جس میں تفسیر سے زیادہ تحقیق و تدقیق ہے۔ اس سلسلے میں حضرت مولانا کا نظریہ واضح اور قابل عمل تھا کہ ''مدارس عربیہ میں بنیادی ہدف قرآن و سنت ہونا چاہئے اس لئے عربی نصاب تعلیم کے پہلے اور دوسرے سال میں ''تیسیر القرآن'' حضرت مولانا عبدالصمدؒ پڑھائی جاتی، جس کا مطلب یہ تھا کہ جملہ الفاظ قرآنی اور مختلف النوع تراکیب، لغوی تحقیق اور نحوی قواعد کی تطبیق کے

ساتھ طالب علم کے ذہن میں آ جائیں۔ پھر ترجمہ قرآن (پارۂ عم)، ترجمہ قرآن سورۂ بقرہ اور ترجمہ قرآن (باقی اجزاء) اس ترتیب و تدریج کے ساتھ پڑھایا جاوے کہ قرآن اپنی سادہ صورت میں (پیچیدہ بحثوں کے بغیر) طالب علم کے سامنے آ جائے۔ بعد ازاں جلالین و بیضاوی جیسی تفسیریں پڑھائی جائیں جن میں طالب علم متعلقات قرآن سے متعلق پیچیدہ مباحث پڑھے اور قرآن کا تحقیقی علم حاصل کر سکے۔" (امیر شریعت نمبر:۲۹)

دورۂ حدیث دو سالوں میں

کتب حدیث بالخصوص صحاح ستہ کی تدریس کا جو مبارک سلسلہ ہندوستان میں مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے دور سے شروع ہوا تھا اس کو ہمارے مدارس نے الحمدللہ ابھی باقی رکھا ہوا ہے لیکن ظاہر ہے کہ محض ایک سال کی مدت ان کتب کی تدریس اور مباحث فن کے احاطہ کے لیے ناکافی ہے۔ چناں چہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ دورۂ حدیث شریف کے سال ابتدائی چند مہینوں تک تو خوب مبسوط تقریریں ہوتی ہیں لیکن اس کے بعد یہی فکر کھانے لگتی ہے کہ کسی طرح شعبان تک کتابیں مکمل ہو جائیں تو بھلا بے بصیرتی اور افراتفری کے ساتھ محض ایک سال میں حدیث پاک سے مناسبت کس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں حضرت امیر شریعتؒ کی رائے واقعی قابل قدر ہے وہ فرماتے ہیں کہ "دورۂ حدیث شریف کو دو سالوں میں تقسیم کر دیا جائے اور حدیث و علوم حدیث بجائے ایک سال کے دو برسوں میں پڑھایا جائے۔" (امیر شریعت نمبر، ص:۳۰)

اس تجویز پر نہایت سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے اور اس کو روبہ عمل لانے کی ضرورت ہے۔ ہماری گزارش ہے کہ مدارس عربیہ اپنے نظام میں لچک پیدا کریں۔ دورۂ حدیث شریف کے ساتھ سے پہلے بعض وہ مضامین جو عصر حاضر میں اپنی افادیت کھو چکے ہیں ان کی مقدار کم کی جائے اور حدیث شریف کے لیے دو سال مختص کیے جائیں۔

الحمدللہ ہمارے جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ نے بزرگوں کے مشورے سے اس نظام کا اپنے یہاں تجربہ کیا ہے اور اس کے مفید نتائج سامنے آ رہے ہیں۔

طریقۂ تعلیم میں تبدیلی

ہمارے مابین عموماً گفتگو کا محور نصاب تعلیم میں ترمیم واصلاح ہوتا ہے حالاں کہ اس بات کی بھی سخت ضرورت ہے کہ نصاب تعلیم کے ساتھ طریقۂ تعلیم میں تبدیلی لائی جائے بلکہ بعض اوقات نصاب تعلیم سے زیادہ طریقۂ تعلیم کو بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ حضرت مولاناؒ بھی نصاب تعلیم کے ساتھ بہت زیادہ چھیڑ چھاڑ کے حق میں نہیں تھے۔ وہ فقہ اور اصول فقہ میں روایتی طریقہ کے ترک کے بھی قائل نہیں تھے البتہ طریقۂ تعلیم کے حوالہ سے انھوں نے مختلف تجربات کیے۔ اساتذہ کرام کی بہ طور خاص ذہن سازی کی، وہ اس بات کے قائل تھے کہ اساتذہ جو اونچی کتابیں پڑھائیں ان کے پاس ابتدائی درجات کے بھی چند اسباق ہوں اس سے ان کا بنیادی علم تازہ رہے گا اور ذہن میں اعتدال وتوازن باقی رہے گا۔ دارالعلوم دیوبند میں درجہ بندی نہیں تھی کتاب بندی کا طریقہ رائج تھا۔ درجہ بندی کا طریقہ نافذ کرانے میں آپ کی کوششوں کو خاص دخل تھا۔ (امیر شریعت نمبر، ص: ۵۵)

مدارس کے وفاق کی ضرورت

حضرت مولانا کی خواہش تھی کہ مدارس اسلامیہ کا ایک مضمون وفاق قائم کیا جائے جس کے امتحان اور دوسرے نظاموں میں یکسانیت ہو۔ مولاناؒ نے اس سلسلے میں پہل کرتے ہوئے صوبۂ بہار کی سطح پر ''آزاد مدارس امتحان بورڈ'' تشکیل دیا تھا، جس کے ناظم حضرت قاضی صاحبؒ مقرر کئے گئے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت ملکی سطح پر اس طرح کے وفاق کی ضرورت ہے۔ چند سال قبل دارالعلوم دیوبند میں ''کل ہند رابطہ مدارس عربیہ'' کا قیام عمل میں آچکا ہے لیکن رابطہ کے کاموں کو مزید وسعت دینے اور پوری اہمیت کے ساتھ اس کو تحریکی شکل دینے کی ضرورت ہے۔

باصلاحیت افراد کی تلاش

کہیں بھی نظام تعلیم اس وقت تک ٹھوس اور مستحکم نہیں ہوسکتا جب تک کہ خود منتظم کو علم و تحقیق سے لگاؤ نہ ہو اور اس کو باصلاحیت اساتذۂ فن کا پورا تعاون حاصل نہ ہو۔ حضرت مولانا کو اپنے یہاں جامعہ رحمانی مونگیر میں تعلیمی معیار بلند کرنے کے حوالہ سے جو کامیابیاں ملیں ان میں ان دو بنیادوں کو بڑا دخل تھا۔ حضرت مولانا خود اعلیٰ درجے کا علمی ذوق رکھتے تھے اور اس کے علاوہ اساتذہ کے انتخاب میں آپ کا اپنا معیار تھا، قابل اور باصلاحیت لوگوں کی تلاش میں رہتے وہ جہاں کہیں ملتے انھیں ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مفتی ظفیر الدین صاحب مدظلہ العالی ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''خاکسار سے فرما رکھا تھا کہ دارالعلوم میں جو ذہین طلبہ فارغ ہوں ان کی خبر میں مولانا کو کرتا رہا کروں۔ عام طور پر اپنے جامعہ کے لیے ایسے ہی ذہین علماء کا انتخاب فرماتے تھے، جامعہ میں بہت سارے وہی اساتذہ تھے، جن کی میں نے نشان دہی کی تھی۔ صلاحیت علمی کے ساتھ ایک بات یہ بھی ضرور فرماتے تھے کہ آپ اس کو بھی پیش نظر رکھیں گے کہ ان فارغین میں اجتماعی زندگی گزارنے کی پوری صلاحیت بھی ہو، بعض قابل ہوتے ہیں مگر اجتماعی زندگی گزارنے پر قادر نہیں ہوتے ان سے کام نہیں چلے گا۔'' (امیر شریعت نمبر: ص۵۶)

حفظ قرآن کریم پر خصوصی توجہ

حضرت مولاناؒ کو اخیر دور میں حفظ قرآن پر بڑی توجہ تھی، درجۂ حفظ کو بہت ترقی دی۔ (امیر شریعت نمبر: ص۵۳) اس سلسلے میں ہم لوگ خاصی غفلت برت رہے ہیں۔ حفظ قرآن کریم کی ہمارے دلوں میں وہ عظمت نہیں رہی جو ہونی چاہیے تھے، اساتذۂ حفظ کے ساتھ ہمارا رویہ بھی بہت اچھا نہیں ہوتا۔ اس باب میں حضرت مولاناؒ کا نظریہ کیا تھا؟ قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''عام طور پر مدرسوں میں درجہ حفظ کے استاذ کو درجہ عربی کے اساتذہ کے مقابلہ میں ثانوی حیثیت حاصل رہتی ہے۔ حضرت کی تربیت یہ تھی کہ چاہے طلبہ درجۂ حفظ کے ہوں یا درجہ عربی کے، اور اساتذہ درجۂ حفظ کے ہوں یا درجۂ عربی کے سب کی عزت وطاعت برابر ہونی چاہیے۔'' (امیر شریعت نمبر: ص ۳۴)

میں یہاں یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ ہم لوگ قرآن کریم کے حوالے سے ہر اعتبار سے بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ قرآن کریم کی تلاوت ہی کو لے لیجیے۔ مدارس کی اس قدر کثرت اور جگہ جگہ مکاتب کے قیام کے باوجود خصوصاً شمالی صوبہ جات میں اب تک قرآن کریم کو تجوید وصحت کے ساتھ پڑھنے کا رواج نہیں ہوسکا ہے۔ ہماری بڑی بڑی کانفرنسیں ہوتی ہیں لیکن المیہ یہ ہے کہ اسے ایک ذیلی مسئلہ سمجھ کر اس پر قطعاً توجہ نہیں دی جاتی۔ حفظ کی تعلیم پر فارسیت کی چھاپ پائی جاتی ہے۔ المیہ تو یہ ہے کہ ہمارے بعض فضلاء بھی صحیح قرآن نہیں پڑھ پاتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کو پوری اہمیت دی جائے اور اس کو مشن بنا کر پورے ملک میں اس سلسلہ کی کوششیں کی جائیں۔

افراد سازی

حضرت مولانا رحمانیؒ تعلیم برائے تعلیم کے قائل نہیں تھے اور نہ اس بات کے قائل تھے کہ صرف فضلاء تیار ہوں اور انھیں ڈگریاں سونپ دی جائیں بلکہ وہ تعلیم کی راہ سے ایسے افراد تیار کرنا چاہتے تھے جو قوم کے مقتدا ہوں اور ہر شعبۂ حیات میں قوم کی رہنمائی کر سکتے ہوں، ان کی تعلیمی استعداد مضبوط اور ٹھوس ہو۔ مولانا معلم گر تھے۔ مولانا نے اس راہ سے زبردست افراد سازی کی، صرف رجال سازی ہی نہیں بلکہ رجال ساز افراد پیدا کیے۔ قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ، حضرت مولانا محمد ولی رحمانی اور حضرت مولانا نظام الدین مدظلہم اس کی واضح مثالیں ہیں۔

آج المیہ یہ ہے کہ ہمارے مدارس سے طلبہ کی ایک بڑی تعداد فارغ ہوتی ہے، اس کے باوجود کام کے افراد تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ ظاہر ہے افراد بنے بنائے نہیں ہوتے بلکہ

بنانے پڑتے ہیں اس لیے مولانا کی زندگی کے اس اہم پہلو سے سبق لیتے ہوئے افراد سازی اور مردم سازی پر توجہ دینی چاہیے۔

تعلیم کے ساتھ تربیت بھی

حضرت مولانا نے صرف تعلیم کو کبھی کافی نہیں سمجھا بلکہ اس کے ساتھ اپنے یہاں کے متعلمین و معلّمین کی تربیت کا بھی خصوصی خیال رکھتے تھے اگر کوئی غلط بات دیکھتے تو تنبیہ فرماتے۔ ایک بار آپ نے اساتذہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''آپ حضرات اساتذہ اپنی ذمے داری محسوس کریں، تعلیم کے ساتھ تربیت پر بھی دھیان دیں، آج تربیت کا فقدان ہے۔ طلبہ آپ کے پاس امانت ہیں ان پر محنت کی جائے، ساتھ عامۃ المسلمین کی نگاہیں علماء پر رہتی ہیں۔ آپ علماء مستحب و مسنون کا اہتمام کریں تو عام لوگ فرض کی طرف بڑھیں گے۔'' (امیر شریعت نمبر، ص:۳۴۳)

''جامعہ رحمانی میں حضرت کی سرپرستی میں جو مزاج اساتذہ کا بناوہ یہ تھا کہ ہر استاذ اپنے رفیق کار کو اپنا دوست اور معاون سمجھتا رقیب نہیں، اور علم کے باب میں ایک دوسرے سے پوچھنا عار نہیں جانتا تھا، بڑے سے بڑا استاذ اپنے سے چھوٹے استاذ کے سامنے بھری درس گاہ میں کتاب لے کر آجاتا کہ فلاں عبارت سمجھ میں نہیں آتی ہے، بتاؤ اس کا کیا مطلب ہے؟'' (امیر شریعت نمبر، ص:۳۴)

غرضیکہ تعلیم کے باب میں آپ کے جو نظریات ہیں وہ نہایت واضح اور قابل عمل ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان نظریات کو عملاً برتا جائے اور ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اللہ پاک حضرت پر اپنی رحمت خاصہ نازل فرمائیں اور ہم سب لوگوں کو صحیح نہج پر اپنے بزرگوں کے کاموں کو آگے بڑھانے کی توفیق ارزانی کریں۔ آمین

لیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

⊙⊙⊙

مولانا امین عثمانی ☆

شیخ طریقت، عارف باللہ
مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے
سماجی نظریات اور خدمات کی ایک جھلک

ان کی یاد اور ان کا ذکر کس پیرایہ میں اور کس زبان سے کروں، یہ میرے بس کی بات نہیں، ان کی عظمت و بلندی کے شایان شان شاید ایک جملہ بھی نہ لکھ سکوں، مگر چند باتیں یاد آ رہی ہیں شاید ان کے ذکر سے سوچنے اور سمجھنے کی کوئی نئی جہت سامنے آ سکے، ساتھ ہی شیخ طریقت کی زندگی اور ان کے طرزِ فکر پر روشنی پڑ سکے۔

شیخ کے یہاں انسانی اور سماجی خدمت اور مخلوق کی ضرورت کا لحاظ و احساس بہت رہا کرتا تھا، وہ اسوۂ رسول، طریقۂ صحابہ، روش اسلاف کے مطابق ''الخلق عیال اللّٰہ'' کے زریں اصول کے تحت مخلوق کی خبر گیری، انسانوں کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے منصوبہ بند جدوجہد ملت کے مسائل کے حل کے لیے فکر مندی، ارضی و سماوی مصائب و آفات سے متاثر آبادیوں، خاندانوں کی ہر طرح امداد کے لیے ایسی سخت محنت کیا کرتے کہ راتوں کی نیند حرام کر لیتے، مخلوق کی خدمت میں ان کا استغراق و انہماک اتنا زیادہ ہوتا کہ رشک آتا، فسادات سے متاثر مسلمانوں کی قانونی، اخلاقی، مالی، مادی مدد ان کے کیمپوں میں پہنچنا، حالات دریافت کرنا اور متاثرہ

☆ سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) جوگا بائی، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

بستیوں میں جا کر جائزہ لینا ان کا خدمتی انداز تھا۔ میرے مشاہدہ نے تو صرف ایک رنگ و پہلو دکھایا اور ایک جلوہ نظر آیا۔ اسلام میں سماجی خدمات کے تصور اور اس کی ضرورت واہمیت کو جاننے اور سمجھنے کے لیے نیز اس کی وسعت و ہمہ گیری اور مذہب و مسلک و علاقہ سے بلند ہونے کو سماج کے خدمت گار، انسانیت کے دکھ درد کو سمیٹنے والے کے خود اپنے الفاظ میں دیکھئے۔

وہ فرماتے ہیں:

''رفاہی کاموں میں ایک اہم گوشہ مریضوں کی تیمارداری اور علاج ہے، یتیم ہر کوئی نہیں ہوتا، مسکین ہونا بھی ضروری نہیں ہے، لیکن زندگی کے ساتھ مرض کا یارانہ شروع سے چلا آرہا ہے، اور اچھا خاصا مرض کی حالت میں جس بیچارگی سے گزرتا ہے اس کا تجربہ تقریباً ہر شخص کو ہوتا ہے، اس لیے اسلام نے مریضوں کی عیادت، ان کی دلجوئی، ان کی خدمت اور ان کے علاج و معالجہ کو بڑی اہمیت دی ہے، حضور ﷺ نے بھوکے کو کھانا کھلانے اور مریضوں کی عیادت کا حکم دیا ہے، اور حضرت ابو ہریرہؓ نے جو روایت بیان فرمائی ہے اس سے اس سنت کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جلوہ افروز ہوں گے، اور پوچھیں گے، اے انسان! میں بیمار ہوا تھا، تو نے میری عیادت نہیں کی، بندہ عرض گزار ہوگا: خداوندا میں تیری کس طرح عیادت کرتا، تو سارے جہاں کا رب ہے، جواباً ارشاد ہوگا: کیا تمھیں خبر نہیں لگی تھی کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہے، پھر بھی تم نے اس کی عیادت نہیں کی، کیا تم نہیں جانتے کہ اگر تم نے اس کی عیادت کی ہوتی تو مجھے تم اس مریض کے قریب پاتے۔''

وہ سماجی خدمت کے ایک اہم حصہ یعنی بیماروں کے حقوق کے بارے میں فرماتے ہیں:

''مریضوں کی عیادت، ان کی خدمت، ان کا علاج اور ان کے لیے دوا اور دعا کا اہتمام انسانی اور اسلامی ذمے داری ہے۔ اسلام نے انسانی خدمت اور رفاہی کاموں کی اہمیت پر زور دیا ہے، سادگی اور قناعت پسندی کی تعلیم دی ہے، ایثار و

قربانی اور دوسرے کے کام آنے کے جذبہ کو سراہا ہے، اس نے تعلیم دی ہے کہ اپنے آپ پر بوجھ پڑے تب بھی دوسروں کی خاطر ایثار و قربانی سے کام لو: یؤثرون علی انفسہم ولو کان بہم خصاصة جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے بڑے بلیغ انداز میں سمجھایا: ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء (مشکوٰۃ) ''زمین والوں پر تم رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔''

ایک موقع پر اس سے آگے بڑھ کر حضور ﷺ نے فرمایا کہ ساری مخلوق خدا تعالیٰ کی اولاد ہے، اور خدا کی اولاد کے ساتھ جو بندہ بھی اچھا معاملہ کرے گا وہ خدا سے قریب ہوگا۔ بندوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا بڑی نیکی ہے، راستہ میں پڑے کانٹے اور پتھر اگر کسی نے اس نیت سے ہٹا دیے کہ کسی مسافر کو ٹھوکر نہ لگ جائے کسی راہ گیر کے قدم زخمی نہ ہو جائیں تو یہ نہ صرف ثواب کا کام ہے، بلکہ اسے ''ایمان کا حصہ'' قرار دیا گیا۔ مسافر حفاظت و آرام کے ساتھ منزل پر پہنچا کرے، یہ اسلام کی خواہش ہے اور راہ میں پڑی کسی تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا ایمان کا ایک گوشہ ہے۔ یہ مسافر خواہ کسی مسلک و مشرب کا ہو اس کا کوئی بھی مذہب ہو مگر اس کی حفاظت اسلام کا پیغام ہے۔

مذہب و ملت کے فرق سے دور اسلام نے پڑوسیوں کو بڑی اہمیت دی ہے۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے کہ مجھے جبریل نے پڑوسیوں کی اہمیت کچھ اس طرح بیان فرمائی اور ان کے خیال رکھنے کا ایسا حکم دیا کہ مجھے لگا کہ کہیں انہیں ہماری جائداد کا وارث نہ بنا دیا جائے۔ ایک موقع پر حضور ﷺ نے بڑے مضبوط الفاظ میں فرمایا کہ یہ مسلمانوں کے شایان شان نہیں ہے کہ وہ پیٹ بھر کھالیں، اور ان کا پڑوسی بھوکا پڑا رہے۔

اسلام نے سماجی تعمیر اور انسانوں کی ترقی کی ذمہ داری صرف اسٹیٹ پر نہیں ڈالی، بلکہ یہ کامیاب تخیل بھی دیا ہے کہ ہر شخص اپنے اردگرد، پاس پڑوس اپنے

اعزہ واقربا، محتاج اور مسکین کی خبر گیری کرتا ہے، اسلام نے رفاہی اور انسانی ہمدردیوں کے کاموں کے جذبہ کو پھیلانا چاہا ہے۔"

یہ تو شیخ طریقت کے سماجی تصورات پر مشتمل خود ان کے اپنے خیالات تھے، اب ان کی سماجی خدمت سے متعلق صرف ایک دو واقعے سنانے پر اکتفا کرتا ہوں۔

آج سے کم از کم ۳۶ سال پہلے کی بات ہے، آخر شعبان کے دن تھے، خانقاہ میں ہجوم تھا، خلقت کے ازدحام میں ایک عجیب منظر سامنے آیا، شیخ طریقت اپنی مسند سے اپنے مریدین اور ان کو جو کسی نہ کسی غرض اور طلب سے آئے تھے اور ان کو بھی جو کوئی ضرورت و حاجت رکھتے تھے، نام بنام نواز رہے تھے، دعاؤں اور نصیحتوں سے نہیں، کیوں کہ دعائیں اور نصیحتیں، فیوض و برکات تو جاری ہی تھیں، ان کا سلسلہ نہ رکا تھا اور نہ رک سکتا تھا، رقومات اور کپڑے تقسیم کر رہے تھے، اور سب کو حسب حال نواز رہے تھے۔ سادہ انداز، بالکل اندر کے ایک کمرہ میں جہاں جانے کی اوروں کو اجازت نہیں تھی، بڑے بڑے مٹی کے دو تین مٹکے رکھے ہوئے تھے، جس میں شیخ طریقت ملنے والے تحائف و نذرانوں کو رکھوا دیا کرتے تھے، اور اخیر شعبان میں بغیر شمار کیے ہوئے مٹھی کے حساب سے ضرورت مندوں کو دیتے جاتے تھے، یہاں تک کہ رمضان سے پہلے اسے وہ مکمل طور پر خالی کر دیا کرتے تھے، اسی طرح جو کپڑے شیخ طریقت کو تحفے میں ملا کرتے، اسے بھی حفاظت سے رکھوا دیا کرتے اور اخیر شعبان میں مکمل تقسیم کر دیا کرتے، وہ بھی اس طرح کہ اوروں کو یہ محسوس نہ ہو پاتا کہ کسے کیا دیا اور کسے کیا ملا؟

حافظہ بلا کا تھا، ضرورت مند کو فوراً پہچان لیتے اور حاجت مند کی حاجت تاڑ لیا کرتے تھے، ایک شیخ طریقت کی یہ شان اور یہ انداز میرے ذہن میں قائم پیر کے اس تصور سے قطعی مختلف تھا، جسے میں دیکھ رہا تھا، میرا اس زمانہ میں شعبان اور رمضان میں مونگیر میں اپنے اعزہ کے یہاں جانے کا سلسلہ قائم تھا اور خانقاہ میں بھی اپنی کم عمری کی وجہ سے اندر باہر آنے جانے کی اجازت حاصل تھی۔

میں ان سے کئی بار ملا جب وہ اعتکاف میں تھے، انھوں نے نرمی و شیرینی کے ساتھ

فرمایا کہ انسانوں کی خدمت، کمزوروں کی مدد وخبر گیری اوران کو سہارا دینا انبیائی اسوہ ہے۔ان کی سماجی زندگی کی سب سے نمایاں خوبی یہ نظر آئی کہ وہ اہل تعلق کی ضرورتوں اور حالات سے باخبر رہتے، مختلف طریقوں سے کمزوروں اور مجبوروں کی امداد کی سعی فرماتے، خاموشی سے روپے، پیسے، غلے بھجوایا کرتے، غریب ویتیم بچیوں کی شادیوں کے موقعے پر خاص نظم کر کے خاموشی سے متعلق خاندان تک ضروری سامان بھیجا کرتے۔

ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ خادم تو چائے لانے گیا مگر ایک ضعیف العمر شخص کو اس کے علاج کے لیے جو کچھ ان کی جیب میں تھا، انھوں نے سب بغیر شمار کیے دے دیا اور فرمایا: اللہ ناصرو حامی ہو، وہ شخص آبدیدہ ہوا تو شیخ نے فرمایا کہ صبر کرو اللہ مسبب الاسباب ہے۔

پٹنہ میں ایک ریٹائرڈ گورنمنٹ افسر (جن کا انتقال ہوئے عرصہ ہوا) شدید مرض میں مبتلا ہو کر داخل ہسپتال ہوئے تو شیخ طریقت خود عیادت کو گئے اوران کے ہاتھ میں نہایت خاموشی سے ایک لفافہ بطور تعاون پیش کر دیا، مگر اس طرح کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔

ہندوستان میں عہد جدید میں یتیموں کی پرورش کے لیے اب بڑے بڑے ادارے قائم ہو چکے ہیں، لیکن شیخ طریقت جس خاموشی سے بہار کے دور دراز علاقوں کے سینکڑوں یتیم بچیوں اور بچوں کی کفالت کا نظم کرتے تھے اس کا علم تو دوسرے ہاتھ کو بھی نہیں ہو پاتا تھا۔

میرا ابتداء میں یہی گمان تھا کہ حضرت تو صرف وعظ ونصیحت، تقریر و بیان اور دعا وتعویذ تک محدود ہوں گے، لیکن میں نے دیکھا ان کی زندگی سراپا انقلاب و دعوت اور سرتا پا جہاد و عزیمت تھی۔ان میں تضاد نہیں تھا۔ حالاں کہ شخصیتوں کے تعلق سے یہ بات عام ہے کہ ان میں تضادات پائے جاتے ہیں، قول وعمل میں، فکر واقدام میں، ذہن وزندگی میں، لیکن ان کی حیات میں ایک حسین اعتدال وتوازن اور میانہ روی پائی جاتی تھی جو گویا قہاری وغفاری وقدوسی و جبروت سے عبارت تھی۔

ایک بار خانقاہ کی مسجد میں جب وہ معتکف تھے اوراہم خطوط کے جوابات لکھا رہے تھے کہ میں پہنچ گیا، میری طرف ایک سادہ کاغذ بڑھایا اور فرمایا: لکھو ''شجر'' اور پھر فرمایا: شجر کا عدد لکھو،

میں نے کہا: مجھے عدد معلوم نہیں، تو انھوں نے فرمایا: تم کیسے خانقاہی بچے ہو، پھر خود میری مشکل آسان فرمائی اور مجھے طریقہ بتایا اور کچھ ضرب و تقسیم کے عمل سے گزار کر ایک عدد نکالا اور فرمایا کہ یہ عدد ''محمد'' کا عدد ہے۔ پھر فرمایا: اب ''حجر'' سے نکالو، میں نے کہا: یہ بہت مشکل کام ہے، فرمایا: تب تمھارا حساب بہت کمزور ہے، اور دوسری بار پھر انھوں نے اسی ضرب و تقسیم کے عمل سے گزار کر محمد کا عدد نکالا اور کہا: ہر شے سے یہی نکلتا ہے، غور کرو یہ عجب شان ہے۔

دوسرے رمضان کے موقع پر مونگیر ہی میں ایک عزیز کے یہاں شیخ کی دعوت تھی، ان کے وسیع و عریض ڈائننگ ہال میں ہر رنگ کی گڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا، ہر سائز کے مجسمے، خوب صورت الماریوں میں سجے ہوئے تھے، میں نے دیکھا کہ شیخ طریقت نے بغیر کسی تکلف و تمہید کے صاحب خانہ کو ہدایت کی کہ ان سب کا رخ پھیر دیا جائے، چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی تب شیخ تشریف فرما ہوئے۔

مشکل سے مشکل پریشان کن حالات میں بھی وہ اپنے ذہن کو حاضر رکھنے والے، جذباتیت اور سطحیت کو کبھی پاس نہیں پھٹکنے دینے والے، حوصلہ مندی اور بلند ہمتی سے پریشانی کا حل ڈھونڈنے والے شیخ تھے، شیخ کا جلال و جمال دونوں ان کے رخ سے ظاہر ہوتا اور ان کا رعب اسی اعتبار سے ہویدا ہوتا، اسی لیے بہت سے باہمی مسائل تو محض ان کے افہام و تفہیم کے چند جملوں سے ہی حل ہو جایا کرتے تھے۔

ندوہ کی اسٹرائک کے بعد میں سیدھا مونگیر پہنچا، جاتے ہی انھوں نے تمام حالات نہایت تفصیل سے معلوم کیے پھر فرمایا: یہ سب نہیں ہونا چاہیے تھا، یہ سب شیطان اور غرور نفس کا افسوس ناک کارنامہ ہے، نفس بھی انسان کا دشمن ہے جو بہکانے میں کامیاب ہو گیا۔

ایک دلچسپ قصہ یاد آتا ہے کہ میرے بڑے بھائی جو جماعت اسلامی ہند کے رکن ہیں اور بہار کے مشہور عالم مولانا سید عروج احمد قادریؒ کے داماد ہیں، جس زمانہ میں وہ جامعہ رحمانی مونگیر میں انگریزی، سائنس، حساب کے مضامین پڑھایا کرتے تھے، اس زمانے میں انھیں ایک پریشانی لاحق ہوئی یعنی جب وہ رات کو اپنا کمرہ بند کر کے بستر پر لیٹ جاتے تو دیکھتے کہ ان

کی کرسی پر مدرسہ کا ایک طالب علم بیٹھا ہوا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے پڑھاؤ، کمرہ بھی بند ہوتا، ایک دن تو اس کو پڑھا دیا، دروازہ خود بخود کھلا اور وہ چلا گیا، دوسرے دن تو ایک خاص بات یہ ہوئی کہ طالب علم کرسی سمیت کمرہ میں اوپر اٹھتا چلا گیا، تب وہ بہت گھبرائے اور فجر کے بعد ہی شیخ سے ذکر کیا، شیخ نے فرمایا کہ میں رات میں آؤں گا، چنانچہ عشاء کے بعد وہ خود کمرہ میں تشریف لائے اور بہ آواز بلند کہا: اچھے طالب علم استاذ کو پریشان نہیں کیا کرتے، آئندہ ایسی حرکت نہیں ہونی چاہیے اور پھر واپس تشریف لے گئے، چنانچہ اس کے بعد سے سکون رہا۔

شیخ طریقت عارف باللہ کے اندر انسان شناسی اور انسان کی پوشیدہ صلاحیتوں کا ادراک کرنے کا غیر معمولی خاصہ تھا، جس سے وہ کام کے انسانوں کو بہ آسانی چن لیا کرتے تھے، ان کا یہ ملکہ واقعی عجیب وغریب تھا۔

ایک بار کان پور بورڈ کے اجلاس میں سارے مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد وہیں طلاق محل میں کالج کے کمرہ میں تنہا لیٹے تھے کہ میں پہنچ گیا، کہنے لگے کیا کر رہے ہو، میں نے کہا: فلاں ادارہ میں ہوں، فرمایا: عزیزم! کم سے کم آمدنی میں زیادہ سے زیادہ کار آمد اور دیرپا کام کا منصوبہ بنانا بہتر ہوا کرتا ہے، کام، صلاحیت وسکت کے مطابق ہونا چاہیے، میں نے کہا کہ مدارس اور اسکولوں کے لیے کچھ نئی کتابیں تیار کرانے کا کام ہو رہا ہے، فرمایا کہ پہلے مکاتب کو مضبوط کرو، بچے کیا بنیں گے، یہ سوچو۔ غرض مدارس کی تعلیم اور عصری تعلیم، بنیادی تعلیم، نصاب وکتب کے بارے میں جامع گفتگو کی۔

پھر اچانک اٹھ کر بیٹھ گئے، اور فرمایا:

> ''ایک بات یاد رکھو! اپنی ملت سے مانگنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن باہر سے لینے میں بڑے خطرات واندیشے ہیں۔ غیور صوفیاء کے مشرب وروش کو نہ بھولو، عنقریب ہی طلب مال میں خطرناک منافست ومسابقت شروع ہونے والی ہے۔''

میں ان کے خیال کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا، کیوں کہ آج اتنے سالوں کے بیت جانے

کے بعد خانقاہ کی دریوں پر بیٹھے فاقہ مست درویشوں کی باتیں یاد کرتا ہوں اور محوِ حیرت ہوں کہ یہ دنیا کیا سے کیا ہوگئی۔

شیخ طریقت کے چند فرمودات یاد آرہے ہیں، جن کو نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

''حق شناس اور حق پسند بنو۔ اللہ کا جو تم پر حق ہے اسے ویسا ہی ادا کرو جیسا کہ وہ چاہتا ہے۔ خالق کا حق جاننے کے لیے قرآن کا حق ادا کرو، اسے پڑھو، سمجھو اور یاد کرو اور آیات میں غور کرو، کچھ سمجھ میں نہ آئے تو رسول اللہ اور صحابہ کی زندگی سے سیکھو۔''

———— ⊙⊙⊙ ————

مولانا امین عثمانی

مولانا منت اللہ رحمانی رحمہ اللہ کے سیاسی نظریات

مدبر و قائد حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کی امت کے تئیں فکر مندی، امت کے مسائل سے تعلق و باخبری اور امت کے عالمی حالات سے دلچسپی کی چند مثالیں بھی لکھنا ضروری ہے، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ محض ذاکر و شاغل، واعظ و ناصح اور مربی روحانی ہی نہ تھے بلکہ وقت کی نبض پر ان کی انگلیاں تھیں، وہ عالم اسلام کے سیاسی مدوجزر کا خوب گہرائی سے تجزیہ کرتے اور اس پر اپنے ردعمل کا اظہار فرماتے تھے۔

مدبر قائد کی فکر میں ''امتی امتی'' کا تصور، جس میں کلمۂ واحدہ کی بنیاد پر پوری امت کو ایک جسم اور ایک وحدت بنانے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے، اتنی قوت اور طاقت سے پیش کیا گیا ہے کہ گویا وہ ایک عظیم انقلابی تحریک ہے، جسے وہ طوفان بنا دینا چاہتے ہیں:

> ''آں حضور ﷺ نے اس امت کو جو اگر چہ لاکھوں اور کروڑوں افراد پر مشتمل ہو ایک ''وحدت'' اور ''اکائی'' کی شکل میں دیکھنا پسند کیا، جس میں ایک فرد کے دکھ کو پوری امت محسوس کرے اور ساری امت کے افراد مل کر ایک جسم کے مختلف اعضا کی طرح دین کی برتری اور خیر و معروف کی اشاعت اور احکام اسلام کے نفاذ کے لیے متحرک رہیں۔

امت اسلامیہ عالم میں پھیلے ہوئے ان افراد کے مجموعہ کا نام ہے، جو ایک
"یقین" سے وابستگی رکھتے ہیں اور وہ دنیا کے جس کونے میں بھی بستے ہوں" خدا
کی وحدانیت اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت" کا یقین انہیں ایک دوسرے سے
مربوط رکھے، اس لیے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا یقین ہی اس امت کے افراد
کو جمع کرنے والی چیز ہے۔"

امت کے انتشار و بکھراؤ نیز اس کے اسباب و علل پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا ارشاد فرماتے ہیں:

"امت منتشر بکھرے ہوئے افراد اور بھیڑ کا نام نہیں بلکہ امت کے لیے فکری
وحدت اور عمل کی یکسانی ضروری ہے، اس لیے قرآن وسنت کا مطالعہ ہماری
رہنمائی اس طرف کرتا ہے کہ اس امت کے لیے انتشار والی زندگی صحیح نہیں ہے،
ایسی زندگی جس میں افرادامت ایک دوسرے سے مربوط نہ ہوں، پسندیدہ نہیں
ہے، بلکہ ایسی اجتماعی زندگی گزارنی ہوگی، جس میں پوری امت کے فکر و عمل کا
محور "حبل اللہ المتین" یعنی وہ دین مبین ہو جو جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل
ہوا اور باہم فرقہ بندی سے منع کیا گیا ورنہ یہ امت باہمی فرقہ بندیوں میں الجھ کر
اپنی قوت عمل اور اپنا نور یقین کھودے گی اور پھر یہ اس امت کی پسپائی کا پہلا دن
ہوگا۔"

مولانا آسمانی پیغام و کتاب کی حامل امت کے تاریخی نشیب و فراز، مد و جزر کے تاریخی فلسفہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ماضی کا دوسرا نام تاریخ ہے، وہی قوم ترقی کرتی ہے، جو تاریخ کی حفاظت کرتی
ہے، اور اس سے سبق لیتی ہے، آپ کی تاریخ چودہ سو سال پر پھیلی ہوئی ہے۔
اس لانبے عرصے میں ملت اسلامیہ نے بہت سے ملکوں کا سفر کیا ہے، کامیابیوں
اور ناکامیوں کے ان گنت مرحلوں سے دوچار ہوئی ہے، اگر کامیابیوں کی تاریخ

لکھی جائے تو محسوس ہوگا کہ اس ملت نے ہزیمت کی تلخی نہیں برداشت کی ہے اور ناکامیوں کی داستان چھیڑی جائے تو سننے والا اسے مظلوم ملت کہے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کی تاریخ میں کامیابی اور ناکامی ساتھ ساتھ چلتی رہی ہے اور ہر مرحلے میں ''إن مع العسر یسرا'' کا مشاہدہ ہوتا آرہا ہے۔''

حالات و مسائل سے مایوس ہوکر شکست خوردگی کے احساس میں مبتلا امت کو مولانا دو ٹوک الفاظ میں شکست و فتح، عروج و زوال کی حکمت یاد دلاتے ہیں:

''ہماری ابتدائی تاریخ میں اگر غزوہ بدر کی فتح ہے تو غزوۂ احد کا دھچکا بھی ہے، غزوۂ خندق کی احتیاط ہے تو فتح مکہ کا ولولہ بھی ہے، اور پھر اُبلتے ہوئے حوصلوں اور بڑھتے ہوئے قدم کو روکنے کی مثال صلح حدیبیہ بھی ہے۔ یہ چیزیں بتاتی ہیں کہ ملت اسلامیہ نے ابتدا سے خدا پر لازوال یقین، عزم و حوصلہ، صحیح فیصلہ اور استقامت اور ایثار و قربانی کے ذریعہ دشواریوں میں سہولت کی راہ تلاش کی ہے اور ناکامیوں کے درمیان کامیابیوں کو ڈھونڈ نکالا ہے، یہ تاریخ بتاتی ہے کہ ملت اسلامیہ نے کامیابی کے مرحلوں میں اپنے آپ کو قابو میں رکھا ہے، اور جب ناکامی ہوئی تو اس نے اسے راستے کی ایک ٹھوکر سمجھا، ایسی ٹھوکر جو احتیاط کا سبق دیتی ہے، بڑھنے کا حوصلہ بخشتی ہے اور منزل کو پانے کے لیے تازہ عزم پیدا کرتی ہے۔

عہد نبوی کے بعد کی تاریخ بھی گرنے، اٹھنے، سنبھلنے اور بڑھنے کی تاریخ ہے اور ایسی تاریخ اس لیے تیار ہوئی کہ خدا پر یقین اور اسلام سے غیر متزلزل اور وفاداری کے نتیجے میں لوگوں نے حوصلہ نہیں ہارا، وہ جانتے تھے کہ شکست صرف ہارنے کا نام نہیں حوصلہ کھودینے کا نام ہے۔ ان لوگوں نے مشکل حالات میں بھی حوصلہ اور ولولہ برقرار رکھا۔ طویل صلیبی جنگوں اور تاتاری حملوں کے نرغے میں کسی بھی ملت کا باقی رہ جانا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن یہ ملت اسلامیہ کی سخت جانی ہی نہیں قوت

ایمانی تھی، جس نے بدترین دنوں میں بھی حوصلوں کو بلند کر رکھا اور جب حالات
نے پلٹا کھایا تو نور ایمانی کے اثرات دور دور تک محسوس کیے گئے۔''

اسرائیل کے قیام کے بعد ہندوستانی علما سخت ردعمل ظاہر کرتے رہے ہیں، لیکن مولانا
صہیونی تحریک کے اصل نشانہ دراصل سازشی منصوبہ سے پردہ اٹھاتے ہوئے پوری امت کو متوجہ
کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''صہیونی تحریک جو انیسویں صدی کے آخر میں شروع ہوئی اس کا مقصد صرف
فلسطین کو اپنا وطن بنانا نہیں ہے، بلکہ دریائے نیل سے فرات تک اور شمالی حجاز
(جس میں مدینہ بھی شامل ہے) سے لے کر شام کی انتہائی شمالی سرحدوں تک کا
پورا علاقہ عرب مسلمانوں سے چھین کر عظیم اسرائیل اسٹیٹ بنانا ہے۔ یہودیوں
کا وہ منصوبہ جو اسرائیلی پارلیمنٹ کی دیواروں پر نقش ہے، یہودیوں کو ان کی
اصل منزل کی برابر یاد دہانی کراتا رہتا ہے، اس نقشہ کے تحت یہودی مصر سے
ڈیلٹا کا علاقہ، سعودی عرب سے مدینہ طیبہ کا علاقہ، شام، اردن، لبنان اور عراق
کا بڑا حصہ اور ترکی کا مخصوص علاقہ چھین لینا چاہتے ہیں اور اس پورے علاقے
سے وہاں کے رہنے والوں کو جبراً نکال کر دنیا کے مختلف حصوں میں بکھرے
ہوئے یہودیوں کو وہاں لاکر آباد کرنا چاہتے ہیں۔ یہودیوں کا یہ منصوبہ اور
دوسرے مقدس مقامات پر قبضہ کر لینے کے بعد عملاً انھوں نے جن جرائم کا اظہار
کیا ہے، وہ پورے عالم اسلام کے لیے زبردست چیلنج ہے، مقامات مقدسہ کی
بے حرمتی، آثار مطہرہ کی تباہی، اسلامی مآثر اور نشانات کی بربادیاں اور مسلم
ملکوں کے مختلف حصوں پر یہودیوں کا غاصبانہ قبضہ ایسے معاملات نہیں کہ کوئی
مسلمان بھی سکون و اطمینان، آرام و عافیت کے ساتھ خاموش بیٹھ سکے،
مسلمانانِ عالم کو عموماً اور عربوں کو خصوصاً اس نازک موقع پر اپنی ذمے داریاں
محسوس کرنی ہیں، ورنہ انھیں تاریخ کے اندھیرے دور میں گم ہو جانا پڑے گا۔''

مدبر قائد تاریخی تجزیہ پیش کرنے کے بعد عالم اسلام کی ایک بڑی مشکل یعنی دفاعی قوت وطاقت اور صلاحیت کی کمزوری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ پر عمل کئے بغیر فتح ونصرت کا خیال کرنا ایک خواب ہے، جو عام طور پر شرمندہ تعبیر نہیں ہوا کرتا لیکن خدا کو بھول کر صرف ظاہری ساز وسامان پر بھروسہ کرنا کم سے کم ایک مسلمان کو کامیابی سے ہم کنار نہیں کرسکتا، ہماری فوجیں جدید ترین اسلحوں سے لیس ہونے کے ساتھ جب رهبان بالليل اور فرسان بالنهار کا نمونہ ہوں گی تو ہماری ظاہری کم زوریوں اور ناتوانیوں کو پورا کرنے کے لیے فرشتوں کے پرے آئیں گے اور ہم کامیابی سے ہم کنار ہوں گے۔''

صیہونیت کی جڑیں کہاں کہاں ہیں مولانا بہت کھل کر ارشاد فرماتے ہیں:

''یورپین ممالک اور بالخصوص برطانیہ اسلام اور مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن رہے ہیں، اس موقع پر بھی عربوں کو پریشان کرنے کے لیے یہودیوں کا انتخاب کیا کہ یہ قوم اپنی روایتی خصوصیات کے ساتھ ہمیشہ حق وصداقت اور اسلام ومسلمان کی دشمن رہی ہے۔

آج بھی وہ نسخۂ کیمیا (قرآن) ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے، جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عزت دی تھی، پھر کیوں نہ ہم قرآن پاک کی طرف رجوع کریں اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں احکام اسلامی کو نافذ کریں۔''

امت مسلمہ پر تہذیبی اثرات، ثقافتی یلغار اور فکری تبدیلی کا جائزہ لیتے ہوئے نہایت بلیغ اسلوب میں تمام امور کو سمیٹ کر بیان فرماتے ہیں:

''اگر کسی قوم کا علم وفکر اور اس کی تہذیب ومعاشرت اس سے چھین لی جائے اور اس کا ذہن ہی بدل دیا جائے تو وہ امت اپنا وجود کھو بیٹھتی ہے اور ختم ہوجاتی ہے۔''

بلاد عربیہ اور حکومت اسلامیہ اور وہاں کے اقتدار وطاقت کے مراکز اور پالیسیوں پر

تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"پچھلے کئی برسوں سے مسلم ممالک میں جنگ یا سرد جنگ چلتی رہی ہے اور لاکھوں کلمہ گو سیاسی آویزش اور اقتدار کی بلند کرسیوں پر فائز حضرات کی خواہش اور کوشش کے نتیجے میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، اور ایمانی حمیت اور اسلامی اخوت کے برخلاف وہ باہم دست وگریبان ہیں وہ کسی تعمیری اور اعلیٰ مقاصد کے لیے نہیں صرف ہوس ملک گیری اور اقتدار کی خاطر جنگ کرتے رہے ہیں، اس جنگ نے اگر کچھ دیا ہے تو وہ تباہی و بربادی، افلاس و بدحالی، یتیموں کی چیخ اور بیواؤں کی آہ ہے۔ اور دینی قدروں اور اسلامی اخوت کی پامالی ہے۔"

ملت اسلامیہ ہندیہ کو بدلتے ہوئے حالات کے تناظر میں مولانا ایک نئی حکمت عملی اور نئی اسٹراٹیجی اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میں مسلمانوں سے خاص طور پر کہوں گا کہ وہ اپنے مسائل انصاف پسند انسانوں کے سامنے بار بار رکھیں اور انھیں حل کرنے کی راہ تلاش کریں، اس جمہوری ملک میں اپنے حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری، خود اٹھانی ہوگی، جب تک آپ اپنا سماجی اور سیاسی استحقاق اور اپنی ضرورت واہمیت ثابت نہیں کریں گے، حقوق نہیں مل سکتے۔"

وہ صاف صاف اشارہ فرماتے ہیں کہ ملک کی اکثریت میں معتدل مزاج پارٹیوں، گرویوں کو ساتھ لے کر چلنا زیادہ مناسب ہے۔ امت مسلمہ کے تغیر پذیر سیاسی ومعاشی حالات، علمی وفکری تغیرات، نئے نئے ابھرتے رجحانات نیز پیش آمدہ نئے نئے مصائب وآلام پر امت مسلمہ کو قائدانہ انداز سے یہ سبق دے رہے ہیں:

"زندگی ــــ خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی ــــ کی راہ میں دشواریاں آتی ہیں۔ لیکن زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے نئی زندگی اور تازگی کی ضرورت ہے، زندگی حرکت کا نام ہے، جمود اور تعطل موت کی شکلیں ہیں اس لیے اپنے مسائل کے حل

کے لیے مسلسل حرکت اور پیہم جد وجہد ضروری ہے، دشواریاں تو ہیں مگر

یہ زندگی تو پہاڑوں کا سلسلہ ٹھہری

یہاں صعوبت منزل پر روئیے کب تک

زندگی کی راہ کانٹوں سے بھری ہے مگر راستہ یہی ہے، اسی پر چلنا ہے اس لیے عزم وہمت کے ساتھ دامن بچا کر اس راہ پر چلنا ہے۔''

عالمی سطح پر رو بہ زوال انسانی شرافت، انحطاط پذیر اخلاقی نظام کی صورتِ حال پر سخت تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''عوام کی رضا اور مرضیات کے نعروں ہی کا کرشمہ ہے کہ روزانہ کوئی نہ کوئی قانون قابل ترمیم نظر آنے لگتا ہے، مضبوط حقیقتوں کو ہٹا کر نئی حقیقتوں کو ڈھونڈنے کی ضرورت پڑتی ہے اور انسانی عقل کا پیمانہ روز نئی شراب کی تلاش میں دریوزہ گری کرتا نظر آتا ہے، قانون اور اختیار کی نئی تشریح نے ابدی صداقتوں، غیر متزلزل حقیقتوں اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کے وجود کو تسلیم کرنے سے بھی عملاً انکار کر دیا ہے اور رائے عامہ کے نام پر زنا، شراب نوشی، ہم جنسی، اسقاطِ حمل کا قانونی جواز نکالا جا رہا ہے، عدل وانصاف، شرافت نفس اور احتیاط نظر کی نئی تعبیریں تلاش کی جانے لگی ہیں، اس لیے اگر یہ کہا جائے تو حقیقت کو شرمسار نہ ہونا پڑے گا کہ ''عملاً'' قانون، موہوم ضرورتوں اور لامحدود خواہشوں کی مساویانہ تکمیل کا پروقار ذریعہ بنتا جا رہا ہے۔''

مولانا نے محض اس تبصرہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ نئے عالمی قانونی نظریات کو چیلنج کرتے ہوئے فرمایا:

''اب تک کوئی ایسا عامل (Factor) مفکرین قانون نہیں تلاش کر سکے، جو ''ضرورتوں'' کو محدود رکھ سکے اور خواہشوں پر قابو پا سکے۔''

ہندوستانی سیکولرزم کی تشریح کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں یہ صراحت کر رہے ہیں

کہ اقلیتوں کے مذہبی حقوق کو سلب کرنے کی کوشش آمریت قرار دی جائے گی:

''سیکولرزم ایک مصالحتی راستہ ہے، جس کے تحت ریاست کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ عام ملکی معاملات کے لیے قوانین بنائے، بین الاقوامی امور میں حصہ لے، ریاست کے باشندوں کی عمومی زندگی کے مسائل کا حل تلاش کرے اور فرد کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ شخصی اور عائلی زندگی میں ان قوانین کو قبول کرے، جن پر وہ مذہب یا رسم و رواج کی بنیاد پر عمل کرتا رہا ہے!...اگر سیکولرزم کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور قرار دیا جائے اور سیکولرزم کو مسلم پرسنل لا کے خاتمہ کا ذریعہ بنایا جائے تو اسے اکثریت کی ڈکٹیٹرشپ کہہ سکتے ہیں، سیکولرزم نہیں۔''

مولانا آزاد ہندوستان میں ملت کو نئی پالیسی اختیار کرنے کی ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے مختلف فرقوں اور مذاہب کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم کرنے اور باہمی مذاکرات و گفت و شنید سے غلط فہمیوں کو دور کرنے کی اہمیت کی جانب متوجہ کرتے ہوئے اشارہ فرماتے ہیں:

''ملک کے لیے اتحاد اور قومی یک جہتی بڑی اہم ضرورت ہے اور ہندوستان میں آباد مختلف فرقوں کے درمیان دوستی، خیر سگالی اور رواداری کے جذبہ کو فروغ دینا بہترین ملکی خدمت ہے۔''

———— ⊙⊙⊙ ————

پروفیسر بدرالدین الحافظ ☆

مولانا رحمانی کا مقالہ

''خاندانی منصوبہ بندی'' میری نظر میں

راقم الحروف نے حضرت مولانا منت اللہ رحمانی مرحوم کی کوئی زیادہ تحریریں نہیں دیکھیں۔مگر مندرجہ بالا مضمون کے مطالعے سے اندازہ ہوا کہ مرحوم ایک جہاندیدہ مبصر، وقت کی نبض پر ہاتھ رکھنے والے اور موجودہ چیلنجوں کا قرآن وحدیث کی روشنی میں پامردی سے مقابلہ کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھنے والے شخص تھے۔

محترمہ اندرا گاندھی کے دور میں سنجے گاندھی کے ذریعے خاندانی منصوبہ بندی کا سختی سے نفاذ ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یاد کیا جائے گا جب سرکاری ملازمین پرنس بندی کے کیس لانے اور حد یہ کہ اسکولوں میں معصوم بچوں کے داخلوں پرنس بندی کے کیس فراہم کرنا لازمی ہوگیا تو ہر طرف ایک سراسیمگی کی کیفیت طاری تھی۔خاص طور پر مسلمان اس قانون کو قطعا خلاف شریعت سمجھتے ہوئے پریشانیوں کا شکار تھے۔ایسے حالات میں مولانا منت اللہ رحمانی نے اس چیلنج کا جم کر مقابلہ کیا اور ۱۹۷۵ میں اعلان حق کرتے ہوئے خاندانی منصوبہ بندی کے عنوان سے ایسا مدلل اور مسکت جواب لکھا جو آج بھی ایک برہان قاطع سمجھا جاتا ہے۔

مضمون کے آغاز میں مولانا نے منصوبہ بندی کے تین مقاصد بیان کرکے اس کے جوابات تحریر فرمائے ہیں:

☆ ڈائرکٹر معہد التخصص فی اللغۃ العربیۃ-نئی دہلی-۲۵

اس میں پہلا مقصد انسانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی پر روک لگا کر کائنات انسانی کو اس غیر معمولی دھماکہ خیز صورت حال سے بچانا ہے جو آبادی کے غیر متوازن اضافہ سے پیدا ہو سکتی ہے۔

دوسرا مقصد ذرائع ۔ معاش میں عدم توازن اور وسائل معاش کے فقدان کا مقابلہ کرنے کے لیے کثرت آبادی پر روک لگانا ہے۔

تیسرا مقصد اولاد کی کثرت سے عورتوں کی ذہنی اور جسمانی صحت پر پڑنے والے مضر اثرات کو روکنا کیوں کہ کثیر العیال خواتین اپنی صحت خراب کر بیٹھتی ہیں۔ اس لیے بچوں کی پیدائش پر روک لگانا ان کے لیے مفید ہوگا۔

یہ ہیں وہ نقطہ ہائے نظر جو عام طور پر خاندانی منصوبہ بندی کی حمایت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ ان کے جواب میں مولانا فرماتے ہیں کہ اگر مذکورہ نقطہ نظر کو تسلیم کر لیا جائے تو پورے ملک کی آبادی اور اس کے مقابل ذرائع معاش کا اندازہ لگانے کے بعد بسا اوقات موجودہ آبادی کو کم کرنے اگلوں کو پچھلوں کی خاطر جگہ خالی کرنے کے لیے کبھی قتل کا ارتکاب بھی کرنا ہوگا۔ کبھی بیماروں روگیوں کی شفایابی کا انتظام کرنے کی بجائے انھیں موت کے گھاٹ اتارنے میں ہی قوم کا بھلا ہوگا۔ اور پھر یہی نہیں بلکہ پورے ملک کی آبادی کے لیے توالد و تناسل کے پورے نظام کو سرکاری نظام کے تحت دینا پڑے گا، جس پر کڑی نگاہ رکھنی ہوگی تاکہ مقررہ تعداد پر زیادتی نہ ہو سکے۔

اس کے بعد ذرا سوچیے کہ تمام فطری تقاضوں کو پس پشت ڈال کر انسانیت کو برباد کر دینے والے نتائج و عواقب کو کس طرح انسانی عقل برداشت کر سکے گی۔ حیرت کا مقام ہے۔ میرے خیال میں یہ انسان کے حق میں ایسا زہر ہے جسے فطرت سلیمہ کبھی گوارہ نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ اس پورے نظریہ کی بنیاد دو مقدمات پر ہے۔ ایک انسانی آبادی میں غیر محدود اضافہ، دوسرے معاشی وسائل کا محدود ہونا۔

مگر کائنات انسانی کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ روز اول سے انسانی آبادی میں اضافہ

ہوتا رہا ہے لیکن اس کے ساتھ عقل انسانی معیشت کے لیے نئے نئے وسائل کا انکشاف بھی کرتی رہی ہے، اس کائنات میں لاکھوں مخفی خزانے تھے جنھیں عقل انسانی نے گزشتہ صدیوں میں منکشف کردیا ہے، پہلے جن چیزوں کا وہم وگمان بھی نہیں تھا، آج کا انسان ان سے روزمرہ کی زندگی میں فائدہ اٹھاتا نظر آتا ہے۔ اس لیے سرے سے یہ تصور ہی درست نہیں ہے کہ وسائل معاش محدود ہیں۔ دراصل اس طرح کی بات کہنا انسان کی نااہلی کا اعتراف ہے۔ اور انسانی عقل کی فاتحانہ صلاحیتوں اور انسان کی جہد وعمل کی قوتوں پر داغ لگانے کے برابر ہے۔

پھر ان حالات میں کیا یہ صحیح نہیں ہوگا کہ ہم اپنی قیمتی صلاحیتوں کو انسانی آبادی کی حد بندی پر خرچ کرنے کے بجائے چھپے ہوئے وسائل معاش کی کھوج پر صرف کریں کہ یہ انسانی فطرت اور اس کو ملی ہوئی قوت تسخیر کے شایان شان بھی ہے اور اس پر عائد ہونے والی ذمے داریوں سے بھی میل کھاتا ہے۔

اس کے بعد مولانا نئے عقلی دلائل اس طرح پیش فرماتے ہیں:

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے؟ جب بڑھتی ہوئی آبادی ضرورتوں کی ایک فہرست ہمارے سامنے لاکھڑا کرتی ہے تو پھر انسانی ذہن ان ضرورتوں کی تکمیل کے لیے نئی راہیں نکالتا ہے۔ جدید تمدن نے جب تیز رفتار سواری اور باہمی قریبی رابطہ کی ضرورت محسوس کی تو ذہن انسانی نے کائنات میں ودیعت کیے ہوئے قدرتی خزانوں کا انکشاف کرکے ایسی ایجادات کیں جس کی نظیر ماضی بعید میں ملنا مشکل ہے۔

اس کی زریں مثال اس سے بہتر اور کیا ہوگی کہ ۱۸۸۰ میں جرمنی کی کل آبادی ۴۵ ملین تھی اور اس وقت وہاں کی معیشت تنگی کا شکار تھی، لیکن ۳۴ سال بعد جب جرمنی کی آبادی ۶۸ ملین ہوگئی تو اس وقت ان کے معاشی وسائل میں کئی سوگنا اضافہ ہو چکا تھا۔ خاکسار کا خیال ہے کہ اس مثال کے تناظر میں ہم ہندوستان کی پوزیشن پر بھی غور کرسکتے ہیں جو مولانا کی تائید میں ہوگی۔ کیوں کہ ۱۹۴۷ میں تقسیم ملک کے بعد ۱۹۵۱ کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی کل آبادی 36,10,90,000 تھی۔ پھر ۱۹۷۱ میں کل آبادی 54,81,60,000 تک پہنچی اور 2001 میں

102,70,10,000 تک آ گئی ہے۔

اب اس کے مقابلہ میں معاشی ترقی کا اندازہ لگانے کے لیے ہم فی کس آمدنی پر غور کر سکتے ہیں۔ چناں چہ 1971 میں ہندوستان کی فی کس آمدنی-/735 تھی اور 2001 میں آمدنی کا تناسب-/2400 فی کس پہنچ چکا تھا، جو اب 2005 میں اور بڑھ گیا ہوگا۔ بحوالہ N.C.E.R.T. India Pepople and Economy-2003 p.7 اس کے علاوہ اگر ذرائع معاش اور آمدنی کے وسائل پر غور کریں تو تقسیم ہند کے وقت بہت محدود تھے، لیکن اب زندگی کی ضروریات اور وسائل معاش کا شمار کرنا ہی مشکل ہے۔ صرف الکٹرانک، پلاسٹک اور تھرماکول کی ایجاد نے ہزاروں مصنوعات کو جنم دیا ہے۔ جس کے مختلف مراحل سے کروڑوں انسانوں کی روزی روٹی وابستہ ہے۔ اس کے علاوہ اقسام ماکولات، مشروبات، پارچہ جات، ان کی تیاری پھر اندرون ملک اور بیرون ملک ترسیل کے کاموں میں کروڑوں افراد روزی حاصل کر رہے ہیں۔ اس کے بعد میں مولانا مرحوم کے قرآنی دلائل کا خلاصہ پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

قرآن کریم نے بڑے بلیغ انداز میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ خزانہ خداوندی میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے، البتہ ذہن انسانی پر ان خزانوں کا انکشاف ہر عہد کی ضرورت کے مطابق محدود مقدار میں ہوتا رہا ہے۔ و جعلنا لکمْ فیھا معایش و من لستم له برازقین، و ان من شی الا عندنا خزائنه و ما ننزله الا بقدر معلوم یعنی اے انسانو! تمھارے لیے اور ان مخلوقات کے لیے جن کے روزی رساں تم نہیں ہو! ہم نے اس کائنات میں معیشت کے لامحدود وسائل رکھ دیے ہیں۔ ہمارے پاس ہر چیز کے لامحدود خزانے ہیں۔ البتہ ہم ان خزانوں کا انکشاف متعین اور محدود مقدار میں کرتے ہیں۔ اور معیشت کا یہ سامان محدود معلوم مقدار میں نازل کرتے ہیں۔ اس لیے وسائل معاش جو ہمیں محدود دکھائی دیتے ہیں یہ ہماری نظر کا دھوکہ ہے۔ فضل خداوندی جہد و عمل کو ضائع نہیں فرماتا۔

قرآن نے اس کی ایک بڑی حکمت یہ بتائی ہے کہ سامان معیشت کا نزول ہی انسانی فطرت کے مطابق ہے ورنہ یہ انسان جس میں بخل، روک لینے، جمع رکھنے اور کم ہو جانے کے ڈر سے ذخیرہ

اندوزی کا مادہ پایا جاتا ہے، ان غیر محدود وسائل کو پا کر اپنے آپ میں نہیں رہے گا۔ اور اس طرح وہ دنیا میں آنے والی آبادی کے حقوق کو بھی خود ہی کھا جانے کی کوشش کرے گا۔

قل لو انتم تملکون خزائن رحمة ربی اذا لامسکتم خشیة الانفاق و کان الانسان قتورا

یعنی ''اے نبی آپ لوگوں سے فرما دیجیے کہ اگر تم رب کائنات کی رحمتوں کے غیر محدود خزانوں کے مالک بنا دیے جاؤ تو اس ڈر سے کہ کہیں خرچ نہ ہو جائے، روک کر رکھنا شروع کر دو گے کہ انسانی فطرت میں ہی تنگ دلی اور بخل پڑا ہوا ہے''۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن رزق کو قدرت کا عطیہ اور اللہ کا فضل قرار دیتا ہے اور اس کی کھوج اور تلاش کا انسان کو مکلف قرار دیتا ہے۔ اس کے بعد مولانا غریب افراد خاندان کی کفالت اور فضول خرچی سے گریز کرنے کو معاشی خوش حالی کے لیے ضروری قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''دوسری بات یہ کہ افراد خاندان کی معاشی منصوبہ بندی کرتے وقت اعتدال اور میانہ روی اختیار کرنا، فضول خرچی سے پرہیز نیز وسائل معاش کی منصفانہ تقسیم اور مخصوص افراد یا گروہوں میں دولت کے ارتکاز کو روکنا انسان کی معاشی دشواریوں کا بہترین حل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جس آیت میں افلاس اور معاشی عدم توازن کے ڈر سے اولاد کو قتل کر ڈالنے سے منع کیا ہے۔ ٹھیک اس سے پہلے رشتہ داروں، سماج کے کم زور طبقات اور مسافرین کا حق ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ہماری معاشیات کی بنیاد کم زور طبقات کی کفالت، فضول خرچی، نمائش اور اسراف سے پرہیز اور ان اعتدال پر رکھی جانی چاہیے''۔

مولانا کے اس اصول کی تائید میں خاکسار پھر ہندوستانی سماج ہی کی مثال رکھنا چاہے گا، ذرا اپنے گرد و پیش کے مختلف طبقات کی تقریبات اور کھانے پینے پر نمائشی مصارف کے علاوہ پلیٹوں میں بچے ہوئے عمدہ تازہ کھانے کو جھوٹا سمجھ کر پھینک دینے اور ضائع کر دینے میں ہزاروں ٹن غذائی اجناس اور ماکولات و مشروبات کی بربادی کیا معیشت کی تباہی کا سبب نہیں؟

دوسرا مسئلہ: اعلیٰ معیاری زندگی کو خطرہ

اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ غور طلب ہے کہ معیار زندگی خود کوئی واضح اور متعین معیار رکھتا ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ معیار زندگی ایک اضافی حقیقت ہے۔ ہر دور میں وہ بدلتا رہتا ہے۔ ہر سوسائٹی اپنے لیے معیار وضع کرتی ہے۔ ہر شخص خوب سے خوب تر کی تلاش میں مشغول ہے۔

اسی طرح یہ بات خطرناک ابہام کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے کہ آخر انسان کون سے معیار زندگی کے حصول کے لیے آنے والی انسانی آبادی کو روک دینا چاہتا ہے؟ کیا اپنی خوبصورت اور تعیش سے بھرپور زندگی گزارنے کی خاطر آنے والی اولاد کو روک دینے کے ذرائع اختیار کرنا خود غرضی، اخلاقی گراوٹ اور اگلوں کی طرف سے پچھلوں پر صریح ظلم نہیں ہے۔ کیا ایثار و قربانی کے جذبات سے محروم اور اپنی ہوس کی تکمیل میں منہمک یہ انسان، انسان کہلانے کا مستحق ہے؟

خاندانی منصوبہ بندی کا تیسرا مقصد: عورت کی صحت کا خیال

اس سلسلے میں عمومی طور پر یہ کہنا کہ زیادہ اولاد ماں کی صحت کے لیے خطرہ ہے، مشاہدہ کی روشنی میں درست نہیں ہے۔ بعض عورتیں دس بارہ اولاد کے بعد بھی بہترین تندرستی پر قائم رہتی ہیں اور بعض ایک دو بچہ کی بھی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ اس لیے اس کا کوئی کلی قاعدہ نہیں بنایا جاسکتا۔ جس عورت کی صحت کو خطرہ ہو اس کے لیے جائز طریقوں کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ لیکن جو عورت بہ طیب خاطر تندرست و توانا رہتے ہوئے کثرت اولاد کی خواہش رکھتی ہے، اس پر پابندیاں لگانا کھلا ہوا ظلم ہوگا۔

میرے خیال میں اپنے موضوع پر یہ مضمون ایسی جامع کوشش ہے جو آئندہ ہر دور میں اہل علم و دانش اور علمائے امت کی رہنمائی کرتا رہے گا۔

———— ⊙⊙⊙ ————

پروفیسر الطاف احمد اعظمی

مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی شخصیت
''سفر نامۂ مصر و حجاز'' کی روشنی میں

راقم سطور کی بدنصیبی ہے کہ اس کو مولانا منت اللہ رحمانی مرحوم سے دید و شنید کا کبھی موقع نہیں ملا، ان کی کوئی اہم تحریر بھی اس مضمون کے لکھنے کے وقت تک نظر سے نہیں گزری۔ ان حالات میں ان کی علمی شخصیت کی تفہیم کے لیے ضروری تھا کہ ان کی قلمی کاوشوں کی طرف مراجعت ہو۔ کافی غور و خوض کے بعد ان کے ایک سفرنامے ''سفر نامۂ مصر و حجاز'' کا انتخاب کیا گیا۔

مولانا کے اس سفرنامے کا تعلق مصر و حجاز کے ان دو اسفار سے ہے جو انھوں نے بالترتیب مؤتمرِ عالم اسلامی، منعقدہ بتاریخ ۶/ مارچ ۱۹۶۴ء اور مؤتمرِ رابطۂ عالم اسلامی منعقدہ بتاریخ ۱۴/ ذی الحجہ ۱۳۸۳ ہجری، میں شرکت کے لیے کیے تھے۔ یہ سفر نامہ متوسط سائز کے ۱۴۲ صفحات پر مشتمل ہے، آخر میں دو مختصر ضمیمے بھی شامل ہیں۔ اہلِ علم کے نزدیک ایک کامیاب سفرنامے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو پڑھ کر قاری محسوس کرے کہ وہ سفرنامے میں بیان کردہ احوال و مقامات کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ مولانا نے دیباچے میں لکھا ہے:

''میں نے کوشش کی ہے کہ حالات و واقعات اس طرح لکھے جائیں کہ اس کی

اصل تصویر سامنے آ جائے اور پڑھنے والا یہ سمجھے کہ میں خود دیکھ رہا ہوں۔''[۱]

مولانا اپنی اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ انھوں نے جزئیات نگاری میں جس قدر باریک بینی سے کام لیا ہے اور واقعات ومقامات کی تفصیل وتعارف کا کام جس خوبی سے کیا ہے وہ بہت کم سفرناموں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

عام طور پر علماء کی تحریریں، مستثنیات سے قطع نظر، عربی کے بھاری بھرکم الفاظ، مشکل تراکیب اور مترادفات کے کثرتِ استعمال کی وجہ سے ثقیل اور نامانوس ہوتی ہیں۔ لیکن مولانا کا یہ سفرنامہ اس عیب سے خالی ہے، اس کی زبان شستہ اور اندازِ بیان سلیس اور موثر ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

''کونے کونے سے مسلمان علماء وفضلاء اور ان کے نمائندے آئے ہوئے ہیں۔ عجیب منظر ہے۔ کالے، گورے، سرخ، سفید سب ہی جمع ہیں۔ رنگ، نسل، زبان، لباس، سب مختلف، لیکن وحدت کلمہ نے سب کو یکجا کر دیا ہے اور اسلام کے عالم گیر مذہب ہونے کا زندہ ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ سب ساتھ بیٹھتے ہیں، ساتھ کھاتے ہیں، ایک ساتھ نمازیں پڑھتے ہیں اور کل مؤمن اخوۃ اور لافضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی کے پیغام کی تصدیق کر رہے ہیں۔ ایک پر ایک صاحب فضل وکمال موجود ہے۔ یہ افریقہ کے شیخ الاسلام ہیں، جن کے ہاتھ پر سترہ لاکھ عیسائیوں نے قبولِ اسلام کیا، یہ فلسطین اور لبنان شمالی کے مفتی اعظم ہیں، یہ سوڈان کے قاضی القضاۃ ہیں، یہ روس کے مفتی باباخانوف ہیں، یہ لیبیا کے محکمۂ شرعیہ کے رئیس ہیں، یہ لندن کے مسلم ہال کے انچارج ہیں، یہ تیونس کے شیخ ہیں، یہ انڈونیشیا کے مذہبی امور کے ذمے دار ہیں۔ یہ جاپان کے نومسلم ہیں، یہ ہالینڈ سے آئے ہوئے بھائی ہیں، شکل وصورت علیحدہ، زبان ولباس جدا، تمدن و معاشرت الگ لیکن کلمہ سب کا ایک اور ایمان سب کا محمد رسول اللہ پر ہے۔ حنفی

اور شافعی بھی ہیں، مالکی اور حنبلی بھی ہیں، غیر مقلد اور سلفی بھی ہیں، نمازیں چھ سات طرح پڑھی جارہی ہیں مگر ایک جماعت اور ایک امام، امام کبھی حنفی ہے، کبھی شافعی اور کبھی مالکی اور مقتدیوں میں ہر مسلک کے لوگ جمع ہیں لیکن نہ کسی کو کوئی تردد ہے نہ تامل۔[۲]

مولانا کے مزاج میں مزاح کا عنصر بھی شامل تھا، جو سفرنامے میں بعض مقامات پر نمایاں ہوگیا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے:

''لوٹے سے صرف مجھ ہی کو نہیں دوسرے رفقاء کو بھی راحت ملی۔ بعض دفعہ تو ڈھونڈنا پڑتا کہ لوٹا کس کمرہ میں ہے۔ جاپانی نمائندے ڈاکٹر عبدالکریم (نو مسلم) کو لوٹے کا استعمال بہت پسند آیا۔ ایک دن ہم لوگ بازار گئے کہ ان کے لیے ایک لوٹا لیا جائے۔ متعدد دکانوں میں گئے ''ابریق'' کو دریافت کیا مگ ہے، جگ ہے... مگر لوٹا نہیں۔ ایک دوکاندار ذرا منچلا تھا اس سے ابریق کو دریافت کیا گیا، اس نے جواب دیا: الابریق فی اللغۃ لا فی السوق ''لوٹا صرف لغت کی کتابوں میں ملے گا، بازار میں نہیں۔'' تجربہ بھی ایسا ہی ہوا۔ مکانوں میں، مختلف اداروں میں، عوامی جگہوں پر کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کا نظم ہے۔ رفعِ حاجت کے لیے کموڈ ہیں۔ اور استنجا و طہارت کے لیے کہیں فوارہ ہے، کہیں نل میں ربڑ کی نلکیاں لگی ہوئی ہیں، اور مگ اور جگ بھی ہے لیکن مشرق کا امتیازی نشان لوٹا، مصر میں کہیں نہ ملا۔[۳]

مصر ایک قدیم تاریخی شہر ہے، بہت سے مذہبی اور تاریخی آثار آج بھی وہاں اچھی حالت میں محفوظ ہیں۔ ممکن نہیں کہ کوئی مصر جائے اور ان تاریخی مقامات کی دید و زیارت سے محروم رہے۔ مولانا نے بھی ان تاریخی مقامات کو دیکھا لیکن ایک تاریخ داں زائر کی حیثیت سے مثلاً وادی سینا کے ذکر میں لکھا ہے:

''تقریباً چالیس میل جانے کے بعد ''وادی سینا'' شروع ہوگئی اور فلسطین کا ارضِ

مقدس آ گیا۔ یہ وادی تقریباً پانچ سو میل لمبی ہے۔ اسی ارض مقدس سے سینکڑوں انبیاء بنی اسرائیل اٹھے اور ہدایت پھیلائی۔ اور یہی وہ وادی سینا ہے جہاں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا گزر ہوا تھا اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو فاخلع نعلیك انك بالواد المقدس طوی کا حکم دیا گیا تھا اور اسی وادی کے کنارے طور کا وہ پہاڑ ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پروردگار عالم کو دیکھنے کی خواہش کی...الواح وحی لانے کے لیے سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسی وادی سے گزرنا پڑا تھا۔ اور یہی وہ ریگستان ہے، جس سے اسلامی لشکر حضرت عمرو بن العاصؓ (متوفی ۴۳ہجری) کی قیادت میں گزر کر مصر فتح کرنے پہنچا تھا۔''[۴]

قاہرہ کے اس عجائب خانے کا ذکر تو بہرحال ضروری تھا، جس میں اس فرعون کی ممی شدہ نعش آج بھی محفوظ ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے عہد کا فرعون تھا اور جس کی موت سمندر میں غرقابی سے ہوئی تھی۔ مولانا نے فرعون کی ممی شدہ لاش کا ذکر کرتے ہوئے لفظ فرعون کی جو تحقیق پیش کی ہے، اس سے ان کا علمی اور تحقیقی مزاج ظاہر ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اصل میں یہ لفظ ''فارا''، ''ادہ'' تھا۔ مصری زبان میں ''فارا'' کے معنی محل اور ''ادہ'' کے معنی اونچا اور بڑا۔ اس طرح ''فارہ ادہ'' کے لغوی معنی عظیم الشان محل کے ہیں۔ لیکن قدیم مصری اپنی بول چال میں مصر کے بادشاہ کو ''فاراادہ'' کہتے تھے، جیسے خلافت عثمانیہ میں خلیفہ اور بادشاہ کو ''باب عالی'' کہتے تھے۔ کثرتِ استعمال نے ''فاراادہ'' کو فرعون بنا دیا۔ عہد فراعنہ کے ہر مصری بادشاہ کو فرعون کہتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ علیہ السلام کے زمانے میں فرعون یعنی شاہِ مصر ''ابوفس'' تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فرعون کا نام منفتاح تھا۔''[۵]

اس بیان میں حضرت مولانا کو تھوڑا سا تاریخی مغالطہ ہوا ہے۔ حضرت یوسف علیہ

السلام کے زمانے میں مصر کا جو بادشاہ تھا اس کا لقب فرعون نہیں تھا، جیسا کہ غلطی سے بائبل میں بھی لکھا ہے۔ مصر پر اس زمانے میں جس خاندان کی حکومت تھی، وہ مصری تاریخ میں چرواہے بادشاہوں (Hyksos Kings) کے نام سے معروف ہے۔ عرب مؤرخین نے ان بادشاہوں کا ذکر عمالیق کے نام سے کیا ہے۔ یہ لوگ دراصل عربی النسل تھے اور دو ہزار قبل مسیح میں فلسطین وشام سے ہجرت کر کے مصر پہنچے اور مقامی مصری حکومت کو شکست دے کر ملک پر قابض ہو گئے۔ پندرہویں صدی قبل مسیح تک ان کی حکومت قائم رہی۔ اس کے بعد قبطی النسل خاندان برسرِ اقتدار آیا اور اسی خاندان کے حکمرانوں کا لقب فرعون تھا۔

مولانا نے مصر کے مشہور تاریخی شہر اسکندریہ کی بھی سیر کی اور اس کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اسی عمارت میں رومی عہد کا قدیم اور قیمتی کتب خانہ تھا، جس میں علوم وفنون کی دو لاکھ چرمی کتابیں تھیں، جس کے متعلق تیرہویں صدی عیسوی میں بعض عیسائی مؤرخین نے ایک روایت وضع کر کے سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اس قدیم اور قیمتی کتب خانہ کے برباد کرنے اور جلانے کا الزام لگایا ہے...اس مسئلہ پر مؤرخین نے سیر حاصل بحثیں کی ہیں...واقعہ یہ ہے کہ اس کتب خانہ کا بڑا حصہ سیزر کے عہد میں اور بقیہ حصہ ۳۹۱ء میں تھیوڈوسس کے زمانے میں برباد ہو چکا تھا اور جل چکا تھا۔''[۱۶]

اس سفرنامے میں مولانا نے مصر کے مشہور علماء وفضلاء، اس کے علمی مراکز اور اس کے تعلیمی نظام کا ذکر تفصیل سے کیا ہے، بالخصوص جامعہ ازہر کے ذکر میں زیادہ دلچسپی ظاہر کی ہے، جو بالکل واضح ہے۔ مصر کی مشہور خاتون دکتورہ عائشہ بنت الشاطی سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے:

> ''یہ ڈاکٹر عائشہ پی ایچ ڈی ہیں۔ کالج میں پروفیسر ہیں۔ مصر کی مشہور صاحب قلم ہیں اور اب دینیات پر بھی لکھتی ہیں۔ ان سے سوال کیا گیا کہ ان القران

انزل علی سبعة احرف کا کیا مطلب ہے؟ جواب دیا: ای علی سبع قراء ات و سبع لهجات التی کانت جاریة علی لسان العرب عرض کیا گیا کہ احادیث بتلاتی ہیں کہ فرق صرف لہجہ کا نہیں، الفاظ کا بھی تھا۔ ایک روایت میں ''عصیا، دوسری میں عتیا'' آیا ہے۔ دکتورہ نے کہا کہ قرآن پر حدیث کو حجت نہیں بنایا جا سکتا۔[۷]

اس گفتگو سے بالکل واضح ہے کہ تفہیم قرآن میں حدیث کی حیثیت کے بارے میں ہندی اور مصری علماء کے مابین اصولی اور فکری بعد ہے۔

مولانا نے برسبیل تذکرہ بعض فقہی مباحث کو بھی چھیڑا ہے، مثلاً داڑھی کی شرعی حیثیت اور مسئلہ اجتہاد۔ مصر اور دیگر عرب ممالک کے علماء اور قراء عام طور پر داڑھی نہیں رکھتے۔ سید قطب شہیدؒ جس پائے کے عالم مفسر قرآن اور ادیب تھے اس سے اہل علم بہ خوبی واقف ہیں لیکن وہ بھی داڑھی نہیں رکھتے تھے۔ مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ مصر کے مشہور قاری عبد الباسط عبد الصمد سے ملے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ بے ریش ہیں۔ اس حیرت کا اظہار انھوں نے ان لفظوں میں کیا ہے:

> ''خیال ہوا کہ قاری عبد الباسط عبد الصمد سے ملاقات کی جائے کہ ان کی تلاوتِ قرآن نے ایمان کو تازگی بخشی ہے۔ ہم لوگ سنتوں سے فارغ ہوئے پھر بھی دیکھا کہ ان پر مصافحہ کرنے والوں کا ہجوم ہے۔ خیر کچھ دیر کے بعد ان سے جا کر ملا۔ اس وقت میرا بھی وہی حال ہوا جو رقص کے بعد اپنے پیروں کو دیکھ کر مور کا ہوا کرتا ہے۔ ازہر کا فاضل، مصر کا مشہور حافظ و قاری لیکن اسے بھی ریش و بروت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''[۸]

الجزائر کے شیخ نعیم النعیمی سے ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے:

> ''ملاقات کے بعد انھوں نے مجھ سے ہندوستان کے تعلیمی حالات پوچھے۔

میری سند حدیث معلوم کی، وہ حضرت شاہ عبد الغنیؒ سے اوپر واقف تھے۔ پھر انھوں نے مسلسلات کے بارے میں دریافت کیا اور مجھ سے حدیث کی اجازت چاہی۔ میں نے تبرکاً حدیث انما الاعمال بالنیات الٰی آخرہٖ پڑھی اور اجازت دی۔ ریش و بروت سے یہاں بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔"[۹]

داڑھی کے سلسلے میں عرب علماء کی اس روش سے مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ سخت کبیدہ خاطر ہوئے۔ انھوں نے لکھا ہے:

"عوام تو عوام مصر کے علماء و مشائخ نے بھی داڑھی کے معاملہ میں ایسا رویہ اختیار کیا ہے کہ گویا اس کا منڈانا ہی اصل ہے۔ اور شاید رکھنا بہتر نہیں۔ ایک فاضل ازہر سے بات ہوئی تو میں نے عرض کیا: آپ حضرات نے تو داڑھی کے معاملے میں قلب موضوع کر رکھا ہے۔ علماء تو علماء، مشائخ طریقت بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ فرمانے لگے: ہمارے خیال میں رسول اللہ کے وہ اعمال و افعال جو آپ نے ایک عرب ہونے کی حیثیت میں فرمائے وہ سنت نہیں اور نہ دین کے باب میں حجت ہیں۔ ہاں جو کام آپ نے نبی ہونے کی حیثیت سے انجام دیے ہیں وہ یقیناً مسنون ہیں، اور دین کے لیے حجت ہیں۔ اب یہ لمبا کرتا پہننا، کمبل اوڑھنا، داہنے ہاتھ سے کھانا کھانا، کھانے میں کدو یا بکری کا اگلا دست پسند کرنا، داڑھی رکھنا وغیرہ عرب کا شعار و طریقہ تھا۔ ان کاموں کو آپ بھی عرب قوم کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے انجام دیا کرتے تھے یا اپنے ذاتی ذوق کی بنیاد پر فرمایا کرتے تھے۔ ان چیزوں کو مسنون یا دینی کام نہیں کہا جا سکتا ہے۔"[۱۰]

حیثیتِ نبی کی یہ تعریف مولانا منت اللہ صاحب کے نزدیک صحیح نہ تھی، انھوں نے جواباً فرمایا:

''اولاً تو آپ نبی تھے اور ہر وقت، ہر جگہ اور ہر حیثیت میں نبی تھے۔ نبوت کو کسی وقت بھی آپ سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ آپ کی پوری زندگی، خلوت کی ہو یا جلوت کی، خانگی ہو یا بیرونی، ذاتی ہو یا اجتماعی اور عوامی، انسان کے لیے اسوہ اور نمونہ تھی اور پھر داڑھی کے معاملے میں تو یہ ہے کہ آپ نے خود رکھی اور قوم کو داڑھی کے بڑھانے کا حکم دیا۔ اگر آپ کا فعل محض ذاتی تھا یا عرب کے شعار و رواج کے تحت تھا تو آپؐ نے دوسروں کو داڑھی بڑھانے کا حکم کیوں فرمایا:''[۱۱]

داڑھی کے معاملے میں ازہری فاضل اور مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ کے اس اختلاف کو پڑھ کر راقم کا ذہن اس مذہبی مناقشہ کی طرف پھر گیا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں یہودی علماء اور ان کے پیروؤں کے درمیان پیش آیا۔ نزاع یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شاگرد ہاتھ دھوئے بغیر کھانا کھالیا کرتے تھے۔ علماءِ یہود نے اس خلافِ سنت عمل پر احتجاج کیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اس کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا:

''تم اپنی تاویل (روایت) سے خدا کا حکم کیوں ٹال دیتے ہو، کیوں کہ خدا نے فرمایا ہے تو اپنے باپ کی اور ماں کی عزت کر، اور جو ماں باپ کو برا کہے وہ ضرور جان سے مارا جائے، مگر تم کہتے ہو کہ جو کوئی باپ یا ماں سے کہے کہ جس چیز کا تجھے مجھ سے فائدہ پہنچ سکتا تھا وہ خدا کی نذر ہو چکی، تو وہ اپنے ماں باپ کی عزت نہ کرے۔ پس تم نے اپنی تاویل سے خدا کا کلام باطل کر دیا، اے ریا کارو، یسعیاہ نبی نے تمھارے حق میں کیا خوب نبوت کی ہے، یہ امت زبان سے تو میری عزت کرتی ہے مگر ان کا دل مجھ سے دور ہے، اور یہ بے فائدہ میری پرستش کرتے ہیں کیوں کہ یہ انسانی احکام کی تعلیم دیتے ہیں۔''[۱۲]

اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام نے مزید فرمایا:

''سنو اور سمجھو، جو چیز منہ میں جاتی ہے وہ آدمی کو ناپاک نہیں کرتی مگر جو منہ سے نکلتی ہے وہ آدمی کو ناپاک کرتی ہے... جو پودا میرے آسمانی باپ نے نہیں لگایا ہے جڑ سے اکھاڑا جائے گا، انھیں (فریسیوں) چھوڑ دو، وہ اندھے راہ بتانے والے ہیں، اور اگر اندھے کو اندھا راہ بتائے گا تو دونوں گڑھے میں گریں گے۔''[۱۳]

اس تمثیل کو سن کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شاگرد پطرس نے کہا: ''یہ تمثیل ہمیں سمجھا دے۔'' آپ نے فرمایا:

''کیا تم بھی اب تک بے سمجھ ہو؟ کیا نہیں سمجھتے کہ جو کچھ منہ میں جاتا ہے وہ پیٹ میں پڑتا ہے اور مزبلہ میں پھینکا جاتا ہے، مگر جو باتیں منہ سے نکلتی ہیں وہ دل سے نکلتی ہیں اور وہی آدمی کو ناپاک کرتی ہیں، کیوں کہ برے خیال، خوں ریزیاں، زناکاریاں، حرام کاریاں، چوریاں، جھوٹی گواہیاں، بدگوئیاں، دل ہی سے نکلتی ہیں جو آدمی کو ناپاک کرتی ہیں، مگر ہاتھ دھوئے بغیر کھانا آدمی کو ناپاک نہیں کرتا۔''[۱۴]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس تمثیلی تعلیم کے ذریعے دین کی اساسی اور فروعی باتوں کے درمیان فرق اور دین میں ان کی حیثیت کا ذکر جس حکیمانہ طور پر کیا ہے، اس کو اہل نظر بہ خوبی سمجھ سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں صحیح مسلم کی درج ذیل حدیث بھی کافی اہمیت رکھتی ہے:

ان اللّٰہ لا ینظر الی صورکم و اموالکم ولکن ینظر الی قلوبکم و اعمالکم[۱۵]

''اللہ نہ تمہاری صورتوں کو دیکھتا ہے اور نہ تمھارے اموال کو، وہ صرف تمھارے قلوب اور اعمال کو دیکھتا ہے۔''[۱۶]

اس مؤتمر میں کئی مقالے مسئلہ اجتہاد پر پڑھے گئے اور اس خیال کا اظہار کیا گیا کہ اجتہاد کا

دروازہ آج بھی کھلا ہوا ہے۔ایک ایسے ہی مقالے کا ذکر کرتے ہوئے مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ نے لکھا ہے:

> ''شام کے اجلاس میں تیسرا مقالہ ''الاجتہاد ماضیہ وحاضرہ'' شیخ نورالحسن نے پڑھا۔اس مقالہ میں فاضل شیخ نے اجتہاد کے معنی، اس کی شرطیں، مجتہدین کی تعریف، رسالت مآب ﷺ، صحابہؓ کرام اور تابعین کے اجتہادوں کی مثالیں، اور اس کے بعد اجتہاد کے اقسام کو بیان کیا اور کہا کہ اجتہاد فی الفتویٰ اس دور میں ہوسکتا ہے اور ہونا چاہیے۔اجتہاد کا دروازہ اب بھی کھلا ہے اور یہ موجودہ مشکلات کا حل ہے۔لیکن آخر میں فاضل شیخ نے قاضی شوکانی کا قول نقل کردیا کہ تقلید گم رہی ہے۔اور پھر اپنی یہ رائے دی کہ ''الاجتہاد مفتوح الی قیام الساعۃ'' مقالے کے اس حصے نے مجمع میں اچھا خاصا ہیجان پیدا کردیا۔''[۱۷]

حقیقت یہ ہے کہ اجتہاد[۱۸] کے باب میں اکثر علماء کا رویہ قابل اعتراض ہے۔وہ کہتے ہیں کہ موجودہ حالات میں اجتہادِ مطلق کی گنجائش نہیں ہے۔نئے مسائل کا حل صرف اجتہاد فی الفتویٰ کی بنیاد پر نکالا جاسکتا ہے۔لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔اجتہاد فی الفتویٰ سے نئے مسائل کا حل نکالنا بہت مشکل ہے۔یہ تو تقلید ہی کی ایک صورت ہے۔سوال یہ ہے کہ اگر اسلام کی ابتدائی چار صدیوں میں اجتہادِ مطلق جائز تھا تو اب ناجائز کیوں ہوگا، جب کہ پہلے کے مقابلے میں اس وقت نئے مسائل زیادہ پیدا ہوئے ہیں اور قدیم مسائل کے فقہی حل بھی عصری حالات میں تسلی بخش نہیں ہیں اور نئے اجتہاد کے طالب ہیں۔

مولانا منت اللہ رحمانی ایک وسیع النظر عالم تھے۔حالات میں تبدیلی کے پیشِ نظر وہ اجتہاد کی ضرورت کو محسوس کرتے تھے۔سفرنامے کے آخر میں جو ضمیمہ (الف) ہے، اس میں انھوں نے لکھا ہے:

> ''شرعی اصولوں کو سامنے رکھ کر مسائل کا استخراج کرنا ہوگا اور نئی باتوں کا جواب دینا ہوگا... اس مشکل کا یہ حل کہ فقہائے اسلام کی مدونہ فقہ کو ہر مسلمان کے لیے

عام کردیا جائے اور جس مسئلہ میں جون سی فقہ مشکل کو حل کرتی ہو اسے اختیار کرلیا جائے، ہمارے خیال میں اس طریق کار سے ہماری دقتیں حل نہ ہوں گی۔ آج بھی ایسے مسائل ہیں، جن میں تمام فقہاء کی فقہ خاموش ہے۔ اور زمانہ کی ترقی اور انقلاب کی رفتار اتنی تیز ہے کہ اگر آج ہم کو مشکلات کا حل کسی نہ کسی فقہ میں مل جاتا ہے تو کل یقیناً نہیں ملے گا اور تمام فقہ ساکت نظر آئیں گی۔ اس لیے اگر اسلام ہر زمانہ اور ہر مکان کے لیے ہے اور قیامت تک کے لیے ہے اور اگر محمد ﷺ کی بعثت عالمگیر ہے اور آپ کی لائی ہوئی کتاب رہتی دنیا تک کے لیے نور اور ہدایت ہے تو اجتہاد کا دروازہ کھولنا ہوگا۔ اس کے بغیر ہماری مشکلات کا حل شاید نہ ہوسکے۔ لیکن ہاں یہ دروازہ اس طرح نہ کھولا جائے کہ دین میں ہمارے ذاتی اور شخصی رجحانات داخل ہو جائیں۔ کتاب اللہ سنت رسول اللہ اور آثارِ صحابہ سے صحیح طور پر استدلال کرتے ہوئے مسائل کے جوابات دیے جائیں۔[۱۹]

عام طور پر اس سلسلے میں علماء کی طرف سے ایک عذر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ موجودہ عہد میں اجتہاد مطلق کی شرطوں کا کسی ایک فرد میں مجتمع ہونا ممکن نہیں ہے اس لیے اجتہاد کا دروازہ کھولنے میں بہت سے مفاسد کا اندیشہ ہے۔ اگر اس دلیل کو صحیح مان لیا جائے تو بھی اجتہاد کی ضرورت اپنی جگہ باقی رہتی ہے اور اس سے چشم پوشی ممکن نہیں ہے۔ اس دشواری کا حل یہ ہے کہ انفرادی اجتہاد کے بجائے اجتماعی اجتہاد کو رواج دیا جائے۔ اس کام کو علماء کی ایک ایسی جماعت انجام دے جو کلی طور پر اجتہاد مطلق کی شرطوں کو پورا کرتی ہو۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہر عہد میں زندہ مجتہد مطلق کی ضرورت ہے، وفات یافتہ مجتہد کی پیروی صحیح نہ ہوگی اس لیے کہ مسائل فرعیہ کے استخراج میں احوال و ظروف کی جو رعایت مطلوب ہے وہ اس صورت میں ناممکن ہے۔ یہاں اس مسئلے پر اس سے زیادہ گفتگو کی گنجائش نہیں ہے۔

معلوم ہے کہ مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ خانقاہ رحمانی مونگیر کے سجادہ نشین تھے اس

لیے قدرتی طور پر اس سفرنامے میں تصوف کی چند جھلکیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ایک مقام پر مولانا لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر عبدالحمید محمود ازہر کے فاضل ہیں اور جرمنی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے اور اس وقت ازہر میں پروفیسر ہیں۔ موصوف کے بارے میں معلوم ہوا کہ چند سال پہلے تک ان پر بھی عام مصری شیوخ وعلماء کی طرح تجدد اور مغربیت کا بڑا غلبہ تھا لیکن چند سال ہوئے انھیں تصوف کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا اور اہل دل کی صحبت میں آمد ورفت ہوئی تو اب ماشاء اللہ دور ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ پر دین غالب آ گیا ہے۔''[۲۰]

امام بوصیری، صاحبِ قصیدہ بردہ کا مزار شہر اسکندریہ میں ہے۔ مولانا نے اس شہر کی زیارت کے دوران ان کے مزار پر حاضری دی اور اپنے قلبی تاثرات ان لفظوں میں لکھے ہیں:
''یہاں (مسجد بوصیری) نماز میں بھی اور امام بوصیری کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے وقت بھی بہت دل لگا۔''[۲۱]

سفرنامے کا دوسرا حصہ یعنی سفر حجاز بہت ہی مختصر ہے، یعنی کل بارہ صفحات۔ اس میں قابل ذکر بات مدینہ طیبہ کی زیارت ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''الحمدللہ پندرہ دنوں کے قیام مدینہ میں نہ کوئی جماعت چھوٹی اور نہ صبح وشام کی حاضری اور صلوٰۃ وسلام میں فرق آیا۔ اپنا معمول بنالیا تھا کہ تہجد کی اذان کے وقت مسجد نبوی میں حاضر ہوتا اور اشراق کے بعد صلوٰۃ وسلام پڑھ کر واپسی ہوتی۔ قیام مدینہ کے دوران رحمۃ للعالمین ﷺ کی جو عنایتیں اور شفقتیں اس تباہ حال اور سیاہ کار راقم الحروف پر رہیں اس کا شکر ادا نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جو کچھ ہوا وہ آپ کی شان رحمت کے مناسب تھا، مجھ جیسا تباہ حال اس کے لائق نہ تھا۔''[۲۲]

بہرحال ''سفرنامہ مصر وحجاز'' کی اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ یہ سفرنامہ علمی اور تاریخی

دونوں اعتبار سے ایک اچھا سفرنامہ ہے۔اس سفرنامے میں مولانا کی بوقلموں شخصیت پوری طرح نمایاں ہے، جس کی ایک ہلکی سی جھلک اس مختصر مضمون میں دکھائی گئی ہے۔اس کوشش میں راقم کہاں تک کامیاب ہوا اس کا فیصلہ قارئین ہی فرمائیں گے۔

⊙⊙⊙

ماخذ وحواشی

۱۔ سفرنامۂ مصر وحجاز، پیش لفظ
۲۔ ایضاً،ص ۱۶،۱۵
۳۔ ایضاً،ص ۳۲
۴۔ ایضاً،ص ۹۹
۵۔ ایضاً،ص ۱۱۷
۶۔ ایضاً،ص ۱۰۶، ۱۰۷
۷۔ ایضاً،ص ۳۵
۸۔ ایضاً،ص ۴۸، ۴۹
۹۔ ایضاً،ص ۷۲
۱۰۔ ایضاً،ص ۴۹
۱۱۔ ایضاً،ص ۴۹، ۵۰
۱۲۔ کتاب متی، باب ۱۵: ۳ تا ۲۰
۱۳۔ ایضاً
۱۴۔ ایضاً
۱۵۔ حدیث کے الفاظ صحیح ہیں اور ترجمہ درست، لیکن اس سے داڑھی سے معری ہو جانے کی گنجائش نہیں نکالی جاسکتی، اگر یہ طریقہ استدلال درست سمجھا جائے تو سر مد کے برہنہ جسم کے لیے حدیث کا سہارا لیا جائے گا اور پھر حدیث کے لفظ "اموالکم" کے پیش نظر کوئی یہ استدلال بھی کرسکتا ہے کہ زکوۃ کی ادائیگی ضروری نہیں ہے۔(مرتب)

۱۶۔ صحیح مسلم

۱۷۔ سفرنامہ مصر وحجاز، ص۲۳،۲۴

۱۸۔ اجتہاد کے لغوی معنی بہت زیادہ کوشش کرنے کے ہیں، اور اصطلاحاً احکام فروعی کو کلیاتِ اربعہ (کتاب وسنت، اجماع، قیاس) کے ذریعے جہد کامل کے ساتھ نکالنے کا نام اجتہاد ہے۔ اصول کی کتابوں میں شرائط اجتہاد میں پانچ چیزوں کا علم ضروری قرار دیا گیا ہے:

(۱) اجتہاد کرنے والا قرآن وحدیث میں مذکور احکام کا علم رکھتا ہو۔

(۲) اجماع کے مواقع اور قیاس صحیح کی شرطوں کا علم رکھتا ہو۔

(۳) علم عربیت۔

(۴) ناسخ ومنسوخ کا علم۔

(۵) راویوں کے احوال وکوائف کا علم (تفصیل کے لیے دیکھیں عقد الجید، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، ص۳)

۱۹۔ سفرنامۂ مصر وحجاز (ضمیمہ الف)، ص۱۸۷،۱۸۸

۲۰۔ سفرنامۂ مصر وحجاز، ص۲۵

۲۱۔ ایضاً، ص۱۰۴

۲۲۔ ایضاً

مولانا سہیل احمد قاسمی ☆

مولانا رحمانی کی فقہی بصیرت

ہندوستان ہر دور میں علم فقہ کا مرکز رہا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ یہاں ہمیشہ ممتاز علماء و فقہاء کی اچھی خاصی تعداد رہی ہے۔ اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی قطب زماں، حضرت امیر شریعت رابع، بانی و جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، سرچشمۂ علم و ہدایت، روحانی و علمی تربیت کے مثالی اور عظیم مرکز جامعہ رحمانی و خانقاہ رحمانی کے سرپرست و سجادہ نشیں کی ہمہ جہت اور جامع ترین مثالی شخصیت ہے۔ وہ شیخ طریقت، عظیم المرتبت مدبر اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ اللہ رب العزت نے انھیں غیر معمولی ذہانت و ذکاوت اور دینی و ملی اور سیاسی بصیرت سے نوازا تھا۔ وہ بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ کتاب اللہ، احادیث نبویؐ، آثار صحابہ، تاریخ و سیر اور دیگر اسلامی علوم و فنون پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔

حضرت امیر شریعت رابعؒ کے تابناک و درخشاں کارناموں کی فہرست بہت طویل اور لمبی ہے اور دینی و ملی خدمات کا دائرہ نہ صرف یہ کہ جہت وسیع بلکہ وسیع ترین ہے۔ ان کی مثالی زندگی اور خدمات پر ملک کے مشاہیر علماء و مشائخ اہل قلم، دانشوروں اور ممتاز اسکالروں نے مقالات لکھے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی زندگی کا ہر پہلو تشنہ اور ہر گوشہ نامکمل ہے۔

☆ امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ (پھلواری شریف، پٹنہ (بہار)

اسلامی نقطۂ نگاہ سے انسانی ضرورتوں کا ایک اہم باب فقہ اسلامی ہے جو انسانیت کی رہنمائی اور ہر دور کے مسائل و مشکلات کے حل کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے اور احکام خداوندی پر چلنے والوں کی تمام شعبہ ہائے حیات میں رہنمائی کرتی ہے۔ خواہ عبادات و معاملات ہوں، انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی۔ ہر موقع پر فقہاء کرام اور مفتیان عظام کی کاوشوں سے تشنگی بجھی ہے اور انشاء اللہ بجھتی رہے گی۔ حضرت فرماتے ہیں:

> علماء کو نئے مسائل کا اسلامی حل دریافت کرنا ہوگا۔ اور ان نئے سوالات کا جواب دینا ہوگا، جن پر فقہ کی قدیم کتابوں میں بحث نہیں کی گئی ہے، ان کے لیے وہی طریقہ کار اپنانا ہوگا جو طریقہ کار ماضی میں علمائے کرام نے نئے مسائل کے حل کے لیے اختیار کیا تھا۔ اس سلسلے میں قرآن و حدیث کو بنیادی حیثیت دینی ہوگی، اصولِ فقہ کو سامنے رکھنا ہوگا۔ اور فقہ اسلامی کے عظیم خزانے سے مدد لینی ہوگی۔ اسی طرح نئے مسائل کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہیں گے۔ اور اسلام ان کا حل بھی پیش کرتا رہے گا۔ (مسلم پرسنل لاء زندگی کی شاہراہ، ص ۱۷)

حضرت امیر شریعت کی نگاہ فقہ، اصول فقہ اور جزئیات وکلیات پر بڑی گہری اور عمیق تھی۔ جدید مسائل کے حل کی راہ بھی ان کے سامنے واضح اور روشن تھی۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے بہ خوبی اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور ان کے کئی قیمتی اور علمی مقالوں (جن کو دستاویزی حیثیت حاصل ہے) سے روشنی اور رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے:

> ان حالات کی بنیاد ہی پر میرے نزدیک صحیح راہ یہ ہے کہ ایک طرف مقاصد شریعت اور روح احکام پر پوری نگاہ رکھی جائے۔ دوسری طرف اصول وکلیات اور اشباہ و نظائر کو سامنے رکھ کر نئے مسائل کا حل نکالا جائے اور زمانے کے تغیر کی وجہ سے پیدا ہونے والی مشکلات کو دور کیا جائے۔ یہی وہ راہ تھی جسے صحابۂ کرام اور اکابر علماء نے ہر دور میں اختیار کیا تھا۔ (مسلم پرسنل لاء، ص ۱۱)

حضرتؒ کا دماغ بڑا با فیض اور زرخیز تھا اور ساتھ ہی نقاد بھی، وہ کسی بات کو بحث ونظر کے بغیر ماننے کے قائل ہی نہ تھے۔ دینی مسائل ومعاملات ہوں یا ملی اجتماعی قضیے وہ انھیں امام ابو حنیفہؒ کی طرح اپنے شاگردوں اور تربیت یافتوں کے درمیان رکھنے اور مسئلہ کے ہر پہلو پر غور کرنے کو ضروری سمجھتے تھے۔ سیاسی مسائل ہوں یا فقہی، انھیں صحیح موقف اختیار کرنے کی خدا نے خاص توفیق بخشی تھی اور ان کا دماغ ہر وقت بیدار اور حاضر رہا کرتا تھا۔ اور فقہ میں خاص ملکہ کا نتیجہ تھا کہ اہم سے اہم سوالوں کا جواب بے تکلف سفر وحضر میں قلم بند فرمایا کرتے تھے۔ اب بہ طور نمونہ حضرت کے چند فتاویٰ نقل کیے جاتے ہیں۔ فتاویٰ کی زبان نہایت ہی سہل، واضح اور موثر ہونے میں ممتاز ہے۔

لیکن اس سے قبل حضرتؒ کی ایک مدلل ومفصل تقریر کا بھی تذکرہ ضروری ہے۔ جس میں قرآن، حدیث اور فقہ کے حوالوں سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلامی اوقاف پر ٹیکس نہیں لگایا جاسکتا ہے۔

یہ بات آج کی نہیں بلکہ ۱۹۳۷ء کی ہے کہ حکومت بہار نے زرعی آمدنی پر ٹیکس لگانے کے لیے ایک بل پیش کیا، جس میں اسلامی اوقاف پر بھی ٹیکس لگانے کی تجویز رکھی گئی۔ حضرت امیر شریعت نور اللہ مرقدہ نے اوقاف سے متعلق حصہ کی مخالفت کی اور فرمایا کہ اسلامی اوقاف پر ٹیکس لگانا ناجائز ہے۔ حکومت کے مثبت انداز میں سوچنے کے بجائے اس کے قانونی مشیر بلدیو سہائے ایڈووکیٹ جنرل نے یہ چیلنج کیا کہ اگر یہ محصول یا ٹیکس مذہباً غلط ہے تو قرآن وحدیث سے اس کا ثبوت پیش کیا جائے کہ مسلمانوں کا مذہب ٹیکس عائد کرنے سے نہیں روکتا ہے۔

حضرت امیر شریعتؒ نے اس موقع پر اسمبلی میں یہ مدلل اور مبسوط تقریر فرمائی۔ مولانا ابو الکلام آزادؒ اس مسئلہ کو حل کرنے پٹنہ تشریف لائے، حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت امیر شریعت نور اللہ مرقدہ سے گفتگو ہوئی۔ مولانا آزادؒ نے حضرت امیر شریعت کے خیال کی تصویب کی اور پھر حکومت کو مشورہ دیا کہ مسلمانوں کے اس مطالبہ اور موقف کو تسلیم کرنے، چنانچہ حکومت نے اس کو مان لیا۔۔۔ یہ تقریر چھپ چکی ہے جس کا مطالعہ بہت ہی مفید اور کارآمد

ہونے کے ساتھ ساتھ بہت دلچسپ بھی ہے اور اندازِ بیان نہایت ہی مؤثر و مدلل۔
چند جملے آپ ملاحظہ فرمائیں:

''ایڈووکیٹ جنرل نے اپنی جوابی تقریر میں کہا تھا کہ قرآن مجید اور حدیث جو اسلامی قانون کی بنیاد ہیں اس میں یہ کہیں نہیں ہے کہ اوقاف پر ٹیکس نہ لگایا جائے اور نہ اس کو ثابت کیا جا سکتا ہے۔

میں ادب کے ساتھ ایڈووکیٹ جنرل کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مجھ کو ان کی تقریر سے سخت حیرت ہوئی، میں سمجھتا تھا کہ ان کو اپنی ذمے داری کا احساس ہوگا۔ لیکن تعجب ہے کہ حکومت کا اتنا بڑا ذمے دار انسان اسمبلی میں اس قدر غیر ذمے دارانہ تقریر کر سکتا ہے..... اسمبلی کے ارکان اور خود ایڈووکیٹ جنرل پر اس کا گہرا اثر ہوا۔

انھیں اسلامی قانون کی بالکل خبر نہیں ہے، انھیں اس کی بھی اطلاع نہیں ہے کہ اسلامی قانون کی بنیاد کن چیزوں پر ہے۔ ایڈووکیٹ جنرل کو چاہیے تھا کہ وہ حکومت کو مشورہ دیتے کہ وقف پر ٹیکس لگانے کا تعلق مسلمانوں کے مذہب سے ہے لہٰذا اس کو صوبہ بہار کی مذہبی جماعت ''امارتِ شرعیہ'' یا جمعیۃ علماء سے باضابطہ دریافت کیا جائے اور دریافت کرنے کے بعد اسلامی قانون اسمبلی میں بیان فرماتے، لیکن صحیح علم حاصل کیے بغیر اسلامی قانون کو غلط طریقہ پر اسمبلی میں بیان کرنا ناجائز اور نامناسب جرأت و جسارت ہے۔

انھیں اسلامی قانون کی واقفیت نہیں ہے اس لیے نہ ان کو حق ہے اور نہ ان کے لیے مناسب ہے کہ اسلامی مسائل پر فتویٰ دیں۔ (مسلم پرسنل لا زندگی کی شاہراہ، ص ۲۲۷، ۲۲۸)۔

اس زمانے میں اسمبلی کانسل وغیرہ میں معقولیت تھی، لوگ علمی باتوں کے وزن کو سمجھتے تھے۔ اس تقریر کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے اس مسئلے کے حل کے لیے

مرکزی قیادت سے گزارش کی جس کے نتیجے میں یہ مسئلہ مسلمانوں کے حق میں فیصل ہوا۔''

مسائل کے بیان کا طریقہ

حضرت امیر شریعت علیہ الرحمہ مسائل کے بیان میں مخاطب کے مزاج، ضرورت اور سمجھ کا بڑا خیال رکھتے وہ آسان زبان استعمال کرتے اور لکھنے کے ادبی انداز کو باقی رکھنے سے زیادہ مخاطب کو مسئلہ سمجھانے کا خیال رکھتے تھے۔ وہ کوئی جملہ ایسا نہیں لکھتے تھے جس کی وجہ سے مسئلہ کے سمجھنے میں دشواری آئے یا ذہن الجھ جائے۔ ان باتوں کا خیال رکھنے کے ساتھ بڑا امتیاز ان کے فتاویٰ کا یہ بھی ہے کہ وہ کم الفاظ کا استعمال کرتے تھے اور بڑے منضبط جوابات لکھا کرتے تھے۔ یہی کمال ان کی تقریروں کا بھی تھا۔ میری طالب علمی کا زمانہ تھا، تعلیمی سال کی ابتداء میں جامعہ رحمانی کے طلبہ کو خطاب کر رہے تھے۔ میں ان دنوں جامعہ رحمانی میں ابتدائی درجات کا طالب علم تھا۔ اب پوری تقریر تو ذہن میں محفوظ نہیں ہے۔ بات ''ماء مطلق'' کی آگئی۔ آپ نے خطاب کے دوران فرمایا، پانی بولنے سے جو چیز سمجھ میں آئے وہی ماء مطلق ہے'' کم لفظوں اور آسان زبان میں ماء مطلق کی یہ تشریح انھی کا حصہ ہے۔

اسی طرح مسائل کے بیان میں بھی وہ مخاطب کے ذہن اور مزاج کا خیال رکھتے تھے۔ فرماتے تھے کہ لکھنا اور بولنا وہی ہے جو صحیح ہو، مگر تعبیر ایسی اپنایئے کہ دل اور دماغ قبول کرلیں۔ ہر جگہ عالمگیری اور شامی کا حوالہ دینا ضروری نہیں ہے، اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمایئے:

خاندانی منصوبہ بندی ۱۹۷۴ء، ۱۹۷۵ء میں ایمرجنسی کے دوران بڑا گرما گرم موضوع تھا۔ حضرت امیر شریعتؒ نے اس موضوع پر رسالہ لکھا جس میں آپ نے بحث کرتے ہوئے گفتگو کا وہ رخ اختیار کیا جس سے دل ودماغ متاثر ہوں۔ آپ نے تحریر فرمایا:

''قرآن نے بڑے بلیغ الفاظ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ خزانہ خداوندی میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ البتہ ذہن انسانی پر ان خزانوں کا انکشاف

ہر عہد کی ضرورت کے مطابق محدود مقدار میں ہوتا ہے۔

وجعلنا لکم فیھا معایش و من لستم له برازقین و ان من شیء الا عندنا خزائنه و ما ننزله الا بقدر معلوم (الحجرات:۲۰،۲۱)

''یعنی اے انسانو! تمھارے لیے اور ان مخلوقات کے لیے جن کے روزی رساں تم نہیں ہو، ہم نے اس کائنات میں معیشت کے لامحدود وسائل رکھ دیے ہیں۔ ہمارے پاس ہر چیز کے لامحدود خزانے ہیں۔ البتہ ہم ان خزانوں کا انکشاف متعین اور محدود مقدار میں کرتے ہیں۔ اور معیشت کا یہ سامان محدود معلوم مقدار میں نازل کرتے ہیں۔''

چاند پر قبلہ کس سمت ہوگا

جناب رحمٰن حمیدی صاحب (آفس سپرنٹنڈنٹ روکی ہائی اسکول گوموہ، دھنباد) نے حضرت امیر شریعت سے ملاقات کی اور چند اہم دینی سوالات کیے۔ حضرت امیر شریعت نے ان کے سوالوں کا جواب عنایت فرمایا، جس کو رحمٰن صاحب نے قلم بند کیا۔ اور پھر نقیب میں شائع کیا۔ اہمیت کے پیش نظر اسے اس مقالہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ رحمٰن صاحب لکھتے ہیں:

''ایک عرصہ سے خواہش تھی کہ حضرت امیر شریعت سے ملاقات کروں۔ میں مونگیر پہنچا۔ ختم بخاری کی مجلس میں شرکت کی، پھر ان سے ملاقات کے لیے وقت مقررہ پر حاضر ہوا، اس وقت ایک شاگرد کو حدیث کے متعلق سمجھا رہے تھے۔ میں نے اسی مناسبت سے پوچھا احادیث نبوی کی باضابطہ تدوین کب شروع ہوئی؟ امیر شریعت علیہ الرحمہ نے جواب دیا: ''احادیث نبوی ﷺ کی تدوین باضابطہ طور پر پہلی صدی ہجری کے بعد ہوئی۔ خلافت بنی امیہ کے اخیر زمانے سے تدوین حدیث کا کام شروع ہوا اور خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے ایما سے پہلا مجموعہ حدیث ابوبکر بن حزم نے تیار کیا۔ اس کے بعد محمد ابن شہاب

زہری نے۔ خلافت بنو عباس کے زمانے میں علوم نے بڑی ترقی کی اور حدیث
پر کتابیں لکھنے کا ذوق عام ہوا۔ لیکن جناب رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے
خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد تک گرچہ عام طریقہ پر احادیث سینوں میں محفوظ
تھیں، لیکن شیوخ حدیث کے پاس قلمی ذخیرے بھی موجود تھے اور پوری احتیاط
کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کے زمانہ ہی میں کم سے کم
پچاس ہزار حدیثیں قلم بند ہو چکی تھیں۔ اس سلسلے میں میرا رسالہ ''کتابت
حدیث'' (شائع کردہ ندوۃ المصنفین، دہلی) دیکھنا مفید ہوگا، جس میں تفصیلات
موجود ہیں۔''

میں نے دوسرا سوال کیا ''ختم نبوت'' کے متعلق قرآن و حدیث کی روشنی میں کچھ فرمایئے۔ امیر شریعت نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا:

''ختم نبوت اسلام کا ایک اہم عقیدہ ہے اور جناب رسول اللہ ﷺ کا اہم ترین
وصف قرآن مجید میں ارشاد ہوا: ماکان محمد ابا احد من رجالکم و
لکن رسول الله و خاتم النبیین جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:
میری مثال پہلے انبیاء کے ساتھ ایسی ہے جیسے کسی نے گھر بنایا اور اسے خوب
آراستہ کیا اور اس کے ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی۔ لوگ شوق
سے مکان دیکھتے اور یہ بھی کہتے کہ یہ ایک اینٹ بھی رکھ دی جاتی کہ مکان مکمل
ہو جاتا۔ چناں چہ میں نے اس جگہ کو پر کر دیا اور مجھ ہی سے قصر نبوت مکمل ہوا۔
میں ہی خاتم النبیین ہوں، مجھ پر سلسلۂ رسل ختم ہوا۔''

صحابۂ کرام سے بے شمار آثار ختم نبوت کے بارے میں مروی ہیں۔ حضور ﷺ کے بعد مختلف لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ صحابہ کرام اور ان کے بعد کے مسلمانوں نے مدعی نبوت کے ساتھ جہاد کیا اور اسے جہنم میں پہنچا کر چھوڑا، مسیلمہ کذاب، اسود عنسی وغیرہ کے واقعات تاریخ میں موجود ہیں۔

اسود عنسی نے خود جناب رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں دعویٰ نبوت کیا تھا اور آپؐ کے حکم سے صحابہ کرام کے ہاتھوں قتل کیا گیا، مسیلمہ کذاب نے جناب رسول اللہ ﷺ کے پردہ فرما جانے کے بعد دعویٰ نبوت کیا اور صحابہ کرامؓ نے بالاجماع اسے مرتد اور غیر مسلم سمجھا اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام اور تابعین کا ایک بڑا لشکر یمامہ بھیجا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کے مقابلے میں مسیلمہ کذاب چالیس ہزار مسلح جوانوں کی تعداد کو لے کر میدان میں آیا۔ صحابۂ کرام کی طرف سے اس جہاد میں شہید ہونے والوں کی تعداد تقریباً بارہ سو ہے اور مسیلمہ کذاب کے اٹھائیس ہزار جوان قتل ہوئے اور خود مسیلمہ کذاب بھی قتل ہوا۔

چودہ سو سال کی تاریخ اسلامی شاہد ہے کہ شرقاً و غرباً ہر دور اور ہر زمانے میں ہر طبقہ و خیال کے علماء وائمہ اور مسلمانوں نے نبوت کو جناب رسول اللہ ﷺ پر ختم تسلیم کیا ہے۔ اور آپؐ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والے کو مرتد اور دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا ہے۔ چناں چہ ۱۹۲۷ء میں کابل کے اندر نعمت اللہ قادیانی کا قتل ایک تاریخی واقعہ ہے، جو ان کے مرتد اور غیر مسلم ہونے پر علماء اور مسلمانان کابل کے عقیدہ کا ترجمان ہے۔ خود نبی کریم ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا: ''عن ثوبان قال قال رسول اللّٰہ ﷺ أنه سیکون فی أمتی کذابون ثلثون کلھم یزعم أنه نبی و أنا خاتم النبیین لا نبی بعدی۔''

میں نے موضوع گفتگو تبدیل کر دیا اور امیر شریعت کی توجہ ایسے مسئلے کی جانب مبذول کرائی جو چند ماہ سے دنیائے اسلام کے لیے اضطراب و بے چینی کا سبب بنا ہوا ہے۔ میں نے سوال کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے مفصل انداز سے کہا: ''اشاعت اسلام اور تبلیغ دین کے لیے حضور ﷺ کی زندگی پر فلم زیر تکمیل ہے اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟''

امیر شریعت کا لہجہ افسردہ ہو گیا اور ان کے چہرے پر حزن و ملال کی چند لکیریں پھیل گئیں، انھوں نے سرد لہجے میں کہا، دین اسلام کی چیزوں کو اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور خانۂ کعبہ کو پردۂ فلم پر لانا ان چیزوں کی توہین ہے۔ دین اسلام ایک ایسی حقیقت ہے جس کو سمجھنے اور قبول کرنے کے لیے سنجیدہ ذہن اور سنجیدہ ماحول چاہیے۔ کھیل کود، تفریح، مزاح، لہو ولعب کے

مواقع اور ماحول میں اسلام جیسی بنیادی حقیقتوں کی تبلیغ و اشاعت نہیں ہو سکتی۔ لہو و لعب اور تفریح و مزاح کے موقع پر جو چیزیں انسان کے ذہن پر آئیں گی وہ سطحی ہوں گی، اگر اسلام کی تبلیغ و اشاعت فلم کے ذریعے یا ٹیلی ویژن کے ذریعے کی گئی تو اسلام ایک مذہبی حقیقت کے بجائے سطحی زندگی کی ایک رسم بن کر رہ جائے گا اور اعتقاد و یقین کی وہ گہرائی جس کے ذریعے انسان مذہب کے نام پر بڑی بڑی قربانیاں دیتا ہے، باقی نہ رہے گی اور پھر فلم اور ٹیلی ویژن میں متعدد ایسی چیزیں بھی ہیں جن کی بنیاد پر اسے مذہبا درست نہیں کہا جا سکتا۔

امیر شریعت خاموش ہوئے تو میں نے وقت کا دوسرا اہم ترین سوال پیش کیا، جو آج سائنس دانوں کے پیش نظر ہے اور کامیابی کے امکانات بہت حد تک روشن اور واضح ہیں، میں نے کہا: ''دور جدید کی سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان چاند پر اقامت پذیر ہو سکتا ہے اور سائنس دانوں کے پیش نظر مستقل انسانی آبادکاری کا مسئلہ زیر غور ہے اور بہت سے افراد چاند پر اقامت کے متمنی ہیں۔ آپ بتائیے کہ سرور کائنات وہاں کے لیے بھی پیغمبر آخر الزماں ہیں؟''

امیر شریعت نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: ''انسان جہاں بھی ہو اور قیامت تک جہاں بھی پہنچے، اسے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے سایہ تلے رہنا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے آپ کو سارے ہی انسانوں کے لیے نبی بنا کر بھیجا ہے۔''

میں نے مزید پوچھا: چاند پر مسلمانوں کا قبلہ کس سمت ہوگا اور وہاں مسلمان نماز کے لیے کس جانب رخ کریں گے؟ امیر شریعت نے اسی طرح مسکراتے ہوئے جواب دیا: ''پہلے مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس تھا۔ تحویل کے بعد ان کا قبلہ کعبۃ اللہ ہے۔ فول وجهك شطر المسجد الحرام و حيث ما كنتم فولوا وجوهكم شطره سے یہ سمجھنا کہ کعبہ صرف اس چہار دیواری اور چھت کا نام ہے جو ہمیں گھری ہوئی نظر آتی ہے، ایسی بات نہیں، کعبہ کا جو جائے وقوع ہے اس سے لے کر اوپر آسمان تک اور نیچے تحت الثریٰ تک پوری فضا قبلہ ہے۔ اس لیے کتنی ہی بلندی یا پستی پر انسان ہو اسے کعبہ ہی کی طرف رخ کرنا ہے۔''

امیر شریعت نے صرف فضائی ہی نہیں بلکہ بحری اقامت کا بھی مسئلہ حل کر دیا۔ میں نے

آخری سوال پوچھا کہ: ''آپ کس نوعیت کی بیعت کرتے ہیں؟''

امیر شریعت علیہ الرحمہ نے فرمایا:

''عام طور پر بیعت توبہ کراتا ہوں اور سب سے پہلے کلمہ کی تلقین، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ اور ماجاء به النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا اقرار، اس کے بعد تمام برائیوں بالخصوص شرک و بدعات سے اور اللہ کی نافرمانیوں سے توبہ، پھر ارکان اربعہ پر عمل کرنے اور منہیات اربعہ (چوری، جھوٹ بدکاری، شراب نوشی) سے مکمل پرہیز کا اقرار، آخر میں جس سلسلہ میں بیعت لی جارہی ہے اس کا نام اور دعائے استقامت اور مغفرت۔''

طلوع فجر کے بعد سنت فجر کے علاوہ نفل پڑھنا مکروہ ہے

جناب مولانا شاہ عبدالستار صاحب آندھرا پردیش نے استفسار کیا تھا: ''طلوع صبح صادق کے بعد فجر کی دو رکعت فرض سے پہلے دو رکعت سنت فجر کے سوا مزید نوافل ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟''

حضرت امیر شریعت علیہ الرحمہ نے اس کا تفصیلی اور مدلل جواب دیا ہے:

"عن ابن عمر أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا صلوٰۃ بعد الفجر إلا سجدتین" (ترمذی، ص ۵٦)۔ جمہور کا مسلک یہی ہے کہ طلوع فجر کے بعد سنت فجر کے علاوہ کوئی اور نفل پڑھنا مکروہ ہے اور امام ترمذیؒ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ البتہ شوافع کے یہاں اس کی اجازت ہے کہ طلوع فجر کے بعد فرض فجر پڑھنے سے پہلے پہلے نفلیں پڑھنے میں کوئی کراہت نہیں ہے۔

حنفیہ کے نزدیک طلوع صبح صادق کے بعد سنت فجر کے سوا اور کوئی نفل پڑھنا مکروہ ہے۔ فتاویٰ ہندیہ، ص ۵۲ میں ہے: "تسعة اوقات یکرہ فیها النوافل (إلی قوله) یکرہ فیه التطوع باکثر من سنة الفجر" یعنی ۹/ اوقات ایسے ہیں جس میں نفل کی ادائیگی مکروہ ہے اس

میں سے ایک وقت طلوع صبح صادق کے بعد اور فرض فجر سے پہلے کا ہے۔اس وقت میں سنت فجر کے سوا اور نفل پڑھنا مکروہ ہے۔

اسی طرح کی بات مراقی الفلاح صفحہ ۱۰۱ پر بھی لکھی ہوئی ہے۔''و یکرہ النفل بعد طلوع الفجر باکثر من سنة قبل أداء الفرض ''یعنی طلوع فجر کے بعد اور ادائے فرض فجر سے پہلے فجر کی دو رکعت سنتوں کے سوا دوسری نفل پڑھنا مکروہ ہے۔صاحب مراقی الفلاح نے اس فقہی حکم کی شرعی دلیل بھی بیان کی ہے ... "لقوله ﷺ ولیبلغ شاھدکم غائبکم ألا لاصلوٰة بعد الصبح إلا رکعتین"— یعنی حضرت محمد ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر حاضر میرا یہ پیغام ان لوگوں تک پہنچادے جو موجود نہیں ہیں کہ طلوع صبح صادق کے بعد دو رکعتوں کے سوا کوئی نماز نہیں ہے۔آگے چل کر مراقی الفلاح نے اس حکم کی حکمت بھی بتلائی اور لکھا:''ولیکون جمیع الوقت مشغولا بالفرض حکما ولذا تخفف قراء ة سنة الفجر''یعنی فرض فجر کی اہمیت کا یہ تقاضہ ہے کہ صبح کا پورا وقت کم از کم حکماً فرض فجر میں مشغول ہے اور اس میں کسی اور نماز کی گنجائش نہیں رکھی جائے— اور اس کے بعد صاحب مراقی الفلاح نے یہ بھی لکھا ہے:''ولذا تخفف قراء ة سنة الفجر ''یعنی چاہیے تو یہ تھا کہ صبح کے وقت میں صرف دو رکعتیں فرض ہی کی پڑھی جاتیں لیکن جناب رسول اللہ ﷺ سے فجر کی سنت کے فضائل بھی بہت مروی ہیں لہٰذا فجر کی سنت تو پڑھی جائے گی مگر فجر کے وقت کو حکماً فرض فجر ہی میں مشغول رکھنے کی خاطر سنت فجر میں قرأت قرآن طویل نہیں بلکہ بہت مختصر کی جائے گی۔''

نماز تہجد آٹھ رکعت ہے

جناب حاجی محمد حسین صاحب رحمانی (ململ دربھنگہ) خانقاہ رحمانی مونگیر کے قدیم ارادت مندوں اور امیر شریعتؒ کے مخلصوں میں تھے۔آپ نے بعض مسائل کے متعلق چند سوالات کیے جن کا تعلق تہجد کی نماز کے وقت اس کی رکعتوں اور عشاء کی نماز کے بعد تہجد پڑھنے سے تھا۔حضرت امیر شریعتؒ نے ان کا جامع جواب دیا ہے:

تہجد کی نماز رات کے آخری تیسرے حصے میں مستحب ہے۔ مراقی الفلاح صفحہ ۲۱۵ میں لکھا ہے:

"صلوٰۃ اللیل خصوصا فی الثلث الاخیر منہ أفضل من صلاۃ النہار لأنہ اشق علی النفس قال اللّٰہ تعالیٰ: "تتجافی جنوبہم عن المضاجع."

یعنی رات کی نماز اور خصوصاً رات کی وہ نماز جو پچھلے تہائی حصے میں پڑھی جائے دن کی نمازوں سے کہیں افضل ہے۔ اس لیے کہ یہ نماز نفس پر بڑی گراں گزرتی ہے۔ قرآن پاک نے کہا ہے: ان کے پہلو (بدن) بستروں سے علیحدہ ہوتے ہیں اور پھر آگے فرمایا کہ اس وقت وہ اپنے پروردگار کو خوف ومحبت دونوں کیفیات میں معتکف ہو کر پکارتے ہیں تو گویا وہ نماز جس کے لیے اپنے نرم اور گرم بستروں سے علیحدہ ہونا پڑے اور وہ دعا ومناجات جس کے لیے میٹھی نیند ترک کرنی پڑے حق تعالیٰ کو بھی مرغوب و پسندیدہ ہے۔ اس لیے فقہاء نے لکھا ہے کہ چوں کہ پچھلے پہر والی نماز جسے تہجد کہتے ہیں نفس پر گراں گزرتی ہے اور حق تعالیٰ نے غالباً مذکورہ بالا آیت میں اشارہ اسی طرف کیا ہے۔ اس لیے وہ رات والی نمازوں میں افضل و برتر ہے۔

لیکن اگر کوئی نماز تہجد کے لیے نہ اٹھ سکے اور عشاء کے بعد ہی تہجد پڑھ لے تو اسے بھی حق تعالیٰ اجر وثواب سے نوازتے ہیں اور تہجد ہی کا ثواب دیتے ہیں۔ (البحر الرائق، ص ۵۲، جلد ۲ پر ہے:

"وروی الطبرانی مرفوعاً لا بد من صلاۃ بلیل و لو حلب شاۃ وما کان بعد صلاۃ العشاء فہو من اللیل انتہی وہو یفید أن ہذہ السنۃ تحصل بالنفل بعد صلوٰۃ العشاء قبل النوم۔"

مقصد یہ ہے کہ فقہاء طبرانی کی مذکورہ بالا روایت کی بنا پر یہ فرماتے ہیں کہ تہجد کی سنت عشاء کے بعد سونے سے پہلے نفلیں پڑھ لینے سے بھی ادا ہو جائے گی یعنی اگر کوئی پچھلے پہر نہ اٹھ سکے اور عشاء کے بعد تہجد کی نیت سے نفلیں پڑھ لے تو اسے تہجد کا ہی ثواب ملے گا انشاء اللہ۔

تہجد کی نماز کم از کم دو رکعت اور زیادہ سے زیادہ آٹھ رکعت ہے۔ مراقی الفلاح صفحہ ۲۱۷ میں ہے۔ اقله رکعتان و اکثره ثمان آٹھ رکعت سے زیادہ تہجد کی نماز صحیح حدیثوں سے ثابت نہیں ہے۔

تہجد کی نماز دو دو رکعت پڑھنی چاہیے اور ہر دو رکعت پر سلام ہونا چاہیے۔

"وعندهما الأفضل في الليل مثنى مثنى و بداى لهما يفتى اتباعاً للحديث وهو قوله عليه الصلوة والسلام صلوة الليل مثنى مثنى."

یعنی حضرت امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں: "رات کی نماز دو رکعت ہے اور فقہاء نے انھی دونوں شیوخ کے قول پر فتویٰ دیا ہے۔ اس لیے کہ حدیث کی اتباع بھی اسی میں ہے۔ جناب رسول اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا رات کی نماز دو دو رکعت ہے۔"

خلاصہ یہ کہ تہجد کی نماز رات کے آخری تہائی حصہ میں مستحب ہے لیکن اگر کوئی شخص عشاء کے بعد سونے سے پہلے پڑھ لے تو اسے تہجد کا ثواب ملے گا۔ تہجد کی نماز کم از کم دو رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ آٹھ رکعتیں پڑھنی چاہیے۔ اور ہر دو رکعت کے بعد سلام پھیرنا چاہیے۔

امت مسلمہ کی قوت کو مناظرہ اور مجادلہ کی مجلس میں ضائع نہ کریں

مشہور عالم دین مولانا محمد یوسف رحمانی چناری ضلع رہتاس نے حضرت امیر شریعت علیہ الرحمہ کی خدمت میں خط لکھ کر میلاد میں سلام و قیام سے متعلق حکم شرعی دریافت فرمایا اور انھوں نے اپنی تحریر میں یہ لکھا: "ایک طبقہ میلاد میں سلام و قیام کو غیر شرعی اور بدعت قرار دیتا ہے اور دوسرا طبقہ اس کے ضروری نہ سمجھنے والے کو رسول اللہ علیہ کا دشمن اور شریعت اسلامیہ کا باغی قرار دیتا ہے، جس کی وجہ سے آپس میں فتنہ و فساد کا ڈر ہے۔ بعض مقامات پر یہ طریقہ مسلسل نزاع کا سبب ہے قیام نہ کرنے والوں کی امامت کو غیر شرعی کہا جاتا ہے اور ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنے سے بعض حضرات انکار کرتے ہیں اس لیے قیام مرجہ کا شرعی حکم واضح کیا جائے۔"

حضرت امیر شریعت نے جواباً لکھا: ''اس وقت مسلمانوں کے اندر ہندوستان میں اس قسم کے فتنے بہت پیدا ہو رہے ہیں، جگہ جگہ پر جھگڑا اور لڑائی ہے، بات بات پر فتنہ اور فساد ہے، آپ کو ایسے لڑانے والوں سے خواہ مولوی کے بھیس میں ہوں یا کسی اور روپ میں پرہیز کرنا چاہیے اور ان لوگوں کی ہمت افزائی ہرگز نہ کرنی چاہیے۔ کتنے افسوس کی بات ہے جو چیزیں صاف صاف قرآن و حدیث سے ثابت ہیں اور جن چیزوں کو سرکار دو عالم محمد ﷺ نے ہمیشہ انجام دیا اور کبھی ترک نہیں فرمایا۔ آج ان چیزوں پر کچھ پوچھ گچھ نہیں ہے اور جھگڑا قیام پر کیا جاتا ہے، جس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔ اس وقت مسلمانوں کے سامنے بڑے بڑے اہم سوال ہیں لیکن لڑانے والے حضرات مسلمانوں کو غیر ضروری اور بے کار چیزوں میں الجھا کر اہم اور ضروری چیزوں کو پس پشت ڈال رہے ہیں۔ مشہور واقعہ ہے کہ بیت المقدس میں عیسائیوں کی حکومت تھی، لیکن اس وقت عیسائی قوم کی بے حسی کا یہ حال ہو چکا تھا کہ اسلامی فوجیں بیت المقدس کے دروازے میں داخل ہو رہی تھیں اور عیسائیوں کے دینی پیشوا اسی شہر کے اندر آپس میں اس مسئلے پر بحث اور مناظرہ کر رہے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پسینہ پاک تھا یا ناپاک۔ کم و بیش یہی حال مسلمانوں کے پیشواؤں کا ہے جو قیام یا اس قسم کے دوسرے جزوی اور غیر ضروری مسائل پر مناظرہ اور مجادلہ کے ذریعے مجلسیں گرم کرتے ہیں اور اس کے ذریعے مسلمانوں میں اختلاف اور افتراق پیدا کرتے ہیں۔ کاش یہ طاقت جو ایسے مسائل میں صرف کی جارہی ہے، مسلمانوں تک خدا اور اس کے رسول کا پیغام پہنچانے میں خرچ کی جاتی ___ آج اس دہریت و الحاد کے دور میں نعرہ لگتا ہے کہ مذہب ہی لڑائی جھگڑے کی جڑ ہے اور ہم لوگ اپنی روش اور طریقہ کار سے اس نعرہ کی صحت کے لیے دلیل مہیا کرتے ہیں ___ آپ نے قیام کی شرعی حیثیت پوچھی ہے، اس لیے عرض ہے کہ قیام کی کوئی اصل شریعت میں نہیں اور نہ اس کا ثبوت قرآن و حدیث سے ہے اور نہ فقہ حنفی سے، اس لیے اس کو دین کا ضروری کام سمجھنا صحیح نہیں۔ اور قیام نہ کرنے والوں کے پیچھے نماز بالکل درست ہے ___

قیام کے متعلق بعض لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ ذکر ولادت باسعادت کے وقت سرکار

دوعالم ﷺ تشریف لاتے ہیں۔ یہ عقیدہ غیر صحیح اور بے اصل ہے۔ اگر کوئی شخص اس عقیدہ سے کھڑا ہوتا ہے تو گنہگار ہوگا اور محض رسم و رواج کی خاطر اس لیے کہ بہت سے لوگ مجلس میں کھڑے ہوگئے ہیں کوئی کھڑا ہو جائے تو اس پر ثواب ہے نہ گناہ، اور اگر کوئی شخص محبت رسول ﷺ کے جوش میں بے اختیار ہو کر کھڑا ہو جائے تو ایسا کھڑا ہونا باعث نجات اور ذریعہ اجر و ثواب ہے۔

لیکن یہ مسئلہ ایسا نہیں کہ اس پر پیشوایانِ مذہب آستین چڑھائیں اور اس کو جنگ و جدال کا موضوع بنائیں۔ بہرحال آپ حضرات ایسے لڑانے والے لوگوں سے پرہیز کریں ــــــ ایک واقعہ سنئے:

''حضرت امام داؤد علیہ الرحمہ جو فن حدیث کے امام ہیں، آپ کو پانچ لاکھ حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ اسی سے انتخاب کر کے آپ نے ایک مسند ترتیب دی جو ''ابوداؤد شریف'' کے نام سے موسوم ہے اور صحاحِ ستہ میں داخل ہے۔ امام موصوف نے فرمایا کہ حدیث کے ذخیرہ میں چار حدیثیں سمجھ دار کے لیے کافی ہیں:

(۱) إنما الأعمال بالنيات

''انسان کے عمل کا دارومدار اس کی نیت پر ہے۔''

(۲) من حسن إسلام المرء ترك مالا يعنيه

''بے فائدہ چیزوں کو چھوڑ دینا اسلام کی سب سے بڑی خوب صورتی ہے۔''

(۳) لايكون المؤمن مؤمنا حتى يرضى لأخيه ما يرضاه لنفسه

''کوئی شخص مومن اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے اس چیز کو پسند نہ کرے، جس کو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''

(۴) الحلال بين الحرام بين و بين ذلك مشتبهات فمن اتقى الشبهات فقد استبرأ دينه

''حلال وحرام دونوں واضح ہیں اور جو کچھ اس کے درمیان ہے مشتبہات ہیں پس جو

شخص مشتبہات سے بچا اس نے اپنا دین پاک کرلیا۔''

حقیقت یہ ہے کہ بالخصوص اس فتنہ وفساد کے زمانے میں مسلمانوں کو حضور ﷺ کے اس ارشاد پر پوری طرح عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ حضرت محمد ﷺ نے حلال وحرام کو کھول کر بیان کردیا اب دونوں کے درمیان متشابہات ہیں اس میں غور وفکر کرنا۔ بال کی کھال نکال کر اس پر مناظرہ اور بحثوں کی مجلس کرنا، ہماری تباہی و بربادی کا ذریعہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو ہدایت دے اور توفیق عطا فرمائے کہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کے واضح اور کھلے ہوئے احکام پر عمل کرسکیں اور فتنہ وفساد سے محفوظ رہ سکیں۔''

مال رہن سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے

ذیل میں حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی علیہ الرحمہ کا ایک مکتوب گرامی نقل کیا جارہا ہے، جس میں ذکر وشغل اور ''سود بھرنا'' سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ یہ مکتوب جناب محمد امین صاحب بی۔ اے چھپرہ جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین میں ہیں، کے جواب میں لکھا گیا ہے:

۱۔ ''ذکر وشغل اتنا ہی کرنا چاہیے جتنی قوت ہو۔ اپنے بس اور طاقت سے باہر محنت کرنے کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا۔ اسلام کی تعلیم بھی یہی ہے کہ دین کا کام استطاعت بھر کرو! اور اسی انداز سے کرو کہ اس کو نباہ سکو، دنیا کے سارے کام کو چھوڑ کر صرف نماز پڑھتے رہنا یا روزہ رکھتے رہنا اسلامی تعلیمات کی روح کے موافق نہیں ہے۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ ذکر وشغل اتنا ہی کرو جو پابندی سے روز کرسکو اور تھوڑا کرو مگر اخلاص اور حق تعالیٰ کے استحضار کے ساتھ کرو۔ دین پر عمل کرنے کے شوق میں ایسی پابندیاں اور سختیاں اپنے اوپر لگالینا جو عمومی استطاعت سے باہر ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ ایک مرتبہ ایک صحابی غالباً عبداللہ بن عمر جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ دل چاہتا ہے کہ صوم وصال رکھوں۔ یعنی کبھی افطار نہ کروں، آپؐ نے ارشاد فرمایا ایسا نہ کرو پھر عرض کیا

صوم داؤدی رکھوں۔ یعنی ایک روز روزہ رکھوں اور ایک روز افطار کروں۔ آخر میں آپؐ نے ارشاد فرمایا اپنے حال کو مجھ پر قیاس نہ کرو، مجھ کو میرا رب کھلاتا اور پلاتا ہے اور پھر ایام بیض یعنی ہر مہینہ ۱۳، ۱۴، ۱۵ کو روزہ رکھنے کی ہدایت کی۔ معلوم ہوا کہ نیکی اور عبادت بھی ایک انداز سے کرنی چاہیے۔

۲۔ آپ نے زرپیشگی کا مسئلہ پوچھا ہے۔ اسے اس دیار میں ''سود بھرنا'' کہتے ہیں۔ یعنی کسی شخص کو روپے کی ضرورت ہے اس نے کسی سے قرض لیا اور اپنا کھیت یا مکان قرض دینے والے کے پاس رکھ دیا کہ جب تک روپے واپس نہ کروں، اس چیز کو تم اپنے پاس رکھو اور اس سے فائدہ اٹھاؤ، کھیت کی پیداوار اور مکان کی آمدنی کو اپنے مصرف میں لاتے رہو اور کھیت کی مال گزاری اور مکان کا ٹیکس اپنے پاس سے دیتے رہو۔ جب میں تمہیں قرض والی رقم واپس کروں گا تو کھیت یا مکان واپس کر دینا، اس کو آپ کی طرف زرپیشگی کہتے ہیں۔ اور اس دیار میں اس کا نام سود بھرنا ہے، یہ شکل سود کی ہے اور ناجائز ہے۔

آپ نے جو روپے لیے وہ قرض ہیں اور زمین یا مکان جو روپے والے کو دیا وہ ''رہن'' ہے اور روپے والا جو آپ کی دی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھا رہا ہے وہ سود ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ:

قال رسول اللہ ﷺ کل قرض جر نفعا فھو ربوا

کہ ہر وہ قرض جو نفع دے وہ ''ربوا'' (سود) ہے ____

صاحب ہدایہ نے ایک حدیث نقل کی ہے:

إن النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن قرض جر نفعا

کہ جناب نبی کریم ﷺ نے اس قرض سے منع فرمایا جس سے نفع حاصل ہو۔

اب دیکھ لیجیے زرپیشگی اور ''سود بھرنے'' میں یہی ہوتا ہے۔ آپ کسی شخص سے قرض لیتے ہیں اور اپنی زمین اس کے حوالے کرتے ہیں، وہ اس کی پیداوار خود لیتا ہے، اور

پھر جب روپے دینے کا وقت آتا ہے تو پورے روپے لیتا ہے۔ پیداوار سے کھیتی کا خرچ وضع کرنے کے بعد جو زیادہ آمدنی ہوئی وہ خالص سود ہے۔ لہٰذا یہ زرِ پیشگی یا سود بھرنا ایسا قرض ہوا کہ جس سے قرض دینے والے کو نفع ہوتا ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق وہ قرض جس سے نفع حاصل ہو وہ ''ربوا'' ہے۔ اس موقع پر دو جملے اور لکھ دوں کہ مذکورہ بالا حدیث کے رواۃ میں لوگوں نے کلام کیا ہے لیکن اس سے فکر مند ہونے کی بات نہیں، اس لیے کہ علامہ ابن ہمامؒ نے فتح القدیر میں اس حدیث کے مختلف طریقے لکھے ہیں اور ''ابن شیبہ'' والی روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ اگر صورتِ مسئلہ پر فقہی نقطۂ نظر سے غور کیجیے تو یہ صورت رہن کی ہے اور اپنے پاس رکھنے والے کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ رہن رکھی گئی چیز سے نفع اٹھائے۔ رہن رکھنے والے نے جو چیز آپ کے پاس رکھی وہ ضمانت میں رکھی ہے، آپ کو اس نے مالک نہیں بنایا ہے۔ رہن رکھی ہوئی چیز کا مالک رہن رکھنے والا ہی ہے۔ اس لیے اس کی پیداوار یا اس کے محاصل رہن رکھنے والے کی ملک ہوں گے۔ اور وہ ہی اس سے فائدہ اٹھا سکے گا۔ اس سے نفع حاصل کرنے کا حق آپ کو نہیں ہے۔

ليس للمرتهن أن ينتفع بالرهن لا بالاستخدام ولا سكنى ولا لبس (هدايه كتاب الرهن، ج۴/۵۰۶)

اسی طرح درمختار میں ہے:

لا الانتفاع به مطلقا لا بالاستخدام ولا سكنى ولا لبس ولا اجارة ولا اعارة (ج ۲/۲۶۶)

اور فتاویٰ سراجیہ صفحہ ۱۸۸ میں تو یہاں تک لکھ دیا:

ولو كان للراهن مصحفا او كتابا ليس للمرتهن ان يقرء فيه

معلوم ہوا کہ رہن رکھی ہوئی چیز سے کسی طرح بھی مرتہن نفع نہیں اٹھا سکتا۔ اگر رہن غلام ہے تو اس سے خدمت نہیں لی جا سکتی۔ گھر ہے تو مرتہن کو اس میں رہنے کا حق نہیں۔

کپڑے ہیں تو ان کو پہن نہیں سکتا اور فقہاء نے یہاں تک تصریح کر دی ہے کہ اگر قرآن پاک رہن میں دیا ہے تو اس کو تلاوت نہیں کر سکتا اگر کتاب ہے تو پڑھ نہیں سکتا، کیوں کہ یہ بھی انتفاع اور استعمال ہے۔

بہرحال یہ بات واضح ہوگئی کہ رہن کے ذریعے مرتہن کو انتفاع اور استعمال کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ شے مرہونہ اس کے لیے ویسی ہی ہے جیسے دنیا کی لاکھوں چیزیں جو دوسروں کی ملکیت میں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دوسری چیزیں مرتہن کے قبضے میں نہیں ہیں اور شے مرہونہ پر مرتہن کو اس کے روپے کی ضمانت میں قبضہ دے دیا گیا ہے، جس کا وہ امین ہے۔ اگر وہ اس میں تصرف کرے گا اور اس سے نفع حاصل کرے گا تو شریعت محمدیہ اُس پر ضمان واجب کرے گی۔

بہرحال زرپیشگی یا سود بھرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔''

تکبیرات تشریق

تکبیراتِ تشریق کب سے کب تک کہنی چاہیے اور کس پر اس کا کہنا واجب ہے۔ اس سوال کے جواب میں حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا:

''امام اعظم علیہ الرحمہ کا مذہب یہ ہے کہ تکبیراتِ تشریق یوم عرفہ کی نماز صبح سے شروع کی جائے اور یوم نحر کی نماز عصر کے بعد تک کہی جائے اور بس۔ نیز تکبیر مذکور شہر کے رہنے والے مردوں پر واجب ہے جب کہ وہ فرض نماز جماعت مستحبہ کے ساتھ پڑھ رہے ہوں۔

صاحبین کا مسلک یہ ہے کہ تکبیراتِ تشریق یوم عرفہ کی نماز صبح سے شروع کی جائے اور آخر ایام تشریق کی نماز عصر کے بعد تک کہی جائے۔ نیز ایام تشریق میں ہر اس شخص پر تکبیرات تشریق واجب ہے جو فرض نماز پڑھ رہا ہو خواہ مرد ہو یا عورت۔ مقیم ہو یا مسافر، شہر میں ہو یا گاؤں میں، جماعت سے پڑھ رہا ہو یا تنہا:

"اتفق المشائخ من الصحابة عمر و علی و ابن مسعود رضی اللّٰہ

عنهم انه يبدأ بالتكبير من صلاة الغداة من يوم عرفة و به اخذ علماؤنا رضى الله عنهم فى ظاهر الرواية ... ثم قال ابن مسعود رضى الله عنه اى صلاة العصر من يوم النحر يكبر فى العصر ثم يقطع و به اخذ ابو حنيفة رضى الله عنه ... و قال على رضى الله عنه اى صلاة العصر من آخر ايام التشريق يكبر فى العصر ثم يقطع وهو احدى الروايتين عن عمر رضى الله عنه و فى الاخرى اى صلاة الظهر من آخر ايام التشريق و اخذ ابو يوسف و محمد رحمهما الله تعالى بقول على رضى الله عنه." (مبسوط: ج۲/ص ۴۲، ۴۳)

و هذا التكبير على الرجال المقيمين من اهل الأمصار فى الصلوات المكتوبات فى الجماعة عند ابى حنيفة رحمه الله تعالى و قال ابو يوسف و محمد رحمهما الله كل من يصلى مكتوبة فى هذه الأيام فعليه التكبير مسافرا كان او مقيماً فى المصر او القرية رجلا كان او امرأة فى الجماعة او وحده وهو قول إبراهيم رحمه الله تعالى. (مبسوط: ج۲/ص۴۴)

امام سرخسیؒ نے مبسوط میں دونوں مذہب اوران کے دلائل بیان کر دیے۔ نہ اپنی رائے لکھی اور نہ کسی قول کو ترجیح دی اور نہ یہ کہا کہ فتویٰ کس پر ہے۔

ہدایہ نے دونوں قول نقل کیے ہیں اور صاحبین کی دلیل مختصر لکھ دی ہے اور تکبیر تشریق کن لوگوں پر واجب ہے اس سلسلے میں امام صاحب کے دلائل کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور دلیل اپنے خاص انداز میں اس طرح دی ہے جس سے امام اعظمؒ کے مسلک کو کافی تقویت پہنچتی ہے:

وهو عقيب الصلوات المفروضات على المقيمين فى الأمصار فى الجماعات المستحبة عند ابى حنيفة و ليس على جماعات

النساء إذا لم يكن منهن رجل و لا على جماعة المسافرين اذا لم يكن معهم مقيم و قالا هو على كل من صلى المكتوبة لأنه تبع المكتوبة وله ماروينا من قبل والتشريق هو الجهر بالتكبير كذا نقل عن الخليل بن احمد ولأن الجهر بالتكبير خلاف السنة والشرع و رد بهٖ عند استجماع هذه الشرائط." (ہدایہ، ج۱/ص۱۵۵)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب ہدایہ اس مختلف فیہ مسئلہ میں امام صاحب کے قول کو راجح لکھتے ہیں۔

صاحب فتح القدیر علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ اس مسئلہ میں کہ تکبیراتِ تشریق کب تک کہی جائیں، امام اعظم کے مؤید ہیں اور صاحبین کی دلیل: ولانا امرنا باكثار الذكر (مبسوط جلد۲، صفحہ۴۴) کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:

و قول من جعل الفتوى على قولهما خلاف مقتضى الترجيح فان الخلاف فيه مع رفع الصوت لا فى نفس الذكر والاصل فى الاذكار الاخفاء والجهربة بدعة فاذا تعارضا فى الجهر ترجح الاقل." (فتح القدیر: ج۲/ص۴۹)

اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت جو صاحبین کے مسلک کی بنیاد ہے اس پر ہی ائمہ حدیث کی جرح نقل کی ہے اور اس کو ناقابل احتجاج قرار دیا ہے، لیکن تکبیر تشریق کن لوگوں پر واجب ہے، اس مسئلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت "لاجمعة ولا تشريق الا فى مصر جامع" سے امام اعظم علیہ الرحمہ اپنے مسلک پر استدلال فرماتے ہیں۔

تشریق سے تکبیر تشریق مراد ہے تو حدیث سے معلوم ہوا کہ مصر کی شرط میں تکبیر تشریق بہ منزلہ جمعہ ہے لہٰذا بقیہ شرائط مثل ذکورت، اقامہ، جماعت وغیرہ میں یہی تکبیر تشریق بہ منزلہ جمعہ ہوگی:

ثبت في الحديث انه بمنزلة الجمعة في اشتراط المصر فيه فكذلك في اشتراط الذكورة والإقامة والجماعة. الخ (مبسوط: ج۲/ص۴۴)

صاحب فتح القدیر نے اس استدلال کا رد کیا ہے کہتے ہیں:

اراد قوله لا لجمعة الى قوله ولا تشريق الا في مصر جامع ولا يخفى عدم دلالته على المطلوب والمتحمل لا يجدى الا الدفع."(فتح: ج۲/ص۵۰)

اس سے ظاہر ہے کہ علامہ ابن ہمامؒ اس مسئلے میں صاحبین کے قول کو قابل ترجیح قرار دیتے ہیں۔ صاحب بحر الرائق نے امام اعظمؒ اور صاحبین دونوں کے مسلک کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے:

و أما عند هما فهو واجب على كل من يصلى المكتوبة لأنه تبع لها فيجب على المسافر والمرأة والقروى قال في السراج الوهاج والجوهرة والفتوى على قولهما في هذا أيضا فالحاصل ان الفتوى على قولهما في آخر وقته و فيمن يجب عليه... (بحر: ج۲/ص۱۷۹)

اس سے معلوم ہوا کہ تکبیر تشریق کا آخر وقت کیا ہے اور یہ تکبیر کس پر واجب ہے۔ ان دونوں مسئلوں میں فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے۔ بحر الرائق کی عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں مسئلوں میں وہ بھی صاحبین ہی کے ساتھ ہیں۔

درمختار میں بھی ایسا ہی ہے:

" و قالا بوجوبه فور كل فرض مطلقا و لو منفردا و مسافرا او امرأة لأنه تبع للمكتوبة إلى عصر اليوم الخامس أخر ايام التشريق و عليه الاعتماد والعمل والفتوىٰ في عامة الامصار و كافة

الاعصار."(درمختار برحاشیہ شامی: ج۱/ص۶۱۹،۶۲۰)

علامہ شامیؒ نے ان دونوں مسئلوں میں بحرالرائق ہی کی عبارت نقل کی ہے۔

و علیه الاعتماد پرعلامہ تحریر فرماتے ہیں:

هذا بناء على أنه إذا اختلف الإمام و صاحباه فالعبرة لقوة الدليل وهو الأصح كما في آخر الحاوي القدسي او على أن قولهما في كل مسئلة مروى عنه أيضا و إلا فكيف يفتى بقول غير صاحب المذهب و به اندفع ما في الفتح من ترجيح قوله هنا ورد فتوىٰ المشائخ بقولهما بحر."(ردالمختار: ج۱/۶۲۰)

فتاویٰ ہندیہ میں بھی ایسا ہی لکھا ہے۔ چناں چہ دونوں مسئلوں کو بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"والفتوىٰ والعمل في عامة الامصار و كافة الاعصار على قولهما كذا في الزاهدي."(عالمگیری: ج۱/۱۵۲)

مذکورہ بالا کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گرچہ ظاہر روایت اور متون میں امام اعظم ہی کا مسلک نقل کیا ہے۔ لیکن علماء کا فتویٰ صاحبین ہی کے مذہب پر ہے۔ اس لیے اس وقت بھی مفتیوں کو اس پر فتویٰ دینا چاہیے۔ نیز فقہ کی کتابوں سے یہ مسئلہ بھی واضح ہے کہ نماز عید الاضحیٰ کے بعد بھی لوگوں کو تکبیرات تشریق کہنی چاہیے:

ولا بأس به عقيب العيد لأن المسلمين توارثوه فوجب اتباعهم و عليه البلخيون." (درمختار: ج۱/ص۶۲۰)

بحرالرائق نے بھی ایسا ہی لکھا ہے:

و في المجتبى والبلخيون يكبرون عقيب صلاة العيد لأنها تؤدى بجماعة فأشبه الجمعة الخ و في مبسوط ابى الليث و لو كبر على إثر صلاة العيد لا بأس به لأن المسلمين توارثوا هكذا

فوجب ان یتبع توارث المسلمین الخ۔" (بحر: ج ۲/ص ۱۷۹)

اختلافی مسائل میں حضرت امیر شریعتؒ کا انداز فکر اور طرزِ عمل

۱۹۷۷ء کی بات ہے کہ حضرت ممدوح مغربی دیناجپور کے علاقہ میں دینی، اصلاحی اور دعوتی دورہ پر تھے۔ مدرسہ فیض عام ہریانو کا سالانہ اجلاس تھا۔ آپ وہاں تشریف فرما تھے۔ مسلک بریلوی کے ترجمان مولانا رفاقت حسین کان پوری، اپنے نظریات وافکار کے پھیلانے میں پوری سرگرمی کے ساتھ مصروف تھے، جس سے پورے علاقے میں غیر معمولی بے چینی پھیلی ہوئی تھی اور انتشار کا ماحول پیدا ہوگیا تھا۔ مزید فتنہ کو ہوا دینے کے لیے مولانا رفاقت حسین نے مختلف سوالوں پر مشتمل ایک دستی مراسلہ حضرت امیر شریعتؒ کی خدمت میں بھیجا۔ حضرت نے اس کا تفصیلی جواب عنایت فرمایا ہے، جس سے آپ کے تبحر علمی اور وسعت علم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ جواب ان کے واضح دینی نقطۂ نظر کی صراحت کرتا ہے۔ ساتھ ہی اختلافی مسائل میں راہِ اعتدال کی نشان دہی کرتا ہے۔ اختلافی مسائل میں توازن، تسامح اور طرزِ عمل کی بھی نشان دہی ہوتی ہے۔ (مکتوب کے متعلق حصے درج ذیل ہیں):

> "میں مناظرے کا آدمی نہیں ہوں، میرا کام حضرت اقدس ﷺ کے لائے ہوئے دین کی اشاعت اور حسب استطاعت اس کا تحفظ ہے۔ میں ہر اس شخص کو جو ماجاء به النبی ﷺ پر ایمان رکھتا ہے، مسلمان سمجھتا ہوں اور قرآن مجید یا کسی حدیث متواتر میں تحریف کرنے والے یا انکار کرنے والے کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں۔ الحمد للہ میں نسباً بھی آل رسول ﷺ میں سے ہوں اور طریقت میں بھی مجھے کچھ حصہ اپنی بضاعت بھر سلسلۂ قادریہ سے ملا ہے، جو سیدنا الشیخ غوث الاعظم محی الدین عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ ہے۔ حضرت موصوف ہی اس کے امام ہیں میرا عقیدہ وہی ہے جو سیدنا علیؓ، سیدنا حسن، سیدنا حسین رضی اللہ عنہم، سیدنا زین العابدین، سیدنا باقر امام سیدنا جعفر

صادق، سیدنا کاظم موسیٰ، سیدنا رضا اور سیدنا الشیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ اسرارہم کا تھا۔

میں مذہباً حنفی ہوں اور فقہ حنفی کا حتی الامکان پابند ہوں لیکن امیر شریعت ہونے کی بنا پر کسی حنفی مسئلہ پر اتنا زور دینا کہ حق اسی میں منحصر سمجھا جائے، مناسب نہیں سمجھتا، میں حنفی ہونے کے باوجود شافعی، مالکی، حنبلی اور اکثر و بیشتر اہل حدیث اور سلفیوں کو اہل سنت والجماعت میں داخل سمجھتا ہوں اور اپنی ہی طرح مسلمان سمجھتا ہوں۔

آپ نے تحقیق اور ثبوت کے بغیر کچھ اعلانات میری طرف منسوب کر دیے ہیں، میرا یقین ہے کہ صلاۃ و سلام افضل ترین اذکار میں سے ایک ہے، جس طرح نماز، کثرتِ تلاوت و نوافل، ذکر نفی و اثبات اور سلطان الاذکار وغیرہ سے تزکیۂ باطن ہوتا ہے اور رضا و قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر انسان منکرات سے بچتا رہے اور فرائض و واجبات، سنت مؤکدہ پر دوام رکھے اور صدق دل سے درود شریف کا ذکر کثرت سے کرتا رہے تو اس کو وہی فوائد حاصل ہوں گے جو کثرتِ نوافل، کثرتِ تلاوت اور سلاسل اربعہ کے اذکار، اشتغال سے حاصل ہوتے ہیں، ایسے لوگوں سے میں ملا ہوں، جنھوں نے شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی پابندی کے ساتھ صرف درود شریف کو اپنا وظیفہ بنایا ہے اور چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے درود شریف ہی کی رٹ لگائی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ان کے باطن کو جلا دی ہے اور اپنے قرب سے نوازا ہے۔

میں اس پر بھی یقین رکھتا ہوں کہ فلاح دارین اور نجاتِ اخروی کے حصول کی راہ صرف ایک ہے، جس کی رہ نمائی جناب محمد رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں۔ اس کے سوا تمام راستے ضلالت و گمراہی کے ہیں۔ امت محمدیہ ﷺ کا پہلا اور آخری کام اتباع سنت محمدیہ ہے۔ حضرت شیخ احمد سرہندی، مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ

نے اپنے مکتوب نمبر ۴۱ بنام شیخ درویش دفتر اول میں فرمایا ہے۔حق سبحانہ تعالیٰ ظاہر و باطن کو سنت مصطفویہ کی متابعت سے مزین فرمائے۔ بحرمتہ النبی و آلہ الامجاد علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محبوب رب العالمین ہیں۔ ہر چیز جو مرغوب ہو وہ محبوب کو دی جاتی ہے۔ بنابریں حق سبحانہ اپنے کلام پاک میں ارشاد فرماتے ہیں:انك لعلى خلق عظيم نیز فرمایا: انك لمن المرسلين على صراط مستقيم ایک جگہ فرمایا ہے:ان هذا صراطی مستقيما فاتبعوه ولا تتبعوا السبل اس آیت میں بھی ملت رسول اللہ ﷺ کو صراطِ مستقیم فرمایا گیا ہے اور اس کے علاوہ تمام راستوں کو داخل سبیل کر کے ان پر چلنے سے منع فرما دیا ہے:ادبنی ربی فأحسن تأديبی میرے رب نے براہِ راست میری تربیت کی ہے اور خوب تربیت کی ہے،تو بہر حال اتباع سنت ہر امتی پر لازم ہے اور یہی فلاح دارین کی ضامن ہے۔

میرا یہ بھی یقین ہے کہ حضرت انسان بلکہ مخلوقات عالم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا فیضان بواسطۂ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم ہوتا ہے پھر کیوں کر ایک مومن آپ پر درود و سلام نہ پڑھے اور شاید آپ کو معلوم ہو کہ ہر مسلمان کے لیے زندگی میں کم از کم ایک دفعہ درود بھیجنا واجب ہے اور یہ عاجز جو کاہل وست واقع ہوا ہے وہ بھی کم از کم گیارہ سو مرتبہ روزانہ درود شریف ضرور پڑھتا ہے۔

میرا ایمان جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ماجاء به النبی صلى الله عليه وسلم پر ہے، میرا ایمان اردو یا عربی کی کتابوں پر خواہ وہ علمائے بریلی کی لکھی ہوئی ہوں یا علمائے دیوبند کی نہیں ہے۔" اس لیے کہ ایمان لانے والی کتاب تو قرآن مجید ہے جو بذریعۂ وحی جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی اور اس کی وہی تشریح و تفسیر معتبر ہے جو سرکار رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو، یا آپ کے

لائق صد افتخار شاگردوں فقہائے صحابہ کرامؓ سے ثابت ہو یا اس کے مماثل یا
قریب تر ہو یا کم از کم اس کے معارض نہ ہو۔
میرا یہ بھی یقین ہے کہ حق تعالیٰ خالق کائنات اور رب العالمین ہے اور ہم
سارے انسانوں کو لوٹ کر اسی کے پاس جانا ہے اور جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا
مرتبہ مخلوقات میں سب سے زیادہ بلند ہے۔ آپؐ نہ صرف انسانوں کے بلکہ
انبیاء و رسل کے سردار ہیں اگر سیدنا موسیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی تشریف
لائیں تو ان کو بھی شریعت محمدیہ ہی کی اتباع کرنی ہوگی اور ان سب باتوں کے
باوجود سرکار دو عالم ﷺ بشر ہیں، مخلوق ہیں، خدا کے بندے ہیں، نہ خدا ہیں نہ
اللہ تعالیٰ کی صفاتِ مخصوصہ کے ساتھ متصف ہیں"۔

غیر مسلموں کے لیے قرآن خوانی

بعض موقع پر بڑی غیر مسلم شخصیتوں کے لیے لوگ تلاوت کرتے ہیں، دعائے مغفرت کرتے ہیں، اجتماعی مجلسوں میں بلاتفریق مذہب دعائے مغفرت ہوتی ہے۔ یہ طریقہ نہ صرف یہ کہ چل پڑا ہے بلکہ بعض علماء بھی اپنے سیاسی تعلقات کو باقی رکھنے کی خاطر ایسی دعا کرتے ہیں۔ حالات کے دباؤ کی وجہ سے علمائے کرام اس سلسلے میں رائے دینے سے گریز کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں حضرت امیر شریعتؒ سے سوال کیا گیا کہ غیر مسلم کی مغفرت اور ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی جائز ہے یا نہیں؟ اگر کوئی مسلمان ایسا کرتا ہے تو شرعاً اس کا کیا حکم ہے، وضاحت کے ساتھ جواب عنایت فرمائیں۔ اس سوال کے جواب میں حضرت امیر شریعت رابع علیہ الرحمہ نے تحریر فرمایا:

"غیر مسلم کی مغفرت اور ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی کرنا قطعاً جائز نہیں ہے، اللہ رب العزت نے صراحت کے ساتھ جناب محمد رسول اللہ ﷺ اور تمام مومنین کو کفار و مشرکین کے لیے دعائے مغفرت کرنے سے منع فرما دیا ہے۔ گرچہ وہ کوئی بھی ہو۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ (التوبۃ:۸۴)

''اوران میں کوئی مرجائے تواس کے (جنازہ) پرکبھی نماز نہ پڑھیے اور نہ اس کی قبر پرکھڑے ہوئیے۔انھوں نے اللہ اوراس کے رسول کے ساتھ کفرکیا ہے اور وہ حالت کفرہی میں مرے ہیں۔''

وَ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ

(التوبۃ:۱۱۳)

''پیغمبرؐ اور دوسرے مسلمانوں کو جائز نہیں ہے کہ مشرکین کے لیے مغفرت کی دعا مانگیں گرچہ وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، اس امر کے ظاہر ہو جانے کے بعد کہ یہ لوگ دوزخی ہیں (اس وجہ سے کہ کافر ہوکر مرے ہیں)۔''

ایسی دعا اور قرآن خوانی کرنے والے سخت گناہ گار ہیں اوراس امر کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں کہ انھیں اسلامی تعلیمات سے کوئی واقفیت نہیں ہے۔

دیوتاؤں اورقومی لیڈروں کی تصویروں کو ہار پہنانا اور مذہبی جلوسوں میں شریک ہونا

جناب اکبر رحمانی (ایم،اے) ایڈیٹر ہفت روزہ جلگاؤں ٹائمز نے ایک چلی ہوئی رسم کی طرف توجہ دلاتے ہوئے حضرت امیر شریعت علیہ الرحمہ سے بذریعۂ خط سوال کیا کہ:

''آج کل مسلمانوں میں یہ عام مرض پھیلا ہوا ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے نام پر قومی لیڈروں اور گنپتی اور شیوجینتی کے جلوسوں میں نہ صرف شریک ہوتے ہیں بلکہ بعض اوقات ان کی قیادت بھی کرتے ہیں۔ اگر کوئی اعتراض کرے تو یہ دلیل دیتے ہیں کہ ان کاموں کے کرنے سے ایمان نہیں بدل جاتا۔ اللہ نیت کو دیکھتا ہے۔ ہم تو صرف مسلمانوں کی بھلائی کی نیت سے یہ کام کرتے ہیں۔

ہندو مسلم یک جہتی کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے قریب آئیں۔
تب ہی نفرتیں کم ہوں گی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ موجودہ حالات اور وقت کا تقاضا
ہے کہ مسلمان ایسے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ اور اس طرح اپنے عمل
سے ثابت کر دکھائیں کہ ان پر علیحدگی پسندی اور فرقہ پرستی کا جو الزام عائد کیا
جاتا ہے وہ غلط ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کو ایسے کاموں میں شریک ہونا چاہیے؟ جب نیت
ہندو مسلم یک جہتی کی ہو، کسی کو خدائی میں شریک کرنا نہ ہو تو پھر ان کاموں کو
مشرکانہ کس بنا پر کہہ سکتے ہیں؟ کیا تصویر کی گردن میں ہار ڈالنا بھی پوجا کرنے
کے مترادف اور شرک ہے؟ ہندو تہواروں کے جلوسوں میں شرکت شرک کس
طرح کہی جاسکتی ہے؟ موجودہ حالات میں جب کہ مسلمانوں میں جان و مال
کے عدم تحفظ کا احساس بڑھتا جا رہا ہے اور اس کی وجہ ہندوؤں کی نفرت بتائی
جاتی ہے۔ ایسی صورت میں اگر مسلمان مصلحتاً ان کاموں میں شریک ہوں تو کیا
شریعت اس کی اجازت دے گی؟''

مولانا رحمانی علیہ الرحمہ نے بڑی وضاحت کے ساتھ اس معاملے پر روشنی ڈالتے
ہوئے جواب دیا کہ:

''ہندو دیوتاؤں اور قومی لیڈروں کی تصویروں یا مجسموں پر ہار ڈالنا اور دوسرے
مذاہب کے مذہبی جلوسوں میں شریک ہو کر اس کی عزت و رونق بڑھانا حرام
ہے۔ اور یہ کام انسان کو شرک تک پہنچاتا ہے۔ ہندو دیوتاؤں کی تصویروں کی
پوجا کرنا، اس کے تو شرک ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں ہے۔ اسلامی نقطۂ نگاہ
سے شرک ایک ایسا جرم ہے، جو کسی حال میں حق تعالیٰ کے نزدیک قابل معافی
نہیں ہے۔ شرک اور اسلام کبھی بھی یکجا نہیں ہو سکتے۔ انسان یا مشرک ہی ہوگا یا
مومن؟ دونوں میں مصالحت کی کوئی شکل نہیں ہے۔ اور شرک فی الذات کی

طرح صفات میں شرک، یا عبادت میں بھی شرک، شرک ہی ہے۔ دیوتاؤں کی پوجا تو حرام اور شرک ہے ہی۔ مجسمہ نصب کرنا، تصویریں آویزاں کرنا بھی اسی لیے حرام ہے۔ یہ سب چیزیں انسان کو آسانی کے ساتھ شرک تک پہنچاتی ہیں اور دوسروں کی بھی گمراہی کا سبب بنتی ہیں۔ ایسے اجتماعات، مجلسیں اور جلسے جلوس جس میں غیراللہ کی تعظیم وتکریم ہوتی ہو، اس کی رونق بڑھانا، اس کی عزت کو بلند کرنے میں حصہ لینا بھی شرک ہی کی ایک قسم ہے۔ عبادت صرف اللہ ہی کے لیے ہے۔ استعانت صرف اللہ ہی سے کی جاسکتی ہے۔ عزت صرف اللہ ہی کے لیے ہے۔ ان امور میں غیراللہ کو شریک کرنا یا غیراللہ کے ساتھ وہ معاملہ کرنا جو صرف اللہ کے ساتھ ہونا چاہیے یقیناً شرک ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

ان العزة للّٰه جميعا

قرآن مجید میں بہت سی آیتیں اس مفہوم کو بتلا رہی ہیں۔ فرمایا گیا:

"اعبدوا اللّٰه ربى و ربكم انه من يشرك باللّٰه فقد حرم اللّٰه عليه الجنة و مأواه النار وما للظلمين من انصار"

"ان اللّٰه لا يغفر ان يشرك به و يغفر ما دون ذلك لمن يشاء"

قرآن نے اہلِ کتاب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

قل يا اهل الكتاب تعالوا الى كلمة سواء بيننا و بينكم الا نعبد الا اللّٰه ولا نشرك به شيئا ولا يتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللّٰه فان تولوا فقولوا اشهدوا بانا مسلمون" (آل عمران)

ایک مومن کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ وہ غیراللہ کی بندگی و پرستش اور پوجا سے پرہیز کرے، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ہر ایسے کام سے بچے جو اسے اسلام سے دور کرنے والے، شرک سے قریب ہونے کے ذریعے ہوسکتے ہیں۔ مسلمان نیتاؤں اور لیڈروں کی یہ دلیل کہ اس طرح کے کاموں کے کرنے سے ایمان نہیں بدل جاتا۔ ہم صرف مسلمانوں کی بھلائی کے لیے یہ کام کرتے

ہیں۔ ہندو مسلم کی یک جہتی کے لیے یہ ضروری ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے قریب آئیں۔ یہ دلیل مہمل اور گمراہ کن ہے۔ یہ دلیل بتاتی ہے کہ ان کے قلوب غیر اللہ کی عظمت و حرمت سے بہت متاثر ہو چکے ہیں۔ دنیا میں تمام احکام ظاہری اعمال پر لگائے جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ہمارے گھر سے سامان چوری کر کے لے جائے گا اسے ہم چور کہیں گے۔ اگر وہ یہ دلیل دے کہ ہماری نیت چوری کی نہیں تھی، تمہارا گھر غیر محفوظ ہے اور سامان قیمتی ہیں اسے محفوظ جگہ رکھنے جا رہے تھے چوری کے لیے نہیں، تو ہمارے نیتا اس کو مان لیں گے؟ ہندو مسلم یک جہتی کے لیے ضروری ہے کہ دونوں قومیں ملکی معاملات میں ساتھ مل کر کام کریں۔ اس میں کسی کا قدم پیچھے نہ رہے۔ یک جہتی کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ مسلمان شرک و کفر کریں اور جن امور کو حق تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے اور جن کاموں سے ہم شرک کے قریب ہو جاتے ہیں، ہم انھیں انجام دینے لگیں، یک جہتی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اسلام کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیں۔ ہر قوم کا ایک شعار ہوتا ہے۔ اس کے خاص امتیازات ہوتے ہیں۔ ہر قوم کے لیے کچھ ایسی باتیں ہوتی ہیں، جس کی وجہ سے وہ دوسری قوموں سے ممتاز ہوتی ہے۔ اور قوم کی انفرادیت اور اس کا تشخص انھیں امور پر قائم ہوتا ہے۔ یہ مجسمہ، یہ تصویروں کی عزت اور اسے ہار پہنانا اور اسے پرنام کرنا یہ کالی اور سرسوتی کی پوجا اور اس کا جلوس اور مجلسوں میں اس کا بھجن، یہ رام نومی کا جلوس، اس کا علم، یہ ہندو قوموں کا شعار اور اس کے قومی امتیازات ہیں، جس پر ہندو دھرم کی بنیاد قائم ہے۔۔۔ ٹھیک اسی کے مقابلے میں صرف اللہ کی عبادت، شرک اور شرک سے قریب کرنے والے امور سے قطعی نفرت، شرک کے مقابلے میں وحدانیت کا بھرپور اظہار اس حد تک کہ کم از کم شرک کا قلع قمع ہو جائے۔ ہر معاملہ میں حق تعالیٰ کی طرف رجوع اور جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع اور پیروی کا جذبہ یہ امت محمدیہ کا امتیاز اور اس کا شعار ہے۔ اور مسلمانوں کے تمام کاموں کی یہ اساس ہے۔ اب اگر مسلمان اپنے ملی امتیازات کو چھوڑ کر غیروں کے شعار اور ان کے امتیازات کو اختیار کر لیں تو ان کا امتیاز باقی نہیں رہے گا اور ملت ختم ہو جائے گی۔ اپنے شعائر اور اپنے امتیازات کا تحفظ اور بقا ملت کے ہر فرد کا اولین فریضہ ہے۔ حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی مشہور حدیث: من تشبہ بقوم فھو منھم میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ مسلمان نیتاؤں کی یہ حرکتیں دراصل احساس کمتری کی دلیل ہے اور

انھیں یہ خیال نہیں آتا کہ ہندو مسلم یک جہتی کے نام پر اس قسم کی خفیف حرکتیں ۱۹۲۰ء سے ہوتی چلی آرہی ہیں اور اس کی ایک پوری تاریخ ہے۔ اگر اسے بیان کیا جائے اور گنایا جائے تو پچاسوں چہرے بےنقاب ہو جائیں گے۔ ابھی ابھی جمشید پور میں ''رام نومی'' کے جلوس میں مسلمانوں نے شریک ہو کر اور رام نومی کے علم کو اپنے ہاتھ میں لے کر جلوس کو آگے بڑھایا۔ ہمارے نیتا اس کے آگے کیا کر سکتے ہیں؟ لیکن اس کے باوجود جمشید پور میں جو کچھ ہوا اس کو سب جانتے ہیں۔ اس لیے یہ سوچنا اور سمجھنا کہ ہندو تہواروں اور ان کی پوجا میں اور ان کے جلوس میں شرکت باہمی منافرت کو کم کرے گی اور اس طرح مسلمان ہندوستان میں اپنی جان اور مال محفوظ کر لیں گے، قطعاً غلط ہے اور ہندوستان کی ساٹھ سالہ تاریخ اور اس سے حاصل شدہ تجربہ کے خلاف ہے ــــــ ذکی انور جو مشہور جمہوریت پسند اور سیکولر ذہن کے آدمی تھے اور ہندوؤں کی تمام تقریبات میں نمایاں طریقہ پر شریک ہوا کرتے تھے، جمشید پور کے ہنگامے کے موقع پر پورے اعتماد کے ساتھ اپنے بھائیوں کو سمجھانے کے لیے باہر نکلے۔ لیکن دوسرے یا تیسرے روز ان کی نعش کنویں سے برآمد ہوئی۔ اس لیے یہ کہنا انتہائی گمراہ کن بات ہے کہ ہمارے ان مشرکانہ افعال سے نفرتیں ختم ہوتی ہیں اور مسلمانوں کے جان و مال کا تحفظ ہوتا ہے۔ ان نیتاؤں سے کہہ دیجیے کہ حضرت اقدس محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو وصیت فرمائی ہے جو قیامت تک کے لیے امت محمدیہ کے واسطے ہدایت کا مینار ہے۔ جب امت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت کو فراموش کرے گی تو ختم ہو جائے گی۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

"ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بھا : کتاب اللّٰہ و سنتی"

فرقہ پرستی اور فرقہ واریت یہ ہے کہ دوسرے اقوام کے شعائر اور ان کے امتیازات کو مٹایا جائے یا ان کے مٹانے کی سعی کی جائے۔ اپنے شعائر اور اپنے امتیازات کا تحفظ اور اس کی بقاء کی سعی و کوشش یہ فرقہ واریت نہیں بلکہ قوم پرستی ہے۔ اگر مسلمان قانونی امن کا پورا لحاظ کرتے ہوئے ایسی چیز کو کھاتے ہیں، جس کو اللہ نے حلال کیا ہے، یہ فرقہ واریت نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو بہ جبر و زور حرام کرنے کی کوشش کرتا ہے، یہ فرقہ واریت ہے۔ اگر کوئی چیز آپ کے یہاں

محترم ہے اور اس کا استعمال آپ کسی مذہبی یا سیاسی نقطہ نگاہ سے صحیح نہیں سمجھتے ہیں تو آپ اس کا استعمال نہ کیجیے، لیکن اپنی مرضی و طاقت کے زور پر کمزوروں پر نافذ کرنا بھی صحیح فرقہ داریت ہے، لیکن اس کو کیا کیجیے کہ ع

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے"

دین کے بعض احکام ایسے ہیں جن کی تفصیل اور تشریح ملک کے موجودہ حالات میں ذرا مشکل ہوتی ہے۔ پروپیگنڈہ اور اکثریت کے دباؤ میں لوگ مسئلہ کی تہہ تک نہ پہنچتے یا نہیں پہنچنا چاہتے ہیں۔ ایسے نازک مسائل میں بھی حضرت امیر شریعت علیہ الرحمہ بڑی وضاحت کے ساتھ حقیقت کا اظہار فرماتے اور شرعی حکم بتایا کرتے تھے۔ یہ آپ کا بڑا امتیازی وصف تھا۔ آپ نے کبھی رواداری، لحاظ، خیال، حالات کے دباؤ کی وجہ سے شرعی حکم کے اظہار یا اس پر عمل میں نرمی نہیں برتی۔ ایمرجنسی کے زمانے میں فیملی پلاننگ پر حضرت امیر شریعت کے اقدامات اور مسلسل جدوجہد ان کے طرزِ عمل اور طریقہ کار کے واضح نمونے ہیں۔ وہ دین کے معاملے میں بہت باخبر، بے حد حساس، غیر معمولی حد تک جری اور باہمت تھے۔ ساتھ ہی وہ حالاتِ زمانہ سے آگاہ، دور اندیش اور جرأت منداقدام کی دولت سے مالا مال تھے۔

داڑھی اہم ترین سنت ہے

داڑھی اہم ترین سنت اور شعائرِ اسلام میں سے ہے۔ انبیاء وصحابۂ کرام اور خود آپ ؐ نے داڑھی رکھی ہے اور داڑھی رکھنے کی تاکید بھی فرمائی ہے۔ چناں چہ داڑھی ایک مشت رکھنا واجب اور منڈانا یا کاٹ کر ایک مشت سے کم کر دینا حرام ہے۔ داڑھی کے سلسلے میں حضرت نے ایک تفصیلی جواب لکھا ہے۔

کیرالہ کے ایک صاحب نے جو پولیس کے جوان ہیں حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا کہ:

۱-ازروئے شریعت داڑھی کے وجوب کے بارے میں کیا حکم ہے؟

۲- کیاداڑھی نہ رکھنے والا گناہ گاراور مرنے کے بعد کی زندگی میں موردِعذاب ہوگا۔

۳-داڑھی کی کتنی مقدار ضروری ہے؟

جواب: ''قرآن و حدیث اور انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے حالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ہی انبیاء داڑھی رکھا کرتے تھے۔ حضرت ہارون علیہ السلام کی داڑھی کا تذکرہ تو قرآن شریف میں موجود ہے۔ امام رازیؒ نے حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی داڑھی گھنی اور کافی شاندار تھی۔ قصص القرآن میں حضرت ادریس علیہ السلام کا حلیہ بیان کرتے ہوئے ان کی خوب صورت داڑھی کا تذکرہ کیا ہے۔ خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ داڑھی رکھی۔ کتب احادیث اور تاریخ اسلام اس سے بھری پڑی ہیں۔ حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ نے داڑھی کو فطرت یعنی اصل بتایا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث میں دس چیزوں کو فطرت کہا گیا ہے۔ اس میں داڑھی شامل ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں فطرت ان باتوں کو کہا جاتا ہے جو تمام انبیاء ورسل کا متفق علیہ طریقہ اور معمول ہو۔ صاحب مجمع البحار نے لکھا ہے:

عشرة من الفطرة ای من السنة سنن الانبياء عليهم السلام و اتفقت عليه الشرائع كأنها امر جبلى فعادوا عليه. ص۸۵

امام نوویؒ عشرة من الفطرة والی حدیث کی تشریح اس طرح فرماتے ہیں:

قالوا و معنا انما من سنن الانبياء عليهم الصلوٰة والسلام

صحیح بخاری، مسلم اور نسائی میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں بھی داڑھی بڑھانے کا ذکر بصیغۂ امر ہے۔ انھی بنیادوں پر داڑھی رکھنا اور چھوڑنا شریعت اسلامیہ میں واجب ہے۔ حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کا عمل اس پر ہمیشہ رہا ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے:

''احفوا الشوارب'' شوارب کو کٹوانا ایسا ہی واجب ہے جیسے داڑھی کا چھوڑنا۔ مجھے

۔ کہیں یاد نہیں کہ فقہاء نے اس کے وجوب کا انکار کیا ہے۔ (جواہر الفقہ جلد ثانی، ص ۴۳۱)

اسی لیے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمہ حضرت امام مالکؒ حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام احمد بن حنبلؒ یعنی فقہ حنفی، فقہ مالکی، فقہ شافعی اور فقہ حنبلی سبھوں کا اس پر اتفاق ہے کہ داڑھی منڈوانا اور ایک مٹھی سے کم داڑھی کا کٹوانا جائز نہیں ہے۔

فتح القدیر اور در مختار میں لکھا ہے:

"و یحرم علی الرجل قطع لحیته الخ و اما الأخذ منها وهی دون القبضة کما یفعله المغاربة، و مخنثة الرجال فلم یبحه أحد" (فتح القدیر، ج ۲/ص ۳۵۲) و در مختار)

"حرام ہے داڑھی کا کاٹنا اور اس حال میں کہ ایک مٹھی سے کم ہو کترنا کسی کے یہاں مباح نہیں ہے۔"

الإبداع فی منار الابتداع مذہب مالکی کی مشہور کتاب ہے اس میں لکھا ہے:

"مذهب العامة المالکیة حرمة حلق اللحیة و کذا قصها اذا کان یحصل مثله، حرام."

"حرام ہے منڈانا اور کٹانا داڑھی کا جب کہ اس سے مثلہ ہو جائے۔"

اور شرح الاحباب میں اذرعی نے لکھا ہے:

قال الأذرعی الصواب تحریم حلقها جملة لغیر علة بها و قال ابن الرفعة بأن الشافعی رحمة الله علیه نص فی الأم علی...

"بلا عذر داڑھی منڈوانا حرام ہے، اس کی امام شافعی نے کتاب الام میں تصریح کی ہے۔"

فقہ حنبلی کی بات ذیل کی عبارت سے معلوم ہوگی:

منهم من صرح بأن حرمة حلقها و منهم من صرح بالحرمة ولم یحك خلافا کصاحب الإنصاف یعلم ذلك من شرح المنتهی و

شرح مداومة الأدب و غيرها.

''تصریح کی ہے کہ حرام ہے منڈانا داڑھی،تصریح کی حرمت پر اور کسی کا خلاف نقل نہیں کیا۔''

کنز کی شرح الفوائد ونہایہ میں تصریح کی ہے:

و اما ما فعله الأعاجم و أكثر المغاربة فهو مخالف لأصول الدين كما فى الصحيحين عن ابن عمر احفوا الشوارب و اعفوا اللحى... (مسلم ج/۱ص۱۲۹)

اور مشکوٰۃ کی شرح ''لمعات'' کے ''باب السواک'' میں لکھا ہے:

"هل يجوز حلق اللحية كما يفعله. الجواب: لا يجوز. ذكره فى جناية الهداية."

فتح القدیر باب الصوم میں لکھا ہے:

"اما الأخذ منها اى من اللحية وهى دون ذلك اى قدر القبضة كما يفعله بعض المغاربة و مخنثة الرجال لم يبحه أحد. انتهى."

اور ایسے ہی درمختار کی کتاب الصوم میں کتاب الفتح اور صاحب المبین شرح مسکین و شرنبلالیہ سے نقل کرتے ہوئے عدم اباحت کا حکم لگایا ہے۔ شیخ عبد الحق الدہلویؒ نے اشعة اللمعات شرح مشكوٰة باب السواك میں لکھا ہے:

''وحلق کردن لحیہ حرام است''

داڑھی کم از کم ٹھوڑی کے بعد ایک مشت ہونی چاہیے۔ داڑھی منڈانا اور ایک مشت سے کم رکھنا ایک ہی بات ہے اور دونوں حرام ہیں۔ داڑھی منڈانے والے اور ایک مشت سے کم رکھنے والے فاسق اور ان کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہے۔ اور امام مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ کے نزدیک داڑھی منڈانے اور کٹوانے والے کے پیچھے نماز ہوتی ہی نہیں۔ (شامی باب الإمامة

عند مطلب البدعة اقسام و کبیری شرح منیة باب الامامة)۔

حاصل کلام یہ ہے کہ داڑھی سنت انبیاء علیہم السلام ہے۔ داڑھی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، جملہ صحابہ، ائمہ دین اور بزرگانِ سلف کا متفقہ معمول ہے اس پر پوری امت کا اجماع ہے۔ داڑھی کا منڈانا ایک مشت سے کم داڑھی کا کٹوانا حرام ہے۔ داڑھی منڈوانے والے اور کٹوانے والے فاسق ہیں اور فاسق کے پیچھے نماز مکروہ ہے''۔

حفاظ کرام کو نذرانہ دینا

رمضان المبارک میں امام تراویح کو ختم تراویح کے بعد نذرانہ دینے کا رواج ملک کے مختلف حصوں میں ہے، اس سلسلے میں بعض حضرات نے امیر شریعت علیہ الرحمہ سے سوالات کیے۔ مختار احمد صاحب سریا گنج، مظفر پور نے بھی ایسا ہی ایک سوال کیا، جس میں انھوں نے لکھا:

رمضان المبارک میں حفاظِ کرام تراویح سناتے ہیں اور ختم تراویح کے بعد لوگ حافظ صاحب کو کچھ نذرانہ دیتے ہیں۔ عام طور پر یہی معمول ہے کہ کوئی رقم اس کے لیے طے نہیں ہوتی ہے بلکہ بروقت کپڑے وغیرہ یا صرف روپے جتنا ہوتا ہے لوگ دیتے ہیں۔ کیا حافظ صاحب کے لیے نذرانہ لینا جائز نہیں ہے؟ اگر حافظ صاحب نے نذرانہ لیا تو اس قرآن کے سننے سنانے والوں کو کوئی ثواب ملے گا یا نہیں؟ کیا نذرانہ لینے والے حافظ کے پیچھے تراویح صحیح نہیں اور کیا اس کا ثواب نہیں ملے گا؟

جواب: ''قرآن پڑھنا اور سننا بھی طاعت وعبادت ہے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کا مسلک یہ ہے کہ طاعت پر اجرت لینا جائز نہیں ہے ــــ متقدمین کا یہی مسلک ہے۔ لیکن متاخرین حنفیہ نے امام اعظم ابوحنیفہؒ اور متقدمین کے مسلک میں وقت کی ضروریات اور حالات کے پیش نظر کچھ سہولت پیدا کی اور توسیع برتی۔ تعلیم قرآن کے ختم ہوجانے کے خطرہ کی بنیاد پر تعلیم قرآن پر اُجرت کو جائز قرار دیا۔ مسجدوں کی آبادی اور جماعت کے متروک ہوجانے کے خطرہ کی بنا پر اذان واقامت پر اجرت کو درست کہا گیا۔ رمضان کی تراویح میں

قرآن سنانے پر متقدمین کی رائے ہمیں معلوم نہیں غالباً اس جزئیہ میں متقدمین ساکت ہیں۔ اس وقت بھی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ یہی ہے کہ رمضان شریف میں قرآن سنانے پر اجرت لینا جائز نہیں اور پہلے سے اجرت مقرر کرنا درست نہیں۔ اور اگر یہ بات پہلے سے جانی بوجھی ہو کہ ہم قرآن سنائیں گے اور اس میں روپے ملیں گے اور سننے والے یہ سمجھتے ہوں کہ ہم قرآن سنیں گے اور ہم کچھ دیں گے تو اس حالت میں بھی قرآن سنانے پر کچھ لینا یا کچھ دینا جائز نہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہماری رائے یہ ہے کہ اگر تراویح کے موقع پر کچھ لینا اور کچھ دینا حرام قرار پائے تو کچھ دنوں کے بعد تدریجاً حفاظ کی تعداد میں کمی آتی جائے گی۔ اور تھوڑے عرصے کے بعد مسجدوں میں تراویح کے اندر قرآن ختم کرنے کا سلسلہ مسدود ہو جائے گا۔ رمضان کے دو ارکان میں سے ایک رکن یعنی قیام لیل کمزور پڑ جائے گا اور آہستہ آہستہ مسجدوں سے تراویح کی جماعت بند ہو جائے گی اور جہاں جہاں سورہ تراویح ہوگی اس میں بہت تھوڑے لوگ شریک ہوا کریں گے، اور رمضان میں رات کی رونق جسے اس دور میں اسلام کا شعار کہا جا سکتا ہے، کم سے کمتر ہو جائے گی۔ درجات حفظ میں بچوں کی تعداد گھٹنے لگے گی اور حفاظ جب تراویح پڑھانا چھوڑ دیں گے تو قرآن بھول جائیں گے، اس طرح حفظ قرآن خطرہ میں پڑ جائے گا۔

تراویح کے سلسلے میں جو صورت حال ہے اس سے ہم نظری اور فرضی طریقوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے بلکہ ہمیں واقعی اور عملی صورتوں پر غور کرنا ہوگا۔

ہمارے خیال میں واقعی شکل وہی ہے جس کا نقشہ اوپر کھینچا گیا ہے۔ اس لیے ہماری رائے ہے کہ تراویح میں قرآن سنانے سے متعلق بھی وہی توسیع پیدا کی جائے، جو تعلیم قرآن، تعلیم حدیث، تعلیم فقہ، امامت، اذان و اقامت کے متعلق کی گئی ہے۔ باضابطہ بھاؤ بتہ کرنا تو مناسب نہیں معلوم ہوتا چوں کہ قرآن سامنے ہے اور اس کے ادب کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی تعلیم اور اس کے سنانے پر مول جول نہ کیا جائے۔ لیکن سننے والوں کو چاہیے کہ وہ قرآن سنانے والے کی خدمت اپنی حیثیت سے بڑھ کر کریں۔ اس نے اپنا قیمتی وقت سننے والوں کو دیا اور اپنے امام و

اوقات کو اس نے محبوب کیا۔ لہٰذا حافظ قرآن کے لیے نذرانہ لینا جائز ہے اور نذرانہ لینے والے حافظ کے پیچھے قرآن سننا بھی باعث اجر وثواب ہے۔ نیز نذرانہ لینے والے حافظ کے پیچھے تراویح پڑھنا بالکل صحیح ہے اور اس کو پورا ثواب بھی ملے گا۔ فقط''

صدقاتِ واجبہ کی رقم سے تعمیرات کے لیے قرض لینا

کلکتہ کیلا بگان مدن موہن برمن اسٹریٹ میں ایک ادارہ بیت المال کیلا بگان ہے۔ یہ ادارہ عرصہ تین سال سے بیوہ ومساکین کی خدمت کر رہا ہے اس کے مختلف شعبے ہیں۔ ان میں ایک شعبہ مسلم گرلز ہائی اسکول کا قائم ہے۔ ایک انسٹی ٹیوٹ ہے، جس میں غیر مستطیع طلبہ کو ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سکھایا جاتا ہے۔ ایک دار الشفا ہے، جس میں پریشان لوگوں کا مفت علاج ہوتا ہے۔ نیز تعلیم بالغان کا بھی نظم ہے لیکن ادارہ کے پاس اپنی کوئی بلڈنگ نہیں ہے۔ ادارہ نے ایک قطعہ زمین خرید کر تعمیر مکان کا پروگرام بنالیا ہے اس ادارہ میں صدقات نافلہ، زکوٰۃ، عشر، چرم قربانی اور عطیات کی رقمیں جمع ہوتی ہیں۔ فنڈ کی کمی کے باعث ذمے داران نے بہ طور قرض چند سال کی مدت کے لیے رقمیں لی ہیں، نیت میں اخلاص ہے اور وعدہ ہے کہ یہ رقمیں واپس کردی جائیں گی۔

اب ایسی شکل میں عرض ہے کہ ادارہ سے زکوٰۃ وغیرہ کی رقمیں بطور قرض لے کر بلڈنگ فنڈ گرلز ہائی اسکول میں لگا سکتے ہیں یا نہیں؟

حضرت امیر شریعت علیہ الرحمہ نے سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا:

''ہماری سمجھ میں استفتاء کا مطلب یہ آیا ہے کہ ادارہ بیت المال میں صدقات واجبہ بھی جمع ہوتے ہیں اور انھیں ان کے صحیح مصرف میں صرف کیا جاتا ہے۔ مثلاً بیوہ ومساکین کی امداد اور ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سیکھنے والے غریب ونادار طلبہ کی امداد، نادار اور غریب مسلمانوں کے علاج پر خرچ وغیرہ۔ ادارہ کے پاس اپنی کوئی عمارت نہیں ہے کہ ان مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے مسلم گرلز ہائی اسکول قائم ہو سکے۔ دار الشفا کا کام چلے اور نادار اور غریب طلبہ کو ٹائپ اور شارٹ

ہینڈ سکھانے کے لیے مناسب جگہ کا سوال حل ہو سکے۔ اب یہی ادارہ بیت المال جس میں اب اس وقت صرف صدقات واجبہ کی رقمیں جمع ہیں (صدقات نافلہ کی رقمیں خرچ کی جا چکی ہیں) شعبۂ تعمیر کے لیے قرض لینا چاہتا ہے اور تعمیر بھی ادارہ ہی کا ایک شعبہ ہے تو اس طرح ادارہ سے ایک ایسے شعبہ کے لیے قرض لینا جو زکوٰۃ کا مصرف نہیں ہے۔ اور قرض والی رقم سے مکان کی تعمیر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

صورتِ مسئولہ میں صدقات واجبہ کی رقم سے قرض لے کر تعمیر پر خرچ کرنا درست ہوگا، بشرطیکہ ادارہ کے ذمہ داروں کو (جس میں علماء، ائمہ اور علاقہ کے اربابِ حل وعقد شریک ہوں) قوی امید ہے کہ یہ قرض وعدہ کے مطابق باقساط واپس کیا جا سکے گا اور واپس مل جائے گا:

للإمام أن يستقرض من أحد البيوت ليصرفه للآخر ثم يرد ما استقرض فإنه يقتضى جواز الدفع من بيت آخر للضرورة ففى مسئلتنا إن كان يمكنه الوصول إلى حقه ليس له الأخذ من غير بيته الذى يستحق هو منه و إلا كما فى زماننا يجوز للضرورة إذ لو لم يجز أخذه إلا من بيته لزم أن لا يبقى حق لأحد فى زماننا لعدم إفراز كل بيت علاحدة بل يخلطون المال كله و لو لم يأخذ ما ظفر به لا يمكنه الوصول إلى شىء فليتأمل. (ردالمحتار: ۵۶/۲)

فعلى الإمام أن يجعل بيت المال أربعة لكل نوع بيتا لأن لكل نوع حكما يختص به لا يشاركه مال آخر فيه فإن لم يكن فى بعضها شىء فللإمام أن يستقرض عليه مما عليه مال فإن استقرض من بيت مال الصدقة على بيت مال الخراج فإذا أخذ الخراج يقضى المستقرض من الخراج إلا أن يكون فى المقابلة فقراء لأن لهم حظا فيها فلا يصير قرضاً. (الفتاوى

الهندیة:۱/۱۹۱)

اس موقع پر ایک مسئلے کی طرف متوجہ کرنا اور ضروری سمجھتا ہوں کہ صدقات واجبہ کی ادائیگی کے لیے ایک اہم شرط تملیک ہے یعنی صدقہ کی رقم یا اس سے خریدی ہوئی کوئی چیز یا صدقہ کی کوئی جنس کسی مستحق کو اس طرح دی جائے کہ وہ اس کا مالک ہو جائے۔ ادارہ بیت المال کو صدقات واجبہ کی رقم کو خرچ کرنے میں مذکورہ بالا امر کا اور ان امور کا جو اپنی جگہ مصرح ہیں پورا خیال رکھنا چاہیے۔ ورنہ ادارہ کے ذمے دار مبتلائے معصیت ہوں گے۔''

بجلی کے جھٹکے کے ساتھ ذبیحہ

فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں مذکورہ جزئیات کے مماثل پیش آمدہ مسائل کے سلسلے میں فتویٰ دینا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا کہ ان جدید مسائل کا حل، جن کا حکم صراحۃً فقہی ذخائر میں مذکور نہیں ہے۔ جدید مسائل پر قلم اٹھانے کے لیے نسبتاً زیادہ تفقہ، حذاقت اور دقت نظر کی ضرورت پڑتی ہے۔ حضرت امیرؒ میں جدید مسائل پر قلم اٹھانے کی بدرجہ اتم صلاحیت موجود تھی۔ چناں چہ ان کے فتاویٰ جو جدید مسائل سے متعلق ہیں ان کی ذہانت اور حذاقت کی آئینہ دار ہیں۔ درج ذیل استفتاء اور اس کا جواب ملاحظہ فرمائیں:

سوال انگلستان سے آیا تھا اور سوال یہ تھا کہ:

''آج کل برطانیہ میں ذبح کرنے کا عام رواج یہ ہے کہ جانور کو ایک بجلی کا جھٹکا لگایا جاتا ہے، جس سے وہ دو تین منٹ کے لیے بے ہوش ہو جاتا ہے اور اسی دوران اسے ذبح کر دیا جاتا ہے۔ ذبح کرنے کے وقت جانور سے اسی طرح خون نکلتا ہے جیسا کہ اُسے بغیر بجلی کے جھٹکا لگائے ذبح کیا جائے۔

یہاں کے بعض لوگوں (مسلمانوں) کا خیال ہے کہ اگر ایسے جانور کو بجلی کے جھٹکے کے بعد اسلامی طریقہ پر ذبح بھی کیا جائے تو بھی اس کا گوشت کھانا جائز نہ ہوگا۔ ان لوگوں کو بعض علماء کی رائے حاصل ہے۔

کچھ لوگ ایسا خیال کرتے ہیں کہ اگر بجلی کے جھٹکے کے بعد اسے اسلامی طریقے سے ذبح کیا جائے تو اس کا گوشت کھانا جائز ہے۔ ان کا خیال ہے کہ بجلی کا جھٹکا صرف اس لیے لگایا جاتا ہے کہ جانور تھوڑی دیر بے ہوش رہے اور اسی وقت اسے ذبح کیا جائے تو اسے تکلیف نہ ہوگی۔ ان لوگوں کو بھی بعض علماء کی رائے حاصل ہے۔

یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ اگر بجلی کے جھٹکے کی وجہ سے بے ہوش جانور کو پانچ چھ منٹ چھوڑ دیا جاتا ہے تو پھر وہ اپنی پہلی حالت میں آنے لگتا ہے اور اٹھ بیٹھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بجلی کی وجہ سے اس کی موت واقع نہیں ہوتی ہے، اس لیے آپ سے گزارش ہے کہ اس کا تفصیلی جواب ارسال فرمائیں تاکہ اس کے مطابق قدم اٹھایا جاسکے۔"

حضرت مولانا فرماتے ہیں:

> "میں سفر میں تھا سفر میں ہی یہ سوال نظر سے گزرا میرے ذہن نے یہ فیصلہ کیا کہ بجلی کے جھٹکے کی حیثیت اس انجکشن سی ہے جو آپریشن سے پہلے عضو کو بے حس کرنے کے لیے لگایا جاتا ہے، جس سے چیر پھاڑ کی تکلیف کم سے کم محسوس ہوتی ہے اور ذبح سے پہلے اور ذبح کے وقت بھی ایسا نظم کرنا جس سے جانور کو کم سے کم تکلیف پہنچے، مستحسن ہے۔
>
> اگر بجلی کے جھٹکے سے جانور کی موت واقع نہیں ہوتی، خون میں کمی نہیں آتی صرف بطلان حس ہوتا ہے اور اسی غرض سے بجلی کا جھٹکا دیا جاتا ہے کہ جانور کو تکلیف کم سے کمتر ہو اور پھر جھٹکے کے بعد اسلامی طریقہ پر جانور کو ذبح کیا جائے تو گوشت حلال ہوگا۔ یہ طریقہ ذبح کم سے کم ایذا رسانی کے باعث مستحسن ہے۔
>
> شریعت نے ذبح کرنے کا حکم دیا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس کا طریقہ اور اوزار بھی بتا دیا ہے کہ چھری کو تیز کرلو اور مذبوح کو جتنا کم تکلیف دے کر ذبح کر سکتے ہو وہ طریقہ اختیار کرو۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے.... (احادیث نقل میں حذف

کردی گئیں) انھیں احادیث کو سامنے رکھ کر فقہاء نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ جس طریقہ کو اختیار کرنے میں مذبوح کو بے فائدہ زیادہ تکلیف دینا لازم آئے مکروہ ہے۔ صاحب ہدایہ نے مکروہ کی چند شکلیں لکھ کر یہ قاعدہ بتایا ہے۔

والحاصل ان ما فیه زیادة إیلام لا یحتاج إلیه فی الذکاة مکروه.

(ہدایہ ج ۴/ص ۴۲۲ کتاب الذبح)

''خلاصہ یہ ہے کہ جو کام ایسا ہے کہ اس سے مذبوح کو زیادہ تکلیف ہو اور اس کو کوئی ضرورت ذبح کرنے میں نہیں وہ مکروہ ہے۔''

ان احادیث اور فقہاء کے اقوال کو سامنے رکھ کر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جس جانور کو ذبح کرنا ہے اس کو جتنا کم تکلیف دے کر ذبح کر سکتے ہوں ایسا طریقہ استعمال کرنا مستحب و مستحسن ہے۔ بشرطیکہ اس طریقہ سے خون کے نکلنے میں کوئی کمی واقع نہ ہو اور نہ کسی غیر شرعی فعل کا ارتکاب کرنا پڑے۔

احادیث سے مثبت طریقہ سے اور ہدایہ سے منفی طریقہ سے یہی حکم معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ حنفیہ کے نزدیک مفہومِ مخالف کا اعتبار نہیں۔ پھر ہدایہ کی عبارت سے کس طرح بطورِ مفہوم مخالف کے اس پر استدلال کیا گیا کہ کم سے کم تکلیف دینا جانور کو مستحب و مستحسن ہے۔ اس لیے کہ حنفیہ کے نزدیک مفہوم مخالف کا عدم اعتبار صرف نصوصِ شرعیہ (کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ) میں ہے۔ فقہ اور عام بول چال میں مفہوم مخالف معتبر ہے۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ ذبیحہ کو تکلیف کم سے کم دے کر ذبح کرنا امر مستحسن و مستحب ہے اور حضور علیہ السلام اور فقہاء کے قول سے یہی ثابت ہے تو اگر بجلی کے جھٹکے سے تھوڑی دیر کے لیے جانور کا احساس ختم کر دیا جائے تاکہ ذبح بھی جلد ہو اور جانور کو تکلیف بھی کم پہنچے اور بجلی کے جھٹکے کے بعد جانور سے خون نکلنے میں کوئی کمی نہیں ہوتی تو ایسا کرنا اگر اسی نیت سے ہو کہ جانور کو کم تکلیف پہنچے تو یہ فعل مستحسن بھی ہوگا اور جائز بھی۔ اور اگر یہ نیت نہیں ہے تو مستحسن نہ ہوگا مگر اس کے جائز اور حلال ہونے میں کوئی شبہ نہیں بشرطیکہ اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے۔ ایسے طریقہ پر جو

جانور ذبح کیا جائے گا اس کا گوشت بغیر کسی کراہت کے جائز ہے۔

سوال و جواب دونوں کے دونوں، دیو بند، مظاہر سہارن پور اور ندوہ کے مفتی صاحبان کے پاس بھیجے گئے۔ان حضرات نے بھی اپنی رائے لکھ کر بھیج دی۔تینوں جگہوں کے مفتی صاحبان نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ذبیحہ تو ہر حال میں حلال ہے لیکن جھٹکے کا فعل مستحسن نہیں۔

حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شیخ الحدیث جامعہ رحمانی مونگیر اور حضرت مولانا شمس الحق صاحب استاذ جامعہ رحمانی مونگیر کی بھی یہی رائے ہے۔لیکن اب تک جناب مفتی یحییٰ صاحب اور عاجز کو بھی مذکورہ بالا بجلی کے جھٹکے کے قبیح ہونے پر اطمینان نہیں ہے کہ اس کی استحسان ہی کی طرف جھکاؤ ہے۔مزید تحقیق اور علماء سے استفادہ جاری ہے"۔

مسلم نعش پر عمل جراحی کا حکم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ پر کہ ہسپتال وغیرہ سے لاوارث مسلم نعش عمل جراحی کے لیے میڈیکل کالج میں بھیج دی جاتی ہے۔اب اس کے متعلق سوال یہ ہے کہ:

۱- مسلم نعش پر شرعاً کسی حالت میں عمل جراحی جائز ہے یا نہیں؟

۲- اور اگر کسی خاص صورت میں جائز بھی ہو تو میڈیکل کالج میں تعلیمی ضرورت کے لیے مسلم نعش پر عمل جراحی جائز ہوگا؟

الجواب:

"مسلم نعش پر عمل جراحی بعض حالات میں شرعاً جائز ہے۔مثلاً کوئی عورت مرجائے اور اس کے پیٹ میں بچہ زندہ اور متحرک ہو تو تمام فتاویٰ میں یہ تصریح ہے کہ اس کے پیٹ کو بائیں جانب سے چیر کر بچہ کو نکال لیا جائے۔درمختار میں ہے: حامل مانت و ولدها حی یضطرب شق بطنها من الأیسر و یخرج ولدها۔" (درمختار: ج۱/ص۶۰۲، حاشیہ ردالمختار)

نیز ایسی صورت میں بھی عمل جراحی جائز ہے جب کہ مرنے والی کے پیٹ میں

کوئی چیز متحرک معلوم ہو اور لوگوں کی رائے یہ ہو کہ یہ متحرک بچہ ہے جیسا کہ فتح القدیر میں ہے:

و فی التجنیس من علامة المنازل امرأة حامل ماتت و اضطرب فی بطنها شیء و کان رأیهم أنه ولد حی شق بطنها. (فتح القدیر باب الشہید، ج ۲/ص ۱۴۲)

مطلب یہ ہے کہ ہر دو صورت میں بچہ زندہ ہونے کا ظن ہو، مردہ نعش کو چاک کرنا جائز ہے۔ نیز ایسی صورت میں بھی مردہ نعش پر عمل جراحی کرنا جائز ہے کہ کوئی شخص کسی کا روپیہ نگل جائے اور مر جائے۔ درمختار میں ہے:

ولو بلع مال غیره و مات هل یشق، قولان والأولی نعم الخ. (قوله والاولیٰ نعم) لأنه و إن کان حرمة الأدمی أعلی من صیانة المال لکنه أزال احترامه بتعدیه کما فی الفتح ومفاده انه لو سقط فی جوفه بلا تعد لا یشق اتفاقاً. (شامی: ج ۱/ص ۶۰۲)

و فی البیری عن تلخیص الکبری لو بلع عشرة دراهم و مات یشق و أفاد البیری عدم الخلاف فی الدراهم والدنانیر. (ردالمحتار)

ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ مردہ نعش پر بحالت ضرورت عمل جراحی جائز ہے۔

(۱) میڈیکل کالج میں تعلیمی ضرورت کے لیے نعش پر عمل جراحی کرنا شرعاً جائز ہوگا۔ اس لیے کہ آئین اسلام کا ضابطہ یہ ہے کہ دو ضرروں میں سے ایک ضرر اگر دوسرے ضرر سے اعظم ہو تو اشد ضرر کا اخف ضرر کے ذریعے سے ازالہ کیا جائے گا، جس کی ایک مثال مردہ عورت کے پیٹ کا بچہ نکالنے کے لیے چیرا جانا ہے:

ولو کان أحدهما اعظم ضررا من الآخر فان الاشد

یـزال بالاخف.(الاشبـــاه والنظائـــر، ص۱۴۴) "تحت القـــاعدة الخاســـة)

اس کے بعد اس کی مثالوں میں بہت سی مثالوں کے ساتھ مذکورہ بالا مثال کو ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

و منها جواز شق بطن الميتة لاخراج الولد اذا كانت ترجى حياته. و قد امر به أبو حنيفة عليه الرحمة فعاش الولد كما فى الملتقط. (الاشباه و النظائر: ص۱۴۴،۱۴۵)

میڈیکل کالج میں چند مردوں کی نعش پر عمل جراحی کے باعث چوں کہ سینکڑوں زندہ مریضوں کی جان بچتی ہے اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ایک بچہ کی جان بچنے کے لیے ایک نعش پر عمل جراحی بلا اختلاف جائز ہو اور سینکڑوں جان بچنے کے لیے چند نعشوں پر عمل جراحی جائز نہ ہو۔"

علمائے کرام کے لیے قابل غور بات یہی ہے کہ عدم تعلیم سینکڑوں جانوں کی ہلاکت کا موجب ہوگا یا نہیں؟ اور اگر موجب ہوگا تو یہ ضرور بہ مقابلہ چند نعشوں کے اعظم اور اشد ضرر ہے یا نہیں؟

میرا خیال ہے کہ بہ مقابلہ چند نعشوں کے سینکڑوں جانوں کی ہلاکت اعظم اور اشد ضرر ہے۔

لہٰذا الاشباہ والنظائر کی تصریح کی بنا پر آئین اسلام کی رو سے اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا ہے کہ میڈیکل کالج میں نعش پر جو عمل جراحی کیا جاتا ہے وہ شرعاً حد جواز کے اندر ہے۔

الجواب صحیح:

علم جراحی مسلمانوں کے لیے حاصل کرنا لازمی اور ضروری ہے اور ادھر یہ قاعدہ بھی ہے: الضرر یزال اور الضروریات تبیح المحظورات پس ضرورت اور

مجبوریوں کی وجہ سے یہ عمل جراحی جائز ہے۔ چناں چہ مجیب لبیب نے توضیح کی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ السید مہدی حسن مفتی دارالعلوم دیوبند

۲۹/۱/۷۶ھ

الجواب صحیح والمجیب نجیح:

خط کشیدہ عبارت تو بہت ہی مضبوط دلیل ہے اور آیت کریمہ ولکم فی القصاص حیوۃ یا اولی الالباب، اور آیت قتال کے اشارے بھی اس طرف ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

(مولانا مفتی) احقر نظام الدین دارالعلوم دیوبند)

نظام الفتاویٰ: ص، ۴۵۶ تا ۴۵۸)

———— ⊙⊙⊙ ————

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن رازؔ

حضرت امیر شریعت
مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی فقہی بصیرت

سابق امیر شریعت بہار واڑیسہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کا وجود گرامی گزشتہ عیسوی صدی کے وسط و اواخر میں دینی، اصلاحی اور معاشرتی خدمات کے حوالے سے انتہائی معروف ومبارک رہا ہے۔ اس دور کے چند ہی اصحاب حال وقال اور اہل فضل وکمال علماء سے ہم واقف ہیں۔ کسی نعمت کی قدر بالعموم اس کے زائل ہونے کے بعد معلوم ہوتی ہے۔ حضرت امیر شریعت مرحوم کی خدمات جلیلہ کا دائرہ نہایت وسیع وعریض ہے۔ اشجار سایہ دار سے مستفید ہونے والے بہت ہوتے ہیں مگر ان کی شجرکاری اور آبیاری کرنے والے خال خال ہی ہوتے ہیں۔ یقیناً حضرت امیر شریعتؒ کی سیرت طیبہ ان سب مطلوبہ صفات کی آئینہ دار ہے، جن کی ایک باصلاحیت قائد ورہنما کو ضرورت ہوتی ہے۔ علمی طور پر آپ کی اصل جولانگاہ علوم فقہ و قانون وحدیث تھے۔

مارچ ۱۹۷۵ کو پوٓا کھالی، کشن گنج (بہار) میں منعقد تحفظ مسلم پرسنل لا کانفرنس میں حضرت امیر شریعتؒ نے فرمایا:

''اسلامی قوانین کا وہ حصہ جس کا تعلق انسان کی ذاتی اور شخصی زندگی سے ہے یا

جس کا تعلق مسلمانوں کی عائلی اور خاندانی زندگی سے ہے، اسی کا نام مسلم پرسنل لا ہے، میاں بیوی، باپ بیٹا، ماں بیٹی، بھائی بہن، چچا بھتیجا، خاندان کے ان سارے لوگوں کے تعلقات سے متعلق جو اسلامی قانون ہے اور نکاح و طلاق، فسخ و خلع، حضانت و ولایت، ہبہ و وصیت اور وقف سے متعلق جو قوانین ہیں وہ مسلم پرسنل لا کہلاتے ہیں۔"

آگے چل کر اسی خطبے میں ہندوستان کے مسلم پرسنل لا کے تعلق سے کہتے ہیں:

"اس موقع پر ایک بات صاف طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ اگر یہ حکومت جمہوری ہے اور جمہوری قدروں کا تحفظ کرنا چاہتی ہے تو اسے آنکھ کھول کر دیکھ لینا چاہیے کہ مسلمان اپنے پرسنل لا میں تبدیلی کرنا نہیں چاہتے۔ اس معاملے میں ان کے جذبات بے حد نازک ہیں ... اور پھر آج کی یہ "تحفظ مسلم پرسنل لا کانفرنس، پوا کھالی" جو ہندوستان کے ایک ایسے علاقے میں ہو رہی ہے جہاں مسلمان نوے فیصد کی تعداد میں آباد ہیں۔ مسلمانوں کا یہ اتنا بڑا اجتماع جو علاقے کی تاریخ میں آج تک نہیں ہوا، بیک زبان کہہ رہا ہے کہ ہم مسلم پرسنل لا میں تبدیلی نہیں چاہتے۔ ان حالات میں ہمارے ملک کی جمہوری حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ ملک کی سب سے بڑی اقلیت کو مطمئن کرے کہ ان کا پرسنل لا دست برد سے محفوظ رہے گا اور اس سوراخ کو بند کرے جہاں سے مسلم پرسنل لا کی تبدیلی اور مشترکہ سول کوڈ کی تیاری کے لیے مواد فراہم ہوتا ہے۔ اور وہ دستور ہند کی ہدایاتی دفعہ ۴۴ ہے۔"

اسی خطبہ میں آپؒ نے مزید فرمایا:

"آج مسلمانوں میں چار طبقات صاف صاف موجود ہیں۔ ایک تو وہ جو اسلامی قوانین اور مسلم پرسنل لا سے اچھی طرح واقف ہے۔ دوسرا وہ جسے براہِ راست قرآن و سنت سے، اسلامی قوانین کا علم حاصل نہیں لیکن وہ تعلیم یافتہ طبقہ ہے،

اسلام کا وفادار اور دین کا پورا احترام کرنے والا ہے۔ ایمان داری کے ساتھ مسلم پرسنل لا میں بعض دشواریاں محسوس کرتا ہے۔ تیسرا طبقہ وہ ہے جو صرف اپنے آپ کو مسلمان اور مسلمانوں کا نمائندہ کہتا ہے لیکن اسلام سے کہیں زیادہ مغربی افکار وخیالات کا وفادار ہے اور دین وشریعت سے بڑھ کر ترقی پسندی کا علمبردار ہے۔ چوتھا طبقہ عام مسلمانوں کا ہے، جو ہمارے سامنے بیٹھا ہے۔ یہ اپنے علم و شعور کی حد تک دین پر عمل پیرا ہے۔ یہ کسی قیمت پر مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کے لیے تیار نہیں۔ اس وقت یہی چوتھا طبقہ میرا مخاطب ہے۔''

یہاں میں نے ایک خطبہ کے تین مختصر اقتباسات پیش کیے، جن سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت امیر شریعت کو کس قدر فقہی واجتماعی معرفت وبصیرت حاصل تھی اور ۱۹۷۵ کے ماحول میں جس میں حکومت نے ایمرجنسی کا اعلان کر دیا تھا۔ کتنی بہ بانگ دہل ان کی گفتگو تھی اور مسلم سماج کے مختلف طبقات پر ان کی کتنی گہری نظر تھی۔ مولانا بدرالحسن قاسمی نے لکھا ہے کہ حضرت امیر شریعت لوگوں کو پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کرتے تھے۔ مولانا مذکور رقم طراز ہیں:

''وہ کوئی جج یا وکیل نہیں تھے لیکن خدا نے انھیں بحث وجرح کی ایسی صلاحیت دی تھی اور حجت واستدلال کا ایسا ملکہ عطا کیا تھا کہ ان کی کاٹ کے آگے اچھوں اچھوں کے اوسان خطا ہوتے تھے۔ وہ جس مجلس میں بیٹھتے، قائدانہ شان سے چھائے رہتے تھے اور جو مسئلہ زیر بحث ہوتا، اس کی تہ تک ان کا ذہن بڑی سرعت کے ساتھ پہنچتا اور ان کی جو رائے ہوتی اس کے اظہار میں بے پناہ جرأت اور بے باکی ان کی شخصیت کے خاص عناصر تھے اور ان تمام اوصاف و خصوصیات کا حامل کوئی دوسرا شخص کم از کم میری نگاہوں نے نہیں دیکھا... وہ لوگوں کو پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کرتے تھے اور جس کسی میں جوہر قابل دیکھتے، اس کو پروان چڑھانے میں بھی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے۔ سینکڑوں ایسے افراد ہیں جو اس بات کی شہادت دیں گے کہ ان کو کارآمد بنانے میں مولانا رحمانی کا ہاتھ

رہا ہے ... دینی معاملات و مسائل ہوں یا ملی اجتماعی قضیے۔ وہ امام ابوحنیفہؒ کی طرح اپنے شاگردوں اور دوستوں کی پارلیمنٹ میں اسے رکھنا اور مسئلہ کے ہر پہلو کی تحقیق کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ ان میں خودرائی نہ تھی۔ وہ دلیل کے ساتھ اختلاف رائے سے خوش ہوتے تھے اور اس میں ان کی پختہ خیالی، بلندیٔ فکر اور اصابت رائے کا راز پنہاں ہے۔" (امیر شریعت رابعؒ، ص ۹۳، ۹۴)

حاصل کلام یہ ہے کہ حضرت امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ علم کے ساتھ عمل اور قال کے ساتھ حال دونوں میدانوں کے شہسوار تھے اور یہ شان اسی وقت پیدا ہوتی ہے، جب روایت کی تہ میں پوشیدہ اسرار کی درایت خبر میں نظر اور علوم و افکار میں اجتہادی بصیرت شامل ہو۔ حضرت امیر شریعت اور ان کے ساتھ مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی (رحمہما اللہ) نے حالات حاضرہ کے پیش نظر بہت سے امور و معاملات میں اجتہادی بصیرت سے کام لیتے ہوئے بہت سے فقہی استنباط کیے ہیں۔ مسلم پرسنل لا نامی مقالہ میں حضرت امیر شریعت رقم طراز ہیں:

"دین کے بارے میں نصوص شرعیہ سے آزاد ہوکر اور قواعد شرعیہ کو نظر انداز کر کے کوئی راہ اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دین کے مقاصد فوت ہو جائیں گے اور دین اور احکام الٰہی سے بغاوت کی راہ کھل جائے گی۔ اور جس طرح یہ عظیم الشان غلطی ہے اسی طرح عصری رجحانات، زمانے اور حالات کے تغیر اور ضرورت و حرج کو نظر انداز کر دینا بھی کچھ کم غلط نہ ہوگا... ان حالات کی بنیاد پر میرے نزدیک صحیح راہ یہ ہے کہ ایک طرف مقاصد شریعت اور روح احکام پر پوری نگاہ رکھی جائے۔ دوسری طرف اصول و کلیات اور اشباہ و نظائر کو سامنے رکھ کر نئے مسائل کا حل نکالا جائے اور زمانے کے تغیر سے پیدا ہونے والی مشکلات کو دور کیا جائے۔ یہی وہ راہ تھی جسے صحابۂ کرام اور اکابر علمانے ہر دور میں اختیار کیا ہے۔ (مسلم پرسنل لا- زندگی کی شاہراہ۔ حضرت امیر شریعت کے مقالات کا مجموعہ، ص: ۸۶)

اس کے بعد انھوں نے خلفائے راشدین اور دیگر اکابر صحابہ و تابعین وغیرہ کے اقوال و آثار سے ضرورت و طریقۂ اجتہاد پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کی معروف اور باعمل شخصیت گوناگوں صفات و مصروفیات کی حامل تھی۔ علمی طور پر انھیں عصر حاضر میں پیش آمدہ معاملات و مسائل کے شرعی و قانونی حل کا خاص ملکہ ودیعت کیا گیا تھا اور اسی اجتہادی بصیرت اور اجتماعی امور کی معرفت نے انھیں باعمل عالم اور عملی مفکر بنایا تھا۔ فقہی علوم کے ساتھ اگر استنباطی بصیرت، مومنانہ فراست اور معاشرتی تجربات نہ ہوں تو صرف ماضی کے دفترہائے پارینہ تیزی سے بدلتے ہوئے عصری تقاضوں کی پورے طور پر تکمیل کرنے سے قاصر رہ سکتے ہیں۔ اور اس کا ثبوت ہر دور کے فقہی اجتہادات اور فتاویٰ کے بے شمار ضخیم مجلدات ہیں۔ اس لیے حضرت امیر شریعتؒ جیسے علمائے کرام کا وجود مسعود ہر دور میں فقہی ضروریات زمانہ کی تکمیل کا جز ولاینفک ہے اور اس عہد کے فرزندوں کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اگرچہ عام نگاہوں کی اس تک رسائی اس نعمت کے زوال کے بعد ہوتی ہے۔ بقول جگرؔ ع

فیضانِ محبت عام سہی، عرفانِ محبت عام نہیں

مولانا ڈاکٹر وارث مظہری قاسمی ☆

حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے فکری و عملی امتیازات

حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کی شخصیت والا صفات کے متعدد پہلو ہیں اور ہر پہلو اس لائق ہے کہ اس کو تفصیل کے ساتھ موضوع تحریر بنایا جائے کیوں کہ ہر پہلو عمومی سطح پر پوری ملت مسلمہ اور خصوصی سطح پر ہندوستان کی ملت اسلامیہ کے لیے نقش راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی پر پچھلے سالوں میں کافی لکھا گیا لیکن حق تو یہ ہے کہ ابھی موضوع کا حق ادا نہیں ہوا۔ ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ ہندوستان کی نئی اسلامی نسل کو ہندوستان میں سرمایہ ملت کی نگہبانی کرنے والوں کی داستان جرأت وعزیمت کے واقعات سے واقف ہونا ضروری ہے تاکہ وہ موجودہ حالات میں ان سے روشنی حاصل کر سکے۔

حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کی فکری وعملی خدمات میں تجدیدی شان نظر آتی ہے۔ مولانا نے ایک ایسے ماحول میں دین وملت کے تحفظ و پاسبانی کا فریضہ انجام دیا جو ہر اعتبار سے اسلام اور اہل اسلام کے لیے آشوب ناک اور ابتلا وآزمائش سے پر تھا۔ اس دور کا تقاضا تھا کہ اللہ کی جاری سنت کے مطابق ایسے افراد سامنے آئیں جو فکری سطح پر دین کو غالیوں، جاہلوں اور نقالی

☆ w.mazhari@gmail.com

کرنے والوں سے بچائیں (ینفون عنه تحریف الغالین،وانتحال المبطلین وتاویل الجاهلین ۔ بیهقی) اور عملی سطح پر دین اور حاملین دین کوان کے خلاف کی جانے والی سازشوں سے محفوظ رکھنے کی جدوجہد کریں۔حضرت مولانا رحمانی سرزمین ہند پر بیسویں صدی کے نصف آخر میں منظرعام پرآنے والی اس نوع کی شخصیات میں سرفہرست تھے۔

دین کے لیے خود کو وقف کردینے والے لوگ عموماً دو میں سے ایک طرح کی خصوصیت کے حامل ہوتے ہیں: یا تو ان کی شخصیت پر فکر کی چھاپ ہوتی ہے چناں چہ وہ اس تعلق سے اپنے وقت اور ماحول میں اسلام کی ترجمانی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔جبکہ دوسری شخصیات وہ ہیں جن پر فکر سے زیادہ عمل کی چھاپ غالب ہوتی ہے۔چناں چہ وہ رفاہ، خدمت خلق، تعلیم، اصلاح معاشرہ اور سیاست کے میدانوں میں اعلی خدمات کی مثالیں قائم کرتے ہیں۔دونوں طرح کی شخصیات کی بہت سی مثالیں ہندوستان اور ہندوستان سے باہر مل جائیں گی۔لیکن اپنے وقت کی بعض تاریخ ساز شخصیات ایسی بھی ہوتی ہیں جو ان دونوں کی جامع ہوتی ہیں۔شاہ ولی اللہ اس کی بڑی مثال ہیں کہ وہ میدان فکر ونظر کے ساتھ میدان عمل واقدام کے بھی شہسوار تھے۔مولانا رحمانی کا شمار اس تیسری قسم کی شخصیات میں ہوتا ہے۔ان کی فکر اور عمل دونوں میں امتیاز اور عبقریت کے واضح نشانات نظر آتے ہیں۔ اگر وہ عملی جدوجہد کے میدان کے بجائے خود کو لوح وقلم اور لائبریریوں اور علمی مجالس ومباحث تک محدود رکھتے تو بلاشبہ وہ اپنے وقت کے بڑے مفکر کی حیثیت سے وسیع شہرت کے حامل ہوتے۔ان کی تصنیف وتالیف کردہ مجلدات ہوتیں۔کیوں کہ ان کے اندر جو تفقہ وبصیرت، ان کی فکر میں جو گہرائی وگیرائی اور جو اجتہادی قوت وتوانائی دیکھنے کو ملتی ہے،اس کی مثال ان کے معاصرین میں خال خال نظر آتی ہے۔اسی طرح اگر وہ کتاب وقلم کی بجائے صرف اجتماعی نوعیت کے عملی کاموں پر توجہ مرکوز رکھتے تو میرا اندازہ ہے کہ ان کے دم سے درجنوں ادارے ہندوستان اور ہندوستان سے باہر وجود میں آجاتے۔لیکن وہ دونوں صفات کے جامع تھے۔دونوں کا امتزاج ان کی شخصیت میں پایا جاتا تھا۔

فکر کے میدان میں مولانا کا اہم کام یہ ہے کہ انہوں نے بغیر کسی تحفظ کے روایتی طرز

واسلوب سے اٹھ کر سوچنے اور مسائل کا حل پیش کرنے کی کوشش کی ۔اس وقت ملت کو جس کم زوری نے دولخت کر دیا ہے، وہ اس کی صفوں میں پایا جانے والا اختلاف وانتشار ہے۔مولانا کی فکر کا یہ ایک نہایت اہم موضوع تھا۔ان کی فکر اس باب میں وہی تھی، جس کو شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی مشہور کتابوں ''الانصاف فی سبب الاختلاف'' اور عقد الجید فی الاجتہاد والتقلید'' کے علاوہ اپنی دوسری کتابوں میں پیش کیا ہے۔ جو غلو اور نقص اور افراط اور تفریط سے پاک ہے۔مولانا کو اس توازن واعتدال فکر کی دولت دین میں گہرے غور خوض کے علاوہ اپنے والد حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ سے وراثت میں بھی حاصل ہوئی تھی۔حضرت مونگیری علیہ الرحمہ دین کے اصول وکلیات پر کامل اعتماد اور ان کے ساتھ تمسک کے ساتھ فروعات دین میں ہونے والے اختلافات کو جن سے امت کی صفوں میں شگاف پیدا ہو اور ان کے وحدت ملی میں خلل آئے، قابل اعتنا تصور نہیں کرتے تھے۔ایک ایسے ماحول میں جب کہ ملت کے اصحاب علم وفکر کے مختلف طبقات باہم مسلکی و جماعتی کش مکش کا شکار ہو کر دین کے اجتماعی تقاضوں کو فراموش کر چکے ہیں۔حضرت مولانا رحمانی اسی شاہ ولی اللہی فکر کے ساتھ اصولیات دین پر تمسک کے ساتھ فروعات دین میں وسعت نظری کی روش اختیار کرنے پر زور دیتے نظر آتے ہیں۔ان کی نظر میں:

> ''دینی اختلافات کی بڑی وجہ اُمور مجتہد فیہا اور فقہی جزئیات وفروع میں غیر معمولی شدت اور تعصب بھی ہے، ان فروعی مسائل کے ساتھ ہم نے وہی معاملہ کیا جو اُمور منصوصہ کے ساتھ ہونا چاہیے تھا، دنیا میں ایسے علاقے بھی ہیں جہاں دوسری فقہ پر عمل کرنے والوں کے پیچھے نمازیں ادا کرنے سے انکار کیا گیا ہے، ایسے مقامات بھی موجود ہیں جہاں دوسرے مسلک والوں کے داخلہ پر مسجدیں دھلوائی گئی ہیں کہ ان کے داخلہ سے مسجد ناپاک ہوگئی، ان اختلافات کی بنیاد پر مسلمانوں نے مسلمانوں سے جدال وقتال کیا ہے، کاش ان کی نظر حضرت امام مالکؒ کے اسوہ پر ہوتی کہ جب خلیفہ مہدیؒ اور خلیفہ ہارونؒ نے امام سے چاہا کہ مؤطا امام مالکؒ کی نقلیں کرا کے مختلف اسلامی ریاستوں میں بھیج دیں اور

حکم دیں کہ اسلامی ممالک میں اسی پر عمل کیا جائے تو اگر چہ امام مالکؒ کو موقع تھا کہ وہ اپنے مسلک کو عالم اسلامی میں حکومت کے سہارے پھیلا دیں، لیکن امام نے ایسا نہیں کیا، بلکہ یہ جواب دیا کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین رسول اللہ ﷺ سے دین لے کر دنیا میں پھیل گئے اور انھوں نے سنت رسول کی بنیاد پر ہی اپنے اپنے طریقوں سے دین کو پھیلایا اور اس پر عمل کیا، تو پھر ہم کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ دین کو ایک ہی طریقہ میں محصور کر دیں اور صحابہ کرام کے پھیلائے ہوئے طریقوں کو ختم کر دیں، جب کہ ان مسالک وطرق کی بنیاد بھی قرآن و سنت ہی پر ہے...''

ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''دینی اختلافات کی بڑی وجہ امور مجتہد فیہا اور فقہی جزئیات وفروع میں غیر معمولی شدت وتعصب بھی ہے، ان فروعی مسائل کے ساتھ ہم نے وہی معاملہ کیا جو کہ امور منصوصہ کے ساتھ ہونا چاہیے تھا''۔

بہت سے مسائل میں حضرت مولانا رحمانی کی رائے عام علما اور فقہا سے مختلف تھی لیکن شریعت کے مصالح اور مزاج پر بصیرت مندانہ نگاہ کے ساتھ وہ اسی کو شریعت کا مقصود تصور کرتے تھے۔ عصر حاضر کے فکری مسائل سے مولانا کی نگاہیں ہٹی ہوئی نہیں تھیں۔ وہ معاصر چیلنجوں سے عہدہ برآ ہونے کو ایک شرعی فریضہ تصور کرتے تھے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ اسلام کی تعلیمات نئے قالب اور جدید اسلوب میں پیش کی جائیں جو آج کی تعقل پسند دنیا کو مطمئن کر سکیں۔ ایک جگہ بڑے درد کے ساتھ لکھتے ہیں: ''آج کا دور معروضی مطالعہ کا دور کہا جاتا ہے۔ کیا ان حالات میں ہماری یہ ذمے داری نہیں ہے کہ ہم اس انقلابی عہد میں اسلام کی لازوال تعلیمات کو جدید اسلوب میں پیش کرنے کے لائق ہو سکیں، کیا ہمارے لیے یہ ضروری نہیں کہ علماء کا طبقہ وقت کی نئی کروٹوں سے آشنا اور ارشاد ربانی: لیظهره علی الدین کله کے مطابق اظہار دین کے فریضہ کی انجام دہی کے اہل علماء پیدا کریں۔''

حضرت امیر شریعتؒ کے نزدیک موجودہ علما وفقہا کے ایک طبقے کی طرف سے خاص طور پر فقہ المعاملات کے باب میں ایک گونہ جمود اور تنگ نظری کی روش اجتماعی زندگی میں اسلام کے دائرہ عمل کو محدود کرنے کے مترادف ہے۔ایسے بہت سے مسائل ہیں جہاں ایک امام کے قول سے عدول کر کے دوسرے امام کے قول کو اختیار کیا گیا ہے۔خاص طور پر متعدد مسائل میں فقہ مالکی سے استفادہ کرتے ہوئے امام مالک کے قول پر فتوی دیا گیا ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اس بابت اپنے نقطہ نگاہ میں مزید وسعت لائی جائے۔دوسری صورت میں ایسے لوگ تعداد میں کم نہیں جن کا ایمان شریعت کے تعلق سے متزلزل ہو جائے گا۔

پچھلی ربع صدی کے درمیان زمانے نے تغیرات کی جو کروٹیں لی ہیں۔جس طرح مواصلات کی ترقی کے نتیجے میں زمین کی طنابیں کھینچ گئی ہیں اور فاصلے سمٹ گئے ہیں چناں چہ بجا طور آج کی دنیا کو گلوبل ویلیج سے تعبیر کیا جارہا ہے۔ایسے میں مولانا کے تفقہ فی الدین کی شان امتیازی اس موضوع پر لکھی گئی ان کی مختلف تحریروں میں نظر آتی ہے۔ایک جگہ بڑی صراحت کے ساتھ موجودہ دور کی پیچیدگیوں اور مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ...''فقہائے اسلام کی مدونہ فقہ کو ہر مسلمان کے لیے عام کر دیا جائے اور جس مسئلہ میں جون سی فقہ مشکل کو حل کرتی ہو اسے اختیار کر لیا جائے۔ ہمارے خیال میں اس طریق کار سے ہماری دقتیں حل نہ ہوں گی، آج بھی ایسے مسائل ہیں، جن میں تمام فقہا کی فقہ خاموش ہے اور زمانہ کی ترقی اور انقلاب کی رفتار اتنی تیز ہے کہ اگر آج ہم کو مشکلات کا حل کسی نہ کسی فقہ میں مل جاتا ہے تو کل یقیناً نہیں ملے گا اور تمام فقہ ساکت نظر آئے گی، اس لیے اگر اسلام ہر زمانہ اور ہر مکان کے لیے ہے اور قیامت تک کے لیے ہے، اور اگر محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت عالمگیر ہے، اور آپ کی لائی ہوئی کتاب رہتی دنیا تک کے لیے نور اور ہدایت ہے تو اجتہاد کا دروازہ کھولنا ہوگا، اس کے بغیر ہماری مشکلات کا حل شاید نہ ہو سکے، لیکن ہاں یہ دروازہ اس طرح نہ کھولا جائے کہ دین میں ہماری ذاتی

رائے اور شخصی رجحانات داخل ہو جائیں۔'' (امیر شریعت: نقوش وتأثرات، ص:۴۹، ۵۰)

ان کی فکر کا ایک اہم مرکز دینی تعلیم کا نصاب ہے۔ حضرت مولاناؒ نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس بات کے قائل تھے کہ دینی تعلیم کے نصاب میں مناسب تبدیلی وقت وحالات کا تقاضا ہے۔ ان کی یہ فکر ان کے والد مولانا محمد علی مونگیریؒ کی فکر کے عین مطابق تھی۔ مدارس کے مشمولات ومضامین اور ان کے طریقہ تدریس دونوں سطحوں پر وہ تبدیلی کو ناگزیر تصور کرتے تھے۔ اگر چہ وہ اس بات کے قائل تھے کہ فی نفسہ درس نظامی کی بنیادی روح کو برقرار رکھتے ہوئے تبدیلی نصاب کی کوشش کی جائے۔ مضامین کی سطح پر تبدیلی کا خاکہ ان کی نظر میں یہ تھا کہ وہ مضامین جو اپنے وقت وحالات کی پیداوار تھے، اب موجودہ زمانے میں ان کی سابقہ اہمیت ومعنویت باقی نہیں رہی ہے۔ جیسے قدیم یونانی منطق وفلسفہ۔ ان کو ان کی اصطلاحات اور بنیادی مسائل کے تعارف کی حد تک باقی رکھ کر ان کی جگہ عصری مضامین شامل کیے جائیں۔ جیسے جدید فلسفہ، سائنس، عمرانیات، معاشیات وغیرہ۔ زبان کی سطح پر انگریزی اور ہندی کو انہوں نے شامل نصاب کرنے پر زور دیا۔ اکابر علما میں مولانا شبلی نعمانیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا یوسف بنوریؒ، مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کی رائے یہ رہی ہے کہ علوم آلیہ یعنی نحو وصرف کے تعلق سے درس نظامی میں جو کتابیں شامل ہیں، ان سے مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اس کی زبان گنجلک اور تعبیر وبیان کا اسلوب نہایت ژولیدہ اور مغلق ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی جگہ ایسی کتابوں کا انتخاب عمل میں آنا چاہیے جو زبان وبیان کے لحاظ سے آسان تر ہونے کے ساتھ حشو وزوائد اور غیر ضروری مباحث سے پاک ہو۔ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی اسی خیال کے مؤید تھے۔ وہ اس بات کے شاکی تھے کہ مدارس میں قرآن وحدیث کی تعلیم پر جس حد تک ارتکاز ہونا چاہئے اس سے یہ نصاب اور اس کا طریقہ تدریس محروم ہے۔ حدیث کی تدریس کے تعلق سے ان کی صائب رائے یہ تھی کہ دورہ حدیث کی ایک سال کی مدت کو بڑھا کر دو سال کر دیا جائے بصورت دیگر اس کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ حضرت مولانا رحمانی نے خود عملی سطح پر جامعہ رحمانی مونگیر کے نصاب میں مناسب تبدیلیاں کیں۔ جامعہ رحمانی کا

موجودہ نصاب قدیم صالح اور جدید نافع کی جامعیت اور جدیدیت وروایت کے درمیان توازن وہم آہنگی کا حامل ہے۔

مولانا رحمانی کی مفکرانہ عظمت کے نقوش ان کی مختلف موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔انہوں نے وقت کے بہت سے حساس موضوعات پر قلم اٹھایا جن میں خصوصیت کے ساتھ ہندوستان میں تحفظ دین وشریعت کا مسئلہ ہے۔حقیقت یہ ہے کہ دوسرے بہت سے مفکرین کی حیثیت سے شہرت حاصل کرنے والی شخصیات کے مقابلے میں جن کے یہاں دین وشریعت کے احیا اور تحفظ کی فکر خیالی فضاؤں میں پرورش پاتی اور بلند آہنگ نعروں سے غذا حاصل کرتی ہے،حقیقت بنی اور عملیت پسندی کی راہ سے فکری وعملی رہنمائی کی اوراس میں ہندوستانی مسلمانوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔

عمل اور اقدام کے میدان میں مولانا کے کارنامے اتنے واضح اور روشن ہیں کہ ملک کا کوئی بھی باشعور اور مسلمانوں کی موجودہ اجتماعی تاریخ سے واقف کوئی بھی شخص اس سے انکار نہیں کرسکتا۔حضرت مولانا سجادؒ کے بعد مولانا کے علاوہ کوئی دوسری شخصیت نظر نہیں آتی جس نے ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کی شکل میں شریعت کے تحفظ اور مسلمانان ہند کی زندگی میں اس کی راہ کو آسان بنانے کی اس پیمانے پر جدوجہد کی ہو۔مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام ان کی فکر کی پیداوار ہے۔اور امارت شرعیہ اپنی موجودہ وسیع سرگرمیوں اور اثرات وخدمات کے ساتھ ان کی عملی کاوشوں کا ثمرہ۔شریعت۔خاندانی منصوبہ بندی،مسلم مطلقہ کو تاحیات نفقہ دیے جانے اور بابری مسجد سے دست برداری کے حوالے سے جب بھی اسلامی شریعت کو نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی،انہوں نے اس جذبے اور دل کی پکار کے ساتھ سردھڑ کی بازی لگادی کہ :اینقص الدین وانا حی۔ان کے مومنانہ جوش اور حمیت دینی کا اندازہ ان کے اس جملے سے لگایا جاسکتا ہے:

''میں اس کے لیے تیار ہوں کہ ہماری گردنیں اڑادی جائیں،ہمارے سینے چاک کردیے جائیں،مگر ہمیں یہ برداشت نہیں کہ مسلم پرسنل لا بدل کر ایک غیر اسلامی لا ہم پر لاد دیا جائے ہم اس ملک میں باعزت قوم اور مسلم قوم کی حیثیت

سے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔''

۱۹۳۷ء میں وقف جائداد پر حکومت کی طرف سے ٹیکس عائد کیے جانے کا مسئلہ ہو یا ۱۹۳۸ء میں گائے کی قربانی پر امتناع کی کوشش کا معاملہ، ذاتی اور سیاسی نوعیت کی مصلحتوں سے اوپر اٹھ کر انہوں نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور ملت کی بے باک ترجمانی کا فریضہ انجام دیا۔ دینی حمیت اور جرأت و بے باکی کی تاریخی مثالیں انہوں نے قائم فرمائیں وہ ہندی مسلمانوں کی ملی تاریخ کے صفحات میں جلی عنوان سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔

حضرت امیر شریعت کے قائم کردہ اور سینچے ہوئے اداروں کی کمی نہیں ہے تاہم ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسا ادارہ وجود میں آئے جس کے ذریعے حضرت مولانا کے ذہنی خاکے کے مطابق ہندوستان میں تحفظ دین وشریعت کی اجتماعی ذمہ داریوں کو نبھانے کی صلاحیت رکھنے والی نسلوں کی تربیت کا نظم ہو اور ان کے علمی وفکری ورثہ کو آگے بڑھایا جا سکے۔

مولانا محمد اویس صدیقی نانوتوی

اکیسویں صدی میں مولانا منت اللہ رحمانی کے افکار کی اہمیت ومعنویت

پوری اسلامی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ اس کا کوئی بھی زمانہ ایسا نہیں گزرا جس میں اس طرح کے لوگ نہ رہے ہوں، جنھوں نے اپنا سب کچھ لٹا کر بھی اسلام کو زندہ رکھا۔ اور اس کی نشرو اشاعت میں کسی طرح کی قربانی سے گریز نہیں کیا۔ مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ بھی انہی مخلص ترین شخصیات میں سے تھے، جن کی سب سے بڑی صفت بے باکی اور حق گوئی ہے۔ جنھوں نے ہر حال میں حق گوئی کو اپنا فریضہ سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی۔ اوز کلمة حق عند سلطان جائر کو اپنا شعار بنایا۔ ہر اس میدان میں سرگرم عمل رہنا ان کا طریقہ کار تھا جس سے متعلق وہ سمجھتے تھے کہ یہ اسلام اور امت مسلمہ کے لیے کسی نہ کسی درجے میں نفع بخش ہے۔ آپ کے لیے معیار کسی کی زندگی نہیں تھی بلکہ معیار صرف اور صرف حضور کی حیات طیبہ تھی ایک جگہ فرماتے ہیں:

> ”قرآن کریم میں اللہ نے ایک جملہ کہہ کر بہت بڑے فتنے کا تدارک کیا ہے، ارشاد ہے لقد كان لكم في رسول الله اسوة حسنة یعنی کوئی بھی ذات قابل تقلید نہیں جب تک کہ اس کی زندگی حضور کی زندگی کے بالکل موافق نہ ہو۔“ (خطبات، ص ۴)

آج جب کہ امت مسلمہ نہایت پر آشوب دور سے گزر رہی ہے اور پوری دنیا کی قومیں ہمارے اوپر بھوکوں کی طرح ٹوٹ پڑی ہیں امت مسلمہ نے اقدامی طریقہ کار کو چھوڑ کر دفائی

طریقہ کار اپنا رکھا ہے۔ شعور و احساس کا فقدان ہے۔ اور ہر آدمی نے تاویلات، رخصت اور مصلحت کو اپنا طریقہ کار بنا رکھا ہے، ایسے میں مولانا منت اللہ رحمانی کی فکر کو پھیلانے کی سخت ضرورت ہے اور ان کے میدانی تجربات سے فائدہ اٹھا کر اسلام کی آفاقیت اور اقدامیت کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ تاکہ ہمارا پڑھا لکھا طبقہ اصحاب اقتدار و ثروت سے کسی بھی طرح مرعوب نہ ہو، اس کے بجائے اس میں دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت ہو۔ مندرجہ ذیل سطور میں ہم مولانا منت اللہ رحمانی کے حوالے سے ان چیزوں کا تذکرہ کرتے ہیں، جن کا اپنانا ازبس ضروری ہے۔

۱- ایمان باللہ

مولانا نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں جس چیز کی طرف سب سے زیادہ توجہ مبذول کرائی ہے وہ ہے ایمان باللہ، جو تمام اعمال کے لیے اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی انسان ہر طرح مشرکانہ رسوم سے اپنے آپ کو پاک کر کے ایمانی مقتضیات پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرے۔ ایمان ایک بہت جامع لفظ ہے، جس میں عقیدہ کی پاکیزگی، کردار کی بلندی، اخلاق عالیہ، شعور، جرأت، بہادری، صداقت اور فراست سب چیزیں یکساں طور پر داخل ہیں۔ جس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں آیا ہے کہ ایک صحابی نے آپ سے دریافت فرمایا۔ یا رسول اللہ مجھے بہت ہی مختصر نصیحت فرمایئے جو کہ میرے لیے کافی ہو۔ آپ نے ارشاد فرمایا: آمن باللّٰہ ثم استقم کہ اللہ پر ایمان لانے کے بعد اس پر قائم رہو۔ مولانا نے بھی اپنے خطبات میں اسی ایمان کی دعوت دی چنانچہ فرماتے ہیں:

> ''اسلام کی دعوت کا بنیادی پہلو توحید ہے، یعنی ایک خدا کی عبادت کرنا، اور مقتضیات ایمانی پر عمل پیرا ہونا۔ ارشاد باری ہے۔ یا أیھا الذی امنوا امنوا باللّٰہ و رسولہ والکتاب الذین نزل علی رسولہ والکتاب الذی انزل من قبل. ایمان والوں کو ایمان لانے کا حکم دینا اس بات کو بتاتا ہے کہ اصل ایمان وہ ہے جس پر استقامت ہو اور اس کے مقتضیات پر بلاکم و کاست عمل کیا

جائے۔(خطبات:۲۵)

ایک اور جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

آج کا اسلام رسم ورواج کی بندشوں میں جکڑا ہوا ہے، اس کی حقیقی اور اصل تصویر نگاہوں سے اوجھل ہو چکی ہے۔ضرورت ہے کہ اسلام کی صحیح اور اصل تصویر لوگوں کے سامنے آجائے۔اسلامی انقلاب لاکر رسم ورواج کی بندشوں کو توڑا جائے اور انسانوں کو امن وسکون کے ساتھ جینے کا موقع دیا جائے۔''(خطبات:۸۸)

مولانا منت اللہ رحمانی نے اس نقطہ کو جگہ جگہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں واضح کیا ہے۔

۲-اسلامی وحدت واخوت

مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ صاحب نے جتنا زور اس مسئلہ پر دیا شاید ہی کسی اور مسئلہ پر دیا ہو۔ان کے خیال میں اسلامی معاشرے کی تشکیل کی اساس ہی تعاونوا علی البر والتقوی ہے۔یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے مدینہ میں جاکر جس معاشرے کی تشکیل کی اس میں سب سے پہلا کام مواخات بین المہاجرین والانصار کا کیا تاکہ معاشرے کے اندر توازن برقرار رہ سکے۔دوسرے قرآن کریم نے بھی اسلامی معاشرے کی تین بنیادوں کی طرف نشاندہی کی ہے، جن کا ذکر سورہ آل عمران میں بڑی تفصیل سے آیا ہے۔وہ تین بنیادیں تقوی، اعتصام بکتاب اللہ اور اخوت واتحاد بین المسلمین ہیں۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلے کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اس کے اوپر مستقل ایک رسالہ لکھا، جس میں ہر اس طرز عمل کو برملا برا کہا، جس میں کہیں سے بھی مسلکی تعصب کی بو آئے۔۱۳۸۳ھ میں مؤتمر عالم اسلامی کا اجلاس جامع ازہر کے زیر اہتمام منعقد ہوا۔اس میں مولانا نے ایک مقالہ پیش کیا تھا۔مولانا اس میں فرماتے ہیں:

''دینی اختلافات کی بڑی وجہ امور مجتہد فیہا اور فقہی جزئیات وفروع میں غیر

معمولی شدت وتعصب بھی ہے، ان فروعی مسائل کے ساتھ ہم نے وہی معاملہ کیا جو کہ امور منصوصہ کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔

دنیا میں ایسے علاقے بھی ہیں جہاں دوسری فقہ پر عمل کرنے سے منع کیا گیا، ایسے مقامات بھی موجود ہیں جہاں دوسرے مسلک والوں کے داخلے پر مسجدیں دھلوائی گئیں کہ ان کے داخلے سے مسجدیں ناپاک ہوگئیں۔ ان اختلافات کی بناء پر مسلمانوں نے جدال وقتال کیا ہے، کاش ان کی نظر حضرت امام مالکؒ کے اسوہ پر ہوتی کہ جب خلیفہ مہدی اور خلیفہ ہارون نے امام سے چاہا کہ مؤطا کی نقلیں کرا کے مختلف اسلامی ریاستوں میں بھیج دیں اور حکم دیں کہ اسلامی ممالک میں اسی پر عمل کیا جائے تو گرچہ امام مالکؒ کو موقع تھا کہ وہ اپنے مسلک کو عالم اسلامی میں پھیلا دیں لیکن امام نے ایسا نہیں کیا بلکہ یہ جواب دیا کہ صحابۂ کرام رسول اللہ ﷺ سے دین لے کر دنیا بھر میں پھیل گئے اور انھوں نے سنت رسول کی بنیاد ہی پر اپنے اپنے طریقوں سے دین پھیلایا اور اس پر عمل کیا تو پھر ہم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم دین کو ایک ہی طریقے پر محصور کرلیں۔ اور صحابۂ کرام کے پھیلائے ہوئے طریقوں کو ختم کردیں جب کہ ان مسالک وطرق کی بنیاد بھی قرآن وسنت پر ہے۔ ان فروعی مسائل کو غیر معمولی اہمیت دینے کا سب سے بڑا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے علما اور اصحاب فتاویٰ کی نظر دین کی ابدی بنیادوں اور عالم گیر اصولوں سے ہٹ کر فروع پر آگئی اور اصل دین مستور ہوگیا، جس پر اصل کامیابی کا مدار ہے اور ان کی جگہ چھوٹے چھوٹے مسائل نے لے لی، جس سے وحدت اسلامیہ کو غیر معمولی نقصان پہنچا۔ اخوت اسلامی پارہ پارہ ہوگئی اور وما أرسلناك الا رحمة للعالمين اور وما أرسلناك الا كافة للناس بشيرا و نذيرا کا اعلان بے معنی ہوگیا۔“

مذکورہ بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا اتحاد ملت کو ہی اس امت کی نجات کا ذریعہ تصور کرتے ہیں، مولانا کی فکر اتحاد کے سلسلے میں آج بہت ہی اہمیت کی حامل ہے۔ کیوں

۔کہ دنیا کا کوئی چھوٹا یا بڑا مسلمان ملک ایسا نہیں جہاں پر مسلمان فروعی مسائل کو لے کر آپس میں الجھے ہوئے نہ ہوں اور یہ الجھن جدال وقتال اور عناد کی شکل اختیار نہ کر گئی ہو، جس کا فائدہ مستقل طور پر دوسری اقوام اٹھا رہی ہیں۔ مسلم پرسنل لا کے انتشار کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس لیے ضرورت اتحاد و سالمیت اور داخلی انتشار کے اسباب تلاش کر کے ان کا سد باب کرنے کی ہے۔ یہاں میں یہ بات ذکر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ بہت زیادہ اسباب تلاش کرنے کی بھی ضرورت نہیں، بلکہ رسول اللہ علیہ کی تعلیمات کو راہ نما بنا کر ان پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔ انتشار وتفریق اسی وقت تک ہے جب تک ہم جادۂ مستقیم سے ہٹے ہوئے ہیں۔

۳- جرأت ودیانت

مولانا کی تیسری سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ نہایت جری اور بہادر تھے۔ جرأت، دیانت داری، شجاعت آپ کو ورثہ میں ملی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کسی بھی موقع حق گوئی میں حق بات کہنے سے گریز نہیں کرتے تھے:

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

ان کی زندگی میں جرأت اور دیانت داری کی مثالیں بھری پڑی ہیں، حق گوئی کی خاطر انھوں نے نہ اقتدار کی پرواہ نہ سامنے والے کے منصب وجاہ اور نہ مال و دولت، علم وحکمت کی انھوں نے جسے صحیح سمجھا بے کم وکاست کہا، اور منہ پر کہا، ان کی زندگی اور سیرت کا پہلو قابل تقلید اور علماء متقدمین کی یاد دلاتی ہے۔

ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیں، جب ہاشم صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ یونیورسٹی میں ایک اجلاس عام کا اہتمام کیا گیا اس میں کافی علما اور دیگر سیاسی حضرات بھی تشریف رکھتے تھے۔ مولانا منت اللہ صاحب علیہ الرحمہ بھی وہاں موجود تھے۔ ہاشم صاحب نے اپنی تقریر میں تمام مذاہب کی ایک ہی منزل بتاتے ہوئے یہ کہا کہ اسلام اور دیگر مذاہب کی جب

منزل ایک ہے تو ان میں کوئی فرق نہیں۔ مولانا نے فوراً اٹھ کر فرمایا کہ معاف کیجیے گا، اسلام اور دیگر مذاہب کی منزل ایک نہیں بلکہ بالکل جداگانہ ہے۔ اور حق تو صرف ایک ہوتا ہے اگر سب حق ہو جائیں گے تو پھر حق و ناحق میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہے گا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ ہے۔ اپنے زمانے کے وزیر داخلہ اور دبنگ لیڈر مسٹر وائی بی چوان خانقاہ رحمانی مونگیر پہونچے۔ حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ نے انھیں طریقۂ وضوء اور طریقۂ نماز سکھانے والا ریکارڈ سنایا، نماز میں تلاوت کی آواز سن کر چوان صاحب بول پڑے کہ ''اچھا! مسلمان عربی میں نماز پڑھتے ہیں؟'' حضرت امیر شریعت نے جواباً فرمایا کہ میں اسے ملک کی بدقسمتی سمجھوں یا مسلمانوں کی۔ ہمارا وزیر داخلہ یہ نہیں جانتا کہ اس کے ملک کی اتنی بڑی آبادی کس زبان میں عبادت کرتی ہے''۔ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کے حالات و کوائف پڑھ کر متنبی کا شعر یاد آتا ہے:

انا صخرة الوادی اذا ما زوحمت

و اذا نطقت فاننی الجوزاء

اور مولانا کے فلسفہ حیات کی ابوالقاسم الشابی کے یہ دو اشعار ترجمانی کرتے ہیں:

اذا الشعب یوما اراد الحیاة

فلا بد ان یستجیب القدر

ولا بد للیل ان ینجلی

ولا بد للقید ان ینکسر

''جب کوئی قوم اپنے آپ کو زندہ بنانا چاہتی ہے تو تقدیر اس کی پکار پر لبیک کہتی ہے۔ پھر اندھیرے چھٹ جاتے ہیں اور ساری بندشیں ٹوٹ جاتی ہیں۔''

مولانا کی تمام صفات کا احاطہ اس مقالہ میں ممکن نہیں میں نے صرف ان صفات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے، جن کا ہماری نوجوان نسل میں پایا جانا بے انتہا ضروری ہے۔ مولانا کا اصل وصف ان کی جامعیت ہے، جس کا آج ہمارے یہاں تقریباً فقدان ہے۔

———— ⊙⊙⊙ ————

ڈاکٹر زبیر احمد فاروقی ☆

مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی اردو نثر

مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر علماء امت کے درمیان ایک امتیازی شان کے حامل تھے۔ آپ ایک کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے، جس میں فکر کی گہرائی، روشن ضمیری، اولوالعزمی، علم نافع اور عمل صالح جیسے اوصاف خاص طور پر نمایاں تھے۔ ایک نابغۂ روزگار شخصیت کے تمام لازمی اوصاف آپ کے اندر ایک نہایت خوب صورت توازن کے ساتھ جمع تھے۔ آپ نے اپنی بلند نگاہی، سخنِ دل نواز اور جان پرسوز کی بدولت میر کارواں کے فرائض نہایت عمدگی اور خوش اسلوبی سے انجام دیے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی کے الفاظ میں ''امیر شریعت'' یوں تو دو حرفی لقب ہے لیکن اس میں فکری اور عملی تعینات کی دنیا پوشیدہ ہے، یہ مسند صرف اس شخص کو زیب دیتی ہے جو دینی مسائل میں غیر معمولی بصیرت رکھتا ہو اور جو اپنی اجتہادی صلاحیتوں کو کام میں لاکر نہ صرف مسائل کا حل پیش کرنے پر قادر ہو بلکہ نامساعد حالات میں صرف عزم و ہمت ہی کا نہیں بلکہ عزیمت کا بھی ثبوت دے سکتا ہو۔ یہ صلاحیتیں مشکل سے ایک شخص میں جمع ہوتی ہیں، جب جمع ہو جاتی ہیں تو وہ شخص نابغۂ روزگار بن جاتا ہے، آنے والے حوادث کا عکس وہ اپنے آئینۂ ادراک میں دیکھ لیتا ہے

☆ سابق صدر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۲۵

اور فضائیں تک پکار اٹھتی ہیں:

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

(حضرت امیر شریعت نقوش وتاثرات، ص:۲۲)

ان سب خوبیوں کے علاوہ ایک اور وصف جو انھیں علماء کی صف میں ایک امتیازی شان عطا کرتا ہے وہ ہے ان کا سلیس، شستہ اور بے تکلف اسلوب تحریر۔ مولانا کا یہ اسلوب تحریر ان کے سفر نامے میں جو انھوں نے مصر اور حجاز مقدس کے سفر سے واپسی کے بعد تحریر کیا تھا اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سفر وسیلۂ ظفر ہے، یہ ظفر اپنے تمام مادی، روحانی اور علمی پہلوؤں پر محیط ہے۔ مذہبی نقطۂ نظر سے سفر کی اہمیت اور افادیت پر قرآن کریم کی آیت "سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ"، انبیائے کرام: حضرت نوح، حضرت موسیٰ، حضرت یوسف اور حضرت ابراہیم علیہم السلام کے اسفار اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مبارکہ سے استدلال کیا جاسکتا ہے۔ سفر ناموں کو دنیا کی تمام زبانوں میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس لیے کہ وہ مختلف ممالک کے تاریخی، جغرافیائی اور سماجی حالات سے متعلق معلومات کا ایک ایسا خزانہ ہیں، جن سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں۔ ابن بطوطہ کے سفر نامہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دنیا کی کوئی ترقی یافتہ زبان ایسی نہیں جس میں اس کا ترجمہ نہ ہوا ہو۔ اس سلسلہ میں یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ مسلمانوں نے اس فن میں دنیا کی دوسری اقوام پر سبقت حاصل کرلی ہے، جس کا اعتراف بعض مستشرقین نے بھی کیا ہے۔

بیسویں صدی میں شائع ہونے والے اردو کے بیشتر سفر نامے سرزمین حجاز اور دیگر مقامات مقدسہ کی زیارت سے متعلق ہیں۔ قدیم سفر ناموں میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا سفر نامہ "جذب القلوب الی دیار المحبوب" اور شاہ ولی اللہ دہلوی علیہ الرحمہ کا سفر نامہ فیوض

الحرمین کے نام سے معروف ہے۔ یہ دونوں سفرنامے اصلاً فارسی میں ہیں بعد میں ان کو اردو میں منتقل کیا گیا۔ اسی طرح نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے سفرنامے ''ترغیب المسالک علی احسن المسالک'' نواب صدیق حسن خان کے سفرنامے ''رحلة الصدیق الی بیت اللہ العتیق''، ''سفرنامہ حجاز'' از شیخ الہند محمود حسن، ''دیارِ عرب میں چند ماہ'' از مسعود عالم ندویؒ، ''سفرنامہ ارض القرآن'' از ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ''شب جائے کہ من بودم'' از شورش کاشمیری، ''سفر حجاز'' از عبد الماجد دریا آبادی، ''کاروان حجاز'' از ماہر القادری اور ''شرق اوسط کی ڈائری'' از مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کو اہم سفرناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔

مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ نے مارچ ۱۹۶۴ء میں مصر کے صدر جمال عبدالناصر کی طرف سے منعقد کی گئی علماء اسلام کی ایک عالمی کانفرنس میں حکومت مصر کی دعوت پر ہندوستانی وفد کے ممبر کی حیثیت سے قاہرہ کا سفر کیا تھا۔ کانفرنس کے اختتام پر آپ نے حج و زیارت کی غرض سے حجاز مقدس کا بھی سفر کیا۔ اس کانفرنس میں ۴۰ ملکوں کے ۸۲ نمائندے شریک ہوئے تھے جو اپنے رنگ و نسل، زبان اور لباس کے لحاظ سے مختلف تھے، مولانا نے اس تنوع کا نقشہ نہایت خوب صورت اور بلیغ انداز میں اس طرح پیش کیا ہے:

> ''عجیب منظر ہے کالے، گورے، سرخ، سفید سبھی جمع ہیں، رنگ و نسل، زبان لباس، سب مختلف لیکن وحدت کلمہ نے سب کو یکجا کر دیا ہے اور اسلام کے عالمگیر مذہب ہونے کا زندہ ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ سب ساتھ بیٹھے ہیں، ساتھ کھاتے پیتے ہیں، ایک ساتھ نماز پڑھتے ہیں اور ''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ'' اور ''لافضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی'' کے پیغام کی تصدیق کر رہے ہیں۔ ایک پر ایک صاحب فضل و کمال موجود ہے۔ یہ افریقہ کے شیخ الاسلام ہیں جن کے ہاتھ پر سترہ لاکھ عیسائیوں نے اسلام قبول کیا۔ یہ فلسطین و لبنان شمالی کے مفتی اعظم ہیں، یہ سوڈان کے قاضی القضاۃ ہیں، یہ روس کے مفتی بابا خانوف ہیں، یہ لیبیا کے محکمہ شرعیہ کے رئیس ہیں، یہ لندن کے مسلم

ہال کے انچارج ہیں، یہ تونس کے شیخ ہیں، یہ ہالینڈ کے آئے ہوئے بھائی ہیں، شکل وصورت علیحدہ، زبان ولباس جدا، تمدن ومعاشرت الگ لیکن کلمہ سب کا ایک اور ایمان سب کا محمد رسول اللہ ﷺ پر ہے۔"

(حضرت امیر شریعت: نقوش وتاثرات، ص:۹۲، ۹۳)

اس مختصر سی عبارت میں مولانا رحمانی نے جس بلاغت آمیز ایجاز کے ساتھ کانفرنس کے نمائندوں کا تعارف کرایا ہے وہ اردو نثر پر ان کی مضبوط گرفت کی غمازی کرتا ہے۔

یہ سفرنامہ اس لحاظ سے بہت جامع اور مفید ہے کہ اس میں کانفرنس کے مختلف اجلاس کی کارروائی کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ مصر کے علماء سے ملاقاتوں اور ان سے گفتگو کا ذکر بھی شامل ہے۔ قاہرہ کی مشہور مسجد ومزارات، وادیٔ سینا، قلعہ صلاح الدین ایوبی، جامعہ ازہر، قاہرہ یونیورسٹی، اسوان بند، عجائب خانہ اور مصری پارلیمانی نظام کے بارے میں دی گئی تفاصیل نے اس سفرنامے کو معلومات کا ایک دلچسپ مجموعہ بنادیا ہے۔

مصر کے نظام تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے جزئیات کو بھی بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔

کم الفاظ میں وسیع تر مفاہیم کو سمیٹنے کا فن مولانا کو خوب آتا تھا۔ یہ ایجاز جو ابہام سے خالی ہے مولانا کی نثر کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ مثال کے طور پر اشاروں ہی اشاروں میں جمال عبدالناصر کی شخصی حکومت پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار نہایت ہی بلیغ طنز آمیز انداز میں کرتے ہیں۔ "مصر کا نیا دستور" عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"جمال عبدالناصر نے دستور کی تمام دفعات سنائیں جنھیں پارلیمنٹ نے منظور کیا اور غالباً منظور کرنے کے سوا ان کے لیے کوئی چارہ بھی نہ تھا۔"

اردو کے بیشتر سفرنامے ایک خاص نہج سے باہر نکلتے ہیں، ان میں سیاح کے ذاتی تجربات، شخصی ملاقاتوں اور ضیافتوں کا تذکرہ ضرورت سے زیادہ اور متعلقہ ممالک کے سیاسی اور سماجی حالات کا ذکر خال خال ہی ملتا ہے۔ جو چند سفرنامے اس عام انداز سے مستثنیٰ ہیں ان میں

"مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا سفرنامہ" بلاد اسلامیہ"،" زمان ومکان اور بھی ہیں" از محمد حمزہ فاروقی اور" دنیا مرے آگے" از جمیل الدین عالی قابل ذکر ہیں۔ اردو کے وہ سفرنامے جو طرز انشاء اور قیمتی معلومات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے یاد رکھے جائیں گے ان میں بلا تکلف مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کا یہ سفرنامہ بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔

اس اسلوب بیان کی متعدد مثالیں مولانا کے خطبات میں بھی جا بجا ملتی ہیں۔ مولانا کے نزدیک دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم کی اہمیت بھی مسلم تھی۔ وہ دینی مدارس کے تعلیمی نصاب کو مؤثر بنانے کے ساتھ مغربی تعلیم کی ضرورت کا بھی شدید احساس رکھتے تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں ان کا یہ فقرہ جہاں ان کے اس احساس کا مظہر ہے وہیں ان کی سلیس اور شستہ نثر کا ایک خوبصورت نمونہ بھی ہے:

> "مسلم یونیورسٹی ہماری صد سالہ تہذیبی، تعلیمی اور قومی جدوجہد کی علامت اور نمونہ ہے۔ یہ ادارہ ہمارے سو سال کی کمائی کا پھل ہے۔ اس ادارہ میں افراد کی تعمیر، ماحول اور معاشرہ کی تعمیر اور عمارت کے بنانے پر ہماری بہترین صلاحیتیں، بہت ہی کوششیں اور بہت سارا مال خرچ ہوا ہے، اس لیے صرف اس کی عمارت ہی نہیں اس کی ایک ایک خصوصیت سے ہمارا گہرا قلبی تعلق ہے اور ہمیں وہاں کی روایتیں، وہاں کا مزاج، وہاں کی تعلیم سب عزیز ہے۔"

(خطبات: ص، ۱۹۳)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

> "اس نے ہماری ملکی تاریخ میں اہم اور قابل قدر شخصیتوں کے لعل و گہر ٹانکے ہیں، اس کی تاریخ روشن ہے اور اس کا کردار بے داغ۔" (خطبات: ص ۲۰۰)

مولانا کی تعلیمی اور عملی زندگی کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں قیام کے دوران وہاں کی تحریری اور تقریری سرگرمیوں میں حصہ لے کر آپ نے اپنے اندر ادبی ذوق پیدا کیا اور پھر اس ذوق کی تکمیل دارالعلوم دیوبند کے چار سالہ قیام کے دوران

ہوئی۔اس کے بعد پٹنہ سے آپ نے ''الہلال'' نامی اخبار نکالا، جس کے زیادہ تر مضامین اور ایڈیٹوریل آپ خود لکھا کرتے تھے۔اس زمانہ میں آپ انگریزی زبان سیکھ کر انگریزی اخبارات سے بھی استفادہ کرنے لگے تھے اور انگریزی مضامین کے اردو ترجمے کیا کرتے تھے۔ان تمام عوامل کے نتیجے میں مولانا کی اردو نثر میں ایک ایسا سلیس، عام فہم اور پختہ صحافتی اسلوب جھلکتا ہے جو اختصار اور جامعیت میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے اسلوب سے بہت قریب ہے اور یہ اسلوب آپ کو علماء کی صف میں ایک اہم اور ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔

———— ⊙⊙⊙ ————

پروفیسر ڈاکٹر لطف الرحمٰنؒ ☆

اردو نثر کے اسلوبی ارتقاء میں
حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی کے امتیازات

یہ ایک بین حقیقت ہے کہ اردو شاعری کی طرح اردو نثر بھی اپنے آغاز وارتقاء کے لئے فارسی ادب کا رہین منت ہے، چونکہ ایک عرصے تک فارسی نثر عوامی اسلوب کی حیثیت حاصل کرنے سے محروم رہی، اس لئے اسی روایت کے زیر اثر اردو نثر کو بھی عوامی ترجمان بننے میں صدیاں لگ گئیں، ویسے اردو نثر محدود سطح پر ہی سہی عوامی ترجمانی کے فرائض ابتداء ہی سے انجام دیتی رہی ہے۔ دراصل فارسی نثری روایت کے زیر اثر اردو نثر میں دو مختلف رجحانات ابتدا ہی سے کارفرما نظر آتے ہیں ایک اشرافیہ نثر کی، اور دوسرے عوامی نثر کی۔ یہ اجمال قدرے تفصیل طلب ہے:۔

ایران میں طبقہ اشرافیہ اپنے آپ کو عوام سے الگ رکھتا تھا، اور خود کو عوام سے بلند و برتر اور ممتاز و مشرف سمجھتا تھا، اس طبقے کا مزاج ہی کچھ الگ تھا، اسی مزاج نے فارسی نثر کو فن نہیں بننے دیا۔ شاعری کا تعلق براہ راست عوام سے تھا اس لئے شاعری نے فن اور آرٹ کا درجہ حاصل کرلیا۔ نثر پیچھے رہ گئی۔ ہندوستان کی فارسی نثر بھی ایرانی اثرات کی بنا پر فن اور آرٹ کا درجہ حاصل نہ کرسکی، بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی فارسی نثر اچھی نثر نہیں ہے۔ ہندوستان میں اعلیٰ درجے کے فارسی شعراء پیدا ہوئے لیکن اعلیٰ درجے کے فارسی نثر نگار سامنے نہیں آئے۔ پھر

☆ سابق صدر شعبۂ اردو وفارسی بھاگلپور یونیورسٹی (بہار)

بھی چند فارسی کتابیں اچھی نثر کے دائرے میں رکھی جاسکتی ہیں۔ عبدالقادر بدایونی کی ''منتخب التواریخ'' یا پھر عبدالنبی فخرالزماں کا تذکرہ ''میٔ خانہ'' وغیرہ۔ واضح رہے کہ مشہور تذکرہ ''میٔ خانہ'' پٹنہ میں مکمل ہوا، اورنگ زیب کی نثر بھی اعلیٰ درجے کی ہے، لیکن مرکزی توجہ اور دلچسپی سے محروم ہے۔ مگر اتنی بات طے ہے کہ فارسی نثر کے ارتقاء میں اورنگزیب عالمگیر کی نثر کو دنیا فراموش نہیں کرے گی۔

ایرانی اثرات کے تحت ہندوستانی اہل قلم خود رائی و کجروی کے شکار ہوگئے تھے، سادہ نثر جو روزمرہ اور عوامی بول چال پر مبنی ہوتی ہے اس کو کم علمی و کم مائیگی پر محمول کرتے تھے، طبقہ اشرافیہ کا مزاج ہی یہ تھا کہ جس نثر کو عوام بھی سمجھ لیں، وہ ان کی چیز نہیں ہوسکتی، ابوالفضل نے لکھا ہے کہ اپنی کتاب کے دو ابواب اس نے اپنے کسی دوست کو دکھائے۔ اس نے مشورہ دیا کہ بھائی! ایسی چیز لکھو جس کو عوام الناس بھی سمجھ سکیں۔ ایسی نثر کیوں لکھ رہے ہو جس کو صرف پانچ ہی افراد سمجھ سکیں۔ ابوالفضل نے جواب دیا کہ میں انہیں مخصوص پانچ آدمیوں کے لئے لکھ رہا ہوں، ابوالفضل بھی طبقہ اشرافیہ کا نمائندہ تھا۔ ہندوستان میں یہی اشرافیہ دانشوری فارسی نثر پر حاوی رہی، اردو نثر پر بھی اس کے دور رس اثرات مرتب ہوئے، غالب کی فارسی نثر بالکل بے کار ہے، اس میں تکلف ہی تکلف، آورد ہی آورد ہے، بے ساختگی و برجستگی کا نام و نشان نہیں، یہ تو اردو مکاتیب کی وجہ سے غالب کو اردو نثر میں مقبولیت و شہرت اور اہمیت وانفرادیت حاصل ہوئی۔

عام طور پر اردو نثر کے باضابطہ آغاز و ارتقاء میں باغ و بہار، خطوط غالب اور مضامین سرسید کو اہم سنگ ہائے میل کی حیثیت دی جاتی ہے، باغ و بہار افسانوی نثر کی نمائندگی کرتی ہے، یہ نثر بول چال کے بہت قریب اور تخلیقی عناصر سے مملو ہے، خطوط غالب ادبی نثر کی حیثیت سے ایک الگ شناخت رکھتی ہے، جس میں تخلیقی عناصر کے ساتھ ساتھ انشاء پردازی کا حسن بھی کارفرما ہے، اور بے تکلفی و برجستگی بھی بدرجہ اتم موجود ہے، مضامین سرسید کا شمار علمی نثر کے دائرے میں ہوتا ہے، علمی نثر میں متانت اور سنجیدگی کے پہلو بہ پہلو استدلالی اور منطقی انداز اور موضوع کے تقاضوں کے مطابق تجزیہ و تحلیل کا رجحان کارفرما ہوتا ہے۔ لیکن ان تین اسالیب نثر سے الگ ایک

اور نثر سادگی و برجستگی اور روانی و بے تکلفی پر مبنی بڑی خاموشی کے ساتھ عوامی سطح پر پروان چڑھ رہی تھی جس کا دائرہ عمل زیادہ وسیع اور متنوع تھا۔ جس کو صوفیائے کرام اور علمائے عظام نے فروغ دیا تھا ورنہ فارسی انشاء پردازی کے زیر اثر قدیم اردو نثر بھی مقفی و مسجع اسلوب کا اظہار تھی۔ عبارت آرائی کو تحریر کا خاص جوہر سمجھا جاتا تھا، جس کی نمایاں مثال رجب علی بیگ سرور کی تصنیف ''فسانۂ عجائب'' ہے جو میرامن کی باغ و بہار کے جواب میں لکھی گئی، سرور کی زبان دانی و انشاء پردازی دراصل فارسی نثر کی تقلید میں طبقہ اشرافیہ کی ترجمانی کرتی تھی جس کو عوامی روزمرہ اور بول چال سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ اس کے مخاطب عوام تھے۔

میرامن نے جس زبان کو ذریعہ اظہار بنایا اس کی بنیاد و پرورش غیر منقسم ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے صوفیاء کرام اور علمائے دین نے کی تھی جن کا براہ راست اور بلاواسطہ گہرا ربط و تعلق عوام سے تھا۔ یہی وجہ ہے اردو نثر نگاری کا یہ اسلوب عوام کی سادہ مزاجی، بے ساختگی و برجستگی آمد و بے تکلفی اور روانی و صفائی کا حسن رکھتا ہے جس نے بتدریج آگے بڑھ کر اور بول چال کی سطح سے بلند ہو کر ایک قومی اسلوب کی حیثیت حاصل کر لی، واضح رہے کہ کسی بھی قوم کی اجتماعی زندگی ایک ایسے نثری اسلوب کی محتاج ہوتی ہے جسے قومی اسلوب کا اعتبار و وقار حاصل ہو۔ اردو نثر کو یہ وقار و اعتبار اسی روایت نثر کے فروغ سے حاصل ہوا۔

میرامن ہوں کہ غالب کہ سرسید ان کی ذہنی تہذیب و تربیت اور تہذیبی و ثقافتی شعور کی پرورش و پرداخت میں اردو نثر کی اس طاقت ور، صالح، سادہ، بے ساختہ عوامی نثر نے بنیادی کردار ادا کیا ہے جو آج بھی انفرادی سطح پر ایک مخصوص مزاج و کردار اور تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار ہے، جس کو عرف عام میں مذہبی نثر سے موسوم کیا جاتا ہے، علمائے کرام اور صوفیاء عظام نے قدیم طرز انشاء کو روایتی ذہن کی غلامی اور درباری کی نفسیات پر مبنی تصنع تکلف اور فارسی کے زیر اثر زبان دانی کے خواہ مخواہ کے اظہار سے پاک و صاف کیا۔ ورنہ اردو نثر کی قدیم ترین شکلیں فارسی نثر کی نقالی کا واضح نمونہ نظر آتی ہیں۔ اور یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ نثر کی اجتماعی اور عوامی غرض و غایت سے اس عہد کے لوگ کما حقہ، واقف نہیں تھے۔ جب کہ صوفیاء کرام اور علمائے دین

متین کے سامنے نثر کا ایک واضح مقصد و مصرف تھا اور جیسا کہ پچھلے سطور میں عرض کیا گیا ان بزرگوں کا براہ راست ربط و تعلق عوام سے تھا۔ ان کا مقصد توسیع اخلاق و محبت، فروغ انسانیت اور اشاعت حق تھا، اس لئے ان لوگوں نے روزمرہ پر مبنی سادہ و بے ساختہ اسلوب کی حامل ایک دلنشیں نثر کی تاسیس و ترویج کی۔ آج اردو نثر کے جتنے اسالیب نظر آتے ہیں، وہ محترم صوفیوں اور مکرم عالموں ہی کی کاوشوں کا ثمرہ ہیں۔

اس پس منظر میں اب یہ دعویٰ کسی دلیل کا محتاج نہیں کہ اردو نثر کو قومی اسلوب کا درجہ عطا کرنے اور عوامی بصیرت و بصارت کا ترجمان بنانے میں ان بزرگوں نے تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے۔ اور ہماری تہذیبی زندگی کے بنیادی اسلوب کی دریافت کی ہے، بلاشبہ سرسید نے جدید اردو نثر کو جدید عہد کے تقاضوں سے روشناس کرانے میں بے حد اہم خدمت انجام دی ہے، لیکن سرسید کے اسلوب کی تعیین میں صوفیوں اور مذہبی بزرگوں کی نثری روایت نے گہرے اثرات مرتب کئے ہیں، سرسید کو ماضی پرستی کے دلدل سے نکال کر جدید علمی نثر کی شاندار عمارت کی بنیاد رکھنے کا شعور و حوصلہ بزرگوں اور صوفیوں کی اسی نثری روایت کا عطیہ ہے جس نے میر امن اور غالب کی نثر کو حسن و جمال اور قوت گویائی عطا کی۔

عوامی احساسات و جذبات کی ترجمانی اور اجتماعی، قومی اور ملی ضروریات و خدمات کیلئے اردو نثر میں جس ممتاز و منفرد اسلوب کو فروغ حاصل ہوا۔ اسی سلسلے کے ایک اہم سنگ میل کی حیثیت سے بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ (امیر شریعت بہار و اڑیسہ) کا نام نامی اسم گرامی ابدی اہمیت کا حامل ہے۔

حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کی شخصیت و سیرت میں بے پناہ تنوع اور جامعیت ملتی ہے۔ بیدار مغز، فعال، متحرک اور جرأت مند قائد کی حیثیت سے وہ بیسویں صدی کے پرآشوب دور میں عالمی سطح پر ملت اسلامیہ کے ایک تابناک اور روشن چراغ تھے، ان کی ذات میں اسلاف کی خودداری بیدار مغزی، حق گوئی، عمل و تحرک، سادگی و فقیری اور عزم و عزیمت کی خوبیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں، جن کا اظہار خطبات کی سطح پر بھی ہوا، اور باضابطہ طور پر تصنیفات و

تالیفات کے ذریعہ بھی۔حضرت امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کے اسلوب کی انفرادیت وعظمت ان کی تحریر وتقریر میں ہر جگہ سنجیدگی متانت، استدلالی نکتہ پذیری، تجزیاتی منطقیت، برجستگی وبے ساختگی اپنی سادگی وصفائی وقاراوراثر پذیری کے ساتھ واضح طور پر نمایاں ہے۔خواہ وہ سفر نامہ ہو کہ حکمت وبصیرت پر مبنی کوئی تصنیف یا دینی مذہبی، ملی، سماجی، اجتماعی، سیاسی اور فقہی وشرعی مسائل پر ان کے نظریات وافکار کا تحریری اظہار یا ان کے خطبات، کتابچے اور مضامین ہر جگہ ایک زندہ اور پراثر نثر مذکورہ خوبیوں کے ساتھ آبشار کی روانی ونغمگی کے ساتھ موج زن ہے۔مثلاً فلسطین چند تاریخی حقائق اور ہدایت الٰہی، مسلم پرسنل لا کو سمجھئے اور اس پر عمل کیجئے، علمائے کرام۔مقام ومقصد اور ذمہ داریاں، امارت شرعیہ۔خدمت کی جہتیں، نئی نسل ذمہ داریوں کو قبول کرے، دارالقضاء کا قیام۔شرعی ذمہ داری، علمائے اسلام کا ہر دور کا فیصلہ، شرم ناک لشکر کشی، ایمانی علمی تہذیبی اور لسانی رشتوں کے باوجود حرمین شریفین کا احترام ضروری، خطرات دستک دے رہے ہیں، جیسے مقالات میں بھی حضرت موصوف کا مخصوص ومنفرد اسلوب ہر جگہ کار فرما ہے، بلاتخصیص چند مثالیں دیکھئے، مسلم پرسنل لا کیا ہے؟ کا تعارف مندرجہ ذیل انداز میں پیش کیا گیا ہے:

> ”انسانی زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک تو اس کی شخصی اور خاندانی زندگی ہے جس کا دائرہ محدود ہے، اس میں انسان کے ذاتی معاملات آتے ہیں یا پھر وہ چیزیں جو اس کے اور اس کے خاندان کے درمیان معاملات اور حقوق وفرائض سے متعلق ہوتی ہیں مثلاً ازدواجی تعلق، ماں باپ اور اولاد کا تعلق، وراثت، ایک دوسرے پر نفقہ اور حق پرورش وغیرہ، اس زندگی کو ہم شخصی اور خاندانی زندگی (Personal & Family life) کا عنوان دیتے ہیں۔ دوسری زندگی شہری اور اجتماعی زندگی ہے جس کا دائرہ خاندانی تعلقات کی حدود سے آگے بڑھ کر شہر، ملک اور بین الاقوامی امور تک کو اپنے احاطہ میں لے لیتا ہے، اسے ہم اجتماعی اور شہری زندگی کا نام دیتے ہیں“(مسلم پرسنل لا۔

زندگی کی شاہراہ صفحہ ۱۵)

اسی مقالے میں فقہ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''قرآن پاک کی تعلیمات، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایتوں اور صحابہ کرام کی تشریحات کی روشنی میں فقہائے اسلام نے زندگی کے تمام گوشوں کیلئے قوانین مرتب کردیے ہیں جنہیں اصطلاح میں ہم فقہ کہتے ہیں۔ یہ پوری فقہ قرآن وحدیث کی بنیادوں پر مرتب ہوئی ہے اور جس طرح انفرادی زندگی کے قوانین پر عمل کرنا ہمارا فریضہ ہے اسی طرح ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ اجتماعی زندگی کے قوانین پر بھی عمل کریں'' (ایضاً صفحہ ۱۶۔۱۵)

چھوٹے چھوٹے جملے، صاف، سادہ، مربوط و منظم، بے ساختہ و برجستہ، عام فہم الفاظ ایک ایک لفظ مافی الضمیر کے اظہار میں متحرک سطح پر کامیاب، اختصار اور جامعیت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صاحب تحریر کو اظہار و بیان پر وہ قدرت کاملہ ہے کہ مطلب کے اظہار کے لئے الفاظ خود بخود وصف بہ صف حاضر خدمت ہیں، کوئی بناوٹ نہیں، کوئی علمی مظاہرہ نہیں، دردمندی، خلوص اور ملت کے لئے ایک فکر دامن گیر اور لطیف وشیریں انداز اظہار، ایسی نثر لکھنے والے خال خال ہی ملیں گے، حالانکہ صاحب اسلوب نثر نگاروں کی کمی نہیں مگر انفرادیت اظہار کی جو تخصیص حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کو حاصل ہے وہ اس عہد کے عام لکھنے والوں کے یہاں مفقود ہے، موضوع زیر بحث کو پوری وضاحت کے ساتھ جامع انداز میں پیش کرنا فکر و عمل کی سازگار مفاہمت کے بغیر ممکن نہیں۔ ملی زندگی میں فقہ اسلامی سے مسلمانوں کی بے توجہی اور بے نیازی کا تاریخی جائزہ کیسے مختصر ترین اسلوب میں پیش کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے۔

''لیکن ہوا یہ کہ جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا اور مسلم حکومتوں میں شخصی رجحان اور خدا کے حکم کے بجائے بادشاہ کی خواہش کے احترام کا جذبہ آتا گیا، اجتماعی قوانین جن کی روشنی میں حکومت چلائی جاتی تھی، عملاً ختم ہوتے رہے اور آہستہ آہستہ اسلام کے بہت سے اجتماعی قوانین کتابوں میں محفوظ ہوتے چلے گئے اور عملی

زندگی سے ان کا واسطہ کم ہوتا گیا۔(ایضاص ۱۶)

اتنے کم لفظوں میں ایک پوری تاریخی سچائی کو اتنی سادگی، توازن، اختصار اور جامعیت کے ساتھ پیش کرنا اظہار کی وہ ساحرانہ خوبی ہے جو ایک عمر کی فکر، ریاضت اور ملی و تاریخی شعور کی آگہی کا ثبوت ہے، روزمرہ کے سادہ، سلیس الفاظ کہ عام آدمی بھی ترسیل و ابلاغ سے محروم نہ رہے، حضرت امیر شریعت کی نثر نگاری کا کمال فن ہے۔

انگریزوں کے دور حکومت میں فقہ اسلامی کی نوعیت پر درجہ ذیل تبصرہ بھی نہ صرف یہ کہ ان کی بے مثال نثر نگاری کا ایک اچھوتا نمونہ ہے بلکہ تاریخی حقائق پر ان کی گہری بصیرت و بصارت کا اشاریہ بھی ہے، ملاحظہ کیجئے۔

''ہندوستان میں جب انگریزوں کا غلبہ ہوا تو انہوں نے حکومت چلانے کے لئے اپنا قانون نافذ کیا، جس کے نتیجے میں اسلام کا اجتماعی قانون زندگی، غیر متحرک ہوکر محض کتابوں میں رہ گیا۔ اور صرف انفرادی زندگی کے قوانین عملا باقی رہ گئے، جس کے نفاذ کے لئے حسب سابق قاضی مقرر ہوئے، بعد میں قضاء کا یہ نظام بھی ختم ہوگیا، اور شخصی و عائلی زندگی سے متعلق اسلامی قوانین کے نفاذ کا اختیار بھی عام سرکاری عدالتوں کے حوالے کردیا گیا۔ انفرادی زندگی کے یہ اسلامی قوانین جنہیں برطانوی حکومت نے اپنے قانون میں جگہ دی، ''مسلم پرسنل لا'' کہلائے، اور مسلم پرسنل لا کا دائرہ صرف وراثت، نکاح، حضانت، خلع وطلاق، فسخ، مہر نفقہ اور اوقاف وغیرہ تک محدود رکھا گیا، گویا مسلم پرسنل لا کی اصطلاح انگریزوں کا عطیہ ہے جو انفرادی اور خاندانی زندگی سے متعلق اسلامی قوانین کا ایک حصہ ہے، یہی مسلم پرسنل لا، اب تک چلا آرہا ہے، یہ گفتگو اس نتیجہ تک پہونچاتی ہے کہ ''مسلم پرسنل لا'' قوانین اسلامی کا ہی ایک حصہ ہے، جن کی تفصیلات فقہاء اسلام کے ہاتھوں مرتب ہوئی تھیں، اور جن کی بنیاد قرآن وحدیث پر ہے۔'' (ایضا ۱۶)

یہ طویل اقتباس ناگزیر تھا، ''مسلم پرسنل لا'' کی شرعی حیثیت، فقہ اسلامی کی طویل تاریخی مذہبی نوعیت اور فی زمانہ اس کے مسائل پر حضرت امیر شریعت نے جتنے اختصار اور توازن کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے، جدید اردو نثر کی روایت میں حضرت امیر شریعت کا اسلوب ایک منفرد دبستان کی حیثیت رکھتا ہے، جس میں عصری زندگی کے انفرادی مسائل اور اجتماعی وتہذیبی زندگی کے نشیب وفراز کو پراثر، سادہ و بے تکلف نثر میں پیش کرنے کی کوئی دوسری روایت اتنی انفرادیت کے ساتھ نظر نہیں آتی۔

ظاہر ہے کہ اسلوب اور انداز بیان صاحب تحریر کی شخصیت وسیرت کا آئینہ دار ہوتا ہے، حضرت امیر شریعت کی شخصی، مذہبی اور اجتماعی زندگی میں جو امتزاج، یک رنگی، توازن اور اعتدال تھا، اس کا اظہار ان کی تحریر وتقریر میں ہر جگہ نمایاں ہے، اجتماعی اور علمی زندگی کے تعلق سے بیسویں صدی کے دوسرے ربع سے تقریباً اواخر بیسویں صدی تک حضرت امیر شریعت نے ایک لمحہ دم لئے بغیر جس دردمندی اور خلوص کے ساتھ شب وروز قومی وملی فکر کے انہماک میں بسر کیا، اس کے ثبوت میں تو ان کی تمام تصنیفات وتالیفات کو سامنے رکھا جاسکتا ہے، لیکن ''اسلامی قانون۔ متعلق مسلم پرسنل لا'' حضرت امیر شریعت کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو رہتی زندگی تک یادگار رہے گا، اور صرف ہندوستان ہی میں نہیں ساری دنیا کے مسلمانوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگا، حضرت مولانا محمد ولی رحمانی نائب امیر شریعت بہار واڑیسہ کی مخلصانہ سعی بے پایاں اور جہد مسلسل نے اس عظیم اسلامی کارنامے کو پایہ تکمیل تک پہونچانے میں جس جانفشانی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کا اعتراف تو مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم نے بھی ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''اس کے بعد حضرت مرحوم کے فرزند ارجمند عزیز گرامی مولانا محمد ولی رحمانی نے اس کی تکمیل پوری دلچسپی سے، مونگیر اور پٹنہ میں مذکورہ علماء کو متعدد بار جمع کر کے کروائی اور بحث میں خود بھی حصہ لیا، ایک ایک ہفتہ کی کئی نشستیں ہوئیں۔
>
> (اسلامی قانون۔ متعلق مسلم پرسنل لا ص ۴۰)

اور اس طرح پسر تمام کند کی عملی تصویر حضرت مولانا محمد ولی رحمانی نائب امیر شریعت کی

ذاتی دلچسپی اور شغف نے اس عظیم الشان شرعی صحیفے کے اسلوب نثر کو اسی توازن اور حسن کے ساتھ برقرار رکھنے میں تاریخی کردار ادا کیا ہے، اس لئے کہ اس کتاب کی تہذیب، تنقیح اور تصحیح انہیں کے مبارک ہاتھوں سے مکمل ہوئی ہے، اور وہ خود بھی اسی سلسلہ اسلوب واظہار کے امین ہیں جو حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی کی تخصیص وعظمت ہے۔

یہ اجمال کچھ تاریخی حقائق اور پس منظر کی تفصیل کا محتاج ہے، جس کے لئے حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی کے خاندانی پس منظر کو مختصراً سامنے رکھنا ناگزیر ہے۔

حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی کی ابتدائی تعلیم وتربیت ان کے والد بزرگوار حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کی نگرانی میں ہوئی، خود حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ اپنے عہد کے ایک ممتاز عالم دین، صاحب کشف وکرامات صوفی اور بلند پایہ نثر نگار تھے، حضرت مولانا فضل رحماں گنج مرادآبادی کے مرید وخلفیہ تھے، انہوں نے مونگیر میں رشد وہدایت اور تعلیم وتبلیغ دین کے ایک مرکز کی بنیاد رکھی جو فی زمانہ خانقاہ رحمانی مونگیر کے نام سے چہار دانگ عالم میں مشہور ومذکور ہے، حضرت مونگیری علیہ الرحمہ نے مونگیر میں ایک دینی مدرسے کی بنیاد رکھی، مسجد کی تعمیر کی اور عیسائیت، قادیانیت اور آریہ سماجی فتنوں کی بڑھتی ہوئی اسلام مخالف تحریکوں کے خلاف پوری طاقت وقوت اور حق گوئی وبیبا کی کے ساتھ عملی اور علمی اجتہاد کا آغاز کیا جس کے مثبت نتائج سامنے آئے، اور جنوبی بہار میں خاص طور پر مذکورہ سازشوں اور فتنوں کا سد باب ہوا، اور مسلمانوں کو مذہبی گمراہیوں سے نجات اور تحفظ حاصل ہوا۔ حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کے عہد میں فقہی اختلافات کی شدت اپنی انتہا پر تھی۔ علماء مختلف گروہوں میں منقسم ہوگئے تھے، فروعی اور مصنوعی مسائل پر مناظروں کی ہماہمی اور تکفیر کے رواج کو مرکزیت حاصل ہوگئی تھی، آریہ سماجیوں اور عیسائیوں کی اسلام دشمن تحریکوں سے عام غفلت تھی، مغربی تمدن کے فتنوں اور زہرناکیوں سے مکمل عدم توجہ کا ماحول تھا عالم یہ تھا کہ

کعبے میں مسلماں کو بھی کہہ دیتے ہیں کافر
بت خانے میں کافر کو بھی کافر نہیں کہتے

حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ اس صورت حال سے بے حد دل گرفتہ اور کبیدہ خاطر تھے، وہ امت مسلمہ کی عظمت گم گشتہ کے سراغ کی طلب وتمنا کیلئے اتحاد ملت کو ناگزیر سمجھتے تھے، چنانچہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں انہوں نے ملت اسلامیہ کے سامنے ندوۃ العلماء کا تصور پیش کیا۔ مدرسہ فیض عام کانپور میں اس سنہرے موقع پر جلسہ دستار بندی کا انعقاد کیا گیا تھا جس میں ملک کے ممتاز علماء کرام نے شرکت فرمائی تھی۔ چنانچہ باہمی مشورے سے یہ طے کیا گیا کہ آئندہ سال دستار بندی کے موقع پر علمائے کرام کی ایک مستقل انجمن کے قیام کیلئے جلسہ عام منعقد کیا جائے، اور ملک کے ممتاز علمائے کرام کو شرکت کی دعوت دی جائے۔

چنانچہ اس موقع پر موجود ممتاز علمائے کرام نے اس انجمن کا نام ندوۃ العلماء رکھا اور اتفاق سے حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کو اس کا ناظم اول منتخب کیا، یہ حضرت مولانا مونگیریؒ ہی تھے جن کے ذہن میں ندوۃ العلماء کا خیال پیدا ہوا تھا، اس امر کی تصدیق مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کے اس مکتوب سے ہوتی ہے انہوں نے حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کے صاحبزادہ مولانا لطف اللہ صاحب مرحوم کے نام رقم کیا تھا۔

> ''ندوۃ العلماء کے قیام کا اولاً موصوف ہی کے دماغ میں خیال پیدا ہوا تھا جس پر سارے ملک نے لبیک کہا۔ آج اس کے آثار ملک وملت کے سامنے ہیں۔'' (بحوالہ سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ بانی ندوۃ العلماء ۱۲۵)

مختصر یہ کہ حضرت مونگیریؒ نے اپنے عہد کے ممتاز علماء اور اکابرین عصر کے اشتراک و تعاون سے لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کی بنیاد رکھی جو دراصل دارالعلوم دیوبند اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے درمیان ایک سازگار مفاہمت اور امتزاج کے نصب العین پر مبنی تھا۔ اور جو ایک اعتبار سے اس خواب کے تعبیر کی حیثیت رکھتا تھا جو حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے دیکھا تھا، واضح رہے کہ سرسید اور مولانا قاسم نانوتوی دونوں ہی مولانا مملوک دہلوی کے شاگرد تھے، ایک نے دارالعلوم دیوبند اور دوسرے نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی بنیاد رکھی، دارالعلوم دیوبند کا نصاب درس نظامیہ کا پابند تھا اور علی گڑھ کا ادارہ جدید طرز تعلیم کا موکل، مولانا قاسم نانوتویؒ کی تجویز تھی کہ علی گڑھ کے

- فارغین دو سال کے آس پاس دارالعلوم دیو بند گذاریں اور دارالعلوم دیو بند کے فارغ التحصیل علی گڑھ سے فیضیاب ہوں اور اس طرح دونوں عظیم الشان اداروں کی روایت سے فیضیاب ہو کرنئی نسل عصر حاضر کا مقابلہ کرنے کی بھر پور صلاحیت پیدا کرے لیکن بوجوہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

حضرت مونگیریؒ کی تعلیم و تربیت میں ابتداءً ان کے چچا ظہور علی اور مولانا سید عبدالواحد بلگرامی نے اہم حصہ لیا، بعد ازاں مولانا لطف اللہ علی گڑھی اور مفتی عنایت احمد کاکوروی سے درسیات کی تکمیل کی، باطنی علوم کے حصول کی طرف بھی ابتداء ہی سے آپ کی دلچسپی تھی، ابتداء میں حافظ محمد صاحب اور مولانا کرامت علی قادری سے درس سلوک و عرفان لیا، لیکن بیعت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی سے حاصل کی جنہوں نے بعد میں آپ کو اپنا خلیفہ مقرر کیا اور بیعت کی اجازت مرحمت فرمائی، حدیث میں مولانا احمد علی سہارنپوریؒ سے سند تکمیل حاصل کی، غرض کہ ظاہری و باطنی علوم میں درجہ اعتبار حاصل کرنے کے بعد اولاً دلارئی مسجد کانپور اور بعدہٗ، فیض عام میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے، تہذیبی سماجی اور دینی تحریکوں سے بھی آپ کی وابستگی کا تسلسل برقرار رہا، کانپور میں انجمن تہذیب کی بنیاد رکھی تھی، اور رد عیسائیت میں کانپور سے ایک رسالہ ''منشور محمدی'' کا اجراء بھی کیا، جو تقریباً ۴ سے ۵/ سال تک جاری رہا۔

حضرت مونگیریؒ قدیم عربی مدارس کے نظام تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتے تھے، ۱۸۹۲ء میں ندوۃ العلماء کی تحریک کے آغاز کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا، لکھنو کی مشہور زمانہ درسگاہ ندوۃ العلماء کا ۱۸۹۸ء میں قیام ہوا جس کے نصاب کی تدوین آپ ہی کے ہاتھوں پایہ تکمیل کو پہونچی، ۱۹۰۳ء تک آپ انجمن ندوۃ العلماء کے ناظم رہے، ۱۹۰۱ء میں آپ نے مونگیر کو اپنا مستقل مستقر بنایا اور اپنے انتقال ۱۳/ ستمبر ۱۹۲۷ء تک عرفان و سلوک کی تعلیم و تربیت کے علاوہ عیسائیت اور قادیانیت کی تردید میں پوری قوت کے ساتھ مصروف رہے، اپنے شاگردوں اور مریدوں سے بھی اس موضوع پر کتابچے قلم بند کرائے اور خود تقریباً سو سے زیادہ کتابیں لکھیں جن میں سے بیشتر اب نایاب ہیں، چند اہم کتابیں مثلاً ترانہ حجازی، مراۃ الیقین لاغلاط ہدایات

المسلمین، تکمیل الادیان بہ احکام القرآن ملقب بہ آئینہ اسلام، دفع التلبیسات، پیغام محمدی، ساطع البرہان، براہین قاطعہ وغیرہ ہیں، حضرت مونگیریؒ نے بھی اپنی سو سے زائد تصنیفات میں اردو نثر کی اس روایت کو مزید مضبوط و مستحکم کیا جس کی تاسیس علمائے کرام اور صوفیائے کبار نے فرمائی تھی، حضرت علیہ الرحمہ خود ایک صاحب اسلوب نثر نگار تھے، سادگی، برجستگی، سنجیدگی، استدلال اور منطقی زور بیان آپ کی نثر کی نمایاں خصوصیتیں ہیں۔

حضرت امیر شریعت اپنے والد بزرگوار حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کی ان تحریکات و خدمات، ان کی دینی و شرعی فکر اور ان کے مذہبی اجتہادات اور اسلوب تحریر و تقریر سے براہ راست متاثر ہوئے اور اس کاروان فکر و فن کو عظیم ترین منزلوں سے آشنا کیا جس کی روایت حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ نے رکھی تھی۔

حضرت امیر شریعت کی ابتدائی تعلیم تو مونگیر ہی میں والد بزرگوار کی نگرانی میں ہوئی، پھر کچھ عرصہ حیدرآباد میں گذرا اور بعدہ ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا، اور اخیر میں دارالعلوم دیوبند سے وابستگی اختیار کی، زمانہ طالب علمی ہی میں تحریک آزادی میں شریک ہوئے، دلی میں پولس لاٹھی چارج میں زخمی ہوئے اور چار ماہ کی قید و بند سے رہا ہونے کے بعد دورہ حدیث کی تکمیل کی، مونگیر کے ماہ نامہ الجامعہ اور پٹنہ کے ہفت روزہ الہلال کی ادارتی ذمہ داریاں سنبھالیں، آپ نے مکاتیب گیلانی کی ترتیب و تدوین بھی فرمائی جو آپ کی تحقیقی بالغ نظری، محنت شاقہ اور فنی صلابت کی ایک یادگار زمانہ مثال ہے۔

غرض یہ کہ والد بزرگوار حضرت مونگیریؒ کی وراثت میں جو دینی اخلاص عملی، سرگرمیوں کی صلاحیت اور تقریر و تحریر کی انفرادیت انہیں حاصل ہوئی تھی ان کو حضرت امیر شریعت نے پوری مصروف و متحرک زندگی میں معراج کمال پر پہونچایا اور ایک منفرد اور ممتاز نثر نگار کی حیثیت سے ایک ایسے اسلوب نثر کے خالق و مالک ہوئے جو مونگیر کی خانقاہ رحمانی کو دبستانی عظمتوں کا حامل بناتا ہے، اور جس روایت نثر کو خانقاہ رحمانی کے موجودہ سجادہ نشیں، نائب امیر شریعت حضرت مولانا محمد ولی رحمانی مزید عظمتوں سے ہم کنار کرنے میں شب و روز مصروف و منہمک ہیں۔

جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے ''سفر مصر وحجاز'' کے حوالے سے حضرت امیر شریعتؒ کے اسلوب نثر پر ایک جامع اور معروضی تبصرہ کیا ہے۔

''سفر مصر وحجاز کا سب سے دلکش پہلو حضرت مولانا کا اسلوب اور ان کے کردار کی سادگی اور دیانت ہے، نثر ایسی لکھنا جو بڑے بڑے الفاظ سے تقریباً عاری ہو، جس میں کسی قسم کی لفاظی اور عبارت آرائی نہ ہو اور جو تمام مسائل کو بہ وضاحت ادا کر سکے آسان کام نہیں ہے، خاص کر ہمارے روایتی قسم کے علماء سادہ اردو نثر لکھنے سے گریز کرتے ہیں، لیکن حضرت مولانا نہایت دلنشیں، چھوٹے چھوٹے جملوں پر مبنی اور بے تکلف لیکن متین نثر لکھتے ہیں۔ اسی طرح حضرت کے مزاج کی سادگی اور دیانت داری بھی فقرے فقرے سے عیاں ہے۔'' (حضرت امیر شریعت نقوش و تاثرات۔ ص ۸۶۔۸۵)

اس میں شک نہیں کہ بعض علماء نے طبقہ اشرافیہ کو ذریعہ اظہار بنایا، مولانا ابوالکلام آزادؒ کی مثال سامنے ہے، لیکن حضرت امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ نے اپنی نثر کو اجتماعی وملی زندگی کا ترجمان اور ایک تہذیب کی قوت گویائی کا مظہر بنایا، اس جہت سے اردو نثر کے ارتقاء میں ان کا نام سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا۔

———— ⊙⊙⊙ ————

باب سوم
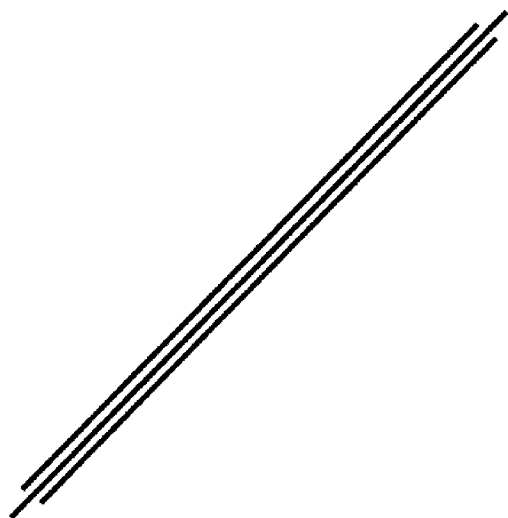
خدمات اور کارنامے

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ☆

امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی اور آپ کی خدمات جلیلہ

بہار کی سرزمین ہر زمانہ میں مردم خیز رہی ہے اور ہر دور میں وہاں بہت سارے علماء و مشائخ پیدا ہوئے ہیں، جنھوں نے اپنی زندگی میں بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں۔ جن کو ہم بھلانا چاہیں بھی تو بھلا نہیں سکتے ہیں۔ انھی ممتاز و نامور علمائے کرام میں ہمارے ممدوح امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ بھی تھے۔ آپ بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ کے چھوٹے فرزند ارجمند تھے۔ آپ کی تعلیم و تربیت ایک علمی گھرانے میں ہوئی۔ آپ ابھی متوسطات کی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ آپ کے والد بزرگوار دنیا سے کوچ کر گئے۔ مگر مادر مہربان زندہ تھیں انھوں نے آپ کی تعلیم برابر جاری رکھی چار سال دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی اور چوں کہ فطرتاً ذہین و ذکی تھے۔ اس لیے اپنے درجے میں برابر نمایاں رہے اور اساتذۂ کرام کی نظر میں ممتاز رہے۔ ندوہ کا یہ ابتدائی زمانہ تھا طلبہ کم ہوتے تھے مگر تعلیم پر بڑا زور تھا۔ اور طلبہ پر اساتذہ گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کا کوئی وقت ضائع نہیں ہوتا تھا۔ پھر وہاں سے سیدھے دارالعلوم دیوبند بھیجے گئے، چار سال مسلسل یہاں تعلیم حاصل کی اور دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی۔ تعلیم کے اخیر سالوں میں ملکی سیاست میں بھی حصہ لیا۔ اور پولس اور حکمراں افسران کے ڈنڈے کھائے۔ جسم زخموں سے لہولہان ہوا۔ اور پھر حکومت نے گرفتار کر کے سہارن پور کے جیل میں ڈال دیا۔

☆ سابق مفتی دارالعلوم دیوبند (یوپی)

مہینوں جیل کی صعوبتیں برداشت کیں۔ یہاں سے نکلے تو وطن آ کر جمعیۃ علماء ہند میں شریک ہوگئے۔ صلاحیت پاکر صوبہ بہار جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ بنا دیے گئے۔ اس وقت جمعیۃ علما پر حکومت برطانیہ کی سخت نظر تھی۔ مگر آپ خوف زدہ نہیں ہوئے، حکومت برطانیہ کے خلاف گرم گرم تقریر کرنے لگے۔

حضرت مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ بانی امارت شرعیہ نے ان کو اپنی تربیت میں لے لیا۔ ۱۹۳۶ میں جب پہلی دفعہ اسمبلی کے لیے انتخاب ہوا تو ممبر اسمبلی کی حیثیت سے میدان میں آ گئے اور ممبر منتخب ہوگئے۔ اسمبلی بہار کے ممبران میں عمر کے اعتبار سے سب سے چھوٹے تھے۔ ایک وقت ایسا آیا کہ حکومت کی طرف سے اوقاف پر زرعی ٹیکس بل پیش ہوا۔ اور اوقاف پر ٹیکس لگانے کی سعی ہوئی۔ مولانا چوں کہ عالم دین اور فاضل دیوبند تھے اس کے خلاف سینہ سپر ہوگئے۔ حکومت کانگریس کی تھی فیصلہ حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کے سپرد کیا گیا۔ مولانا آزادؒ نے دلائل کے پیش نظر فیصلہ مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے حق میں دیا اور اوقاف کو ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔

اس زمانے میں آپ کے بڑے بھائی مولانا لطف اللہؒ کا وصال ہوا اور سجادہ نشینی کی بات آئی تو سبھوں نے مشورہ کر کے آپ کو خانقاہ رحمانی کا سجادہ نشیں منتخب کیا۔ لہٰذا سیاسی زندگی کے ساتھ ارشاد و بیعت کا سلسلہ بھی شروع کرنا پڑا:

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن

آپ نے دونوں کام انجام دینا شروع کیا۔ رشد و ہدایت والی خدمت بھی کرتے تھے اور سیاسی و ملکی آزادی میں بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ پھر جب دوبارہ اسمبلی کے انتخاب کا وقت آیا تو امارت شرعیہ نے مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی بنائی اور اپنے ممبران اسمبلی کے لیے کھڑے کیے۔ اور ان کی کامیابی کے لیے سعی بلیغ کی۔ نتیجہ جب آیا تو معلوم ہوا کہ اسمبلی میں کانگریس کے بعد دوسری پوزیشن مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی کی ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ جب کانگریس نے حکومت

سازی سے انکار کیا، تو گورنر نے دوسری پارٹی انڈی پنڈنٹ کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ پارٹی میں وزارت بنانے کے سلسلے میں اختلاف ہوا۔ حضرت امیر شریعت کی رائے ہوئی کہ موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔ چناں چہ پارٹی نے وزارت بنانا قبول کرلیا۔ اور مسٹر یونس کی سربراہی میں وزارت بنائی گئی۔ اس موقعے سے بہار میں اردو کو سرکاری مقام دیا گیا۔ تین ماہ کے بعد کانگریس دوبارہ وزارت بنانے پر آمادہ ہوگئی تو مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی کی حکومت ختم ہوگئی۔

دفتر امارتِ شرعیہ کا ۱۹۵۶ء تک خانقاہ مجیبیہ کے ایک کمرے میں رہا۔ حضرت مولانا قمر الدین امیر شریعت ثالث کے انتقال کے بعد چوتھے امیر کے انتخاب کا وقت آ گیا تو اہلِ بہار نے محسوس کیا کہ امارت شرعیہ کو آزاد ہندوستان میں ترقی دینا ضروری ہے۔ چنانچہ چوتھے امیر شریعت متفقہ طور پر حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ منتخب ہوئے۔ اس پر پورے صوبہ بہار واڑیسہ میں بڑی خوشی منائی گئی کہ اب امارت کا کام اچھا رہے گا کہ مولانا موصوف بانی امارت شرعیہ حضرت مولانا سجاد صاحبؒ کے تربیت یافتہ ہیں۔ چناں چہ یہی ہوا۔

پہلا فرمان جو آپ نے کتاب الاحکام میں لکھا۔ اسے غور سے بار بار پڑھیں کہ وہ کس قدر جاندار ہے لکھا:

> ''امارت شرعیہ ہر طبقہ اور ہر خیال کے مسلمانوں کا مشترک ادارہ ہے۔ جس کا بنیادی مقصد بنیادی عقیدہ کی وحدت پر مسلمانوں کی شرعی تنظیم ہے۔ تا کہ اللہ کا حکم بلند ہو۔ مسلمانوں میں ممکن حد تک اسلامی احکام جاری ہوں اور مسلمان اس ملک میں اسلامی زندگی گزار سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصدِ عظیم تعصب، تنگ نظری، پارٹی بندی اور اپنے مقصد سے ہٹے ہوئے لوگوں پر طعن و تشنیع کرنے سے حاصل نہیں ہوسکتا ہے۔ اس لیے کارکنان امارت شرعیہ کا فرض ہے کہ وسعت نظری اور فراخ دلی سے کام لیں۔ پوری یک جہتی کے ساتھ مقصد عظیم پر نظر جمائے رکھیں۔ فروعی اور جزئی اختلاف سے دامن بچاتے ہوئے آگے بڑھیں اور جب تک مسلک اور خیال سے کفر و اسلام کا اختلاف ظاہر نہ ہو۔ رواداری

ترک نہ کریں، ہر معاملہ میں بالخصوص تبلیغ و ہدایت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں زمانہ رسالت اور عہد صحابہ کے اسوہ کو مشعل راہ بنائیں اور ایسا طریقہ اختیار کریں کہ مختلف مسلک اور خیال کے ادارے اور اشخاص اس مقصد عظیم کے لیے امارت شرعیہ کے گرد حسن ظن رکھتے ہوئے جمع ہوسکیں کہ یہاں ان کی انفرادیت پر حملے نہ ہوں گے اور نہ ان کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔ امارت شرعیہ کی ترقی اور استحکام میں اس فکر اور طریق کار کو بنیادی مقام حاصل ہے۔اس لیے امارت کے ہر کارکن پر اس کی پابندی لازمی ہے۔'' (خطبات امیر شریعت:ص ۸۵)

حضرت امیر شریعت جب تک زندہ رہے تمام کارکنان نے اس پر عمل کیا اور کسی کو اس کے خلاف کرنے کی جرأت وہمت نہیں ہوئی۔ امارت شرعیہ برابر ترقی کرتی رہی۔ اور اس کی آواز پورے ملک میں پھیل گئی۔

ایک دفعہ شیر کشمیر عبداللہ کشمیری تشریف لائے۔ حضرت ان کو شہر پھلواری میں جو دفتر تھا وہاں لے گئے۔ وہاں نفاست و نظافت پر تقریر کی۔ اور اشارہ کیا امارت کا دفتر ایسی جگہ نہیں ہونا چاہیے۔ جہاں گندی سڑکوں سے گزر کر آنا پڑتا ہے۔ حضرت مولانا حساس طبیعت رکھتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد فرمانے لگے۔ اب امارت کا دفتر لب روڈ بنوانا ہوگا۔ چناں چہ اس کے لیے فکر مند ہوگئے۔

پہلا فرمان ایسا ہے کہ اس کا ایک ایک جملہ بڑا قیمتی ہے۔ مسلمانوں کی تمام انجمنوں، اداروں کے لیے ضروری ہے وہ اس کے ایک ایک جملہ کو غور سے پڑھیں۔ اور عمل کریں، اگر چہ حضرت کی وفات کے بعد خود امارت شرعیہ کے ذمے داران و کارکنان بدل گئے۔ اور اس فرمان کی کھلی مخالفت کی۔ حضرت مولانا سجادؒ کے دور سے جو دستور چلا آرہا تھا اس کو بدل ڈالا اور انتخاب امیر کے لیے ایسا دستور بنایا کہ جس سے مسلمانوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ صوبہ کے پڑھے لکھے لوگوں نے محسوس کیا کہ اس سے پارٹی بندی کی بنیاد پڑنی شروع ہوگئی۔ خاکسار نے تحریراً اس کی مخالفت

کی مگر کون سنتا ہے فغان درویش۔

چناں چہ امیر شریعت سادس کا انتخاب حکومت کی پولیس کے چھاؤں میں ہوا، جس پر ہر شریف کو تکلیف ہوئی۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون یہاں اس کی تفصیل مناسب نہیں۔ مگر یہ سن کر حیرت ہوگی کہ چھٹے امیر کا نام بھی اسی مرد جلیل نے پیش کیا، جس کے نام سے کارکنان گھبراتے تھے۔

تذکرہ امارت شرعیہ کے لئے عمارت کی تعمیر کا تھا۔ حضرت مولانا نے طے کرلیا کہ امارت کو زندہ کرنا ہے اور زندہ رکھنا ہے جس کا اپنا مکان نہ ہو عوام کی نظر میں وہ نہ ہونے کے درجے میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی گورنر بہار نے اپنے مضمون میں لکھا ہے:

''امارت شرعیہ کو میں نے اس حال میں دیکھا ہے جب وہ ایک بوسیدہ عمارت میں تھی اور گلیوں میں اس کا دفتر تھا۔

حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ نے اس کے لیے حکومت سے زمین حاصل کی اور مجھے خوشی ہے کہ میری گورنری کے زمانہ میں یہ زمین امارت شرعیہ کو ملی، زمین کو حاصل کرنے آئے انھوں نے اپنے صاحب زادہ مولانا محمد ولی رحمانی سابق چیئرمین کونسل کو ذمے دار بنایا تھا کہ وہ مناسب موقعوں پر توجہ دلاتے اور تعلق رکھنے والوں کو اعتماد میں لے کر ان سے مدد لیتے رہیں۔ نتیجہ میں حکومت بہار نے پھلواری شریف میں سڑک کے کنارے ایک بڑی اراضی امارت شرعیہ کو قیمتاً دی۔ مولانا مرحوم کی یہ شرافت اور عظمت تھی کہ انھوں نے راج بھون پہنچ کر میرا شکریہ ادا کیا۔'' (امیر شریعت نقوش وتاثرات: ص ۷۳)

آگے لکھا ہے:

''آج امارت شرعیہ کا پروقار ہیڈ کوارٹر انھیں خراج تحسین پیش کر رہا ہے اور خاموشی کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔''

(ص: ۷۳)

مگر دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہیں۔ حضرت کے زمانے کے ہی کچھ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی ساری ترقی ان کے ہی نام پہ حاصل کی۔ وہ آج حضرت کے نام کو مٹانا چاہتے ہیں اور اپنے ناموں کا بورڈ لٹکانا چاہتے ہیں۔ یہ افسانہ نہیں حقیقت ہے۔ زمین جب حاصل ہو چکی تو آپ نے اس زمین پر عمارتوں کی سنگ بنیاد رکھنے کا ارادہ کیا تو اس کے لیے ملک اور صوبہ کے اکابر علماء اور دانشوروں کو اس مقام پر جمع کیا اور اپنے ابتدائی خطبہ میں فرمایا:

''حضرات گرامی! ہم لوگ بڑے اچھے اور یادگار موقع پر جمع ہیں، آج دفتر امارت شرعیہ کی مرکزی عمارت ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ اور شفا خانہ کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا ہے۔ آنے والے دنوں میں جب یہ عمارتیں تیار ہوں گی تو مجھے یقین ہے کہ انسانی خدمت کا بہترین ذریعہ ثابت ہوں گی۔ یہ تین قسم کی عمارتیں دراصل امارت شرعیہ کے انداز فکر کو ظاہر کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ امارت شرعیہ کی نگاہ میں کن چیزوں کی کیا اہمیت ہے۔ دفتر خاموشی کے ساتھ نظم وضبط کی تعلیم دیتا ہے۔ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ امارت شرعیہ کی نگاہ میں تعلیم کی کیا اہمیت ہے اور وہ نوجوانوں کو کس طرز کی تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دے رہی ہے۔ شفا خانہ کی عمارت رفاہی خدمت کی علامت ہے اور یہ اشارہ ہے کہ امارت شرعیہ چاہتی ہے کہ بیماری کی تکلیف نہ جھیلے، ہر شخص صحت مند رہے اور خوشی کی زندگی گزارے۔ مولانا سجاد ہسپتال کی اسکیم اسی احساس کا نتیجہ ہے۔ ان تینوں چیزوں سے انسانوں کو فائدہ ہوگا اور یہ چیزیں ہمارے ملک کی بنیادی ضرورت ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ اس ضرورت کو پورا کرنے کی طرف امارت شرعیہ نے ایک چھوٹا سا ہی مگر مضبوط قدم اٹھایا ہے۔

امارت شرعیہ ملک اور ملت کی خدمت کا برابر ذریعہ رہی ہے۔ اسے ۱۹۲۱ء میں حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے جنگِ آزادی کے مشہور رہنما اور عالم دین مولانا ابوالکلام آزادؒ کے مشورہ سے حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کی دعاؤں اور

حضرت مولانا بدرالدین (رحمہ اللہ) کی سرپرستی میں قائم کیا تھا۔ ساٹھ سال گزر گئے اس پورے عرصہ میں امارت شرعیہ نے بہت ٹھوس، قابل قدر اور تعمیری خدمات انجام دی ہے۔'' (نقوش تاباں: ص ۱۱۳)

حضرت نے جو کچھ فرمایا صحیح فرمایا اور آگے یہ درست لکھا ہے:

''اس ادارہ نے کمزوروں اور مظلوموں کو اوپر اٹھانے، سہارا دینے اور ان کی حمایت کرنے کا گراں قدر فریضہ انجام دیا ہے۔ بچوں کی تعلیم اور تعلیم گاہوں کو ترقی دینے کی خدمت انجام دی ہے۔ سماجی خاندان اور افراد کے آپسی جھگڑوں کو ختم کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ امارت شرعیہ نے آزادی کی جنگ میں پر وقار حصہ لیا ہے اس کے رہنماؤں اور کارکنوں نے آزادی وطن کی خاطر ریل اور جیل سے گہرا رشتہ رکھا۔'' (ص: ۱۱۴)

آخر میں یہ بھی لکھا:

''یہ عظیم الشان تعمیری منصوبہ آپ حضرات کے سامنے ہے، میں عمر کی اس منزل میں پہنچ چکا ہوں جہاں لوگ نئے منصوبے نہیں بناتے۔ لیکن خدا کے فضل اور پورے ملک میں پھیلے ہوئے مخلصین پر اعتماد کرتے ہوئے یہ نیا کام شروع کیا جا رہا ہے۔ قومی اور ملی کاموں کا انحصار افراد پر نہیں ہوتا۔ میں رہوں یا نہ رہوں اسے پورا کرنے کی ذمے داری آپ سبھوں پر ہے۔'' (ص: ۱۱۴)

یہ سنگ بنیاد ۱۳ر نومبر ۱۹۸۱ میں رکھا گیا تھا۔ اس کے بعد یہ کام ہوتا رہا حضرت امیر شریعت اس کام کی تکمیل کے لیے پورے عملہ کے ساتھ مصروف رہے اور کام آگے بڑھتا گیا اور دو سال کی جدو جہد کے بعد الحمد للہ وہ وقت آگیا کہ نئی عمارتوں کا افتتاح اسی شان سے ہوا، جس شان سے سنگ بنیاد رکھا گیا تھا۔ مجمع کو خطاب کرکے فرمایا:

''حضرات گرامی! آج کا یہ اجتماع خدا تعالیٰ کی مرضی کا اظہار ہے، اور اس بات کی علامت ہے کہ اخلاص اور حسن نیت کے ساتھ جس کام کی ابتدا کی جاتی ہے

اس کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ راہ ہموار کر دیتا ہے۔ اور بے سروسامانی میں تکمیل کے اسباب جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ آج سے تقریباً دو سال پہلے اسی نومبر میں اور اسی سرزمین پر ہم لوگ جمع ہوئے تھے اس وقت اس عمارت کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ کون جانتا تھا کہ دو سال بعد ہم لوگ افتتاح کی تقریب میں جمع ہوں گے۔ لیکن کل کا خواب آج کی ٹھوس حقیت ہے جو سامنے کھڑی ہے جب ۱۵ر نومبر ۱۹۸۱ء کو سنگ بنیاد کی تقریب جاری تھی میرے ذہن میں ایک شعر آیا تھا۔

باندھتی ہے ابد کے منصوبے
کیا کلیجہ ہے عمر فانی کا

(نقوش تاباں ص:۱۲۹)

مولانا سجاد ہسپتال کے افتتاح کے موقعے سے حضرت امیر شریعت نے جو کلمات فرمائے تھے، میں چاہتا ہوں اسے بھی یہاں پیش کر دوں تاکہ حضرت والا کی مسرت اور ساتھ ساتھ آپ کا جو نظریہ تھا وہ سامنے آجائے اور آپ محسوس کریں حضرت امیر شریعت کیا چاہتے تھے۔ ایسے ہر موقعے سے آپ کچھ نہ کچھ فرماتے تھے۔ ارشاد فرمایا:

''حضرات محترم! خدا کا شکر ہے کہ آج مولانا سجاد میموریل اسپتال کا افتتاح ہو گیا۔ آج سے امارت شرعیہ کی تاریخ میں ایک مستقل نئے و خاص کام کی ابتدا ہو جائے گی۔ اور اس اسپتال کے ذریعے غریب انسانوں اور خاص پھلواری شریف اور قرب و جوار کے لوگوں کو فائدہ پہنچے گا۔ میرے لیے اور امارت سے تعلق رکھنے والے تمام لوگوں کے لیے خوشی کی بات ہے۔

میرے لیے یہ بات بھی اطمینان کی ہے کہ مشہور عالم دین بے لوث رہنما، امارت شرعیہ کے مفکر اور بانی مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب علیہ الرحمہ کی ایک مستقل محسوس اور مضبوط یادگار قائم ہو گئی جس کا جذبہ عرصہ سے میرے دل میں

تھا۔ بہت اچھا ہوا انسانی خدمت کا یہ ادارہ ان کی عظیم شخصیت سے وابستہ ہوگیا۔"

اخیر میں لکھا ہے:

"شریف افراد اور زندہ قومیں ہمیشہ اپنے محسنوں کو یاد رکھتی ہے، محسن فراموشی اور احسان ناشناسی زندگی کا وہ نقطہ ہے جہاں زوال کی ابتدا ہو جاتی ہے۔
شاید اب یہ دور احسان ناشناسی کا ہے جہاں سے زوال شروع ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس برے وقت سے بچائے، اور امارت شرعیہ کو باقی اور محفوظ رکھے۔ اور یہ ادارہ برابر ترقی کی طرف گامزن رہے۔ انشاء اللہ احسان ناشناسی کا دور جلد ہی ختم ہو کر رہے گا۔"

حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ برابر اپنے مقاصد جلیلہ میں کامیابی سے ہم کنار ہوتے رہے اور امارت شرعیہ کو اپنی زندگی میں ایسے مقام پر لا کر کھڑا کر دیا کہ اس دور کا کوئی فتنہ اس کو زیر نہیں کر سکتا ہے بلکہ یہ دینی ادارہ برابر پھیلتا اور مضبوط ہوتا رہے گا۔ جو زندہ رہیں گے وہ دیکھیں گے۔

بات لمبی ہوتی جارہی ہے بیان کرنے کی بہت باتیں ہیں لیکن دارالقضاء کا ذکر کر کے ختم کرنا ہے۔ دارالقضاء کے لیے حضرت والا نے بڑی محنت کی اور اسے سب سے پہلے رکھا۔ پہلے فرمان میں خصوصی طور پر دارالقضاء کا ذکر فرمایا۔ پھر اس کے لیے کیمپ قائم کیا۔ علماء کو دعوت شرکت دی، ایک خطبہ اس سلسلے میں حضرت کا چھپا ہوا ہے۔ اس کا تھوڑا حصہ نقل کر دینا اچھا رہے گا۔ سجدہ شکر کے بعد فرمایا:

"میرا انتخاب امیر شریعت کی حیثیت سے ۱۹۵۷ء میں ہوا اور اس وقت امارت کا دفتر خانقاہ مجیبیہ (حق تعالیٰ اس کے فیوض کو تا قیامت جاری رکھے) کے ایک گوشہ میں کھپڑا پوش گھر کے اندر تھا۔ میں صاحب سجادہ سے اجازت لے کر دفتر امارت شرعیہ میں حاضر ہوا۔ سرسری معائنہ کے بعد یہ بات واضح ہوگئی کہ امارت

کا سالانہ آمد وخرچ اکیس ہزار روپے کا ہے اور اس وقت بیت المال میں امانتوں کے سوا دوسو روپے ساٹھ پیسے ہیں۔ بزرگوں کے چھوڑے ہوئے ان پیسوں میں اللہ نے بڑی برکت دی اور آج امارت شرعیہ کا سالانہ آمد وخرچ سولہ لاکھ روپے کا ہے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مجھے سابقہ دفتر چھوڑنا پڑا۔ خدا بال بال مغفرت فرمائے جناب قاضی احمد حسین صاحب ایم پی ناظم امارت شرعیہ کا کہ آپ کے ذریعے جلد ہی حضرت مولانا قاضی نورالحسن رحمۃ اللہ علیہ کا مکان دفتر کے لیے مل گیا۔ اور دفتر خانقاہ مجیبیہ سے یہاں منتقل ہوگیا۔ کام بڑھا اور بڑھنے کی رفتار اچھی اور اطمینان بخش رہی۔ کام بڑھتے ہی قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکان کی وسعت بھی ناکافی ہونے لگی تو پھر اس کے مقابل ایک اور مکان خریدا گیا اور اس میں صرف دارالقضاء کا دفتر رکھا گیا۔" (ص:۱۴۱)

بہرحال کام بڑھتا گیا اور ضرورت ہوئی کہ ایک ایسی بلڈنگ بنے جہاں ساری ضرورتیں پوری ہوسکیں۔ الحمدللہ امارت شرعیہ کا ایسا دفتر تیار ہوگیا۔ اب تھوڑا تذکرہ دارالقضاء کا بھی ضروری ہے۔ حضرت امیر شریعت" لکھتے ہیں کہ

"استاد محترم حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی رحمۃ اللہ علیہ نائب امیر شریعت کی سرپرستی اور جناب مولانا شاہ عون احمد صاحب قادری قاضی شریعت کے تعاون سے قضا کے دو ہفتے بہت کامیاب گزرے جس کی رپورٹ آپ حضرات کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ اس تربیت کے دو ہفتوں میں حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بیش قیمت مقالہ پیش فرمایا، جس سے پورا استفادہ کیا گیا، جو آپ کے ہاتھوں میں ہے اور راقم الحروف نے قضا کے موضوع پر دو مقالے پڑھے وہ بھی پیش کیے جارہے ہیں۔

حضرت مولانا شاہ عون احمد قادری نے دارالقضا کے علمی دور کا اجمالی خاکہ جامع طریقہ پر پیش فرمایا اسے آپ تربیت قضا کے دو ہفتہ میں ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔"

(ص:۱۴۷)

اس کے بعد رقم طراز ہیں:

''الحمدللہ تربیت قضا کے دو ہفتے کامیاب رہے اور اس کے بعد دار القضاء کا قیام اور قضاۃ کے تقرر کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ چناں چہ اس وقت بہار میں اور اڑیسہ میں انیس دار القضاء قائم ہیں۔ جہاں قاضی حضرات اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ہر جگہ دار القضاء کا قیام بڑے اہتمام سے کیا گیا۔ میں نے خود شرکت کی یا اپنے معتمد نمائندہ کو بھیجا، بڑے بڑے جلسے ہوئے اور اشتہار تقسیم کیے گئے، جن کے ذریعے پورے علاقہ کے عوام دار القضاء کے قیام اور قاضی کے تقرر کا مقصد جان لیتے ہیں۔ امام سرخسیؒ نے اپنی مشہور عام کتاب مبسوط میں لکھا ہے: قضاء بالحق ایمان باللّٰہ کے بعد اہم ترین فریضہ ہے اور عظیم ترین عبادت ہے''۔ (ص ۱۵۰)

حضرت امیر شریعتؒ نے دار القضا کے سلسلے میں جتنی محنت کی وہ سبھوں کے لیے جاننے کی چیز ہے۔ اور اس پر عمل کی ضرورت ہے۔ کیسے قائم کیا، کس نہج پر قائم کیا؟ اسے امارت کی تاریخ قضا میں دیکھا جائے۔ مولانا مجاہد الاسلام کی حضرت امیرؒ نے کس طرح تربیت کی، جاننے والے جانتے ہیں۔ قاضی عون احمد قادریؒ کے بعد مولانا مجاہد الاسلامؒ ہی اس منصب پر فائز رہے یا پھر مولانا محمد جسیم الدین صاحب رحمانیؒ جو اس وقت یہ کام انجام دے رہے ہیں۔

بہار و اڑیسہ سے فارغ ہوئے تو دوسرے صوبوں میں اس نظام کو پھیلایا اور خود جا کر وہاں دار القضا قائم کیا جیسے کرناٹک صوبہ آسام اور حیدر آباد وغیرہ۔ ان صوبوں میں آپ نے جو کچھ فرمایا اس کا بھی کچھ حصہ آپ کے خطبات میں آ گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ آپ ان کا مطالعہ فرمائیں تاکہ صحیح صورتِ حال آپ کے سامنے آئے۔

اس وقت اس کی تفصیل ممکن نہیں ہے۔ ''نقوش تاباں'' نامی کتاب میں ان خطبات کا بقدر ضرورت حصہ آ گیا ہے۔ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ اس سے آپ کی قضا کی تاریخ پر ایک نظر

ہو جائے گی۔ اور آپ کو معلوم ہوگا کہ حکومت برطانیہ نے کس طرح اس شعبہ کو برباد کیا۔ حضرت نے اس کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

موجودہ امیر شریعت مولانا نظام الدین حضرت کے پورے زمانہ تک ناظم امارت شرعیہ کے عہدے پر فائز رہے۔ امیر شریعت خامس کے زمانہ میں یہ نائب امیر شریعت بنائے گئے اور اس وقت بھی نظامت کے منصب پر باقی رہے۔ حضرت امیر شریعت رابعؒ کی زندگی میں آپ کے معتمد رہے۔

—— ⊙⊙⊙ ——

محمد عبدالرحیم قریشیؒ☆

تحفظ شریعت تحریک کا اولین علم بردار

میں اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دو ایسی شخصیتوں کے تحت اور ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع عنایت فرمایا جو اولوالعزم تھے۔ ریاست نظام حیدرآباد کے خاتمہ کے بعد یہاں کے مسلمانوں میں شدید مایوسی اور دل شکستگی کی کیفیت تھی جب کہ میدانِ قیادت میں شیروں کی طرح گرجنے والے راہِ فرار اختیار کر چکے تھے اور جو رہ گئے تھے وہ سلاخوں کے پیچھے ڈھکیل دیے گئے تھے۔ کوئی امید بندھانے والا نہیں تھا، اسی سناٹے میں تنہا آواز نحیف جسم والے سید خلیل اللہ حسینی کی تھی، جنھوں نے دل ہارے ہوؤں میں اپنی تعمیر نو کی آرزو کو ابھارا۔ ان کی آواز پر کان دھرنے والوں کی 'بزم احباب' ان کے ارادے کی صلابت اور عزیمت کے سہارے تعمیر ملت کی مجلس بن گئی۔ یہ پہلی آہنی ارادہ رکھنے والی شخصیت تھی جن سے ربط نے ملت کی تعمیر کے جذبہ کو رگوں میں دوڑنے والا خون اور دل کی دھڑکن بنا دیا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی تحریر کا رنگ بلاشبہ منفرد تھا، اپنے ہفتہ وار 'صدق جدید' میں مختصر جملوں میں معنوں کی دنیا سمو دیتے تھے۔ اسی 'صدق جدید' کے ذریعے امیر شریعت بہار و اڑیسہ مولانا منت اللہ رحمانی کا غائبانہ تعارف ہوا۔ امیر شریعت کے بے باکانہ بیانات پر مولانا دریابادیؒ کے تحسینی تبصروں نے ان کو دیکھنے اور ان سے ملنے کا اشتیاق پیدا کیا۔ ۱۹۶۴ء کے ہلاکت خیز دخوں آشام فسادات کے بعد لکھنؤ میں مسلم کنونشن منعقد ہوا۔ جناب سید خلیل اللہ حسینی

☆ سابق اسسٹنٹ جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ و سابق صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت، حیدرآباد

مرحوم کے ساتھ شرکت کا موقع ملا۔ معلوم ہوا کہ حضرت امیر شریعت بھی تشریف لائے ہیں، ملنے کا اشتیاق بڑھا مگر یہ شوق پورا نہ ہوسکا، ان کی عالالت کی وجہ سے صرف سلام علیک ہوسکی۔ ۱۹۷۲ء میں جب بمبئی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا کنونشن کی تیاریاں چل رہی تھیں، میں وہیں مقیم تھا، بھیونڈی اور جلگاؤں کے فسادات کی تحقیقات کے لیے جسٹس مادن کمیشن قائم کیا گیا تھا۔ بیرسٹر اکبر پیر بھائی کی عالالت کے بعد مسلمانوں کی جانب سے پیروی کی ذمے داری میرے سرآ گئی تھی۔ دسمبر میں کنونشن کے دوران حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ سے ملنے اور بات کرنے کا موقع ملا۔ وہ الفاظ کا جادو جگانے والے مقرر نہیں تھے، نہ ٹھاٹ باٹ متاثر کرنے والا تھا، گفتگو بھی رعب داب والی نہیں تھی، اس کے باوجود کچھ ایسا تھا کہ ملنے والا متاثر ہوجاتا، یہ تھا خلوص اور خلوص کے ساتھ فولادی ارادہ۔ یہ دوسری آہنی عزم والی شخصیت تھی، جس کے تحت کام کرنے کا موقع اللہ نے مجھے عطا فرمایا۔

حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کے کارہائے نمایاں اور ان کی دینی وملی خدمات کے مختلف میدان اور گوناں گوں پہلو ہیں۔ میں اپنی اس تحریر کو مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے سلسلے میں ان کی عہد ساز جدوجہد کے خاکہ تک محدود رکھوں گا۔ اس موضوع پر کچھ قلم بند کرنے سے پہلے یہ عرض کرنا مناسب اور ضروری سمجھتا ہوں کہ مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کی نظر میں مسلمانوں کا باہمی اتحاد اور اس اتحاد کے حصول اور برقراری کی خاطر، وسعت نظری، فراخ دلی، مسالک کے اختلاف میں تحمل و برداشت و رواداری مسلمانانِ ہند کے مسائل کے حل کے لیے شاہ کلید (Master Key) تھی۔ چنانچہ مارچ ۱۹۵۷ء میں چوتھے امیر شریعت بہار و اڑیسہ کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہونے کے بعد جو پہلا فرمان تحریر فرمایا اس میں ان باتوں کی اہمیت کا ذکر فرمایا اور لکھا:

> ''امارت شرعیہ ہر طبقہ اور ہر خیال کے مسلمانوں کا مشترکہ ادارہ ہے، جس کا مقصد بنیادی عقیدہ کی وحدت پر مسلمانوں کی شرعی تنظیم ہے تاکہ اللہ کا کلمہ بلند ہو۔ مسلمانوں میں ممکن حد تک اسلامی احکامات جاری ہوں، اور مسلمان اس ملک میں اسلامی زندگی گزار سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ عظیم مقصد،

تعصب نظری، پارٹی بندی، اور اپنے مقصد سے ہٹے ہوئے لوگوں پر طعن و تشنیع کرنے سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کارکنانِ امارت کا فرض ہے کہ وسعت نظری اور فراخ دلی سے کام لیں، پوری یک جہتی کے ساتھ مقصدِ عظیم پر نظر جمائے ہوئے فروعی و جزئی اختلافات سے دامن بچاتے ہوئے آگے بڑھیں اور جب تک کسی مسلک اور خیال سے کفر و اسلام کا اختلاف نہ ہو، رواداری ترک نہ کریں۔''

اس ملک میں اسلامی زندگی گزارنے کے لئے وہ امارت شرعیہ جیسے اداروں کو ضروری سمجھتے تھے۔ اسی فکر اور نظریے کی بنیاد پر امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ کا قیام عمل میں آیا تھا، جس کے وہ چوتھے امیر منتخب ہوئے تھے۔ ان کی یہ بھی سوچ تھی کہ اسلامی زندگی گزارنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ملک میں مسلم پرسنل لا میں کوئی تبدیلی نہ ہو، عدالتیں شریعت کے مطابق عائلی معاملات میں خصومات کا فیصلہ کریں اور مشترکہ سول کوڈ کی تدوین اور نفاذ کی تلوار ان کے سروں پر لٹکتی نہ رہے۔ ابھی مسلم پرسنل لا کنونشن کا خیال بھی نہیں تھا اور بورڈ کی تشکیل کی بات کی کوئی سن گن نہیں تھی، آپ نے اپریل ۱۹۷۰ء میں پٹنہ (بہار) میں منعقدہ امارت کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے، فرقہ وارانہ فسادات، ملازمتوں میں حق تلفی و معاشی بدحالی اور اردو زبان سے تعصب کا ذکر کرنے کے بعد خطبہ صدارت میں فرمایا:

''چوتھا سب سے اہم مسئلہ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی اور ملک میں مشترکہ سول کوڈ کا نفاذ ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ دستور ہند نے ایک طرف ہندوستان میں بسنے والے تمام مذہبی فرقوں کی مذہبی آزادی کا حق تسلیم کیا ہے اور دوسری طرف مشترکہ سول کوڈ کا نفاذ بھی دستور کے رہنما اصول میں موجود ہے، اس سے فائدہ اٹھا کر خود اربابِ حکومت اور جو طبقہ مسلمانوں کی ملی انفرادیت کو پسند نہیں کرتا تھوڑے تھوڑے عرصہ پر اس مسئلہ کو چھیڑ کر آہستہ آہستہ رائے تیار کر رہا ہے اور دوسری طرف خاموشی

کے ساتھ ریاستی حکومتیں ایسے قوانین بنا رہی ہیں، جن سے مسلم پرسنل لا
میں مداخلت ہوتی ہے۔ مثلاً پہلے ریاستی حکومتوں اور خود ریاست بہار نے
حکومت کے ملازمین کے لیے تعدد ازدواج پر پابندی عائد کی ہے اور اس
سے مسلمانوں کو مستثنیٰ نہیں کیا۔ چنانچہ اس کی مثالیں بھی موجود ہیں کہ محض
اس بنیاد پر مسلم ملازمین اپنی نوکریوں سے علیحدہ کر دیے گئے۔ اب دہلی
اور مہاراشٹر کی ریاستوں نے سرکاری ملازم کی قید ہٹالی ہے اور تمام شہریوں
کے لئے تعدد ازدواج پر پابندی عائد کر کے مذہبی آزادی کو مجروح کیا اور
بدقسمتی سے حکومت اور اس قسم کے عناصر کو اب خود مسلمانوں میں ایسے لوگ
ملنے لگے ہیں جو مسلم پرسنل لا کی تبدیلی کا مطالبہ کریں، یہ انتہائی افسوس
ناک صورت حال ہے جس کے لئے مسلم رائے عامہ کو تیار کرنا اور ہر طرح
کی قربانی دینا ہوگا اور کم سے کم درجہ یہ ہے کہ پورے ملک کے پیمانہ پر
جدوجہد کر کے مشترکہ سول کوڈ کی ہدایاتی دفعہ میں ترمیم کرائی جائے ورنہ ہر
لمحہ اس قسم کے عناصر اس دفعہ کا سہارا لیں گے۔"

اس اقتباس سے یہ مطلب نہ نکالا جائے کہ مولانا منت اللہ رحمانی چاہتے تھے کہ مسلمان ایک سے زیادہ بیویاں رکھیں، اس پر تحدید کے ریاستی قوانین کی طرف اشارہ کر کے وہ یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ شریعت میں جس بات کی اجازت دی گئی ہے، وہ ختم کی جا رہی ہے اور اگر اس سلسلے کا تدارک نہ کیا جائے تو مسلم پرسنل لا یعنی شریعت اسلامی کے عائلی قوانین ختم کر دیے جائیں گے یا بدل دیے جائیں گے۔ اقتباس طویل ہو گیا، مگر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم سے کم ۱۹۷۰ء ہی سے سہی، مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کی فکر اور سوچ یہ تھی کہ مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لیے مسلمانوں کی رائے عامہ بنائی جائے اور اس مقصد کی خاطر ایثار و قربانی پر ان کو آمادہ کیا جائے اور اس کے لیے پورے ملک کے پیمانہ پر جدوجہد کو منظم کیا جائے۔ حضرت کی یہی سوچ آل انڈیا مسلم پرسنل لا کنونشن (بمبئی ۱۹۷۲ء) کے انعقاد اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کی محرک ہے۔

مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ ہی تحریک تحفظ شریعت کے محرک اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اصل بانی ہیں۔ ان کی فکر اضطراب بن گئی، یہ بے چینی ان کو علمائے دین اور ماہرین قانون کے پاس لے گئی۔ شریعت اسلامی بالخصوص اس کے عائلی قوانین یعنی مسلم پرسنل لا پر مخالفین کی جانب سے کئے جانے والے اعتراضات پر تبادلۂ خیال اور غور ہوا۔ اعتراضات زیادہ تر اس پر تھے کہ مرد کو طلاق دینے کا غیر مشروط اختیار کیوں حاصل ہے، عورت کیوں طلاق نہیں دے سکتی، ایک وقت میں دی گئی تین طلاقیں کیوں فوری نافذ ہو جاتی ہیں اور کیوں دادا کی وراثت سے یتیم پوتا محروم رہتا ہے؟ ان امور کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ کیا اسلامی قانون کے دائرہ میں ان کا حل نکالا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اعتراضات کو سامنے رکھ کر سوال نامہ مرتب کیا گیا اور ملک کے مشہور دینی اداروں اور علمائے کرام کو روانہ کیا گیا۔ مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کی تحریک پر دارالعلوم دیوبند میں ۱۳/۱۴ر مارچ ۱۹۷۲ء میں مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ نے ایک اجتماع طلب کیا۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ حکومت کی جانب سے لے پالک بل (Childern's Adoption Bill) کے پارلیمنٹ میں پیش کئے جانے پر مسلم پرسنل لا کنونشن کا خیال پیدا ہوا۔ یہ بات پوری طرح صحیح نہیں ہے کیوں کہ یہ بل مئی ۱۹۷۲ء میں پیش ہوا (اس کو پیش کرتے ہوئے اس وقت کے وزیر داخلہ مسٹر گوکھلے نے اسے یونیفارم سول کوڈ کی طرف پہلا قدم قرار دیا تھا) اس سے قبل ہی خاص طور پر مارچ ۱۹۷۲ء ہی سے مسلم پرسنل لا میں مداخلت کو روکنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنے کی فکر شروع ہو چکی تھی۔ لے پالک بل نے بے چینی اور اضطراب میں اضافہ کر دیا اور مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لئے کچھ نہ کچھ کرنے کی تحریک کو تیز تر کر دیا۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا کنونشن کے انعقاد کے لئے سرگرمیاں تیز کر دی گئیں۔ دسمبر کی تاریخیں طے ہوئیں اور شہر بمبئی کا انتخاب ہوا۔

مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کا ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ مسائل کے حل کے لئے مسلمانوں کے درمیان کلمہ کی بنیاد پر اتحاد ضروری ہے مسالک سے بلند ہو کر دین وملت کے مفاد کی خاطر ان میں اشتراک کار ضروری ہے۔ مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی تحریک کے لئے بھی اس کو وہ

ضروری خیال کرتے تھے۔ بمبئی کے انھوں نے کئی دورے کیے، داؤدی بوہرہ فرقہ کی اونچی علمی شخصیت ڈاکٹر یوسف نجم الدین مرحوم کو، جو اس فرقہ کے پیشوا کے بھائی ہوتے تھے، مجلس استقبالیہ کی سربراہی کے لئے آمادہ کیا، ڈاکٹر یوسف نجم الدین صاحب نے کنونشن کے کامیاب انعقاد میں خود کو لگا دیا، کنونشن میں تمام مسالک اور مکاتب کی شرکت اور مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے معاملہ میں مسلمانوں میں اتحاد کا مظاہرہ ضروری تھا۔ مختلف مسالک، مکاتب اور فرقوں کے ذمہ داروں اور اکابر سے ربط پیدا کیا گیا۔ ایسے کام میں اپنی انا کو قربان کرنا، مسلکی وابستگی کو اتحاد ملت کے عظیم تر مقصد کے تابع کرنا، خوش خلقی ہی نہیں منت وسماجت سے کام لینا پڑتا ہے۔ انھوں نے یہ سب کچھ کیا، انھوں نے قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ سے جوان ہی کے تربیت یافتہ تھے اس سلسلہ میں کام لیا۔ بریلوی مسلک کے علماء میں مفتی شاہ برہان الحقؒ جبل پوری ممتاز مقام کے حامل تھے جب یہ دونوں حضرات مفتی صاحب علیہ الرحمہ کے پاس پہنچے تو درس چل رہا تھا۔ بیٹھنے کے لئے جگہ نہیں تھی، دونوں حضرات بلا جھجک جوتوں اور چپلوں کے پاس بیٹھ گئے۔[۲] مفتی شاہ برہان الحقؒ ان کے رویہ اور گفتگو سے اتنے متاثر ہوئے کہ کنونشن کے مقاصد سے اتفاق فرمایا اور پیرانہ سالی اور صحت کی کمزوری کے باوجود شرکت فرمائی۔ مہتمم دارالعلوم دیوبند مولانا قاری محمد طیبؒ کے بازو میں مولانا مفتی شاہ برہان الحقؒ کو بیٹھے اور آپس میں بات کرتے، ایک دوسرے کو پان پیش کرتے دیکھ کر مسلمانوں کا حوصلہ بڑھ گیا۔ کنونشن کے پلیٹ فارم پر دیوبندیوں، بریلویوں کے ساتھ اہل تشیع، اہل حدیث، داؤدی بوہروں اور سلیمانی بوہروں کے اکابرین، علماء و مشائخ کی موجودگی سے ملت اسلامیہ ہند کے اتحاد کا عظیم الشان مظاہرہ دنیا نے دیکھا، مسلم پرسنل لا سے مسلمانوں کی وابستگی کا ثبوت مل گیا۔ اس کنونشن میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ چار مہینہ بعد اپریل ۱۹۷۳ء میں حیدر آباد میں بورڈ کے دستور کو قطعیت دی گئی اور منظور کیا گیا جس کے تحت آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی۔ اور حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔

مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ نے آخری سانس تک اپنی صلاحیت اور توانائی مسلم

پرسنل لا کے تحفظ کی جدوجہد میں صرف کی۔ اس کے لئے انھوں نے کیا کیا یہ تذکرہ بڑا طویل ہوگا میں صرف چار واقعات و اقدامات کا ذکر کروں گا، جن سے آپ کی عظیم دینی و ملی خدمات کے اس پہلو پر روشنی پڑے گی۔

۱۹۷۵ء میں وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے ملک میں ایمرجنسی کا اعلان کر دیا۔ ایمرجنسی میں خاندانی منصوبہ بندی اور اس کے لئے نس بندی کے پروگرام کو جبراً نافذ کیا جانے لگا۔ اخبارات پر سنسرشپ عائد کردی گئی، اخبارات وہی خبریں شائع کر سکتے تھے جو حکومت جاری کرتی یا جن کی اجازت حکومت دیتی، اظہار و بیان، تحریر و تقریر کی آزادیاں ختم کردی گئی تھیں۔ حکومت اور اس کے پروگرام کے مخالفین پولیس کے ذریعہ حوالات یا جیلوں میں بند کر دیے جاتے تھے۔ خاندانی منصوبہ بندی اور نس بندی کے لئے لالچ، ترغیب، دھمکی اور زور وزبردستی کا ہر طریقہ اختیار کیا گیا۔ غیر شادی شدہ نوجوانوں اور بن بیاہی لڑکیوں کی نس بندی کے واقعات تک ہوئے۔ حکومت کے جبر و استبداد کا خوف ایسا چھا گیا تھا کہ بڑے بڑے لوگوں کی ہمتیں ٹوٹ گئی تھیں۔ خاندانی منصوبہ بندی کی تائید میں بعض علماء، مشائخ اور شاہی اماموں نے فتوے جاری کرنے میں اپنی عافیت سمجھی۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے بعض اکابرین نے بھی رخصت کا رویہ اختیار کرنے کو مصلحت سمجھا مگر مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ ڈٹے رہے۔ نہ حالات کا خوف ان پر سایہ ڈال سکا اور نہ قید و بند کی دہشت ان کے دل میں وحشت پیدا کرسکی۔ ایمرجنسی کے اس پرآشوب دور میں دارالحکومت دہلی میں انھوں نے بورڈ کی مجلس عاملہ کا اجلاس بلایا۔ اپریل ۱۹۷۶ء میں منعقدہ اجلاس کا اصل اور اہم موضوع خاندانی منصوبہ بندی اور نس بندی تھا۔ بعض گوشوں اور اصحاب کی جانب سے مصلحت اختیار کرنے اور نرم روی کا مشورہ دیا گیا۔ مہندیان درگاہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمہ کے احاطہ میں پولیس بھی نظر آ رہی تھی، حکومت کے مخبر بھی پھیلے تھے۔ ان سب کے باوجود مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کی حق گوئی اور بے باکی غالب آئی اور بورڈ نے شرعی موقف کو بلاکم وکاست اپنی قرارداد کے ذریعے واضح کیا، جس میں کہا گیا:

''یہ صحیح ہے کہ فقہ اسلامی کی روشنی میں بعض مخصوص حالات میں متعین شخصی اعذار کے باعث عزل جیسی مانع حمل تدابیر کو اختیار کرنا جائز ہے اور ماضی میں اصحاب افتاء اس طرح کے ہر شخصی معاملہ پر اس کی مخصوص نوعیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے فتویٰ دیتے رہے ہیں اور آج بھی فقہ اسلامی کی روشنی میں ایسے فتوے دیے جاتے ہیں لیکن اس اجتماع کے نزدیک شخصی حالات میں دی گئی اس اجازت کا موجودہ اجتماعی قانون سازی سے کوئی تعلق نہیں اور نس بندی جیسی تدبیر بہرحال شرع اسلامی کی رو سے قطعاً ناجائز ہے۔''

یہ مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کی عزیمت تھی، جس نے یہ قرارداد منظور کروائی اور یہ ان کی فراست تھی کہ دہلی کے حالات میں اس کی عوامی تشہیر کی مشکلات کو دیکھتے ہوئے۔ جناب بنات والا صاحب رکن پارلیمنٹ ورکن بورڈ کے ذریعے بمبئی سے اس کی اشاعت کا انتظام فرمایا۔ یہ تھا ان کی شخصیت میں عزیمت اور فراست کا امتزاج۔

۱۹۸۵ء میں شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ نے فیصلہ سنایا، جس میں نادار مطلقہ کو تا نکاح ثانی بہ صورتِ دیگر تا حیات سابق شوہر سے نفقہ پانے کا مستحق قرار دیا گیا۔ اس فیصلے نے مسلمانوں میں اضطراب کی لہر دوڑا دی۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ میں اس پر غور ہوا۔ غالب رائے یہ تھی کہ ملک گیر احتجاج منظم کیا جائے۔ مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کی قیادت میں مجلس عمل (ایکشن کمیٹی) تشکیل دی گئی۔ جہاں شرعی موقف کو بحال کروانے کے لئے مہم کو منظم کرنے کا عزم تھا وہیں یہ دانش مندی بھی تھی کہ وزیر اعظم سے گفتگو تک احتجاجی سرگرمیوں کو ملتوی رکھنے کے بعض اکابر ارکان کے مشورہ کو قبول فرمایا۔ مگر تیاریاں جاری رکھیں۔ اس اجلاس میں جو مئی ۱۹۸۵ء میں منعقد ہوا تھا، ارکان کے علاوہ بعض مفتیان کرام کو بھی بلایا گیا تھا، ان کی تحریری رائے حاصل کی۔ اس پر ملک بھر کے علمائے کرام اور مفتیان عظام کے تائیدی دستخط حاصل کئے۔ رمضان کے جمعۃ الوداع کو 'یوم تحفظ شریعت' قرار دیا گیا اور سارے ملک میں اس کا اہتمام ہوا۔

شاہ بانو کیس کے فیصلہ کے خلاف احتجاجی مہم مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کی زبردست تنظیم کارانہ صلاحیت (Organising Capacity) کا نتیجہ تھی۔ ہر وقت یہ فکر رہتی کہ یہ مہم سست نہ پڑے، رفتار باقی رہے۔ وزیر اعظم سے ملاقات کے بعد بھی کوئی نتیجہ برآمد ہوتا نظر نہیں آیا تو سارے ملک میں دوروں کا پروگرام منظم فرمایا۔ بورڈ کے دفتر سے ہزاروں کی تعداد میں ورقیے اور پوسٹر چھپوائے، بمبئی، مدراس، حیدرآباد اور بنگلور کے کنوینرس کو یہی ورقیے اور پوسٹرس شائع کرنے کی ہدایت جاری کی، اس طرح لاکھوں پوسٹرس طبع ہوئے۔ شہروں اور دیہاتوں میں پہنچائے گئے، اس دوران ہفتۂ تحفظ شریعت کا پروگرام بھی منظم ہوا۔ ملک کے مالیاتی دارالحکومت بمبئی میں مسلمانوں نے کاروبار ایک دن بند رکھا۔ اس مہم کے دوران جو ختم نومبر تک چلی، شہروں اور قصبات ہی نہیں دیہاتوں میں احتجاجی جلسے منعقد ہوئے۔ زمانہ دیکھے ہوئے لوگوں کو خلافت تحریک یاد آ گئی۔ کئی شہروں اور قصبات میں آزادی کے بعد مسلمانوں کا اتنا بڑا اجتماع پہلی مرتبہ دیکھا گیا۔ اس ساری مہم کی تنظیم کاری مولانا رحمانی نے فرمائی اور اس خوبی سے فرمائی کہ جو پروگرام اور جو دورہ جس دن مقرر ہوا، اسی دن منعقد ہوا، جنھیں دورہ میں شرکت اور جلسوں میں مخاطبت کی دعوت دی گئی، ان کی لازماً شرکت کا اہتمام اور انتظام کیا گیا۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے جذبات کی شدت کے باوجود بھی، انھوں نے ایسا رخ اختیار کرنے سے روکے رکھا، جس سے مخالف مسلم عناصر کو شرانگیزی کا موقع ملے، اس مہم کو فرقہ وارانہ رنگ میں دیکھنے کا کوئی موقع انھوں نے نہیں دیا۔ بعض شہروں میں انھوں نے غیر مسلم دانشوروں کے ساتھ مذاکرات منعقد کرائے۔ ان کی یہ حکمت عملی تھی کہ ہندو عوام اس مہم کو اپنے خلاف نہ سمجھیں، بلکہ ان میں یہ ہمدردی پیدا ہو کہ مسلمان اپنے مذہب کے مطابق ایک جائز مطالبہ کر رہے ہیں۔

اس مہم کے دوران بورڈ کی مجلس عاملہ اور مجلس عمل کے مشترکہ اجلاس منعقد ہوتے رہے اور مہم کی نوعیت اور رفتار کا جائزہ لیا جاتا رہا۔ دسمبر ۱۹۸۵ء کے تیسرے ہفتہ میں وزیر اعظم راجیو گاندھی سے بورڈ کے وفد کی ملاقات نتیجہ خیز رہی۔ ان پر واضح کیا گیا کہ اسلام میں کفالت کا قانون کسی نادار کو چاہے وہ نادار مطلقہ ہی کیوں نہ ہو بے سہارا نہیں چھوڑتا۔ انھوں نے اس پر ایک

نوٹ بورڈ کی جانب سے دینے کے لیے کہا۔ مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ نے یہ ذمے داری مولانا مجاہدالاسلام قاسمیؒ کے سپرد فرمائی اور جناب غلام محمود بنات والا صاحب نے اس کو انگریزی جامہ پہنایا۔ ۱۷رفروری ۱۹۸۶ء کو وزیراعظم راجیو گاندھی کی دعوت پر صدر بورڈ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور جنرل سکریٹری مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ نے ان سے ملاقات کی۔ وزیر قانون اشوک سین اور دوسرے مرکزی وزیر نارائن دت تیواری موجود تھے۔ اشوک سین صاحب نے مجوزہ قانون کا ایک مسودہ پڑھ کر سنایا جس کے کئی نکات کے بارے میں بورڈ کی جانب سے ترمیم یا تبدیلی کی تجویز رکھی گئی۔ ۱۸ر کو دوبارہ ملاقات ہوئی، بتلایا گیا کہ نیا مسودہ بنایا گیا ہے۔ ۱۹ر کو یہ مسودہ حوالے کیا گیا۔ اس مسودہ پر رائے کے لئے مجھے بھی حیدرآباد سے طلب کیا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ مسودہ بڑی بدنیتی کے ساتھ وزارت قانون نے مرتب کیا ہے۔ چناں چہ مسٹر اشوک سین سے ملاقات میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کی موجودگی میں میں نے اپنا نقطۂ نظر رکھا۔ وزیر قانون نے مزید ترمیم کا وعدہ کر کے مسودہ لے لیا۔ اس کے بعد آخری مسودہ حکومت کی طرف سے روانہ کیا گیا۔

اس مسودہ پر غور کے لئے مجلس عاملہ کا اجلاس ۲۳رفروری ۱۹۸۶ء کو منعقد ہوا، اس دوران وزیراعظم راجیو گاندھی کی جانب سے یہ پیام وصول ہوا کہ اگر اس مسودہ میں بورڈ ان کی جانب سے ایک ترمیم منظور کرلے تو بورڈ کی طرف سے جو ترمیمات پیش کی جائیں ان کو وہ قبول کرلیں گے، ان کی طرف سے یہ ترمیم وصول ہوئی تھی کہ اگر مطلقہ اور سابق شوہر دفعہ ۱۲۵ قانون فوج داری کے تحت نفقہ کے مسئلہ کا تصفیہ چاہیں تو اس دفعہ کے تحت عدالت فیصلہ دے گی۔ اجلاس نے مسودہ پر غور اور ترمیمات تجویز کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی جس میں ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب، سید شہاب الدین صاحب، یوسف حاتم مچھالا صاحب ایڈوکیٹ، مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی اور مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب شامل تھے اور مجھے اس کا کنوینر مقرر کیا گیا تھا۔ اسی دن ہم نے ترمیمات مرتب کر کے مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کے حوالے کیں، اجلاس میں بعض ارکان کا جن میں جناب عبدالکریم پاریکھ صاحب پیش پیش تھے یہ رجحان تھا کہ

فی الوقت جس شکل میں بھی مسودہ قانون ہو قبول کرلیا جائے، احتجاجی مہم کو مزید چلانا مناسب نہیں ہے۔ خامی رہ جائے تو بعد میں ترمیمات کرائی جاسکتی ہیں، جبکہ میرا اور کمیٹی کے ارکان کے علاوہ دیگر ارکان عاملہ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ بورڈ کی پیش کردہ ترمیمات قبول کرنے اور پارلیمنٹ میں منظور کروانے پر اصرار کروایا جائے۔ اس کے لئے وزیر اعظم اپنے وعدہ کے مطابق پابند ہیں کیوں کہ ان کی پیش کردہ ترمیم قبول کرلی جارہی ہے۔ مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ بھی ہم سے متفق تھے۔

جب پارلیمنٹ میں بل پیش ہوا اور منظور بھی ہوگیا تو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ بورڈ کی مجوزہ کوئی ترمیم شامل نہیں کی گئی تھی۔ بل خامیوں کے ساتھ منظور ہوگیا اور قانون بن گیا۔ استفسار پر پتہ چلا کہ جناب عبدالکریم پاریکھ صاحب کے اصرار پر مولانا علی میاںؒ (صدر بورڈ) نے ڈاکٹر طاہر محمود صاحب کو بلایا اور کمیٹی کی مرتبہ ترمیمات کو جو تعداد میں ۱۴ تھیں ان کے حوالے کیا کہ اس کا خلاصہ مختصر انداز میں مرتب کردیں۔ یہی تحریر مسٹر فوطے دار کے ذریعے وزیر اعظم کو پہنچائی گئی، جنھوں نے یہ کہلایا کہ اس کو بعد میں دیکھا جائے گا۔ اگر مجوزہ ترمیمات پیش اور منظور ہوجاتیں تو آج جو صورت حال پیدا ہوئی ہے نہ ہوئی ہوتی۔ آج اس قانون کے لیے چور دروازے کے ذریعے وہی شاہ بانو والا فیصلہ قانون بن کر نافذ ہورہا ہے۔[۲]

مولانا سید منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کو یہ خدشہ تھا۔ چنانچہ آپ نے قانون حقوقِ مسلم مطلقہ میں ترمیم کے لئے کوششوں کا آغاز فرمایا۔ مسٹر بھاردواج سے جو اس وقت بھی وزیر قانون تھے، ترمیمات پر غور کے لئے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ مگر سیاسی صورت حال بدل گئی اور انتخابات کے اعلان نے ان کوششوں پر پانی ڈال دیا۔ شاہ بانو فیصلہ کے خلاف ملک گیر احتجاجی مہم کے نتیجہ میں حکومت ہند سپریم کورٹ کے فیصلہ کے اثر کو قانون سازی کے ذریعے کالعدم قرار دینے کے لئے تیار ہوئی۔ اس کارنامہ کا سہرا مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کے سر ہے جنھوں نے مہم کو خوبی، باقاعدگی اور ڈسپلن کے ساتھ منظم کیا۔ یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ۲۱ر دسمبر ۱۹۸۵ء کو ہوئی ملاقات میں وزیر اعظم راجیو گاندھی نے اس شرعی موقف سے اتفاق

طے کرلیا تھا کہ:

۱۔ شوہر پر صرف زمانۂ عدت کا مطلقہ کا نفقہ لازم ہے، اس کے بعد کا نہیں۔

۲۔ عدت کے بعد اگر مطلقہ نادار ہو تو شریعت کے مطابق اس کا نفقہ ورثاء پر واجب ہوگا۔

۳۔ اور اگر ورثاء موجود نہ ہوں یا ان میں نفقہ ادا کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو نادار مطلقہ کا نفقہ وقف بورڈ کے ذمے ہوگا۔

شاہ بانو کیس فیصلہ کے خلاف احتجاج کے دوران ہی یہ خیال پیش ہوا کہ مسلم لا کی جو کتابیں شرعی حکم واضح کرنے کے لئے عدالتوں میں پیش اور تسلیم کی جاتی ہیں وہ علمائے کرام کی مرتبہ نہیں ہیں۔ ان میں زیادہ مشہور فریدوں جی اور ملا کی مرتبہ ہے۔ اس لئے علمائے کرام کی جانب سے ان ہی کتابوں کے طریقے پر دفعہ وار قانون مرتب کروایا جائے۔ احساس یہ تھا کہ یہ بات افسوس ناک ہے کہ عدالتوں میں مسلم لا کی ان کتابوں کا حوالہ پیش کیا جاتا ہے جن میں صریح غلطیاں یا غلط فہمیاں موجود ہیں۔ زمانۂ حاضر کی ضرورت اور تقاضوں کے مطابق مرتبہ کوئی ایسا مستند مجموعہ موجود نہیں ہے جو شریعت اسلامی کی صحیح ترجمانی کرتا ہو اور جس پر مستند علماء کا اتفاق ہو۔ بورڈ کو اپنی نگرانی اور رہنمائی میں مستند علماء کے قلم سے، مسلم وکلاء اور قانون دانوں کے مشورے سے ایک ایسا مجموعہ تیار کروانا چاہیے جس کو عدالتوں میں سند کے ساتھ پیش کیا جاسکے۔ اس احساس کے ساتھ ہی مولانا سید منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ نے مرکزی دفتر مسلم پرسنل لا بورڈ میں (جو ان دنوں خانقاہ رحمانی مونگیر میں قائم تھا) یہ کام شروع کر دیا۔ اردو میں مسودہ مرتب فرمایا پھر چند فاضل علماء کی خدمات حاصل کیں، اور مسودہ پر تفصیلی بحثیں ہوئیں۔ مولانا مرحوم کی وفات تک ملک بھر سے بلائے گئے علماء کی موجودگی میں اس مسودہ کی دو مرتبہ خواندگی ہوچکی تھی، اور قطعیت دے دی گئی تھی۔ صرف اس کا مبیضہ کرنا باقی تھا۔ ۲۰۰۱ء میں قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے بحیثیت صدر بورڈ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں یہ مجموعۂ قوانین اسلامی جاری کیا۔ چند ابواب اس میں چھوٹ گئے تھے[۱۴] جن کو شامل کر کے مولانا محمد ولی رحمانی نے خانقاہ رحمانی سے اور مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے مرکزی دفتر مسلم پرسنل لا بورڈ سے جو اَب دہلی میں قائم

ہو چکا تھا، جاری فرمایا۔ مستند علماء کے ذریعے مجموعۂ قوانین کی ترتیب مولانا منت اللہ رحمانیؒ کا تحفظ مسلم پرسنل لا کے سلسلے میں تیسرا بڑا کارنامہ ہے۔ افسوس یہ ہے کہ تقریباً دس سال بعد یہ مجموعہ زیور طباعت سے آراستہ ہوسکا[۵] اور ابھی تک اس کو اس انداز میں زبان انگریزی میں مرتب اور شائع نہیں کیا گیا ہے کہ عدالتوں میں پیش کیا جاسکے اور حوالے کے طور پر وکلا اس سے کام لے سکیں۔ مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے جس جانفشانی کے ساتھ اس کام کی تکمیل فرمائی تھی اس کا تقاضہ ہے کہ ان کے جانشین[۶] اس کی ترتیب جس مقصد کے تحت ہوئی تھی اس پر توجہ دیں۔

بابری مسجد کا قضیہ ۱۹۴۸ء کے اواخر سے چلا آرہا تھا، جس میں اشرار نے رات کے اندھیرے میں اس قدیم مسجد میں مورتیاں لاکر رکھ دیں، دوسرے دن حکام نے مورتیوں کو ہٹانے کے بجائے مسجد کو بند کردیا اور اس کو عدالتی نزاع بنادیا۔ ۱۹۷۶ء کے اوائل میں ان رکھی گئی مورتیوں کی پوجا کے لیے ہندوؤں کے لئے مسجد کو کھولنے کے ڈسٹرکٹ جج فیض آباد کے فیصلے نے صورت حال کو یکسر بدل دیا۔ چونکہ مسلم مجلس مشاورت نے اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لیا تھا اس لئے بورڈ نے مسجد کی شرعی اور قضیہ کی اصولی حیثیت تک خود کو محدود رکھا۔ ۱۹۹۰ء میں گفت وشنید کے ذریعے سمجھوتہ کی مختلف تجویزیں زیر بحث آنے لگیں۔ حکومت ہند کو بھی اس میں دلچسپی تھی، وزیر اعظم چندر شیکھر بھی چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح سمجھوتہ ہوجائے مگر جتنی تجویزیں پیش ہو رہی تھیں ان میں مسجد یا اس کے کسی حصہ سے دست برداری اور اس کی مندر کی تعمیر کے لئے حوالگی کی شرط ضرور تھی۔ اس صورتحال نے کان پور کے علماء کو بے چین کردیا، ان علماء کے ایک وفد نے مولانا منت اللہ رحمانیؒ سے مل کر اس معاملہ پر شریعت کے احکامات کی روشنی میں غور کرنے اور مسجد کی شرعی حیثیت کو واضح کرنے کی تجویز رکھی اور یہ کہ یہ کام بورڈ کرے۔ یہ بورڈ کی ذمہ داری ہے اور بورڈ کے فیصلے کو سب ہی قبول کریں گے۔ چنانچہ مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے ۳/دسمبر ۱۹۹۰ء کو مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کیا، اس اجلاس میں مختلف مسالک کے علماء ومفتیان کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ بعض ارکان کا ذہن سمجھوتہ قبول کرنے کی جانب مائل نظر آتا تھا۔ اس اجلاس میں بابری مسجد رابطہ کمیٹی اور بابری مسجد ایکشن کمیٹی اور

بابری مسجد پروٹیکشن کمیٹی کے ذمے دار ارکان بھی شریک تھے۔ مسجد کی شرعی حیثیت زیر بحث آئی، بابری مسجد کے قضیہ پر اظہار خیال ہوا اور جو فیصلہ ہوا اس کے پیچھے مولانا منت اللہ رحمانی کی عزیمت کارفرما تھی کہ ان کی گفتگو میں رعب داب نہ تھا اور نہ ہی الفاظ میں شان وشوکت تھی۔ مگر شخصیت میں رعب ضرور تھا اور یہ بھی اس موقع پر کام آیا، جو مصلحتوں کے دامن میں پناہ تلاش کر رہے تھے، انھیں بھی اتفاق کرنا پڑا۔ بورڈ نے یہ اعلان کیا کہ:

''مسجد اور مسجد کی جگہ خدا کی ملک ہے، نہ اسے تبدیل کیا جاسکتا ہے، نہ اس کی خرید وفروخت ہوسکتی ہے، نہ کسی مصلحت کی بناء پر کسی فرد، جماعت یا حکومت کے حوالے کی جاسکتی ہے اور نہ کوئی حکومت اسے اکوائر کرسکتی ہے۔''

مسجد کی اس شرعی حیثیت کی وضاحت کے ساتھ بابری مسجد کے تعلق سے اس قرارداد میں کہا گیا کہ:

''ناقابل تردید تاریخی وقانونی شواہد سے واضح ہے کہ بابری مسجد، مسجد ہی ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف حکومت اترپردیش نے بھی عدالت میں دیے گئے تحریری بیان میں کیا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ بابری مسجد غصب کی ہوئی زمین پر یا کسی مندر کو توڑ کر نہیں بنائی گئی اس لئے اس کی شرعی حیثیت وہی ہے جو ایک مسجد کی ہوتی ہے۔ بناء بریں یہ مسجد مسلمانوں کو اسی حالت میں جس میں کہ ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء تک تھی واپس کی جانی چاہیے۔''

بورڈ کے اس فیصلے نے حیلہ جو اصحاب کی غیر اصولی اور غیر منصفانہ تجاویز کی ہوا نکال دی۔ وزیر اعظم چندر شیکھر کی برانگیختگی دیکھنے کے لائق تھی، جب مولانا منت اللہ رحمانی کی قیادت میں بورڈ کے وفد نے مل کر شکایت کی کہ بابری مسجد کو بلا ثبوت رام جنم بھومی قرار دے کر سارے ملک میں مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیز تقریریں کی جارہی ہیں اور حکومت تماشائی بنی ہوئی ہے۔ شری چندر شیکھر نے اس شکایت پر کچھ کہنے کے بجائے بورڈ کے فیصلہ کو ہدف بنانا چاہا، مولانا منت اللہ رحمانی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ وزیر اعظم برہم اس لئے تھے کہ بورڈ کے اس

فیصلے کے بعد کوئی مسلمان، مسجد سے مکمل یا جزوی دست برداری پر آمادہ نہیں ہوسکتا تھا۔ مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کے اس جرأت مندانہ قدم اور مسجد کی شرعی حیثیت کے بے باکانہ اظہار نے بابری مسجد کو مسلمانوں ہی کے ہاتھوں مندر کے حوالے ہونے سے بچالیا۔

بورڈ کے اس اجلاس نے مسلمانانِ ہند کے نام ایک پیام بھی جاری کیا۔ سنگھ پریوار کے زہریلے پروپیگنڈے کے نتیجہ میں ملک کے کئی مقامات پر مسلم کش فسادات ہوئے، پولس نے بھی درندگی اور بربریت کا مظاہرہ کیا، ان دل دوز واقعات کے حوالے سے بورڈ نے اپنے پیام میں کہا کہ:

> مسلمانوں نے آزمائش کے ان لمحات میں صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا ہے اور استقامت کا ثبوت دیا ہے۔ جان و مال پر حملے اور قتل و غارت گری کے ان ہنگاموں میں جو مسلمان ہلاک کئے گئے وہ شہید ہیں، شہادت کی موت اتنی عظیم ہے کہ مومن اس کی تمنا کرتا ہے اور جو مسلمان برباد ہوئے ہیں یہ اجلاس ان سے اظہار ہمدردی کرتا ہے اور یقین دلاتا ہے کہ اس قربانی اور ایثار کا اجر اللہ کے پاس محفوظ ہے۔''

اسی پیام میں آگے چل کر جو کہا گیا ہے اس کا نقل کرنا بھی مفید ہوگا کیوں کہ ایسی صورت حال آئندہ بھی پیش آسکتی ہے:

> ''ملک میں فرقہ پرست فاشسٹ ذہن جس قوت کے ساتھ ابھر رہا ہے، اس کے نتیجہ میں آئندہ بھی ایسے ہولناک واقعات پیش آسکتے ہیں۔ مسلمان صبر وتحمل سے کام لیں اور ٹکراؤ سے بچنے کی کوشش کریں۔ لیکن جب ان کی جان و مال اور عزت وآبرو اور شعائر دینی پر حملہ ہو تو وہ اللہ کی ان امانتوں کی حفاظت کے لئے حملہ آوروں کا مقابلہ کریں اور اپنے دفاع کے لئے دینی، اخلاقی وقانونی حق کا بھرپور استعمال کریں... اس ملک میں مسلمانوں کا وجود حکومت یا اکثریت یا کسی گروہ کے رحم وکرم پر نہیں ہے۔ اس کا سہارا

صرف اللہ کی ذات ہے، وہ خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کے ذریعے ہی زندہ رہ سکتا ہے اور اسی ذاتِ واحد کے سہارے پر وہ ملک میں اپنے دین و ایمان کے ساتھ باقی رہے گا اور ان شاء اللہ درخشاں مستقبل کی طرف گامزن ہوگا۔"

بورڈ کے اس اجلاس سے پہلے بھی بابری مسجد کے تعلق سے کی گئی ایک سازش کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر مولانا منت اللہ رحمانی بر وقت حرکت میں نہ آتے تو بابری مسجد کے تعلق سے مسلمانوں کے حقوق ختم ہو گئے ہوتے۔ آندھرا پردیش اور بہار کے دو گورنروں نے وی پی سنگھ کی وزارتِ عظمیٰ کے دور میں رام جنم بھومی مندر تحریک چلانے والوں اور بورڈ میں شامل صرف علمائے کرام کی نشست دہلی میں منعقد کرائی۔ شری کرشن کانت اور جناب یونس سلیم نے ایسا چکر چلایا کہ علمائے کرام مسجد کو حکومت کے قبضہ میں دینے اور اس تعلق سے فیصلہ کا حق اس کو دینے کے لئے تیار ہو گئے اور ایک انگریزی تحریر پر چند علماء سے جو بورڈ کے معزز رکن تھے، دستخط حاصل کر لی اور اس تحریر کی بنیاد پر وی پی سنگھ حکومت نے فوری طور پر بابری مسجد کو تحویل میں لینے (اکوائر کرنے) کا آرڈی نینس جاری کر دیا۔ اس نازک اور مشکل مرحلہ میں مولانا منت اللہ رحمانی فوراً حرکت میں آئے اور انھوں نے وی پی سنگھ کو آرڈی نینس واپس لینے پر مجبور کیا۔ چنانچہ ۲۴ گھنٹوں کے اندر آرڈی نینس بے اثر کر دیا گیا۔ یہ ان ہی کی جرأت تھی کہ دو گورنرس کی چال بازی دھری کی دھری رہ گئی اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا وقار باقی رہ گیا اور دستخط کرنے والے ممتاز علمائے کرام کی عزت باقی رہ گئی۔ ورنہ انھیں اپنے شہروں اور علاقوں میں مسلمانوں کی شدید برہمی کا سامنا کرنا پڑتا۔

بابری مسجد کے شرعی موقف پر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی جانب سے پر عزم اعلان کا اہتمام کروانے کے بعد مولانا سید منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کی توجہ مجموعۂ قوانین اسلامی کی ترتیب کے کام پر مرکوز رہی ہے اور وہ اس کی جلد از جلد تکمیل کے لئے کوشاں رہے مگر انھیں اپنی حیات میں اس کارنامہ کو منزل مقصود تک پہنچتے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ چند ہی ماہ بعد رمضان المبارک کے

مقدس مہینہ میں جان، جان آفریں کے سپرد کردی۔

آپ کی رحلت پر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ نے جو قرارداد تعزیت منظور کی اس کے اقتباس پر میں اپنی بات ختم کرتا ہوں:

مرحوم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے بانیوں میں تھے، جس عزم و ہمت، فراست و دانش مندی، دل سوزی و مستعدی کے ساتھ انھوں نے مسلم پرسنل لا کے کاز کو آگے بڑھایا وہ یقیناً ہندوستان میں تحفظ شریعت تحریک کا ناقابلِ فراموش باب ہے۔ موصوف کی رحلت ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ ان کے انتقال سے ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے، جس کا پر ہونا مشکل نظر آتا ہے۔"

اور واقعی یہ خلا آج تک پُر نہ ہو سکا۔

"ضروری نوٹس از مرتب"

(مقالے میں بہت سی باتیں قابل ملاحظہ تھیں اس لیے ان پر نوٹس کا اضافہ ضروری سمجھا گیا۔ عمید الزماں کیرانوی)

۱۔ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کو ہندوستان میں قانون شریعت کے تحفظ کی فکر عملی زندگی کے ابتدائی دور سے تھی۔ شریعت اپلی کیشن ایکٹ ۳۷ء کے مسودہ کی ترتیب میں وہ شریک رہے، واضح رہے کہ اس زمانہ میں حلقہ جمعیۃ علماء ہند میں ہمارے علم کی حد تک وہ تنہا انگریزی داں نمایاں عالم دین تھے۔ حضرت مولانا نے ۳۸ء میں بہار اسمبلی میں اراضی وقف پر ٹیکس لگانے کی تجویز کی زبردست مخالفت کی تھی، جس کے نتیجے میں اوقاف پر ٹیکس عائد کرنے سے حکومت بہار باز رہی۔ بہار اسمبلی میں حضرت مولانا کی تاریخی تقریر (جو ۳۸ء میں رسالہ کی شکل میں بار بار طبع ہوئی اور اب "خطباتِ امیر شریعت" اور "مسلم پرسنل لا- زندگی کی شاہراہ" کا حصہ ہے) کا آخری جملہ ہے "میں امید کرتا ہوں کہ اسلامی اوقاف پر ٹیکس لگا کر حکومت مسلمانوں کے مذہب میں مداخلت نہ کرے گی۔ اسی تقریر کا یہ جملہ بھی یاد رکھنے والا ہے "جب کانگریس حکومت قائم ہوگی اور کوئی مذہبی مسئلہ پیش آئے گا تو اس وقت مسٹر بلدیو سہائے (اس

وقت کے ایڈووکیٹ جنرل بہار) ہمیں بتلائیں گے کہ قرآن کا مطلب یہ ہے اور یہ نہیں ہے۔" آج جب کہ مختلف کورٹس قانون شریعت کی اپنے انداز پر تشریح کرر ہے ہیں، مردِ دانا کی ۱۹۳۸ء میں کہی ہوئی بات یاد آتی ہے۔ ملی تاریخ کے اس حصہ کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ نے ۲۸؍ جولائی ۱۹۶۳ کو انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ میں کل جماعتی مسلم پرسنل لا کنونشن منعقد کیا تھا۔ جس کی صدارت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمان صاحب عثمانی (ورکنگ صدر جمعیۃ علما ہند) نے فرمائی تھی، جس میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث علما کے ساتھ جماعت اسلامی، بوہرہ جماعت اور شیعہ حضرات کی نمایاں شخصیتوں نے شرکت فرمائی تھی۔

۲۔ درس ہونے کی بات محل نظر ہے۔ مفتی شاہ برہان الحق صاحب اس وقت بمبئی میں تھے اور موصوف کے پاس قاضی صاحب نہیں بلکہ مولانا مفتی عتیق الرحمان صاحب اور حضرت مولانا رحمانی علیہ الرحمہ گئے تھے۔ (کیرانوی)

۳۔ حضرت مولانا رحمانی علیہ الرحمہ نے سپریم کورٹ کے صرف ایک فیصلہ کے خلاف مسلمانانِ ہند کو بیدار کر دیا تھا۔ ایسی حکمت عملی اپنائی تھی کہ وزیر اعظم نے نہ صرف شرعی موقف سے اتفاق کرلیا، بلکہ ایک انٹرویو میں قانونِ شریعت اسلامیہ کی تعریف بھی کی تھی۔

افسوس کہ حضرت مولانا رحمانی علیہ الرحمہ کے انتقال کے بعد سے حال تک ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ نے متعدد فیصلے قانونِ شریعت کے خلاف کیے ہیں، مگر کوئی مؤثر آواز بلند نہیں ہوئی۔ امید ہے کہ ذمہ داران بورڈ اس صورتِ حال کے تدارک کے لیے اس طرف خصوصی توجہ دیں گے۔

۴۔ مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ (صدر بورڈ) نے مجموعہ قوانین کے نام سے پہلی مرتبہ کتاب شائع کرائی تھی، اس میں تقریباً ایک تہائی دفعات طباعت میں شامل ہونے سے رہ گئی تھیں۔ (کیرانوی)

۵۔ اپنی معلومات کے علاوہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب سے گہرا تعلق رکھنے والے حقائق پر مطلع واقف کار حضرات سے حاصل شدہ معلومات کے پس منظر میں احقر کے نزدیک مندرجہ ذیل ملاحظات قابل توجہ ہیں: اس گراں قدر مجموعہ قوانین اسلامی کا دس سال بعد شائع ہونا افسوسناک ہے حضرت مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد کتاب کی تہذیب وتحشیہ کی ذمے داری مولانا محمد ولی رحمانی کے حوالے کی گئی، جو اس کام میں شریک رہے تھے۔ جن کی زبان و بیان اور قانونی سمجھ پر اعتماد تھا، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے کتاب کے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے۔ "حضرت مولانا منت اللہ

صاحب رحمانی علیہ الرحمہ کام پورا ہونے سے قبل ہی ۱۹۹۱ء میں رحلت فرما گئے، (انا للّٰہ و انا الیہ راجعون) اس کے بعد مرحوم کے فرزند ارجمند عزیز گرامی مولانا محمد ولی رحمانی نے اس کی تکمیل پوری دلچسپی سے مونگیر اور پٹنہ میں مذکورہ علماء کو متعدد بار جمع کر کے کروائی۔ اور بحث میں خود بھی حصہ لیا۔ دوسرے دور میں مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب شرکت نہیں کر سکے۔'' یہ بار بار علمائے کرام کو جمع کر کے کتاب پر نظر ثانی کا کام صدر بورڈ حضرت مولانا ندویؒ، مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی، اور مجلس عاملہ کے مشورے سے ہوا۔ اور جولائی ۱۹۹۶ء کی مجلس عاملہ بورڈ میں مولانا محمد ولی رحمانی نے رپورٹ پیش کر دی تھی۔ بورڈ کے کارروائی رجسٹر میں یہ الفاظ درج ہیں: ''مجموعۂ قوانین اسلامی کا مسودہ طباعت کے مرحلے میں ہے اس کے حواشی کی کمپوزنگ ہو چکی ہے اور اس کی تصحیح بھی کر لی گئی ہے، اس میں صدر محترم (بورڈ) کا ایک مقدمہ بھی شامل کیا جائے گا۔'' ۲۸ر مارچ ۱۹۹۷ء کی مجلس عاملہ بورڈ میں مولانا محمد ولی رحمانی نے رپورٹ پیش کی اور بتایا کہ ''اب کام اتنا رہ گیا ہے، کہ صدر محترم بورڈ کا مقدمہ آ جائے، تو اس کی طباعت ہو جائے گی۔'' (از رجسٹر کارروائی)۔ مگر اس کتاب پر نظر گزارنے کا کام مکمل نہیں ہوا تھا۔ اس لیے صدر بورڈ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے اس مجموعہ کو (جسے مولانا محمد ولی رحمانی نے ٹائپ کرا کے آخری شکل دی تھی) مولانا محمد برہان الدین صاحب، استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء اور رکن مجلس عاملہ بورڈ کے ذریعہ کسی مشہور قانون داں کے پاس بھیجا۔ یہ کام ۱۹۹۹ء میں پورا ہوا۔ پھر صدر بورڈ حضرت مولانا ندویؒ نے کتاب پر مبسوط مقدمہ تحریر فرمایا، جس میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ: (مشہور قانون داں) ''موصوف نے یہ مخلصانہ اور مفید مشورہ دیا کہ اس مسودہ میں جو فقہی اصطلاحیں استعمال ہوئی ہیں، ان کی اردو و انگریزی میں تشریح ہونی چاہیے۔'' غنیمت ہے کہ اس مشورہ پر عمل نہیں کیا گیا اور مسودہ کتاب کی اشاعت کا فیصلہ کیا گیا۔ ورنہ اس مجموعہ کی اشاعت میں اور بھی تاخیر ہوتی۔ یہ بھی یاد رہے کہ جب مولانا قاضی مجاہد الاسلامؒ بورڈ کے صدر ہوئے تو انھوں نے پھر مسودہ کتاب پر نظر ثانی کرائی، جس کا تذکرہ قاضی صاحب نے اپنے قلم سے کتاب کی ابتداء میں کیا ہے۔ حیرت اس پر ہے کہ کتاب کے ٹائٹل پر حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کا نام نہیں دیا گیا اور انگریزی ترجمہ میں مرتب کی حیثیت سے مولانا مفتی محمد ظفیر الدین (مفتی دار العلوم دیو بند) کا نام دیا گیا ہے۔

۶۔ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے بحیثیت صدر بورڈ اس مجموعہ کے انگریزی ترجمہ کا کام کرایا،

جس کی اشاعت ان کے زمانہ صدارت میں ہو چکی ہے۔ انگریزی ایڈیشن میں وہ حواشی نہیں ہیں، جو اردو میں ہیں اور جن سے کتاب کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اور کتاب میں موجود حواشی کی نقل و ترتیب و تنقیح مولانا محمد ولی رحمانی کی گراں قدر علمی خدمت ہے۔

۷۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ بابری مسجد کے مسئلہ کو بورڈ نے اُس وقت تک اپنے ہاتھ میں نہیں لیا تھا، مگر حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کی شخصیت کا وزن اتنا تھا کہ بورڈ کے فیصلہ کو تمام ارکان نے مان لیا۔ یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ جب تک مسجد کی عمارت کھڑی تھی، بورڈ نے براہ راست مسجد کے معاملہ کو اپنے ایجنڈے میں شامل نہیں کیا، اور جب بابری مسجد ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو شہید کردی گئی تو جنوری ۱۹۹۳ء میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلامؒ کی تجویز پر شہید بابری مسجد بورڈ کے ایجنڈے میں لے لی گئی۔ اور اس وقت بورڈ کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ بابری مسجد پر بنی ساری کمیٹیاں توڑی جاتی ہیں ــــ پھر بھی ــــ کمیٹیاں اپنی جگہ ہیں اور بورڈ کی کوششیں اپنی جگہ ــــ حضرت مولانا رحمانی علیہ الرحمہ کی زندگی میں اور وفات کے بعد بورڈ کے اثر انداز ہونے کی صلاحیت میں جو فرق آیا ہے۔ یہ اس کی ایک مثال ہے، بابری مسجد کا تذکرہ آیا، تو مختلف معتمد لوگوں سے سنی ہوئی بات بھی یاد آئی۔ چاہتا ہوں کہ لکھوں، تاکہ مستقبل میں ملت کی تاریخ لکھنے والے اس واقعہ کے پس منظر سے ''اسباب زوال'' تلاش کرلیں ــــ ایک بار بورڈ کی مجلس عاملہ میں بار بار یہ مسئلہ اٹھایا جارہا تھا، اور بورڈ کے رکن مسلم ارکان پارلیمنٹ زور دے رہے تھے کہ بابری مسجد کے مسئلہ کو بورڈ اپنے ہاتھ میں لے، حضرت مولانا رحمانی علیہ الرحمہ خاموش رہے جب اصرار زیادہ بڑھا تو انھوں نے چاروں ارکان پارلیمنٹ (جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ، جناب بنات والا، جناب سلطان صلاح الدین اویسی اور جناب سید شہاب الدین) کو مخاطب کیا اور فرمایا: بورڈ اس مسئلہ کی ذمہ داری قبول کرسکتا ہے۔ اور انشاء اللہ کامیابی بھی ملے گی۔ شرط صرف یہ ہے کہ اس موضوع پر آپ حضرات میرے مشورہ کے بغیر نہ بولیں نہ لکھیں، سب لوگ خاموش رہے۔ انھوں نے اپنی عادت کے مطابق دوبارہ اور سہ بارہ پوچھا کہ آپ لوگ تیار ہیں، سبھوں کی خاموشی قائم رہی، تو انھوں نے فرمایا کہ پھر بورڈ اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔ (کیرانوی)

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی ☆

حضرت امیر شریعتؒ اور ان کی ملّی خدمات

بانیٔ ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ ایک روشن ضمیر اور صاحب نسبت بزرگ ہونے کے ساتھ، صاحب بصیرت اور زمانے کے نبض شناس، عالم باعمل اور مستقبل بعید پر نظر رکھنے والے دانائے راز بھی تھے، انھوں نے اس ملک میں ندوۃ العلماء کی ضرورت کا احساس اس وقت کرلیا تھا، جب قائدینِ ملت بدلتے ہوئے حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اسلامی تہذیب کا احیاء ایک خواب بن کر رہ گیا تھا اور امت مسلمہ کی وحدت ٹوٹ کر دو خانوں میں تقسیم ہوگئی تھی اور دین و دنیا کی جامعیت کی بات کرنا ایک گناہ سمجھا جانے لگا تھا اس وقت مولانا مونگیریؒ نے یہ پیغام دیا تھا:

> ''بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک جماعت علماء کی دنیا کے حالات اور واقعات سے بھی باخبر ہو، اس کو معلوم ہو کہ جس سلطنت میں وہ زندگی بسر کرتی ہے، اس کے اصول سلطنت کیا ہیں، اس کو سلطنت سے کس قسم کا تعلق ہے، مسلمانوں کی دنیوی حالت کیا ہے ان کو کیا ضرورتیں درپیش ہیں، سلطنت کے انتظامات میں جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، ان سے مسلمانوں کی حالت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ ملک میں علما کا جو اثر کم ہوتا جارہا ہے، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ خیال عام طور پر پھیلتا جارہا ہے کہ علماء حجروں میں معتکف ہیں، اور ان کو دنیا کے

☆ مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

حال کی بالکل خبر نہیں، اس لیے دنیاوی معاملات میں ان کی ہدایت اور ان کا ارشاد بالکل نا قابل التفات ہے، بے شبہ جو علماء دنیا سے بالکل ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور ان کو کثرتِ عبادت اور ذکر و فکر کی وجہ سے اپنے زن و فرزند کے ضروریات کی طرف بھی توجہ نہیں، اصحابِ صفہؓ سے ان کو تشبیہ دی جا سکتی ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ کل صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اصحاب صفہ نہیں تھے اور نہ ہو سکتے تھے، بے شبہ اصحاب صفہؓ کے مشابہ ایک گروہ ہمیشہ قوم میں موجود رہنا چاہیے، لیکن اس کے ساتھ نہایت ضروری ہے کہ ایک جماعتِ کثیر ایسی بھی موجود ہو جو واقفیت و اطلاع، انتظام و تدبیر، حزم و مصلحت اندیشی میں حضرت عمرؓ، عمرو بن العاصؓ، خالد بن ولیدؓ، ابوعبیدہ امینؓ کے نقش قدم پر ہو۔"

امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی، بانی، ندوۃ العلماء کے آخری فرزند ہیں، مولانا نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں چار سال تعلیم حاصل کی، اور بیعت کا تعلق حضرت مولانا مونگیریؒ سے رکھا اور مولانا شاہ قمر الدین صاحب پھلواریؒ کے بعد صوبۂ بہار واڑیسہ کے امیر شریعت مقرر ہوئے اور محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے انھوں نے اپنے زمانۂ امارت میں بڑی ذہانت، جرأت اور دور اندیشی کے ساتھ مسلمانوں کے شرعی عائلی قوانین کو نافذ کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ جب بھی حکومت وقت نے کسی شرعی مسئلہ میں مداخلت کرنا چاہی تو امیر شریعت نے اس کو روکنے کا پورا انتظام کیا۔ متبنیٰ بل اور نفقۂ مطلقہ تا حیات اور تدوینِ فقہ اسلامی خاص طور سے ان کے دور امارت کے اہم ترین کارناموں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔

مسلمانوں کے عائلی شرعی قوانین میں مداخلت کا خطرہ روز بروز بڑھتا ہی جا رہا تھا اور اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ یکساں سول کوڈ نافذ کر کے شریعت کے قوانین کو ختم یا بے اثر کر دیا جائے اور مسلم عائلی قانون کی کوئی حیثیت باقی نہ رہ جائے، اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے جس علمی استعداد اور صلاحیت کی ضرورت تھی، وہ پوری طرح مولانا کے اندر موجود تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اس فتنہ کا ادراک کر لیا اور اس کو دفع کرنے کی تیاری میں دارالقضاء کا قیام اور اس کو

وسیع پیمانے پر پورے ملک میں رائج کرنے کا فیصلہ کیا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے امیر شریعت کے اس وصف کو بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

''اس خطرہ کو سمجھنے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ذہانت، وسیع مطالعہ، حقائق کے ادراک، امیر شریعت کے فرائض کی وسعت ونزاکت کو سمجھنے، اکثریتی فرقہ کے رجحانات اور مجالس قانون ساز کے اختیارات کی وسعت کا ادراک کرنے اور اخبارات ومضامین، تقاریر وبیانات اور مجلسی گفتگوؤں کے ذریعے اس قریبی خطرہ کو محسوس کرنے کی صلاحیت کی ضرورت تھی، جو ہر قائد اور عالم کو آسانی سے میسر نہیں ہوتی۔ اس کے لیے ذہانت، مطالعہ کی وسعت، خطرہ کے ادراک کے ساتھ توفیقِ الٰہی کی بھی ضرورت ہے اور بعد کے واقعات اور تجربہ نے ثابت کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانیؒ کو اس دولت سے نوازا تھا۔ ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

امارت شرعیہ کے ابتدائی و بنیادی فرائض اور دائرۂ عمل کے ساتھ، جس میں مختلف مقامات پر قضاء شرعی کے مراکز (دارالقضاء) کا قیام، قضاۃ کا تقرر اور مسلمانوں کو سرکاری عدالتوں (Courts) کے بجائے شرعی عدالتوں کی طرف رجوع کی ترغیب اور ایسے فیصلوں کا صدور شامل ہے، جن کو سرکاری عدالتوں میں بھی چیلنج نہ کیا جاسکے اور جن کے بارے میں مولانا کے دورِ امارت میں اس حد تک کامیابی ہوئی کہ سرکاری عدالتوں نے بھی عام طور پر ان فیصلوں کا احترام کیا اور بہت سے مواقع پر ان کو قائم رکھا، اسی طرح اصلاحِ معاشرہ کی تحریک جس کا مولانا کے دورِ امارت میں خاص طور پر کام ہوا۔''

امیر شریعت ایک عظیم عالم، مدبر، فقیہ اور صاحب علم وبصیرت شخصیت کے مالک تھے، ان کی اصلاحی اور عوامی تربیت کا دائرہ بہت وسیع تھا، وہ تعلیم کے میدان میں بھی بڑی مہارت رکھتے

تھے، جامعہ رحمانی کی نشأۃ ثانیہ انھی کا کارنامہ ہے، اس کی تنظیم جدید اور تعمیری وسعت اور تعلیمی معیار کی بلندی اور اس کو صحیح معنوں میں جامعہ بنانے میں مولانا کا زبردست حصہ ہے، وہ اپنی خاندانی بلند نسبت اور عالی ہمتی کی وجہ سے علماء کے طبقے میں بہت زیادہ مقبول تھے، ملک کی عظیم اسلامی درس گاہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے اہم ترین رکن ہونے کے ساتھ وہ ندوۃ العلماء کی مجلس منتظمہ کے بھی سرگرم رکن تھے اور اپنے مشوروں اور توجہات سے فائدہ پہنچاتے تھے، حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے تعلقات بہت وسیع اور پائدار تھے، حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کا بے حد احترام فرماتے تھے اور ان کی بے نفسی اور تواضع کا ان کے دل پر بہت گہرا اثر تھا، شاہ بانو کیس کے سلسلے میں امیرِ شریعت کے ساتھ ذمہ دارانِ حکومت سے بار بار ملاقات اور اس موضوع پر بات کرنے کی ضرورت میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہو، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے لکھا ہے کہ:

> ''راقم الحروف کو اپنے دورِ صدارت (مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت) میں (جو ۲۷، ۲۸ر دسمبر ۱۹۸۳ سے شروع ہوا) مولانا کے ساتھ دورہ کرنے، جلسوں میں خطاب کرنے اور اس وقت کے وزیر اعظم ہند آنجہانی راجیو جی سے بار بار ملنے، ان سے اس مسئلہ پر تنہائی میں اور کبھی اس وقت کے وزیر قانون مسٹر اشوک سین اور بعض دوسرے مشیرانِ حکومت کی موجودگی میں گفتگو کرنے پھر ان کے بعد وی پی سنگھ جی (سابق وزیر اعظم ہند) اور دوسرے ذمے دارانِ حکومت سے بار بار ملنے کا موقع ملا، اس میں راقم کو مولانا کی بے نفسی، تواضع، حقیقت پسندی اور مقصد سے لگن اور اس کی فکر کا اندازہ ہوا، اور اب یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس مسئلہ کی کامیابی (جس حد تک ہوئی) میں مولانا کی بے نفسی، اشتراکِ عمل کی صلاحیت اور صرف مقصد کے حصول سے دلچسپی کو بہت بڑا دخل ہے، انھوں نے کبھی اس کی کوشش نہیں کی کہ وہ ان گفتگوؤں میں نمایاں اور پیش پیش ہوں اور کامیابی کا سہرا ان کے سر بندھے اور وہ پریس میں یا پبلک میں زیادہ نمایاں مقام

حاصل کریں۔"

حضرت امیرِ شریعت جب بھی ندوہ تشریف لاتے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ ان کے لیے آنکھیں فرشِ راہ کرتے تھے، اور ان کے احترام میں وہ اپنے دوسرے کاموں کو مؤخر کر دیتے تھے، اور جب تک قیام رہتا حضرت مولانا ان کے ساتھ اپنا پورا وقت صرف کرتے، اور ہر طرح ان کے آرام و راحت کا خیال فرماتے تھے، دورانِ قیام طلبہ کی بڑی تعداد امیر شریعت کو دیکھنے اور ان سے مستفید ہونے کی کوشش کرتی تھی۔ اساتذہ کرام ان کی مجلسوں میں عقیدت کے ساتھ حاضر ہوتے اور مولانا کی بلند قامت شخصیت سے مل کر انبساط محسوس کرتے تھے اور بعض اہم مسائل پر تبادلۂ خیال کیا کرتے تھے۔

ہر سال جلسۂ انتظامیہ کے موقع پر حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ ان کو باصرار مدعو فرماتے تھے، اور اکثر جلسہ کی صدارت انھی سے کراتے، جلسۂ انتظامیہ میں بھی امیر شریعت اپنے تاثرات پیش فرماتے تھے اور الگ سے بھی طلبہ کی انجمن میں تقریر فرمایا کرتے تھے، رفیق سفر کی حیثیت سے اکثر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور کبھی صاحبزادۂ گرامی حضرت مولانا محمد ولی رحمانی صاحب ہوا کرتے تھے۔

۱۹۷۵ء میں منعقد ہونے والے ندوۃ العلماء کے تاریخی جشنِ تعلیمی میں حضرت امیرِ شریعت نے حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصی درخواست پر شریک ہوکر اپنی تشریف آوری سے جشن کی رونق اور اس کی افادیت میں اضافہ فرمایا تھا۔ اختتامی جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے تقریر فرمائی اور دعا پر پروگرام کا اختتام فرمایا۔ اس موقع پر آپ نے ندوۃ العلماء کے اس اجلاس کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور اس کی غیر معمولی اور حیرت انگیز کامیابی اور اس کے دوررس، ہمہ گیر اور متوقع اثرات کا ذکر کیا، انھوں نے علمائے دین اور منتظمینِ مدارس کو بدلے ہوئے حالات میں زیادہ وسیع النظری اور زمانہ شناسی کی دعوت دی اور فرمایا کہ اگر موجودہ دور میں ہمیں کوئی نقش قائم کرنا ہے تو اس کے لیے اب ہمیں اپنے طرزِ فکر اور طرزِ عمل میں تبدیلی لانا ہوگی، انھوں نے ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خاص طور سے اور ان تمام حضرات

کو جنھوں نے جشن کے انعقاد میں حصہ لیا، مبارک باد دی تھی۔

امیر شریعت کو اللہ تعالیٰ نے ملت اسلامیہ کی ہمہ جہت خدمت کے لیے منتخب فرمالیا تھا، وہ صرف امارت شرعیہ کی ذمہ داریوں کو درجہ کمال کے ساتھ انجام نہیں دیتے تھے بلکہ معاشرتی اور ملی حالات سے بھی پوری طرح تعلق رکھتے تھے، آزادی کے بعد ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کے تسلسل سے احساسِ کمتری کی جو فضا مسلم معاشرے میں قائم ہوگئی تھی اس کو نہ صرف دور کرنے بلکہ ان فسادات کے سلسلے کو روکنے اور مسلمانوں کے اندر دین کا احساس پیدا کرنے اور شریعت کا پابند بنانے میں امیرِ شریعت کا کردار بہت بلند اور بےلوث ہے، ان کی بلند قامت شخصیت کا لحاظ نہ صرف ریاستی حکومت کو بلکہ مرکزی حکومت کو بھی کرنا پڑتا تھا۔

شرعی قوانین کو نافذ کرنے اور مسلم معاشرہ کو اس کا پابند بنانے کے لیے امیرِ شریعت کی بےچینی اور مسلسل اسفار کے ذریعے اس کی کوشش کو کون نہیں جانتا، اسی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے ملک کے ہر طبقہ کے علماء سے رابطہ قائم کر کے شرعی قوانین کے نفاذ کے سلسلہ میں بحث و گفتگو کی اور امت مسلمہ کے تمام نمائندوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا، اور ان کے سامنے مسلم عائلی قوانین کے نفاذ کے لیے ایک متحدہ بورڈ کے تشکیل دینے کی تجویز پیش کی جس کو متفقہ طور پر منظور کرلیا گیا اس اجلاس میں یہ بات طے پائی کہ ایک نمائندہ وفد حکومتِ وقت سے ملاقات کر کے اس کو بتادے کہ مسلم معاشرہ میں شرعی قوانین کو نافذ کرنے کے لیے بورڈ کا قیام عمل میں آیا ہے، اور اس امانت کو ادا کرنا ہمارا ملی اور مذہبی فریضہ ہے، اس لیے مسلمانوں کے شرعی قوانین میں مداخلت کا حق حکومت یا عوام کسی کو نہیں ہے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام امیر شریعت کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ ان کے اخلاص اور فکرمندی نے بورڈ کو عظمت و ہیبت عطا کی۔ وہ اپنے مدبرانہ عمل سے اس کی افادیت اور وسعت و طاقت میں برابر اضافہ کرتے رہے۔ انھی کی جدوجہد اور بےچینی کی وجہ سے مشہور زمانہ ''شاہ بانو کیس'' کے سلسلے میں سپریم کورٹ کا فیصلہ جو شرعی قانون کے منافی تھا، پارلیمنٹ کے ذریعے منسوخ کرانے اور نئے مسلم مطلقہ بل کو پاس کرانے میں کامیابی حاصل ہوئی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مضمون میں امیرِ شریعت کے اس تاریخی کردار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''مولانا کے دورِ امارت کا اصل کارنامہ اور تاریخی کردار'' آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کا قیام ہے، جس کی ۲۷، ۲۸ر دسمبر ۱۹۷۲ء کو بمبئی میں تشکیل ہوئی اور جس کے صدر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند منتخب ہوئے جو اس اہم ملی منصب و قیادت کے لیے موزوں ترین شخصیت تھے، اور جن کو زیادہ سے زیادہ اعتماد و احترام عام حاصل تھا اور مسلمان فرقوں، جماعتوں اور تنظیموں کی اس میں ایسی نمائندگی ہوئی جو کم کسی نمائندہ ادارہ اور جماعت میں ہوتی ہے۔ پھر اس کے بعد سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کی تنسیخ جو اس نے شاہ بانو کیس میں جو اس نے ۲۳ر اپریل ۱۹۸۵ء کو دیا تھا، ۵ر مئی ۱۹۸٦ء کو پارلیمنٹ سے نئے مسلم مطلقہ بل کا متفقہ طور پر پاس ہونا، اس کے ذریعہ مسلم مطلقہ قانون کے بارے میں اس قانون وتعامل کا باقی رہنا جو سپریم کورٹ کے فیصلہ سے پہلے رائج اور معمول بہ تھا، اکثریت کے رہنماؤں، فرقہ پرست جماعتوں اور انگریزی، ہندی پریس کو جب معلوم ہوا کہ مسلمان سپریم کورٹ کے فیصلہ کو بدلوانا چاہتے ہیں، اور اپنے قدیم شرعی قانون کو باقی رکھنا چاہتے ہیں تو انھوں نے اس کو قومی وقار کا مسئلہ بنالیا، اور مسلمانوں کے اس مطالبہ کے خلاف ایسے شدید ردعمل کا اظہار کیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کے منسوخ ہوجانے اور مسلمانوں کو اپنی شریعت پر عمل کرنے کی آزادی سے ملک پر کوئی بجلی گر جائے گی، یا کوئی بیرونی طاقت حملہ کرنے والی ہے، اس تحریک کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم ہوگیا، اور ایسا نظر آنے لگا کہ اس صورتِ حال میں تبدیلی ناممکن ہے، لیکن عاقلانہ اور متوازن قیادت اور مسلمانوں کے اتفاق رائے سے ۵ر مئی ۱۹۸٦ء کو مسلم مطلقہ بل کی پارلیمنٹ میں منظوری عمل میں آئی، آنجہانی وزیراعظم راجیو گاندھی جی کے مسلم خاتون کے بارے میں اسلام کے منصفانہ اور

فراخ دلانہ قوانین اور عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے بارے میں واضح بیانات، پھر خود مسلمانوں میں اصلاح معاشرہ کی ہمہ گیر تحریک اور تعمیری، اصلاحی وفکری و عملی جدوجہد اور اس کے اثرات، پرسنل لا بورڈ کے وہ عظیم الشان جلسے جو بمبئی، کلکتہ، بنگلور، رانچی، حیدرآباد اور کانپور میں ہوئے اور جن کی (حاضرین کی تعداد ان کے تاثر سے اور ان کی سنجیدگی اور مقصدیت کے غلبہ میں) ہندوستان کی قریبی تاریخ میں نظیر ملنی مشکل ہے، اس پورے سلسلہ کی کامیابی اور اس کے دور رس اثرات جو عرصہ سے کسی تحریک میں دیکھنے میں نہیں آئے تھے، مولانا کے تعمیری ذہن، حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر، دماغی توازن اور مقصد سے اتفاق رکھنے والے تمام عناصر سے مخلصانہ تعاون، ان کی قدردانی، ان سے کام لینے کی صلاحیت اور ان کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے اور ان کے حسب مرتبہ سلوک و معاملہ کرنے کی فکری و مزاجی قابلیت کا بھی بڑا دخل ہے، اب یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' جس طرح ملت اسلامیہ۔ ہندیہ کا متفقہ پلیٹ فارم اور اجتماعی نمائندہ ہے ویسا ہندوستان میں کوئی دوسرا ملی و مذہبی بلکہ سیاسی پلیٹ فارم بھی نہیں ہے۔''

امیر شریعت کی یہ تمنا بھی اللہ تعالیٰ نے پوری کرادی کہ اسلامی اور شرعی قوانین کی تدوین اردو زبان میں ہوجائے تاکہ مسلم معاشرہ کو شرعی قوانین پر عمل کرنے کی ہر طرح آسانی حاصل ہو اور وہ مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے مختلف اداروں اور فقہی شخصیات سے بار بار ملنے اور فتویٰ معلوم کرنے کی زحمت سے بچ جائیں اور کم سے کم وقت میں وہ مسائل کو سمجھ لیں۔

اس کام کے لیے مولانا نے شرعی قانون کے ماہرین اور علماء کی ایک جماعت کو متعین فرمایا اور ان کی سرپرستی میں یہ کام شروع ہوا۔ اس کا مسودہ آپ کی حیات ہی میں مکمل ہوگیا تھا، اس پر نظر ثانی کرنے اور انگریزی داں ماہرینِ قانون کی اس پر آخری نظر پڑنے کے بعد یہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر تمام مراکز اور اداروں میں پہنچ چکی ہے۔

امیر شریعت کو اللہ تعالیٰ نے تفقہ فی الدین کا عملی ذوق عطا فرمایا تھا۔ حالات سے آگہی، تاریخ عالم پر گہری نظر ملک کے قوانین اور آئین ہند کے جملہ دفعات سے پوری واقفیت اور امت کے ساتھ پیش آنے والے واقعات اور اس کو صراطِ مستقیم سے ہٹانے کی سازشیں، یہ ساری باتیں آپ کے پیشِ نظر ہوا کرتی تھیں، آپ نے مسلم پرسنل لا بورڈ کے امین عام کی حیثیت سے اس کے نشیب وفراز، اس کی ضرورت وخدمات نیز موجودہ درپیش مسائل پر نہایت پر مغز مضامین تحریر فرمائے۔ یہ رسالے نہایت قیمتی اور معلومات افزا ہیں اور ان مسائل کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہیں اور ان کی ایک دستاویزی حیثیت ہے۔

اس رسالہ کے ناشر فرید بک ڈپو دہلی کے مینیجنگ ڈائرکٹر جناب ناصر خاں نے امیرِ شریعت کے بارے میں کتنی متوازن بات تحریر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''حضرت امیرِ شریعت مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ (بانی و جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) ان صاحبِ بصیرت علمائے کرام میں بڑا امتاز مقام رکھتے ہیں، جنھوں نے دین وشریعت کے خلاف کی جانے والی سازشوں کو بہت پہلے سمجھا، اور ان سازشوں کے خلاف سینہ سپر ہوئے۔ انھوں نے حکمت و تدبر، فراست وبصیرت سے کام لیتے ہوئے مسلم پرسنل لا کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا اور نہ صرف تحفظِ شریعت کی تحریک کو پورے ملک میں پہنچایا اور امت کے دلوں میں اتار دیا، بلکہ انھوں نے اتحادِ ملت کا عملی سبق دیا اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے پلیٹ فارم پر ہر طبقہ اور فرقہ کے مسلمانوں کو جمع کر کے ایک خواب کو حقیقت میں بدل دیا۔
>
> ان کی دور بیں نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ آنے والے دنوں میں مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لیے سازشوں کا سلسلہ جاری رہے گا، اور قانونِ شریعت کے بارے میں مسئلے پھر کھڑے کئے جائیں گے، مسلم پرسنل لا میں ترمیم کی سازش رچی جائے گی، اس لیے انھوں نے علمائے کرام اور رہنمایانِ ملت کو ساتھ لے کر نہ صرف آل

انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ قائم کیا، اسے مستحکم کیا، بلکہ اپنی تحریروں، رسالوں، مضامین اور کتاب کی شکل میں امت مسلمہ کو علمی اور فکری غذا بھی فراہم کی۔''

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، ناظم ندوۃ العلماء نے امیر شریعت کی وفات کے موقع پر اپنے مضمون میں لکھا تھا:

''مولانا رحمانی کا شمار مسلمان ملی قائدین میں صرف دو تین چوٹی کے افراد میں ہوتا تھا، ہر اہم موقع پر ان کی دوراندیشی اور ان کے علم سے ملت کو مدد ملتی تھی، افسوس ہے کہ ملت اسلامیہ ہندیہ اپنے اس عظیم فرزند سے محروم ہوگئی اور اس کے لیے مولانا کی وفات موت العَالِم موت العَالَم کا صحیح مصداق بن گئی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ملت کے اس عظیم خسارہ میں اس کی مدد فرمائے، اور بدل عطا فرمائے اور مولانا مرحوم کو اپنے خاص قرب سے نوازے، مولانا کی وفات ۳ر رمضان ۱۴۱۱ھ ۲۰ر مارچ ۱۹۹۱ء کو صلاۃ تراویح ادا کرتے ہوئے پیش آئی، اس سے بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا جو مقام ہوگا اس کا اندازہ ہوتا ہے۔''

اخیر میں ایک حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کو تفقہ فی الدین کی نعمت سے سرفراز فرمایا تھا اور ان کو اس کا بڑا حصہ اور ذوق عطا فرمایا تھا، اور وہ (من یرد اللّٰہ بہ خیرا یفقهه فی الدین) کا مصداق کامل تھے، اور اب مولانا کے خلف صالح جناب مولانا محمد ولی رحمانی صاحب اپنے والد معظم کے نقش قدم پر چل کر ملت کی پاسبانی اور امت کی رہنمائی کا فرض انجام دے رہے ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی عمر اور کاموں میں زیادہ سے زیادہ برکت عطا فرمائیں، اور ان کی کوششوں کو سعی مشکور کا درجہ مرحمت فرمائیں۔ وما ذلك على اللّٰه بعزيز

⊙⊙⊙

مولانا بدرالحسن القاسمی ☆

مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ
شخصیت اور کارنامے

ایک خاص پس منظر میں نبی اکرم ﷺ نے ایک دن اپنا ایک خواب بیان فرمایا اور اپنے بعد آنے والے خلفاء کی الگ الگ خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت عمر بن الخطابؓ کی غیر معمولی فطری لیاقت اور کارہائے نمایاں انجام دینے کی صلاحیت کی طرف اشارہ ان لفظوں میں فرمایا:

فلم ار عبقريا يفرى فريه

''ایسا غیر معمولی انسان میں نے نہیں دیکھا جو ان کے جیسا کام انجام دے سکے۔''

حضرت مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کا نام آتے ہی نہ جانے کیوں میرے ذہن ودماغ میں یہ جملہ گردش کرنے لگتا ہے اور ایک طرح کا داخلی موازنہ دل ہی دل میں شروع ہو جاتا ہے کہ ان کے معاصرین میں بہت سی نامور شخصیتیں تھیں، جن میں عالمی شہرت رکھنے والے لوگ بھی تھے، ارباب درس وافتاء بھی تھے، دسیوں کتابوں کے مصنفین بھی تھے لیکن وہ بات جو مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت میں تھی وہ کسی اور میں نظر نہیں آتی تھی، کہیں علم تھا تو عزیمت نہ تھی۔ کہیں ہمت تھی تو دور بینی کی کمی تھی۔ کہیں معاملہ فہمی تھی تو جرأت وبیبا کی کا فقدان تھا

☆ مقیم حال کویت

اس لیے سکھوں کی اپنے اپنے دائرۂ کار میں خواہ کتنی ہی اہمیت کیوں نہ رہی ہو ملت کی بے لوث خدمت اور قوم کی مؤثر قیادت کے لیے اگر کوئی شخص پورے طور پر موزوں تھا تو وہ رب کائنات کی قدرتِ خاص کی نشانی مولانا سید منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ ہی تھے جن کو اللہ نے علم وفضل کے ساتھ پہاڑوں جیسی عزیمت دی تھی اور معاملہ فہمی و دور اندیشی کے ساتھ غیر معمولی جرأت و بے باکی کے اوصاف بھی عطا کیے تھے۔

مولانا سید منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے آخری چشم وچراغ تھے اور مولانا محمد علی مونگیریؒ نادرۂ روزگار شخصیتوں میں سے تھے، جن کو اللہ نے غیر معمولی علم کے ساتھ بے پناہ تقویٰ وطہارت سے بھی نوازا تھا اور وہ خالص قدیم طرز کی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود قدیم اور جدید کے تقاضوں کے بارے میں نہایت ہی متوازن ذہن وفکر کے حامل تھے۔ ایک طرف وہ مسند خانقاہ کی زینت اور مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی خلافت سے سرفراز تھے تو دوسری طرف تعلیمی نظام میں تبدیلی کے خواہاں اور ندوۃ العلماء جیسے ادارے کے بانی اور تحریک کے روحِ رواں بھی تھے اور اسلام کی حقانیت ثابت کرنے اور مسیحیت اور قادیانیت کے فتنہ کے سد باب کے لیے انھوں نے سینکڑوں مقالات لکھے تھے اور درجنوں کتابیں بھی تصنیف کی تھیں۔

اس طرح مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے لیے خانوادۂ نبوی ﷺ سے نسبی رشتہ کے ساتھ علم وفضل اور رشد وہدایت کا منصب موروثی تھا۔ ذہانت وعبقریت کے آثار بچپن سے نمایاں تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں ہوئی۔ اپنے والد بزرگوار کے علاوہ مولانا عبدالصمد رحمانی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی انھوں نے کسب فیض کیا پھر اپنے وقت کے نامور مدرس مولانا مفتی عبداللطیف رحمانی (سابق صدر شعبہ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی) کے پاس حیدرآباد بھیج دیے گئے۔ ایک سال وہاں رہنے کے بعد ندوہ میں علم حاصل کرنا شروع کیا۔ وہ چار سال تک ندوے میں زیر تعلیم رہے۔ ۱۹۲۹ء میں پورے اہلِ خانہ کے ساتھ سفر حج پر روانہ ہوگئے۔ کچھ دنوں ''الجامعۃ'' کے مدیر رہے۔ پھر درسیات کی تکمیل کے لیے دیوبند بھیج دیے گئے اور چار سال وہاں بھی گزارے۔

مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تعمیر میں ''فیضان نظر'' اور ''مکتب کی کرامت'' دونوں ہی چیزیں شامل تھیں۔ چناں چہ ایک طرف ان کی پرورش و پرداخت حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ جیسے ولی کامل کی گود میں ہوئی تو دوسری طرف ان کو حیدرآباد سے لے کر ندوۃ العلماء اور دارالعلوم دیوبند تک ہر جگہ نامور اساتذہ ملے، ندوۃ العلماء میں مولانا حیدر حسن خاں اور مولانا شبلی متکلم وغیرہ سے فیض پایا تو دیوبند میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا میاں اصغر حسین صاحب، مولانا اعزاز علی صاحبؒ، مفتی محمد شفیع صاحب اور علامہ محمد ابراہیم بلیاوی رحمہم اللہ جیسے آسمان علم کے آفتاب و ماہ تاب سے ان کو کسب فیض کا موقع ملا۔

تعلیمی زندگی میں ہی ان کو سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا موقع ملا اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ ۱۹۳۳ء میں دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد پورے طور پر عملی زندگی میں شریک ہو گئے اور ۱۹۳۴ء میں وطن لوٹے ہی تھے کہ بہار میں قیامت خیز زلزلہ آیا اور لاکھوں افراد اس ہولناک زلزلہ کی نذر ہو گئے اور مولانا کو سب کام چھوڑ کر ریلیف کے کام میں لگ جانا پڑا، جو مہینوں جاری رہا۔ اس زمانہ میں خانقاہ رحمانی ریلیف کے کاموں کا مرکز تھی۔ پھر ۱۹۳۵ء میں آپ کو جمعیۃ علماء بہار کا ناظم اعلیٰ منتخب کیا گیا اور مولانا محمد سجادؒ کے مشورے سے آپ مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کے ٹکٹ پر اسمبلی کے لیے کھڑے ہوئے اور شاندار کامیابی حاصل کی انھوں نے اسمبلی میں بھی اپنی قابلیت کا لوہا منوالیا۔ اسمبلی میں متعدد اہم مسائل اٹھائے اور مسلمانوں کی طرف سے بھرپور وکالت کی۔ ۱۹۴۲ء میں آپ کو خانقاہ رحمانی مونگیر کا سجادہ نشیں اور ۱۹۵۷ء میں امیر شریعت منتخب کیا گیا۔ آپ نے ذمہ داری سنبھالتے ہی امارت کے ہر شعبہ کو منظم کیا، دارالقضاء کے کام کو وسعت دی۔ بیت المال کو مستحکم کیا، دارالافتاء کے نظام میں باقاعدگی پیدا کی۔ قاضیوں کی تربیت کا نظم کیا اور قاضیوں کی ہدایت کے لیے بنیادی کتابیں تیار کرائیں۔ ۱۹۶۴ء میں مصر کی حکومت کی دعوت پر قاہرہ کی اسلامی کانفرنس میں شرکت کی اور ۱۹۶۵ء میں آپ نے رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کی اس کے بعد عراق، اردن اور لبنان وغیرہ کا دورہ بھی کیا۔

آپ دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء اور دیگر دینی اداروں کے رکن شوریٰ یا مجلس انتظامی منتخب ہوئے اور ہر جگہ اپنی قابلیت کے جوہر دکھلائے۔ وقت کے ساتھ ساتھ آپ کی خدمات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا چلا گیا۔

مولانا منت اللہ رحمانی نے اپنی تعلیمی زندگی میں چوں کہ ندوۃ العلماء اور دارالعلوم دیوبند دونوں ہی اداروں سے خوشہ چینی کی تھی اس لیے قدرتی طور پر ان میں دونوں طرح کے رجحانات اور دونوں مکاتب فکر کی خصوصیات پیدا ہوئیں پھر انھوں نے سیاست کی پرخار وادی میں قدم رکھا اور قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں اس کے علاوہ انھوں نے انگریزی زبان سیکھی، ایوان حکومت میں شرکت کا بھی تجربہ کیا اس کے بعد ان کو حضرت مولانا محمد سجادؒ جیسا بے نفس لیکن انقلابی، خاموش لیکن عالی دماغ، تواضع کا پیکر لیکن غیرتِ ایمانی سے سرشار، عالم دین اور فقیہ النفس لیکن زمانہ کے حالات سے باخبر اور قانونی دماغ رکھنے والے رہنما کی صحبت بھی ملی۔ چناں چہ ان کی ذات ان تمام خصوصیات کی حامل ہونے کی وجہ سے اپنے انداز کی نرالی اور منفرد شخصیت اور ایسے قائد کی شکل میں سامنے آئی، جس میں ہر چمن کی خوشبو شامل ہونے کے باوجود اس کی الگ خوشبو، الگ انداز اور اپنا الگ طریقہ وآہنگ تھا۔

مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کی حق گوئی کسی وقتی تأثر یا ہنگامی صورتِ حال کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ شروع سے ہی وہ حق بات کہنے کے خوگر اور بے خوف وخطر مسلمانوں کے حق کے لیے لڑنے کا جذبہ رکھتے تھے۔

۱۹۳۷ء میں حکومت بہار کے وقف کی جائیداد پر ٹیکس لگانے سے متعلق بل کے خلاف مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کی مفصل و مدلل تقریر اور ۱۹۳۸ء میں گائے کی قربانی کے مسئلہ پر بہار اسمبلی میں کی جانے والی تقریر کو اگر دیکھا جائے تو وہاں بھی ان کی شخصیت اسی طرح نمایاں نظر آتی ہے، جس طرح آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس میں کی جانے والی تقریروں میں ہے۔ وہاں بھی ان کی غیرتِ ایمانی اور استدلال کی قوت اپنی پوری شان بان سے نظر آتی ہے۔ اسلامی شریعت میں مداخلت خواہ غلام ہندوستان میں ہوئی ہو یا آزاد

ہندوستان میں، مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ اس کی مخالفت کے لیے دونوں ہی جگہ سیف برہنہ نظر آتے ہیں۔

آزاد ہندوستان میں مراد آباد اور بھاگل پور وغیرہ کے فسادات پر بھی مولانا کا ردعمل عام لیڈروں کی طرح نہ نارو ا توجیہ وتاویل والا ہوتا تھا اور نہ مسلمانوں میں بیجا خوف و ہراس پھیلانے والا۔ بلکہ انھوں نے کھل کر ان تمام فسادات کی ذمے داری پولیس اور سرکاری مشنری پر ڈالی اور مسلمانوں کو اپنی جان کی طرف سے دفاع پر ابھارا اور ان کی ایمانی غیرت کو للکارا۔

مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کارناموں سے بھرپور رہی ہے اور ان کی زندگی کا ہر کارنامہ اس قابل ہے کہ اس کا باقاعدہ جائزہ لیا جائے اور اسے آنے والی نسلوں کے سامنے قابل تقلید نمونے کے طور پر پیش کیا جائے۔

ان کی خدمات کا دائرہ فتویٰ نویسی، صحافت، سیاست اور بیعت وارشاد سے لے کر پوری قوم کی رہنمائی اور قیادت تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ بیک وقت ایک نامور عالم دین ایک بلند پایہ پیرومرشد سے لے کر ایک عالی دماغ دینی وسیاسی رہ نما بھی کچھ تھے۔ اور ان کی روزمرہ کی زندگی بیعت وارشاد، دینی اداروں کی سرپرستی، ملی مسائل کے حل اور سیاسی پیچیدگیوں کو سلجھانے میں صرف ہوا کرتی تھی اور ان کی مجلس میں بیٹھنے والے کو نمایاں طور پر یہ بات محسوس ہوتی تھی کہ وہ کئی دماغوں کے ایک انسان ہیں اور اللہ نے ان کو ملت کی، کئی راستوں سے خدمت کی توفیق بخشی ہے۔ جامعہ رحمانی ان کی توجہ کا مرکز تھا تو خانقاہ رحمانی ان کی جلوہ گاہ۔ وہ کبھی دیوبند اور لکھنؤ میں دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء کے مسائل حل کرتے نظر آتے تھے تو کبھی دہلی، بمبئی، حیدرآباد اور بھوپال میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے جلسوں کی زینت اور سبھوں کی توجہ کا مرکز ہوا کرتے تھے، راوڑکیلا، جمشید پور، مرادآباد اور بھاگلپور کے فسادات پر کبھی وہ خون کے آنسو بہاتے نظر آتے تھے تو کبھی جبری نسبندی، متبنیٰ بل اور یکساں سول کوڈ کا مسئلہ ان کی نیند حرام کیے رہتا تھا اور جب تک اپنی مکمل کوشش کر نہیں لیتے ان کو سکون نہیں ملا کرتا۔

ان کے یہ سارے کارنامے ایسے ہیں جن پر مفصل کتابیں لکھنے اور ان کی زندگی کے

مختلف پہلو اُمت کے سامنے لانے کی کوشش کی جانی چاہیے۔خوشی کی بات ہے کہ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند نے دہلی میں مولانا منت اللہ رحمانی کی شخصیت اور کارناموں پر سمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور یقیناً مختلف اربابِ قلم اس موقع پر مولانا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے۔

مجھے اس سمینار کی اطلاع صرف چند دنوں پہلے ایک مخلص کے ٹیلی فون سے ہوئی اس لیے اس وقت مولانا مرحوم کے شایانِ شان کوئی تحریر لکھنے کا تو موقع نہیں رہا البتہ ان کے اعمال جلیلہ کے صرف دو شاہ کار کی طرف توجہ دلاؤں گا ایک مولانا کی ذات بحیثیت امیر شریعت اور دوسرے مولانا کی ذات بحیثیت بانی مسلم پرسنل لا بورڈ۔

مولانا منت اللہ رحمانی ملت کے اُن باعزیمت قائدین میں سے تھے، جن کا نام ہی کسی تحریک کی کامیابی اور کسی ادارے کی عظمت کا ضامن ہو۔ وہ ''امیر شریعت'' تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ لقب ان کو ہی جچتا ہے اور یہ منصب ان ہی کے لیے وجود میں آیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ امیر شریعت رابع کا زمانہ امارتِ شرعیہ کی تاریخ میں ہر لحاظ سے عہد زریں کہلانے کا مستحق ہے۔ چناں چہ حضرت مولانا سجادؒ نے جس مقصد کے لیے اس البیلے نظام کی بنیاد رکھی تھی اور جس دور اندیشی کے ساتھ مسلمانوں کے تشخص کو ایک ایسے ملک میں محفوظ رکھنے کا انتظام کیا تھا، جس میں ہر دین و مذہب کے لوگ بستے ہیں اور جہاں مسلمانوں کو اقلیت میں رہ کر بھی اپنا وجود برقرار رکھنا اور اپنے دین و مذہب کی حفاظت کرنی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کھوکھلے نعروں اور اوہام وخیالات کی دنیا میں خواہ دین کی اقامت اور شریعت کی خدمت کا جو بھی تصور قائم کر لیا جائے، آج بھی پوری دنیا میں مسلمان اقلیتوں کے لیے اس سے بہتر کوئی نظام سامنے نہیں آیا ہے جو امارتِ شرعیہ پیش کرتی ہے، بلکہ آج تو بیشتر مسلم ممالک میں بھی پرسنل قوانین یعنی نکاح و طلاق اور وقف و میراث وغیرہ سے زیادہ حصہ پر مسلمانوں کو عمل کرنے کا موقع میسر نہیں ہے اور کئی ایسے مسلم ممالک بھی ہیں جہاں اس دائرہ میں بھی آزادی سے لوگ محروم ہیں۔

مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کو جب امیر شریعت رابع کی حیثیت سے منتخب کیا گیا تھا اس وقت امارت شرعیہ کے پاس تو بانی امارتِ شرعیہ اور بیشتر امراء کے جذبۂ اخلاص کے علاوہ کوئی سرمایہ نہیں تھا۔ آفس بھی ایک ایسی تنگ و تاریک گلی کے ایک کمرہ میں واقع تھا جہاں پہنچنا ہر موسم میں آسان نہیں تھا۔ مولانا رحمانی نے ذمے داری قبول کرتے ہی امارتِ شرعیہ کے لیے دفتر کی عمارت حاصل کی، اس کے بیت المال، دارالقضاء، نظام افتاء سبھوں میں باقاعدگی اور وسعت پیدا کی، داعیوں اور نقباء کو سرگرم بنا کر عوامی رابطہ کو مستحکم کیا اور ''امارتِ شرعیہ'' کے عنوان اور نظام کو ملک کے دوسرے صوبوں تک عام کیا اور پھر وہ وقت بھی آیا جب انھوں نے لبِ سڑک ایک کشادہ اراضی کا انتظام کر کے امارتِ شرعیہ کے شایانِ شان کمپلیکس تعمیر کرایا، ہاسپٹل اور ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ قائم کیے اور امارت اتنا مستحکم کر دیا کہ اپنے بعد آنے والوں کے لیے ترقی کی راہیں تلاش کرنے اور اس کے کاز کو مستحکم بنانے کے لیے کسی نئی منصوبہ بندی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ چناں چہ آپ کے جانشینوں حضرت مولانا نظام الدین صاحب اور حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ جو دونوں درحقیقت آپ ہی کے پروردہ اور آپ کے زیر سایہ کام کرنے کا طویل تجربہ رکھتے تھے انھوں نے مولانا رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد اس امانت کی نہ صرف حفاظت کی بلکہ مولانا ہی کے خطوط پر اس کے دائرۂ کار کو مزید وسعت دی۔ معہد العالی للقضاء والافتاء وجود میں آیا، ٹیکنیکل تعلیم کے اداروں میں وسعت پیدا ہوئی۔ ہاسپٹل کے نئے شعبے قائم ہوئے اور اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس نظام میں اضمحلال نہ آئے اور امارتِ شرعیہ کو جو عوامی اعتماد حاصل ہے وہ برقرار رہے۔

مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا دوسرا اہم کارنامہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام اور ہر مکتبِ فکر کے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا انتہائی کامیاب تجربہ ہے۔ مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ اس بورڈ کے بانی اور روح رواں تھے اس کا ذکر و اعتراف بورڈ کے دوسرے صدر مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی کئی تحریروں میں کیا ہے اور یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ مولانا رحمانی گو کہ ساری عمر بورڈ کے جنرل سکریٹری ہی رہے لیکن نہ

بورڈ کا تصور ان کے بغیر ممکن تھا اور نہ بورڈ کے اجلاس ان کے بغیر مؤثر اور بارونق ہوا کرتے تھے۔

دراصل وہ ان شخصیات میں سے تھے جن کے نام سے اور جن کے دم سے ادارے وجود میں آیا کرتے اور پروان چڑھا کرتے ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جن کو اداروں کی نسبت سے بڑائی اور عظمت حاصل ہوا کرتی ہے۔ جب تک مولانا رحمانی رحمۃ اللہ علیہ زندہ رہے، بورڈ مسلمانوں کا ایک معتبر پلیٹ فارم رہا اور ان کی کوشش رہی کہ اس میں پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی واقعی نمائندگی ہو اور ہر علاقہ کی نمائندہ شخصیتوں کے ذریعے ہی ہو اور بورڈ کے پہلے صدر حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اور دوسرے صدر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحبؒ دونوں کو اس سلسلہ میں بے فکری تھی کہ مولانا منت اللہ رحمانی کی سیاسی و ملی مسائل میں غیر معمولی بصیرت اور ان کے نفس ناطقہ مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی فقہی سوجھ بوجھ اور پیش آمدہ مسائل پر مکمل طور پر حاوی ہو کر بولنے کی ادا ایسی ہے جس سے بورڈ اپنے مشن میں کامیابی کی راہ پر گامزن رہے گا اور سرکاری حلقہ کو بھی کوئی قدم اٹھانے سے پہلے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی طاقت وقوت کا خیال رکھنا پڑے گا۔

مولانا نے نہایت ہی بصیرت سے بورڈ کی قیادت فرمائی اور ملک کے نامور علماء، دانشوروں اور ماہر قانون دانوں کی بے لوث خدمات ان کو حاصل ہو گئیں بلکہ انھوں نے اپنے حکیمانہ انداز اور بے لوث جذبۂ خدمت سے ان قانون دانوں کو بھی بورڈ کا حامی بنا لیا جو کبھی حکومت کے ترجمان اور بورڈ کے خلاف نظریات کے حامل ہوا کرتے تھے۔

مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ نے مسلم پرسنل لا بورڈ کو ایسا باوقار، با اعتبار ادارہ بنا دیا تھا کہ ہر حلقہ کا مسلمان اس میں اپنی قوت محسوس کرنے لگا تھا۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ یہ کارنامہ انھوں نے اس طرح انجام دیا کہ بورڈ کا کوئی باقاعدہ اور مستقل آفس دہلی میں نہیں تھا۔ خانقاہ رحمانی مونگیر سے سائیکلو اسٹائل شدہ معمولی سے پیپر پر بھیجے جانے والے دعوت ناموں میں یہ تاثیر تھی کہ ساری ملت کے نمائندے یکجا ہو جایا کرتے تھے۔ اور پورے جوش و جذبہ کے ساتھ

ہر پیش آمدہ مسئلہ کے قانونی حل کے لیے اپنی ہر طرح کی خدمات پیش کرنے کے لیے تیار ہو جایا کرتے تھے۔

مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بورڈ کے اسٹیج پر جب حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے صدر حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے صدر شعبہ دینیات و ایڈیٹر ماہنامہ برہان مولانا سعید احمد اکبر آبادی، ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، حکیم محمد زماں الحسینی، کرناٹک کے امیر شریعت حضرت مولانا ابوالسعود اور حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ وغیرہ ایک صف میں اور بڑے بڑے بیرسٹروں اور وکیلوں اور قانون دانوں کی جماعت دوسری صف میں ہوا کرتی تھی تو بورڈ کے جلسوں کی شان ہی کچھ اور ہوا کرتی تھی، اور عین اس زمانے میں جب کہ ملک میں ایمرجنسی نافذ تھی اور ملک کی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے اپنے چھوٹے صاحبزادے کو خدائی قہر کی طرح ملک پر مسلط کر دیا تھا اور خاص طور پر مسلمانوں کے خلاف ظلم و زیادتی اور جبری نسبندی نے ہر طرف خوف و ہراس کا ماحول پیدا کر رکھا تھا۔ ان حالات میں دارالحکومت دہلی میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ کا اجلاس بلانا اور شرعی حکم بیان کرنا اور نسبندی کے خلاف قرارداد منظور کرانا یہ مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ ہی کے بس کا کام تھا اور اس مرد مجاہد نے یہ کام کر کے حق گوئی و عزیمت کی مثال قائم کر دی۔ اس اجلاس میں حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اور دیگر اکابر کو بھی آنکھوں نے دیکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبروں کو نور سے بھر دے۔ اس وقت کوئی اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ بورڈ میں کبھی ایسا اضمحلال بھی آئے گا کہ ہر مکتب فکر کی طرف سے نئے نئے بورڈ کی تشکیل کی صدا آنے لگے گی اور ٹیلی ویژن پروگراموں میں بورڈ کے کاز کی ایسی کمزور ترجمانی کی جانے لگے گی کہ سننے والوں کو شرمندگی محسوس ہو۔

مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے ایک طرف بورڈ کے قیام کے پیچھے جو مقاصد تھے ان کو بروئے کار لانے کے لیے وسائل کی کمی کے باوجود عملی جدوجہد کا سلسلہ جاری رکھا تو دوسری طرف

بورڈ کے استحکام اور درپیش مسائل کو قوم کے سامنے صحیح شکل میں رکھنے اور مسئلہ کی نزاکت کا لوگوں کو احساس دلانے کے لیے مسلم پرسنل لا، متبنی بل، یونیفارم سول کوڈ، خاندانی منصوبہ بندی وغیرہ کے عنوان سے نہایت ہی مفید، رسائل تصنیف فرما کر فکری لٹریچر بھی فراہم کر دیا جو آج بھی مسلم پرسنل لا کے مسائل کو سمجھنے کا واحد ذریعہ ہے۔

مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کا ذہن فطری طور پر تعمیری اور مثبت تھا چناں چہ انھوں نے معاملہ کو نعرہ بازیوں اور احتجاجی جلسوں پر منحصر رکھ کر سستی شہرت کمانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ٹھوس کام انجام دیے۔ چناں چہ ''مجموعہ قوانین اسلامی'' کے نام سے مسلمانوں کے پرسنل لا کو قابل اعتماد طریقہ پر مدون کرانے کا سہرا بھی حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے سر جاتا ہے کہ ان کی سرپرستی اور نگرانی میں ہی مستند علمائے کرام کے ہاتھوں یہ کام انجام پایا جو اسلامی ملکوں میں اور خاص طور پر مصر و شام اور دوسرے عرب ملکوں میں انجام پانے والے اس سلسلہ کے کام سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

آج جب کہ کئی سالوں کی تاخیر اور انتظار کے بعد مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر سمینار کا انعقاد عمل میں آ رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کو از سر نو متحرک اور فعال بنایا جائے کیوں کہ آج ہندوستان کے مسلمانوں کو درپیش چیلنج اس سے کہیں زیادہ سنگین ہیں جو مولانا مرحوم کی زندگی میں تھے، اور یہ کام محض اپنے حلقہ، علاقہ اور جماعت کے لوگوں کو بورڈ کی عمومی یا عاملہ کی رکنیت دے کر نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ضرورت ایسے لوگوں کے انتخاب کی ہے جن میں بورڈ کی ترجمانی کی اہلیت بھی ہو اور ملت کی بے لوث خدمت کا جذبہ بھی اور ہر کس و ناکس کی طرف سے بورڈ کے کاز کی میڈیا میں ناقص ترجمانی کا سلسلہ بند کرایا جائے تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں اس کی ایسی بے وقعتی نہ ہو کہ ہر گھر سے ایک علاحدہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کی صدا بلند ہونے لگے بلکہ جس طرح تیز رو اور زود اثر حربے استعمال کر کے باطل قوتیں اپنے مقاصد کو بروئے کار لا رہی ہیں۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کو بھی جدید وسائل سے آراستہ اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر ان کا

مقابلہ کرنا چاہئے۔

مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ یقیناً امت کے ایک بے لوث خادم، ملت کے بے مثال رہنما اور مسلمانوں کے ایک بطل جلیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا کو خراج عقیدت پیش کرنے کا میری نظر میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ:

۱- پٹنہ اور مونگیر میں ان کی طرف نسبت کے بعض اداروں کے ہونے کے باوجود دارالحکومت دہلی میں بھی مولانا کے نام پر ایک تحقیقی ادارہ قائم کیا جائے۔

۲- مولانا رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کے تمام کتابچوں اور خطبات کے مجموعوں کو موجودہ زمانے کے معیار وانداز پر ایک سلسلہ کے طور پر شائع کیا جائے۔

۳- آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے سلسلہ میں مولانا کی خدمات کو ایک علیحدہ وثیقہ کے طور پر مرتب کیا جائے۔

۴- مولانا کی ایک مبسوط ومفصل سوانح حیات تیار کرائی جائے، جس میں ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو سمیٹنے کی کوشش کی جائے اور ان کے معاصرین کے ساتھ اپ کی شخصیت کا موازنہ بھی کیا جائے۔

۵- علم من أعلام الهند یا کسی اور عنوان سے عربی میں بھی ان کا ایک مختصر تذکرۂ حیات شائع کیا جائے۔

۶- مسلم پرسنل لا بورڈ کو خاص طور پر مزید متحرک اور فعال بنایا جائے۔

۷- انھوں نے جو یادگار ادارے چھوڑے ہیں، ان کی تقویت کی بھرپور کوشش کی جائے اور یہ نہ فراموش کیا جائے کہ

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے

۱۰، ۱۱ سال کی عمر میں احقر نے پہلی بار مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ کو دیکھا تھا جب جامعہ رحمانی میں تعلیم کی غرض سے میری حاضری ہوئی تھی، ان کی وجیہ اور بارعب شخصیت کا جو نقش اس وقت قائم ہوا تھا وہ اب تک برقرار ہے۔ دیوبند کی تعلیم کے زمانہ میں تعارف ہوا اور

ان کی عظمت کے احساس اور ان کی ذات سے عقیدت میں اضافہ ہی ہوتا رہا ہے اور قریب سے دیکھنے کے بعد ان کی شخصیت کے جوہر جوں جوں کھلتے گئے یہ احساس بڑھتا ہی گیا کہ نہ حق گوئی و بیباکی میں ان کا کوئی بدیل ہے اور نہ ملت کی بے لوث اور صحیح قیادت میں ان کا کوئی شریک و سہیم۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور ان کی گراں قدر خدمات کو قبولیت بخشے۔ آمین

مولانا عبدالحفیظ رحمانی ☆

امیر شریعت
حضرت مولانا منت اللہ رحمانی نور اللہ مرقدہ
کے مجاہدانہ کارنامے

اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا میں بہت سی خوبیاں جمع کردی تھیں۔ وہ ایک جامع الصفات شخصیت کے حامل تھے، بیک وقت مولانا رحمانیؒ ممتاز عالم دین، دیدہ ور مصنف، بلند پایہ خطیب، صف اول کے مدبر و مفکر، صاحب زہد وتقویٰ اور حوصلہ مند مجاہد تھے، آپ کے والد گرامی شیخ وقت حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کی نظر کیمیا اثر نے صفائے قلب ونظر کی دولت بے بہا سے نوازا تو دارالعلوم ندوۃ العلماء نے وسعت فکر ونظر اور زبان و بیان کی خوبیوں سے مالا مال کردیا، تزکیہ نفس، علم وفراست اور باطل قوتوں کا مقابلہ موروثی تھا، اسی طرح انگریز دشمنی وراثت میں ملی تھی، حصول علم کے لیے دارالعلوم دیوبند میں قدم رکھا تو اس کے درودیوار سے انگریز دشمنی کے شعلے نکل رہے تھے، حوصلہ مند طبیعت نے جہاد حریت کا استقبال کیا، زمانہ طالب علمی کا تھا، لیکن استخلاص وطن کی تحریک میں شمولیت کے لیے طالب علمی رکاوٹ نہ بن سکی، آگے بڑھے اور قید وبند کی صعوبتوں کو خندہ جبینی سے قبول کیا۔

☆ سابق محقق شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند

فرنگی قید خانہ سے رہائی ہوئی تو پھر دارالعلوم دیوبند واپس آئے اور فراغت حاصل کی، لیکن سہارن پور جیل میں جو مستی کردار پیدا ہوئی تھی اس نے چین سے نہیں بیٹھنے دیا، اپنے استاذ گرامی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے نقوش عمل اور آزادی وطن کی تگ ودو کو حرز جان بنالیا۔ سچ تو یہ ہے کہ مولانا مرحوم نے حضرت شیخ الاسلام کی مجاہدانہ سرگرمیوں کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنالیا اور اس وقت جمعیۃ علمائے ہند نے استخلاص وطن کے لئے جو راہ عزیمت اپنائی تھی اسی سے وابستہ ہوکر آزادی وطن کے لیے نمایاں کردار ادا کیا۔ مولانا کو اپنے استاذ حضرت شیخ الاسلام سے والہانہ عقیدت تھی۔ حضرت شیخ کی ایک ایک ادا اور اشارۂ چشم پر جان نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت مدنیؒ کو فرنگیوں نے گرفتار کرکے سہارن پور جیل بھیج دیا تو مولانا مرحوم اس گرفتاری کو برداشت نہیں کرسکے اور اسی فدا کارانہ جذبہ کے تئیں خود کو گرفتاری کے لیے پیش کردیا۔ حضرت شیخ مدنیؒ بھی اپنے اس ہونہار شاگرد کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور تادم آخر اس قدر شناسی، حوصلہ افزائی اور رہنمائی میں فرق نہیں آیا، ہونہار اور جان چھڑکنے والے شاگرد نے بھی حق تلمذ ادا کرنے میں وہ مثال پیش کی جو کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔

حضرت امیر شریعت ایک علمی اور عملی خانوادے کے چشم و چراغ تھے، عارف باللہ حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کے علمی اور باطنی کارناموں سے بہار کا چپہ چپہ متاثر تھا، سلسلہ بیعت وارشاد نے نہ جانے کتنے گھرانوں کو منور کردیا تھا، تاریک دلوں میں روشنی کی کرن پھوٹی تھی اور علمی بساط نے بہار، اڑیسہ اور بنگال کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ عیسائیت نے سر ابھارا تو اس مرد مجاہد کے قلمی جہاد نے اس کو کچل دیا۔ قادیانیت نے اپنے بال و پر کھولے تو اس کے پر کتر دیے، مریدین اور عقیدت مندوں کا حلقہ تو موجود ہی تھا، روز بہ روز حلقہ کی وسعت بڑھ رہی تھی لیکن حضرت امیر شریعت جاہ ومنصب کی حرص و آز سے کوسوں دور تھے، نظر صرف خلق خدا کے نفع پر تھی۔ حضرت امیر شریعت اس وقت جام مسرت سے سرشار ہوجاتے تھے جب ان کے ذریعے مسلمانوں کو کسی طرح کا فائدہ پہنچ جاتا تھا، نفع رسانی کا یہی وہ جذبہ محمود تھا، جس نے ارادت

مندوں کا رخ حضرت شیخ الاسلام مدنیؒ کی طرف پھیر دیا۔

کیا جاہ و منصب کی اس عظیم قربانی کی کوئی مثال ماضی قریب میں مل سکتی ہے؟ اور استاذ پر فدائیت کا کوئی نمونہ اس طرح کا نگاہوں میں ہے؟ قربان جایئے اس فدائیت اور اعتراف عظمت پر۔ حضرت شیخ الاسلام مدنی رحمۃ اللہ علیہ جب کبھی بہار تشریف لے جاتے تو پروگرام کو حضرت امیر شریعت مرتب فرماتے۔ کسی اور کی دخل اندازی کو حضرت مدنی نے گوارا نہیں فرمایا: حضرت امیر شریعت ان مواقع پر حضرت مدنی کے دست حق پرست پر لوگوں کو بیعت کراتے اور اس کار خیر کے لیے پوری جدو جہد فرماتے، اس کو استاذ سے والہانہ عقیدت نہ سمجھئے تو کیا کہیے؟ اور اسی پر بس نہیں، چند ہوا خواہوں نے حضرت امیر شریعت کے اس طرزِ عمل پر نکتہ چینی بھی کی، بیعت کرانے سے منع بھی کیا اور یہ بھی باور کرانے کی کوشش کی کہ اس سے آپ کا نقصان ہو رہا ہے، آپ ہی کا حلقہ تنگ ہو رہا ہے، لیکن جس کا مطمح نظر نفع رسانی ہو اور جس کا دل عمل اخلاص وللّٰہیت سے معمور و منور ہو وہ بھلا کب دنیوی ہوا خواہوں کی باتوں پر کان دھرتا۔

اکابر علماء دیوبند کا یہی طرزِ عمل رہا ہے، حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی رحمہ اللہ کو جب مکہ مکرمہ سے گرفتار کر کے مالٹا میں قید کیا گیا، گرفتاری کے وقت حضرت شیخ مدنی وہاں موجود نہیں تھے نہ انگریزوں نے ان پر کوئی فرد جرم عائد کی تھی، لیکن ان کو جب حضرت شیخ الہند کی گرفتاری کا علم ہوا اور یہ بھی پتہ چلا کہ حضرت شیخ الہند کو رفقاء سمیت جدہ روانہ کر دیا گیا ہے، تو فدایانہ جذبات سے بے قابو ہو گئے اور خود کو گرفتار کرنے کے سارے جتن کر ڈالے۔ بالآخران مردان صفا کیش کے ساتھ جا کر مل گئے اور مالٹا کی اسارت اپنے مربی استاذ کے قدموں میں خندہ پیشانی کے ساتھ جھیل لی۔ اسی راہ عزیمت کو حضرت امیر شریعت نے بھی اختیار کیا اور اپنے استاذ عالی مقام سے عقیدت و محبت اور جاں نثاری کا ثبوت پیش کرتے رہے۔

۱۹۳۲ء میں پہلی بار جیل گئے اور قید کی صعوبتوں سے دوچار بھی ہوئے۔ روزانہ کم سے

کم سات کلو گیہوں پیسنا پڑتا تھا، لیکن حوصلہ میں فرق نہیں آیا بلکہ یک گونہ حوصلہ میں بلندی آئی اور تعزیر جرم نے اس طرح کے جرائم سے عشق پیدا کر دیا، چناں چہ ۱۹۴۳ء میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے تو استخلاص وطن کے لیے وقف ہو گئے۔ اسی جذبہ حریت نے جمعیۃ علمائے ہند سے وابستہ کر دیا اور ۱۹۳۵ء میں جمعیۃ علما صوبہ بہار کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ اپنی انتھک محنت، تگ و دو اور جدوجہد سے پورے صوبہ میں جمعیۃ علمائے ہند کا تعارف کرایا، اس کے کارناموں سے عوام وخواص کو روشناس کیا، زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ جمعیۃ علماء ہند صوبہ بہار میں مرکز توجہ بن گئی۔ اس کا ثبوت کھگڑیا کا وہ تاریخی اجلاس ہے جو جمعیۃ علمائے ہند کے نام پر منعقد کیا گیا اور عوام وخواص کی بھیڑ نے یہ واضح کر دیا کہ جمعیۃ علمائے ہند صوبہ بہار کی معتمد جماعت ہے اور اس کو عوامی اعتماد حاصل ہے۔

حضرت امیر شریعت کی جمعیۃ علماء سے وابستگی تادیر قائم رہی اور جمعیۃ کو وہ اپنی اصابت رائے، صالح فکر اور مجاہدانہ سرگرمیوں سے استحکام بخشتے رہے۔ تا اینکہ ۱۹۶۴ء میں ایک قضیہ نامرضیہ نے حضرت امیر شریعت کو جمعیۃ سے دور رہنے پر مجبور کر دیا، ہم اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے اور مولانا صدرالدین انصاری مرحوم کے الفاظ میں اس کو پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، حیرت ہے کہ عمر کی آخری منزل میں یہ بھی جمعیۃ علماء ہند سے دور ہو گئے تھے یا دور کر دیے گئے۔ خیر ملاحظہ فرمائیے حضرت مولانا صدرالدین انصاریؒ کے الفاظ:

> ''۱۹۳۴ء سے ۱۹۶۴ء تک وہ مسلسل جمعیۃ علمائے ہند کے کاموں میں شریک رہے اور ہم سبھوں کے مرکز نگاہ تھے، مشاہیر کی حیثیت سے وہ مرکزی جمعیۃ کے رکن رکین بھی تھے۔ مگر ۱۹۶۴ء میں صوبائی جمعیۃ علماء کی میٹنگ میں یہ بحث لائی گئی کہ انھیں مشاہیر بہار کی حیثیت سے جمعیۃ کا رکن بنایا جائے یا نہیں؟ یہ افسوسناک گفتگو ہوئی اور بدقسمتی سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ مشاہیر بہار کی حیثیت سے انہیں رکن نہیں بنایا جاسکتا۔ اس طرح عملاً انہیں جمعیۃ علماء کی سرگرمیوں اور میٹنگوں میں شرکت سے الگ کیا گیا۔ یہ اس سال ہوا جب وہ

جید عالم دین اور ماہر فقہ کی حیثیت سے جامعہ از ہر مصر کی دعوت پر عالمی فقہی کانفرنس میں شرکت کے لیے ہندوستان کے نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے۔"

لیکن ۱۹۶۴ء تک حضرت امیر شریعت اپنے مجاہدانہ کارناموں، سیاسی اور مذہبی سرگرمیوں سے ملک کے گوشہ گوشہ میں شہرت وخدمت کے بام عروج پر پہنچ چکے تھے، اب وہ کسی تنظیم کے محتاج نہیں تھے، تنظیمیں خود ان کا راستہ دیکھتی تھیں، حضرت امیر شریعتؒ ذہین وفطین، نکتہ داں اور نکتہ رس، فعال ومتحرک شخصیت کے مالک تھے، مردم سازی اور مردم شناسی میں ان کو امتیاز حاصل تھا، انھوں نے جو خاکے تیار کیے اور اپنے لیے جو راہ عمل متعین کی، اسی خاکہ کو نہایت حوصلہ مندی اور جرأت وبیباکی کے ساتھ پر کرتے رہے اور شاہ راہ عمل پر چلتے ہوئے اپنی منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ حالاں کہ صفحہ ہستی پر اس طرح کی کامیابیاں شاذ ونادر ہوتی ہیں، بہت سے خواب ادھورے رہ جاتے ہیں اور بہت سے سپنے چکنا چور ہو جاتے ہیں، مگر اولو العزم ہستیاں نامساعد حالات میں بھی مایوسی کا شکار نہیں ہوتیں بلکہ خطر پسند طبیعتوں کو حوادث سے حوصلہ ملتا ہے۔

حضرت امیر شریعتؒ کی پوری زندگی کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہے، جس کے اوراق منتشر نہیں ہیں، اس میں دیکھا جاسکتا ہے کہ ملت اسلامیہ کی خدمت انھوں نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر کی ہے، بہار میں فرقہ وارانہ فسادات کا نہایت ہیبت ناک سلسلہ چل پڑا، بستیاں کی بستیاں صفحہ ہستی سے مٹادی گئیں، ہر طرف کشت وخون کا بازار گرم رہا، ہر چھوٹا بڑا اپنی جگہ سراسیمہ اور حیران وششدر، گویا ہر ایک نے سپر ڈال دیا۔ اس سیلاب بلا کا رخ پھیرنے کی جرأت کسی میں پیدا نہیں ہوئی، لیکن مسلمان مظلوموں کی چیخ وپکار، آہ وبکا اور دلدوز فریادوں نے مجاہد حریت حضرت امیر شریعتؒ کے اسلامی خون کی گردش تیز سے تیز تر کردی، قوت برداشت جواب دے گئی پھر بلا خوف وخطر جان ہتھیلی پر رکھ کر فرقہ وارانہ فسادات کا سیلاب روکنے میں کامیاب ہوئے۔

اسی جذبۂ خدمت نے ۱۹۳۶ء میں بہار اسمبلی کی رکنیت کے لیے انتخاب لڑنے پر مجبور کیا تھا، ملک کے عظیم دانشور، ملت اسلامیہ کے مفکر، سیاسی مدبر حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ نے انڈی پنڈنٹ پارٹی کے نام سے ایک سیاسی جماعت تشکیل کی تھی، اسی کے ٹکٹ پر انتخابی میدان میں اترے اور نمایاں کامیابی حاصل کی، لیکن اپنے بلند عزائم اور بیکراں جذبات کی بنا پر رکنیت کی مدت پوری کرنے سے پہلے مستعفی ہو گئے۔ حضرت امیر شریعتؒ کی بے کراں طبیعت کو یہ ماحول راس نہیں آیا اور آزاد فضا میں رہ کر انھوں نے فکر و تدبر کے ساتھ عملی اقدامات کیے۔ حضرت امیر شریعتؒ کی بیدار مغزی، فکر و تدبر اور اصابت رائے سے متاثر ہو کر دار العلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ارباب حل وعقد نے مجلس شوریٰ کا رکن منتخب کیا۔ ۱۹۵۵ء میں دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کی رکنیت قبول فرمائی اور مدت العمر اپنی اصابت رائے کا لوہا منواتے رہے، ارکان شوری میں آپ کی شخصیت نمایاں اور قابل صد احترام تھی، اپنی افتادِ طبع کے مطابق کسی مسئلہ میں انھوں نے دار العلوم کے مفاد کے پیچھے نہیں ڈالا۔ انداز گفتگو استدلالی ہوتا تھا اس لیے ارکان شوری حضرت امیر شریعتؒ کی تجاویز کو بہ نظر استحسان دیکھتے تھے، مزاج کی سلامتی کا یہ عالم تھا کہ کسی رائے کو منوانے کے لیے ضد نہیں کرتے تھے لیکن رائے اور تجویز ہی ایسی استدلالی ہوتی تھی جو خود کو تسلیم کرا لیتی تھی، اب ارکان شوریٰ میں ایسی قد آور شخصیات کو دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔

۱۹۵۷ء میں حضرت مولانا محمد قمر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی نور اللہ مرقدہ امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے چوتھے امیر شریعت منتخب ہوئے، یہ مسند جو دیر سے ایسی ہی فعال و متحرک شخصیت کی منتظر تھی، اس کے دن لوٹ آئے اور حضرت مولانا کی شبانہ روز کی انتھک محنتوں نے اس محدود ادارے کو ملک گیر سطح پر نمایاں کر دیا، مرور ایام کے ساتھ اس کے دائرہ کار میں اضافہ ہوتا گیا، اس ادارہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے حضرت امیر شریعت نے ایسے افراد کا انتخاب فرمایا جو اس کو بام عروج تک پہنچا سکتے تھے، چنانچہ لائق اور ہونہار علماء کی ایک مختصر جماعت کو انھوں نے ہر اس زاویہ سے تربیت دی جس کی

امارت شرعیہ کو ضرورت ہوسکتی تھی، یہ جماعت ابھر کر سامنے آ گئی اور امارت شرعیہ کے کاموں میں قابل اعتناء اضافہ ہوا تو علمی دنیا نے حضرت امیر شریعتؒ کی مردم سازی اور دیدہ وری کو خراج تحسین پیش کیا۔ نکاح وطلاق، وراثت اور دیگر معاملات کے مرافعوں کی امارت شرعیہ کے دفتر میں کثرت ہوگئی، غیروں کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ جو مقدمات عدالتوں میں برسہا برس میں فیصل ہوتے ہیں اس نوعیت کے مقدمات یہاں مہینوں میں نمٹ جاتے ہیں، وکالت کے اخراجات نہ بار بار آمد ورفت کے، چند پیشیوں میں فیصلہ سامنے آ جاتا ہے۔ وہ بھی بالکل سچا خدا اور رسول کے احکام کے مطابق، اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ بہت جلد ادارہ کو رجوع عام حاصل ہوگیا، اس کی کامیابی کے اثرات دور تک پہنچے، اور مسلم تنظیموں نے محسوس کیا کہ محکمہ قضا کا قیام ہر جگہ ضروری ہے تاکہ مسلمانوں کو غیر اسلامی فیصلوں سے بچایا جا سکے۔ حضرت امیر شریعتؒ نے امارت شرعیہ کو مفید تر ادارہ بنانے کے لیے عوام وخواص کو براہِ راست متوجہ فرمایا، علماء کرام کو ان کا منصب یاد دلا کر امارت شرعیہ کے قیام اور اس کی افادیت کو نہ صرف واضح کیا بلکہ اپنے عملی اقدام کے ذریعے اس کی ضرورت کو محسوس کرا دیا، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ امارت شرعیہ بہار نے مسلم معاشرہ پر جو اثرات مرتب کیے وہ تادیر سماج پر چھائے رہیں گے اور آئندہ نسلیں ان تابندہ نقوش سے راہ عمل متعین کرتی رہیں گی۔

امیر شریعت رحمہ اللہ کی درخشاں زندگی کا ایک روشن باب یہ بھی ہے کہ وہ پیش آمدہ مسائل کو نظر انداز کرنے کے قائل نہیں تھے، وہ حالات کا مقابلہ کرنا اپنا مذہبی، ملی اور اخلاقی فریضہ سمجھتے تھے، اپنی عملی زندگی میں وہ کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہوئے اور نہ پر خطر راستوں نے انھیں ہیبت زدہ کیا۔ ۱۹۶۳ء میں حکومت ہند نے مسلم پرسنل لا میں اصلاح کے عنوان سے ایک کمیشن مقرر کیا، مقصد یہ تھا کہ دستور میں ترمیم واضافہ کر کے یکساں سول کوڈ کا راستہ ہموار کر دیا جائے اور ایک ملک ایک قوم اور ایک قانون کے نام پر مسلمانوں کو اپنے شخصی قوانین سے دست بردار ہونے کا مطالبہ کیا جائے، مسلمانوں کے لیے یہ ایسا خطرناک منصوبہ تھا جو اسلامی وملی تشخصات کو یکسر کالعدم کر رہا تھا، کمیشن کی نزاکت کو حضرت امیر شریعتؒ نے شدت کے ساتھ محسوس کیا اور ان کی

رگ اسلامیت پھڑکی، ایک لحہ ضائع کیے بغیر انھوں نے صدائے احتجاج بلند کی، پورے ملک میں ہلچل مچ گئی، پھر اپنی آواز کو طاقت ور بنانے کے لیے ۲۸ر جولائی ۱۹۶۳ء میں مسلم پرسنل لا کنونشن منعقد کیا، اس عظیم الشان کنونشن کی صدارت جمعیۃ علمائے ہند کے کارگزار صدر حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی۔ یہ کنونشن اس قدر مؤثر ثابت ہوا کہ ۳۱ راگست ۱۹۶۳ء میں مرکزی وزیر قانون مسٹر اشوک کمار سین نے راجیہ سبھا میں مسلم پرسنل لا میں ترمیم نہ کرنے کا اعلان کر دیا۔

یہی فتنہ ۱۹۷۲ء میں نیا روپ بدل کر آیا، مسٹر آر، ایچ گوکھلے وزیر قانون تھے، انھوں نے ۲۳ر مئی ۱۹۷۲ء کو راجیہ سبھا میں متبنیٰ بل پیش کیا اور مسودہ پیش کرتے ہوئے مسٹر گوکھلے نے کہا:

> ''ہندو قانون تبنیت و نفقہ ۱۹۵۲ء کی جگہ یہ نیا قانون یکساں شہری قانون کی حیثیت سے ملک کے تمام شہریوں پر نافذ ہوگا، یہ مسودہ قانون یکساں سول کوڈ کے لیے پہلا مضبوط قدم ہے۔''

حضرت امیر شریعت کو اس چیلنج نے مزید حرکت دی اور متبنیٰ بل کے خلاف ملکی سطح پر تحریک شروع کر دی، ملک کے گوشہ گوشہ میں صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ شب و روز کی جدو جہد نے ہندوستانی مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا، خون میں گردش بڑھی اور اپنے اسلامی قوانین اور ملی تشخصات کے تحفظ کے لیے وہ اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے، اس سے قبل مسلم پرسنل لا پر موثر اقدام کا فیصلہ کر چکے تھے، انہوں نے حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو تفصیلی خط لکھا، ملاقات کی اور انہیں اس اہم مسئلہ پر غور و فکر کیلئے دار العلوم دیوبند میں باقاعدہ نشست کرنے پر آمادہ کیا۔ چنانچہ ۱۳، ۱۴ر مارچ ۱۹۷۲ء کو وہ نشست منعقد ہوئی۔ اور یہ طے پایا کہ سال کے آخر تک عروس البلاد بمبئی میں عظیم الشان اجلاس منعقد کیا جائے۔ اس سلسلہ میں بعد میں بمبئی کا سفر کیا گیا، اور مشورہ کے بعد ۲۷، ۲۸ر دسمبر ۱۹۷۲ء کو ممبئی میں ایک عظیم الشان مسلم پرسنل لا کنونشن منعقد کرنے کا اعلان کر دیا گیا، یہ کنونشن بلاشبہ ملت

اسلامیہ کی آواز ثابت ہوا، ہر مکتب فکر کی اہم ترین شخصیات نے اس میں شرکت فرمائی۔ مجمع کیا تھا، ہندوستانی مسلمانوں کے بحر بیکراں سے اس کو تعبیر کیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا، اخباری نمائندوں نے کم وبیش تین لاکھ کا تخمینہ پیش کیا، اسی عظیم الشان کنونشن میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی داغ بیل پڑی، مسلم قائدین نے حالات کے تناظر میں بورڈ کی تشکیل کو اہم قرار دیا اور یہ محسوس کیا کہ زبردست اجتماعی طاقت کے بغیر اس طرح کے طوفانوں کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ ۷-۸/ اپریل ۱۹۷۳ء کو حیدرآباد میں ایک اجلاس عام ہوا، اسی موقع پر باضابطہ مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی اور ہر مکتب فکر کو مناسب نمائندگی دی گئی۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کے صدر بنائے گئے اور بحیثیت جنرل سکریٹری امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی نور اللہ مرقدہ کا انتخاب عمل میں آیا۔ یہ دونوں عظیم شخصیات تادم آخر صدارت ونظامت کے عہدوں پر فائز رہیں۔

مسلم پرسنل لا بورڈ وجود میں آنے کے بعد ملت اسلامیہ ہند نے راحت کی سانس لی اور بورڈ نے بھی اپنے کارناموں سے ملت کو مایوس نہیں ہونے دیا، جو مسئلہ بھی سامنے آیا، بورڈ نے اس کو حل کرنے میں پہلوتہی نہیں کی، متبنی بل ابھی واپس نہیں ہوا تھا، اس لیے حضرت امیر شریعت سکون سے نہیں بیٹھے، تگ ودو جاری رکھی بالآخر جنتا پارٹی کے دور حکومت میں ۱۹/ جولائی ۱۹۷۸ء میں یہ بل واپس لیا گیا۔ ۱۹۸۰ء میں کانگریس برسر اقتدار تھی اس نے متبنی بل کو دوبارہ زندہ کیا تو حضرت امیر شریعت کی اسلامی روح پھر مضطرب ہوئی اور اس طرح میدان میں اترے کہ کانگریس حکومت کو گھٹنا ٹیکنے پر مجبور ہونا پڑا اور تبنیت بل سے مسلمان مستثنیٰ قرار دے دیے گئے۔

۱۹۷۴ء میں کانگریسی حکومت نے ایمرجنسی نافذ کی تھی، مبصرین سیاست کانگریس کے اس دور کو سیاہ دور کہتے ہیں۔ اس میں صرف زبانوں پر ہی تالے نہیں لگے تھے۔ ہزاروں سیاسی غیر سیاسی لوگ سلاخوں کے پیچھے تھے، ہر شخص سراسیمہ اور خوف زدہ تھا، اسی دور میں برتھ کنٹرول کو جبراً نافذ کیا گیا۔ ہر محکمہ سے آپریشن کے لیے افراد مانگے گئے، سختیاں کی گئیں، راہ گیروں،

کسانوں کو پکڑ پکڑ کر نسبندی کی گئی، جگہ جگہ نسبندی کے خیمے لگائے گئے، برتھ کنٹرول کا ایک حشر برپا تھا، ایمرجنسی کے خوف سے کسی میں زبان کھولنے کی ہمت نہیں تھی۔ بڑے بڑے سورما سکتے میں تھے، پورے ملک میں کہرام برپا تھا، لیکن اس ظلم وتعدی پر احتجاج کون کرے؟ یہ حوصلہ اور ہمت و دلیری وشجاعت اور اعلان حق کا ولولہ تو صرف حضرت امیر شریعت میں تھا، انھوں نے جھرجھری لی اور پوری قوت کے ساتھ اس طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اپریل ۱۹۷۶ء کو بورڈ کی مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کیا، اسی مجلس میں برتھ کنٹرول کو حرام کیا گیا اور اخبارات کو اس فتویٰ کی پوری تجویز بھیجی گئی۔ ملک کے گوشے گوشے میں مسلمانوں نے اس اعلان حق کا پرجوش استقبال کیا، برادران وطن نے بھی راحت محسوس کی، یہ پہلی صدائے حق تھی، جس سے باشندگان ملک کو توانائی ملی، جن حالات میں یہ فتویٰ جاری کیا گیا تھا، ان کا تصور بھی لرزہ خیز ہے، لیکن:

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

۱۹۸۶ء میں فتنہ کی ایک گھڑی اور آئی، آزمائش کا ایک نیا دور شروع ہوا، شاہ بانو کیس اس وقت اخبارات کی شہ سرخیوں میں تھا، سپریم کورٹ نے اس مقدمہ میں مسلم پرسنل لا کے خلاف یہ فیصلہ کیا کہ مطلقہ کو اس وقت تک نان ونفقہ دیا جائے جب تک وہ دوسرا نکاح نہ کرلے اور اگر وہ زندگی بھر دوسرا نکاح نہ کرے تو طلاق دینے والے کو عمر بھر گزارا دینا پڑے گا۔

ظاہر ہے یہ فیصلہ مسلم پرسنل لا میں بے جا مداخلت تھی جو مسلمانوں کے حلق سے نہیں اتر سکتی تھی، یہ فیصلہ درحقیقت ۱۹۷۳ء کے ایک نئے ضابطہ فوجداری کا اجرا تھا، بورڈ نے اس کے خلاف جدوجہد شروع کردی تھی، لیکن کامیابی کے راستے ابھی ناہموار تھے، ہر زاویہ سے کوشش جاری تھی، احتجاجی جلسے، وزیراعظم سے ملاقات اور دیگر شکلیں اختیار کی گئیں۔ احتجاج میں تیزی آئی اور حکومت نے بھی محسوس کرلیا کہ اس ضابطہ فوجداری میں ترمیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے، پارلیمنٹ میں بحث ومباحثہ کے بعد حکومت ہند نے ۶ رمئی ۱۹۸۶ء میں قانون تحفظ مسلم خواتین

۱۹۸۶ء ایکٹ منظور کیا اور مسلم مطلقہ خواتین کے نان ونفقہ کے حدود متعین کیئے گئے۔ اس طرح یہ ہنگامہ فروہوا۔

ابھی اس مہم اور سخت مجاہدے سے ماحول میں کچھ سکون پیدا ہوا تھا کہ فرقہ پرست جماعتوں نے ملک کی فضا کو مسموم کرنے کا بیڑا اٹھایا، طرح طرح کی اشتعال انگیزیاں، نعرے بازی، گالی گلوج، دھمکیاں اور عزت وناموس پر حملے، یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہندوستان کی سرزمین مسلمانوں کے لیے تنگ ہوگئی ہے۔ یہ سب کچھ حکومت کی نظروں کے سامنے ہورہا تھا، اور حکومت خاموش تماشائی تھی، مقصد یہ تھا کہ مسلمان خوف زدہ ہوکر بابری مسجد سے دست بردار ہوجائیں اور فرقہ پرست تنظیمیں ہندوؤں کو مذہبی جنون میں مبتلا کرکے اقتدار کی کرسی تک پہنچ جائیں، حالات ناگفتہ بہ تھے، مسلم تنظیمیں ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہی تھیں۔ گویا حالات نے قوت فیصلہ چھین لی ہے، لیکن یہ سکوت ٹوٹا اور پورے عزم وحوصلہ کے ساتھ حضرت امیر شریعت نے بورڈ کی مجلس عاملہ طلب فرمائی، اس میں بابری مسجد کا تحفظ اور دیگر مسائل زیر بحث آئے اور بالکل واشگاف الفاظ میں کہا گیا کہ بابری مسجد خدا کا گھر ہے اس کا تحفظ حکومت کا آئینی حق ہے۔ ہم اس سے دست بردار ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔

اس اجلاس کے بعد حضرت امیر شریعتؒ کی قیادت میں ایک وفد وزیراعظم سے ملا، اپنی تجاویز پیش کیں، حضرت امیر شریعتؒ نے بلاخوف وخطر ماحول کا مکمل جائزہ پیش کیا، وزیراعظم اس بے باکانہ گفتگو سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، اول مرحلہ میں تو اس مسئلہ کو ٹالنا چاہتے تھے اور کچھ اس طرح کے جملے بھی استعمال کرگئے تھے، مگر بعد میں سنبھلے اور مسجد کے تحفظ کا یقین دلایا، لیکن تحفظات کی یقین دہانیاں صرف زبانی ثابت ہوئیں اور الفاظ کی بازی گری سے مسلمانوں کا دل بہلایا گیا اور دیکھتے دیکھتے بابری مسجد شہید کردی گئی اور اسی کے ساتھ دنیا نے جمہوریت کا تار تار بھی فضاؤں میں اڑتا ہوا دیکھا اور اس عظیم سانحہ پر دنیا دم بخود رہ گئی۔

ان چند کارناموں کے تناظر میں حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب زندگی کا ایک ایک ورق نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے، کوئی صفحہ زندگی کارناموں سے خالی نہیں ہے، ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ پوری زندگی ہی کارناموں سے عبارت تھی۔ اس عظیم شخصیت نے کردار وعمل اور حق گوئی و بے باکی کے جو تابندہ نقوش چھوڑے ہیں وہ آئندہ نسلوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوں گے۔ میں اپنی گفتگو ختم کرنے سے پہلے حضرت امیر شریعتؒ کے کارناموں کی ایک مختصر فہرست پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں تاکہ ایک حد تک کاموں کے تنوع اور ان کی وسعت کا اندازہ کیا جاسکے۔ تو یہ ہیں کتاب زندگی کے جلی عنوانات:

۱- خانقاہ رحمانی کا صاحب نظر سجادہ نشیں اور مصلح

۲- امارت شرعیہ کا بیدار مغز قائد

۳- دیدہ ور مصنف

۴- اسلامی شعائر کا بہادر نگہبان

۵- مدارس اسلامیہ کا معمار

اللہ تعالیٰ ملت اسلامیہ کے اس بطل جلیل کے نقوش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں اور اس کے درجات بلند فرمائیں۔ آمین

مولانا مفتی اسعد قاسم سنبھلی ☆

حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ اور مسلم پرسنل لا بورڈ

ہندوستان میں اسلامی عہد کا خاتمہ کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ کل تک برصغیر پر رعب و دبدبے کے ساتھ حکومت کرنے والی قوم چشم زدن میں محکومیت کے ایسے گڑھے میں پھینک دی گئی، جہاں تاریک مستقبل کے بھیانک سائے اور بربادی کے ہولناک تصورات اس کا دل دہلا رہے تھے، انگریزوں کا مقصد یہاں مستقل قیام نہ تھا اور نہ ہی کوئی جہاں دیدہ قوم ایسی غیر فطری بات سوچ سکتی ہے۔ ان کی منزل تو بس اسلامی حکومت کو ڈھانا اور مسلمانوں کو اس طرح کچل ڈالنا تھا کہ پھر دوبارہ کبھی وہ کھڑے ہونے کی ہمت نہ کرسکیں اور امت اپنی تاریخ وتمدن سے کٹ کر ہمیشہ کے لیے صلیب پرستوں کی غلام بن جائے۔ چناں چہ حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہی انھوں نے تدریجاً شریعت کی بساط لپیٹنی شروع کردی۔ اسلامی شعائر کو کھرچ ڈالا گیا، دینی تعلیم و تربیت جرم قرار پائی اور مغربی قانون وتمدن اتنی قوت کے ساتھ تھوپے گئے کہ سو سال ہی میں ملک کا منظر عام بدل گیا جب انگریزوں کے اقتدار کا سورج غروب ہوا تو اجتماعی نظام بکھر چکا تھا اور ہمارے پاس دین کے نام پر نکاح وطلاق اور وراثت واوقاف جیسی چند چیزیں ہی بچی تھیں۔

۴۷ء میں جب ملک آزاد ہوا تو اپنی عظیم قربانیوں کی بدولت مسلمانوں کو یہ توقع تھی کہ

☆ ناظم جامعہ شاہ ولی اللہ، مراد آباد (یوپی)

اب ظلم وستم کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا اور مشترکہ نظام کے تحت مسلم پرسنل لا کی بھی وہ تمام مشکلات دور ہو جائیں گی جنھوں نے دین کو محدود کر کے امت مسلمہ کو ایک طویل عرصے سے کرب واضطراب میں مبتلا کر رکھا ہے، لیکن یہ ہماری سادہ لوحی تھی۔ آزادی کے بعد جن لوگوں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی وہ مسلمانوں کے حقیقی خیر خواہ نہ تھے۔ ایک طرف تو دفعہ ۲۵ اور ۲۹ میں مذہبی آزادی دے کر ہمیں مطمئن کر دیا گیا لیکن دوسری جانب دفعہ ۴۴ کی تلوار لٹکا کر یہ عندیہ بھی دے دیا گیا کہ مسلمان نوشتۂ دیوار کو پڑھنے کی کوشش کریں۔ یکساں سول کوڈ ہمارا نصب العین ہے، جسے آج نہیں تو کل انھیں قبول کرنا ہی پڑے گا۔

چناں چہ ہندو پرسنل لا میں ترمیم کر کے جب ۱۹۵۶ء میں ہندو کوڈ بل پاس ہوا تو وزیر قانون مسٹر پاٹیکر نے ان اصلاحات کو آئندہ تمام ہندوستانیوں پر نافذ کرنے کا عزم ظاہر کیا۔ پھر ۲۲ راگست ۱۹۶۳ء کو راجیہ سبھا میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے بزور طاقت مسلم پرسنل لا کا خاتمہ کرنے اور کامن لا کو نافذ کرنے کا گویا بگل بجا دیا، رہی سہی کسر لا کمیشن کے چیئرمین گجندر گڈکر کی وارنگ نے پوری کر دی اور حکومت نے پرسنل لا میں ترمیم کرنے کے لیے ۱۹۶۳ میں باضابطہ ایک کمیشن بنانے تک کا اظہار کر ڈالا۔

ایک طرف تو اقتدار کے نشے میں ڈوب کر یہ ”جرأت مندانہ“ اقدامات کیے جا رہے تھے دوسری جانب ایسے ایمان فروشوں کی بھی تلاش جاری تھی جو مسلمانوں کو پوری قوت سے یہ باور کرا سکیں کہ حکومت ان کی خیر خواہی میں عائلی قوانین کی اصلاح کرنا چاہتی ہے تاکہ وہ پسماندگی سے نکل کر تہذیب وترقی کی راہ پر گامزن ہو سکیں لیکن قدامت پسند علماء اس کی راہ میں حائل ہیں اور خواہ مخواہ ارباب اقتدار کی نیت پر شک کر کے وہ ایک مہذب ومشترک معاشرے کی تشکیل میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔ عبدالحمید ڈلوائی، اسی ٹولے کے سربراہ تھے۔ ۱۹۷۱ء میں بمبئی میں ایک میٹنگ کا انعقاد کر کے پرسنل لا پر شدید حملے کیے اور بلا تفریق مذہب وملت پورے ملک میں یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کا مطالبہ کیا۔

یہ خبر بڑی ہوش ربا تھی جسے سن کر ہر دردمند دل تڑپ اٹھا، ہر آنکھ روئی اب پانی واقعی سر

سے اونچا ہو رہا تھا اور اس بات کا پورا اندیشہ تھا کہ حالات اگر اسی رخ پر چلتے رہے اور اس ناگفتہ بہ صورت حال کا فوراً کوئی تدارک نہیں کیا گیا تو مسلم دشمنی کا یہ عفریت ہمارے بچے کھچے ملی سرمایے کو بھی نگل لے گا۔ اس وقت ضرورت ایسی مخلص قیادت کی تھی جسے مسلمانوں میں اعتبار و احترام حاصل ہو، علم و فضل میں اس کا پایہ بلند ہو، حکمت و تدبر اس کا شعار ہو اور دین و ملت کی خاطر وہ آندھیوں سے لڑنے کا حوصلہ رکھتی ہو۔

اس موقع پر امت کی ترجمانی کے لیے جن علماء کا کارواں آگے بڑھا ان میں سرفہرست امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ تھے، جو اپنے معاصرین میں نہایت بلند مقام شخصیت کے حامل تھے۔ ان کا ایک خاندانی پس منظر تھا، اللہ نے انھیں علم و فضل، اخلاص و تقویٰ، عزم و حزم، فکری بصیرت، بالغ نظری، اصابت رائے، ہمت و حوصلہ، توازن و اجتماعیت، ملی سوز و کڑھن اور مضبوط قوت ارادی جیسی مختلف بلکہ کئی حیثیتوں سے متضاد صفات سے نوازا تھا، جن کا کسی ایک شخصیت میں اجتماع مشکل اور بیک وقت ان میں توازن قائم رکھنا عظمت و عبقریت کی دلیل ہے۔

حضرت مولاناؒ اپنی خداداد بصیرت کی بدولت خطرات و حوادث کو بہت جلد بھانپ لیتے تھے اور فوراً ہی ان سے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ چناں چہ مسلم پرسنل لا میں ترمیم کرنے کے لیے ۱۹۶۳ء میں جب حکومت نے ایک کمیشن بنانے کا ارادہ کیا تو اس کے خلاف سب سے پہلی اور زوردار آواز آپ ہی نے اٹھائی اور ۲۸ر جولائی ۱۹۶۳ء کو پٹنہ میں ایک کل جماعتی کانفرنس کا انعقاد کر کے ارباب اقتدار کو دوٹوک لہجے میں یہ پیغام دیا کہ وہ ہماری حمیت و غیرت کا امتحان نہ لیں۔ ہم سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں لیکن شریعت سے چھیڑ چھاڑ کی ہرگز کسی کو اجازت نہیں دیں گے۔ خواہ اس کے لیے ہمیں کوئی بھی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔

پھر جب ایک مشترک ملی محاذ بنانے کا فیصلہ آپ نے کیا تو حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ کو آمادہ کیا، انھوں نے ۱۳، ۱۴ر مارچ ۱۹۷۲ کو دارالعلوم دیوبند میں ایک نمائندہ اجلاس طلب کیا۔ اس کو کامیاب و نتیجہ خیز بنانے میں مولانا رحمانیؒ نے اپنی پوری

طاقت جھونک دی۔اس میں پرسنل لا بورڈ کے قیام کی تجویز بھی آپ ہی نے پیش کی، جس کی مفتی عتیق الرحمٰن عثانی علیہ الرحمہ نے تائید کردی۔ یہ معرکہ آرائی کی تمہید تھی اور اگلا قدم بمبئی کا اجلاس قرار پایا جس کی تیاری کے لیے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمہ اور مولانا محمد سالم قاسمی پر مشتمل جو چار رکنی وفد بمبئی روانہ ہوا اس میں امیر شریعت سرفہرست تھے۔ وہاں انھوں نے ایک مہینہ تک قیام کیا اور شبانہ روز جدوجہد کے بعد مسلم پرسنل لا کنونشن کے لیے زمین پوری طرح ہموار کردی اس طرح ملت کی پاسبانی کے لیے دیوبند میں جو چھوٹا سا کارواں بنا تھا وہ عروس البلاد ممبئی میں ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں تبدیل ہوگیا اور ۲۷، ۲۸ر دسمبر ۱۹۷۲ء کو مسلمانوں کا ایسا تاریخ ساز اجتماع ہوا جس کی نظیر عہد قریب کی تاریخ میں نہیں ملتی، آزاد ہندوستان میں پہلی بار تمام مکاتب فکر نے اتحاد واتفاق کا ایسا بھرپور مظاہرہ کیا کہ حکومت معذرت پر اتر آئی اور اس نے اپنے قدم پیچھے ہٹا لیے۔

اگلے سال حیدرآباد میں بورڈ کا پہلا اجلاس ہوا تو حکیم الاسلام کو اس کا صدر بنایا گیا جو اس عظیم منصب کے لیے سب سے زیادہ موزوں شخص تھے جب کہ جنرل سکریٹری کے اہم عہدے کے لیے حضرت امیر شریعت کا انتخاب ہوا، اپنی وجیہ شخصیت حکمت وتدبر، قوتِ فیصلہ اور مؤثر گفتگو کی بنا پر وہ واقعتاً اس اعزاز کے مستحق تھے۔ اہل نظر کے نزدیک یہ قران السعدین تھا جس کی بدولت بورڈ بہت جلد مسلمانوں کا ایسا متحدہ پلیٹ فارم بن گیا جس کی مثال دوسری ملی تنظیموں میں دکھائی نہیں دیتی۔

بورڈ کو پہلی کامیابی متبنی بل کے سلسلے میں ملی جس کو راجیہ سبھا میں پیش کر کے ۲۳ر مئی ۱۹۷۲ء کو وزیر قانون ایچ آر گوکھلے نے صفائی کے ساتھ کہا تھا کہ یہ بل یکساں سول کوڈ کی سمت میں ہمارا مضبوط قدم ہے اس کے بعد رفتہ رفتہ پورے کامن لا کو نافذ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ نہایت غیر فطری اور کرب ناک صورت حال تھی کہ ایک بالکل غیر آدمی کو زبردستی بیٹا تسلیم کیا جائے اور میراث میں وہ بھی صلبی اولاد کی طرح برابر کا شریک ہو پھر اس کی رو سے مصنوعی باپ کی بیویوں، نواسیوں اور پوتیوں کے ساتھ نکاح کا وہ تعلق قانوناً ممنوع قرار پاتا تھا، جو شرعاً

جائز و درست ہے یہ اس جاہلی رسم کو زندہ کرنے کی کوشش تھی، جس کا اسلام نے شروع ہی میں خاتمہ کر دیا تھا اب اسے دوبارہ قبول کر لینا شریعت کی ایسی ناقدری تھی، جسے امت کبھی گوارا نہیں کر سکتی۔ چناں چہ پارلیمنٹری کمیٹی کے سامنے بورڈ نے اپنے موقف کو بڑی قوت کے ساتھ پیش کیا۔ ایک طرف حضرت مولانا محمد سالم قاسمی دامت برکاتہم کا زوردار بیان ہوا تو دوسری سمت حضرت امیر شریعتؒ نے ''متبنی بل ۱۹۷۲ء ایک جائزہ'' نامی مدلل دستاویز لکھ کر اس کے تار و پود بکھیر دیے۔ نتیجتاً ۱۹ر جولائی ۱۹۷۸ء کو حکومت نے یہ بل واپس لے لیا اور ۱۶ر دسمبر ۱۹۸۰ء کو وہ جب دوبارہ پارلیمنٹ میں پیش ہوا تو صراحتاً مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔

۱۹۷۵ء کا سال آزاد ہندوستان کی تاریخ میں جمہوریت کے قتل کا سال تھا۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی نے ایمرجنسی لگا کر برتھ کنٹرول کو نافذ کرنے کے لیے پوری سرکاری طاقت جھونک دی تھی، زبانوں پر تالے لگا دیے گئے تھے، قلم کو توڑ دیا گیا تھا، ذرائع ابلاغ پر پابندی تھی اور زعماء ملت کو سلاخوں کے پیچھے ڈھکیل کر پورے ملک میں خوف و ہراس کا ماحول پیدا کر دیا گیا تھا اس وقت نس بندی کے خلاف زبان کھولنا دار و رسن کو دعوت دینا تھا۔ علماء خصوصی نشانہ تھے۔ ایسے بھیانک اور سنگین وقت میں مولانا رحمانی علیہ الرحمہ شیر کی طرح اٹھے اور دار الحکومت دہلی پہنچ کر ۱۷، ۱۸ر اپریل کو مجلس عاملہ کی ایک میٹنگ منعقد کی۔ پولیس نے مسجد (مہندیان) کو چاروں طرف سے گھیر لیا، اندر امت کی قیادت کا امتحان ہو رہا تھا۔ امیر شریعتؒ نے جب یہ وضاحت کی کہ میں آج گھر والوں سے یہ کہہ کر آیا ہوں کہ شاید اب واپس نہ آ سکوں۔ اللہ کی کچھ ایسی مرضی نظر آتی ہے تو دوسرے اراکین کا بھی حوصلہ بڑھا، خوف و ہراس کے بادل چھٹتے ہوئے محسوس ہوئے اور پوری جرأت اور ہمت کے ساتھ انھوں نے یہ تجویز پاس کی کہ نسبندی حرام ہے۔ شریعت اس کی کبھی اجازت نہیں دے سکتی۔ یہ فیصلہ گویا ایٹم بم تھا، جس نے حالات کو یکسر بدل دیا اور پھر بہت جلد اندرا گاندھی کے اقتدار کا سورج غروب ہو گیا۔ امیر شریعتؒ نے اس موضوع پر ایک نہایت مدلل و قیمتی رسالہ بھی تحریر فرمایا، جس میں مسئلے کا عقلی و نقلی تجزیہ کر کے دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ وسائل و ذرائع کی قلت دراصل وہ گمراہ فکر ہے، جسے کوئی بھی عقل مند قوم قبول نہیں

کرسکتی۔

مولانا رحمانیؒ کا تیسرا بڑا کارنامہ مساجد و مقابر کا تحفظ ہے۔ ۱۹۷۸ء میں الٰہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ نے ایسا خطرناک فیصلہ کیا جس کی رو سے مساجد و مقابر کا احترام یکسر ختم کر دیا گیا اور حکومت کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ مفاد عامہ کے پیش نظر کسی جگہ کو ایکوائر کر کے اسے دوسرے مصرف میں بھی استعمال کر سکتی ہے۔ حتی کہ لکھنؤ کی دو مسجدیں، ایک قبرستان اور جے پور کی ایک مسجد کو فوراً حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس کے بعد ملک میں اب کسی بھی مسجد یا قبرستان کے تحفظ کی قانوناً کوئی ضمانت نہ رہی اور مسلمانوں کے تمام ہی مذہبی مقامات شدید خطرے کی زد میں آ گئے تھے۔ مولانا رحمانی نے اس کے تدارک کے لیے بر وقت دو قدم اٹھائے۔ پہلا کام تو انھوں نے یہ کیا کہ بورڈ کی جانب سے مسلمانوں کو ایک گشتی مراسلہ بھیجا، جس میں عدالتی فیصلے کی تفصیل اور اس کے مضمرات کی وضاحت کے ساتھ یہ درخواست کی گئی تھی کہ وہ اس ظالمانہ قانون کے خلاف ارباب اقتدار کو ٹیلی گرام بھیجیں اور پورے ملک میں احتجاجی جلسے منعقد کر کے پرامن جلوس بھی نکالیں۔ دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ بورڈ کے ذمے داروں کو لے کر وزیر اعظم سے ملاقاتیں کیں اور چندر شیکھر، بہوگنا اور وزیر قانون وغیرہ کو میمورنڈم دیے جن میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ حکومت سنٹرل ایکوائزیشن ایکٹ میں ایسی ترمیم کرے جس سے ہر مذہب کے مقدس مقامات محفوظ ہو جائیں اور پھر انھیں کوئی بھی ضبط نہ کر سکے۔ الحمدللہ مولانا مرحوم کی یہ کوشش کامیاب ہوئی اور بورڈ کے مطالبے کو منظور کر کے حکومت نے مذکورہ فیصلے میں ترمیم کا آرڈر جاری کر دیا، جس کے باعث لکھنؤ کی دو مسجدیں، قبرستان اور جے پور کی مسجد مسلمانوں کے حوالے کر دی گئی اور ان کے دیگر مقامات بھی محفوظ ہو گئے۔

اسی طرح اپریل ۱۹۸۰ء میں جب اوقاف کی آمدنی کو بھی انکم ٹیکس کے دائرے میں لانے کی کوشش کی گئی اور ان مقامات پر خطرے کے بادل منڈلانے لگے تو مولانا مرحوم تڑپ اٹھے اور بورڈ کے ذمے داران سے مشورہ کر کے انھوں نے فوراً دفاعی کوششیں شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ آپ نے اس سلسلے میں پندرہ دن تک دہلی میں بھی قیام فرمایا تب کہیں جا کر یہ

مصیبت مسلمانوں کے سر سے ٹلی، حضرت امیر شریعتؒ بورڈ کے پلیٹ فارم سے مسلسل یہ جدوجہد کرتے رہے کہ اوقاف کے قانون میں حکومت ایسی ترمیم کردے جس کی رو سے وقف بورڈ کی بااختیار حیثیت نمایاں ہو اور مسلمانوں کے اوقاف ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائیں۔

ایسی ہی ایک زبردست کوشش حضرت مولانا نے نکاح کے سرکاری رجسٹریشن کے خلاف انجام دی۔ ۱۹۸۱ء میں جب نکاح کے سرکاری طور پر اندراج کرانے کو لازم کیا جانے لگا تو خطرہ ہوا کہ اس صورت میں کہیں اس کی شرعی حیثیت بالکل ہی مفقود نہ ہو جائے کیوں کہ پھر شرعاً صحیح و درست شادیاں تو محض اس بنیاد پر ناقابل اعتبار قرار پاتیں کہ حکومت میں ان کا اندراج نہیں ہے جب کہ بہت سے فاسد و باطل نکاحوں کو اس لیے معتبر قرار دیا جاتا کہ حکومت ان کو تسلیم کرتی ہے۔ یہ بلاشبہ پرسنل لا میں کھلی مداخلت تھی جس کے خلاف حضرت امیر شریعتؒ نے زوردار تحریک چلائی اور حکومت کو اپنا فیصلہ واپس لینے پر مجبور کردیا۔

لیکن افسوس اس فتح پر مسلمانان ہند راحت و آرام کا سانس بھی نہ لینے پائے تھے کہ ایک اور ناگہانی مصیبت ان کے گلے آپڑی جو اپنی المناکی، شدت غم اور درد و اضطراب میں پچھلی تمام قیامتوں سے بڑھ کر تھی۔ صوبائی حکومت نے اچانک بابری مسجد کا تالا کھول کر اس کے منبر و محراب میں ہندوؤں کو پوجا کی کھلی اجازت دے دی اور مسلمانوں کا وہاں داخلہ بھی ممنوع قرار پایا۔ ہندو فسطائی جماعتوں کو ایک بہترین موقع ہاتھ آگیا۔ رام مندر کے نام پر ملک میں یاترائیں ہونے لگیں، مسلمانوں کو ہراساں کیا جانے لگا، طاقت کے بل پر مسجد شہید کرنے کی دھمکیاں دی جانے لگیں، ظلم و ستم کا ایسا بازار گرم ہوا کہ اس کی مثال عہد قریب کی تاریخ میں نہیں ملتی، ناکامی، جھنجھلاہٹ اور باہمی اختلافات کو جنم دیتی ہے پھر اعتماد و اتفاق کے ساتھ ایک پل چلنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ چناں چہ حالات جب بد سے بدتر ہوتے گئے تو بابری مسجد ایکشن کمیٹی بھی تین دھڑوں میں تقسیم ہوگئی اور بعض شخصیات کے تعلق سے مسجد کا سودا کرنے کی چہ میگوئیاں سنی جانے لگیں۔ مسئلے کی حد درجہ سنگینی اور ملک کے مسلمانوں کے اصرار پر امیر شریعت مولانا رحمانی نے ۳؍ دسمبر ۱۹۹۰ء کو دہلی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ کی میٹنگ طلب کی، جس میں

مختلف مکاتب فکر کے علماء اور ایکشن کمیٹیوں کے ذمے داران کو بھی شریک کیا گیا۔ مولانا نے اپنی دوراندیشی، معاملہ فہمی اور حکمت وتدبر کے باعث اجلاس میں ایسی تین قراردادیں منظور کرائیں جو ذمے داران کی دلجوئی، اراکین کی حوصلہ افزائی اور امت کے اتحاد واتفاق کے ساتھ حکومت کو بھی واضح پیغام دیتی تھیں، انھوں نے ایک طرف قائدین کے گزشتہ اقدامات کو سراہا اور انھیں اتفاق کی تلقین کی تو دوسری سمت پوری قوت سے یہ بات کہی کہ مسجد اللہ کی ملکیت ہے جس میں کسی کو تبدیلی کرنے کا حق نہیں۔ پھر تاریخ بھی اس کے مسجد ہونے کی شہادت دیتی ہے۔ اس لیے قانوناً حکومت کی ذمے داری ہے کہ وہ ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء والی پوزیشن بحال کر کے بلا تاخیر بابری مسجد کو مسلمانوں کے حوالے کردے۔ تیسری جانب انھوں نے مسلمانوں کو یہ پیغام دیا کہ اس ملک میں وہ محض خدا کے بھروسے پر زندہ ہیں اگر کوئی فسطائی طاقت ان کی جان و مال پر حملہ کرے تو اللہ کا نام لے کر وہ اس بربریت کو پوری قوت سے روکیں۔ دفاع کے حق کو دنیا کا ہر قانون تسلیم کرتا ہے۔ اس اجلاس کے بعد باہمی کش مکش کا خاتمہ ہوگیا اور مسئلہ پوری طرح علماء کی گرفت میں آگیا۔ اب مولانا رحمانی علیہ الرحمہ نے ایک وفد کے ساتھ وزیر اعظم چندر شیکھر سے بھی ملاقات کر کے بابری مسجد کے قضیے کو پوری تفصیل کے ساتھ ان کے سامنے رکھا اور فسطائی طاقتوں پر لگام کسنے کی درخواست کی جس کا وزیر اعظم نے نامعقول جواب دیا۔ انھوں نے کہا ''ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک کنویں میں بھنگ ڈال دی گئی ہے اور ہندو مسلمان سب اسی سے پانی پی رہے ہیں۔'' یہ جواب بڑا ہی دل خراش اور ملت کے نمائندوں کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ مولانا رحمانیؒ کی غیرت جوش میں آگئی اور انھوں نے فرمایا: ''کیا حکومت نے بھی بھنگ پی رکھی ہے۔'' یہ سن کر چندر شیکھر کا مزاج ٹھکانے آیا اور انھوں نے پھر وفد سے سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کی۔ حضرت امیر شریعت کی خوش قسمتی تھی کہ وہ بابری مسجد کی شہادت سے پہلے ہی دنیا سے تشریف لے گئے ورنہ اس قیامت پر تو معلوم نہیں ان پر رنج وغم کے کیسے پہاڑ ٹوٹتے یا شاید یہ حادثہ نہیں ہوتا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ دشمنوں کی سازشیں اسی وقت کامیاب ہوتی ہیں جب کہ امت کا دینی شعور بیدار نہ ہو اور مادہ پرستی نے ایمانی قوتوں کو مفلوج کر دیا ہو۔ مولاناؒ اس راز سے اچھی

طرح واقف تھے۔ چناں چہ مسلمانوں میں ملی احساس کو جگانے کے لیے انھوں نے ایک طرف ''خاندانی منصوبہ بندی''، ''مسلم پرسنل لا''، ''یونیفارم سول کوڈ''، ''متبنی بل ایک جائزہ''، مسلم پرسنل لانئے مرحلے میں'' اور ''مسلم پرسنل لا بحث ونظر کے چند گوشے'' جیسی مدلل کتابیں لکھیں جو فکر ونظر میں بالیدگی، شعور میں بلندی اور احساس وادراک میں سوز پیدا کرتی ہیں تو دوسری سمت انھوں نے بورڈ کے پلیٹ فارم سے اصلاح معاشرہ کی تحریک بھی پوری قوت کے ساتھ چلائی تا کہ بے دینی کے خول سے نکل کر معاشرہ خالص شرعی بنیادوں پر قائم ہو اور دشمنوں کے لیے اس کا استحصال ممکن نہ رہے۔

حضرت امیر شریعتؒ کی ملی خدمات کا یہ ایک مختصر تعارف ہے جو اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ مولانا مرحوم نے مسلم پرسنل لا بورڈ کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا۔ اس کے قیام سے لے کر اپنے آخری ایام تک وہ بورڈ کے پلیٹ فارم سے مسلسل سرگرم رہے۔ امت مسلمہ کے لیے بیسیوں معرکے سر کیے حتی کہ زندگی کے آخری اسفار بھی ملت ہی کی نذر ہو گئے۔ دسمبر ۱۹۹۰ء کا جنوبی ہند کا طویل دورہ اور ۱۳ر فروری ۱۹۹۱ء میں ان کی لکھنؤ آمد اسی کی مثال ہے، جس کے ایک مہینہ بعد ہی وہ ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ یہ بلاشبہ کسی فرد کی نہیں بلکہ ایک عہد کی موت اور ایک دور کا خاتمہ تھا۔

——— ⊙⊙⊙ ———

مولانا مفتی احمد نادر القاسمی ☆

حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ اور مسلم پرسنل لا بورڈ

یوں تو اس کائنات ہست بود میں ہر مخلوق اللہ کا انعام اور عطیہ ہے مگر کچھ شخصیتیں بہ طور خاص انسانیت کے لیے اللہ کا انعام اور احسان ہوتی ہیں۔ مولانا منت اللہ رحمانی کی شخصیت ایسی ہی انعام تھی۔ اس نے اپنے پاکیزہ ذہن وفکر، علمی صلاحیت، زبان وقلم اور غیر معمولی سیاسی بصیرت سے آخری سانس تک انسانیت کی خدمت کے ذریعے یہ ثابت کردیا کہ واقعی وہ ''منت اللہ'' اور آیت من آیات اللہ تھے۔

مولانا کا جس خانوادے سے تعلق ہے وہ اہل علم اور طبقہ علماء کے لیے محتاج تعارف نہیں۔ راقم الحروف مولانا کے تحفظ شریعت کے اس تحریکی جذبے کو خاندانی پس منظر میں نہ تو دیکھنا چاہتا ہے اور نہ ہی اس کا موقع ہے، بلکہ محض شخصی زاویے سے وہ چند باتیں جو حضرت موصوف کی عبقری شخصیت کے تعلق سے دوران مطالعہ ذہن و دماغ اور قلب وجگر میں جگہ پائی ہیں انھیں ابھرنے والے نقوش کو اپنے غیر مربوط جملوں اور بے ربط سطروں میں آپ حضرات اہل علم اور اصحاب دانش وبینش کی نذر کرنا چاہتا ہے۔

☆ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا۔ نئی دہلی

مولانا رحمانیؒ اور تحفظ شریعت کا جذبہ

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ یا بالفاظ دیگر ہندوستان میں تحریک تحفظ شریعت کے کسی وجود اور مولانا علیہ الرحمہ کی ذات گرامی کو ایک دوسرے سے الگ کرکے نہیں سوچا جاسکتا، دونوں ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی شناخت ہی ہندوستان میں منت اللہ رحمانی سے ہے۔ ہندوستان کے مادی اعتبار سے پسماندہ مگر فکری، ذہنی اور علمی لحاظ سے مالا مال صوبۂ بہار سے تعلق رکھنے والی یہ شخصیت سراپا انقلاب، جدوجہد اور تحریک سے عبارت ہے، خالق کائنات نے موصوفؒ کے اندر فعالیت، حرکیت، جرأت اور دین محمدی کی بقا کے لیے جہد مسلسل کا جذبہ انسانی رگوں میں دوڑنے والے خون کی طرح بھر دیا تھا، آپ کے اندر تحفظ شریعت اور خدمت ملت کا یہی وہ تحریکی جذبہ تھا، جس کے فیض سے یہ ملت اپنے ملک میں اجتماعی زندگی کی لذتوں سے آشنا ہوئی۔ مولاناؒ اپنے اس جذبہ کا اظہار بڑی جرأت و بے باکی سے ہر دور میں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ اپنی ایک تقریر میں فرماتے ہیں:

> ''میں نے آزادی کے پہلے بھی کہا تھا اور آج بھی کہتا ہوں کہ آزاد ہندوستان کا خواب اسی وقت پورا ہوسکتا ہے جب آزاد ہندوستان میں اسلام آزاد ہو، ہمیں نہ حکومت کے دباؤ میں جینے والا اسلام منظور ہے اور نہ رسم ورواج میں جکڑا ہوا اسلام قابل قبول ہے، ہم صرف اس اسلام کے پابند ہیں جو قرآنی ہدایات اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کے مطابق ہے، ہم ایسی قانون سازی کو قبول نہیں کرسکتے جو قرآن کی تعلیمات اور رسول پاک کی ہدایات کے خلاف ہو اور ہم ایسے کسی رسم ورواج کو صحیح سمجھ سکتے ہیں جو شریعت اسلامیہ سے کسی درجے میں ٹکراتے ہوں، حکومت ہند اور مسلم سماج دونوں کو اپنے طرزِ عمل پر سوچنا چاہیے۔'' (دیکھئے: نقوش وتاثرات/ ۲۲۸)

اس طرح جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے ایک ساتھ حکومت اور

ہندوستانی مسلمان دونوں کو مخاطب کیا۔ انھوں نے ایک طرف مسلمانوں میں دین وایمان کے تحفظ کی اجتماعی شکل میں روح پھونکنے کی کوشش کی، ان کے خوابیدہ احساسات کو جگایا، حق شناسی اور ملی وقار کے ساتھ جینے کی طرف رہنمائی کی، اپنے مقام ومرتبہ کو پہچاننے اور صحیح اسلامی اسپرٹ کے ساتھ مسلم سماج تشکیل دینے کی آواز بلند کی، کتاب وسنت کو زندگی کا رہبر بنانے اور عملی زندگی میں داخل کرنے کی تلقین کی، تو دوسری طرف حکومت اورارباب اقتدار کو بھی چیلنج کیا کہ ہم مرد ناداں نہیں ہیں، جو چند کلیوں پر قناعت کرلیں۔ ہم اپنی مذہبی اور اسلامی زندگی میں محمد عربی ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کے پابند ہیں، خود تراشیدہ وہمی دفعات اور فلسفہ کے نہیں، محض زبانی اور دستوری طور پر اس بات کا تذکرہ کافی نہیں کہ ہندوستان کے ہر مذہب کے ماننے والے کو مذہب کے مطابق جینے اور ہر شہری کو مساویانہ حقوق دیے گئے ہیں۔ انھوں نے ایوان اقتدار تک اس سچائی کو پہنچایا کہ دستور ہند میں مساویانہ حقوق مسلمانوں پر احسان نہیں بلکہ وہ ملک کی ضرورت ہے، چناں چہ وہ فرماتے ہیں:

> ''دستور ہند میں مذہب پر یقین اور مذہب پر آزادی دی گئی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ مسلمانوں پر احسان کیا گیا ہے، مگر یہ دستور ملک کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہے، اور اس میں ملک کی ضرورتوں کی رعایت کی گئی ہے، اس لیے دستور میں مذہبی آزادی کا تذکرہ مسلمانوں پر احسان نہیں، بلکہ ملکی ضرورت کی تکمیل ہے۔''
>
> (نقوش وتاثرات/ ۳۳۸)

مولانا کو اس بات کا اچھی طرح اندازہ تھا، انھوں نے دستور ہند کو باریکی سے پڑھا تھا، ہندوستان کا دونوں دور اُن کے سامنے تھا، ان کی نگاہ دوررس نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کرلیا تھا کہ دستور ہند میں جو الفاظ مسلمانوں کے شرعی حقوق کے تئیں درج ہیں، ان میں بہت سی خامیاں ہیں اور ان خامیوں کا فائدہ اٹھا کر بقول حضرت قاضی مجاہد الاسلام علیہ الرحمہ ''بہت سے بیار ذہن ان چور دروازوں سے داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔ اور مسلم پرسنل لا میں مداخلت کی راہیں کھلیں گی۔ مولانا کی عقابی روح بیدار ہوئی اور ہندوستان کی فضا پر ایک حقیقت بن کر چھا

گئی۔اسی حقیقت کو اقبالؒ نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے:

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

وہ مردِ آہن جسے دنیا سید منت اللہ رحمانی، امیر شریعت رابع، امارت شرعیہ بہار واڑیسہ بانی و سابق جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے نام سے جانتی ہے۔ ملک کا وہ عظیم داعی اور بے لوث خادم تھا جو ۱۹۳۴ء کے زمانہ طالب علمی دارالعلوم دیو بند سے ہی ملت کے استحکام کی فکر و تدبیر کی آگ میں جلتا اور جھلستا رہا، مختلف میدانوں سے امت کو تحفظ شریعت اور ایک جھنڈے تلے جمع ہونے اور اپنی قوت کو مجتمع کرنے کی دعوت دیتا رہا اور یہی جذبات آخر کار ایک دن مسلم پرسنل لا جیسے متحدہ ملی پلیٹ فارم کی شکل میں ملت کی احیائی تاریخ کا حصہ بن گئے اور ملت میں نئی جان ڈال گئے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کا پس منظر

یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ برصغیر ہند و پاک میں ملت اسلامیہ کی جڑیں بہت مضبوط، بہت پرانی اور گہرائی تک پیوست ہیں۔ مگر اس خطہ کی یہ بدنصیبی ہی کہی جائے گی کہ جس تیزی کے ساتھ یہاں اسلام پھیلا اور جتنی بڑی تعداد میں بندگان خدا حلقہ بگوش اسلام ہوئے اسی تیزی کے ساتھ وہ اپنے دشمنوں کی فتنہ سامانیوں کے بھی شکار ہوتے گئے اور یہ بڑی بدنصیبی رہی کہ برصغیر میں کبھی نہ تو مسلمانوں نے خلافہ علی منہاج النبوۃ کی طرف توجہ دی اور نہ ہی کبھی پورے طور پر شرعی نظام نافذ ہو سکا، جس کا خمیازہ برصغیر کی مسلم امۃ کو یہ بھگتنا پڑا کہ مختلف زاویوں سے خود اپنے دور اقتدار میں اغیار کی سازشوں کا نشانہ بنتے اور رفتہ رفتہ کمزور ہوتے رہے۔ مگر ہر دور میں یہاں ایسے علماء ضرور پیدا ہوتے رہے، جنھوں نے ان فتنوں اور سازشوں کا بے جگری سے مقابلہ کیا، دین محمدی اور شریعت کی حفاظت کا فریضہ دین کی تجدید و احیاء کی شکل میں انجام دیا (حضرت شاہ ولی اللہ کی تجدیدی تحریک بھی اسی کا ایک حصہ ہے) اور مسلمانوں پر منڈلانے والے خطرے کو اپنی

بے بضاعتی اور بے سروسامانی کے باوجود ٹالنے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ سلطنت مغلیہ زوال پذیر ہوگئی اور جو کچھ بھی بچی کھچی مسلمانوں کی پونجی تھی وہ بھی ہاتھ سے نکل گئی۔ اور انگریز اس ملک پر مسلط ہو گئے اور چونکہ برادران وطن تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی اعتبار سے ہر تہذیب کے ساتھ ضم ہو جانے میں بڑی فراخ دلی رکھتے تھے، اس لیے فرنگیوں کے ساتھ سمجھوتا کر لینے میں ان کے لیے کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ اہل اسلام کے نزدیک ان کا مذہب ہمیشہ ہر چیز سے عزیز تر رہا ہے، اس لیے مذہبی معاملے میں مداخلت کرنے والی ہر قوت کے ساتھ متصادم رہنا ایک فطری بات تھی، لیکن اقتدار چونکہ ان کے ہاتھ میں تھا، لہٰذا انھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کے رشتۂ دین سے کمزور کرنے کے لیے مسلمانوں کے عائلی قوانین کو یکے بعد دیگرے ختم کرنے کی کوشش شروع کردی، اس میں سب سے پہلا تجربہ ۱۹۶۴ء میں ہائی کورٹ ایکٹ کے نفاذ کی شکل میں سامنے آیا۔ قاضی کے اختیارات منسوخ کر دیے گئے، مسلم پرسنل لا کی من مانی توضیحات شروع ہوگئیں۔ اس طرح مسلم پرسنل لا اور شرعی قوانین کے معاملے کو حکومتی عدالت کے حوالے کر دیا گیا، جو انگریزوں کی جابرانہ پالیسی کا حصہ تھا۔

مگر مسلمانوں کی مذہبی غیرت اور ایمانی پختگی ہر مقام پر اس وقت بھی حائل رہی اور ملک میں قانونی حیثیت سے بے دست و پا ہونے کے باوجود اپنے ایمان وعقیدے کے ساتھ وہ ڈٹے رہے۔ بالآخر ۱۸۶۰ء سے ۱۸۷۰ء کی دہائی میں چار بار رائل کمیشن بیٹھنے کے بعد انگریزوں نے یہ فیصلہ کیا کہ مسلمان عائلی قوانین میں ''قانون شریعت'' اور ہندو ''دھرم شاستر'' پر عمل کریں گے۔

پھر ہندوستان مشترکہ جدوجہد کے نتیجے میں آزاد ہوا، مگر آزادی کے بعد وہ عناصر جو برٹش دور میں کلیتاً مسلمانوں کے تہذیبی اور مذہبی تشخصات کو مٹانے میں اندرونی طور پر انگریز کے حامی تھے انہوں نے پھر سر ابھارا اور سب سے پہلے اس بدنیتی کا آغاز دستور ہند کی ہدایاتی دفعہ ۴۴ کے ذریعہ ہوا، جس میں یکساں سول کوڈ کی بات کہی گئی تھی اسی کا سہارا لیکر کبھی کبھی مرکزی وزراء اور بعض فرقہ پرست عناصر کے ساتھ ساتھ تجدد پسند مسلمانوں نے بھی ملک میں یونیفارم سول کوڈ کی آواز رہ رہ کر اٹھائی ان کوششوں کا نوٹس سب سے پہلے حضرت مولانا منت

اللہ رحمانیؒ امیر شریعت نے لیا، آپ نے اپنی تقریروں اور بیانات کے ذریعہ معاملہ کی نزاکت کو واضح کیا اور ۲۸/ جولائی ۱۹۶۳ء کو کل جماعتی مسلم پرسنل لا کنونشن انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ میں منعقد کیا یہ اجلاس سنگ میل ثابت ہوا اور عوام کے علاوہ علمائے کرام نے بھی یونیفارم سول کوڈ کے سلسلہ میں اچھی واقفیت حاصل کی، علمائے کرام نے اسکو اپنی تقریروں کا موضوع بنایا اور ملک میں عام بیداری پیدا ہوئی۔

یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ کی کوشش خود مرکزی حکومت کے ذہن میں تھی اور وقتاً فوقتاً سرکاری اور نیم سرکاری لوگ اس مسئلہ کو اٹھاتے رہے، حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ صاحب رحمانیؒ اس صورتحال پر بہت متفکر تھے انہوں نے ۱۹۷۲ء کے شروع میں دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو تفصیلی خط لکھا جسمیں انہوں نے لکھا کہ آزاد ہندوستان میں اب دین وشریعت کا خاتمہ قانونی طور پر ہونے والا ہے، حکومت کی نگاہ بد میں یہ چیز آچکی ہے اور وہ آئین ہند کی ایک کمزور دفعہ کے سہارے مسلم پرسنل لا میں تبدیلی لانا چاہتی ہے یہ دارالعلوم دیوبند کا مقام ومنصب ہے کہ وہ خدمت کے اس بڑے میدان کو چیلنج سمجھ کر قبول کرے مختلف مسلک ومشرب کے لوگوں کو جوڑا جائے، اور تحفظ مسلم پرسنل لا کی تحریک چلائی جائے، انہوں نے یہ بھی لکھا کہ ہم لوگ اپنی بساط بھر اس کام کو انجام دینے کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے اس خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا کہ یہ کام بے حد اہم ہے لیکن دارالعلوم دیوبند کا مزاج تدریسی ہے تحریکی نہیں ہے اس خط کے جواب میں حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانیؒ دیوبند پہونچ گئے اور وہاں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اور سینئر اساتذہ سے گفتگو فرمائی۔ اور یہ طے پایا کہ دارالعلوم دیوبند میں منتخب علماء کی چھوٹی سی نشست طلب کی جائے، واپسی میں آپ نے دہلی رک کر حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت مولانا ابواللیث صاحب اصلاحیؒ، جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحبؒ ایم پی، اور دوسرے حضرات سے ملاقاتیں کیں اور سبھوں نے اتفاق کیا کہ رخ صحیح نہیں جارہا ہے اور صورتحال نازک ہے ان حضرات نے اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا پھر

دیوبند میں مجوزہ علماء کا مختصر اجلاس ہوا اور اس میں طے پایا کہ بمبئی میں مسلم پرسنل لا کنونشن منعقد کیا جائے چونکہ مہاراشٹر سے بار بار مسلم پرسنل لا میں ترمیم کی آواز بلند ہورہی تھی اس لئے کنونشن کے انعقاد کے لئے بمبئی کا انتخاب بہت مناسب تھا۔

مہینوں کی جدوجہد کے بعد مختلف مسلک ومشرب کے علماء کو جوڑا گیا، دانشوروں کو معاملات کی نزاکت سمجھائی گئی مہاراشٹر میں علماء اور ائمہ مساجد کے ذریعہ خاص طور پر ذہن سازی کی گئی اوران تیاریوں کے بعد ۲۷/۲۸ر دسمبر ۱۹۷۲ء کوآل انڈیا مسلم پرسنل لا کنونشن منعقد ہوا جس کے صدر استقبالیہ ڈاکٹر یوسف نجم الدین صاحب (بوہرہ جماعت) اور صدر اجلاس حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ تھے۔ کنونشن کی تیاریوں میں ممبئی کے علمائے کرام اور ائمہ حضرات کا بڑا حصہ رہا اور بابائے قوم جناب یوسف پٹیل صاحب اور جناب عبدالستار یوسف شیخ صاحب نے بڑی نمایاں خدمات انجام دیں اسی کنونشن میں اور تجویزوں کے علاوہ یہ تجویز بھی منظور ہوئی کہ مسلم پرسنل لا کی حفاظت کے لئے تمام مسلک ومشرب کے نمائندوں پر مشتمل آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں لایا جائے اور ۷؍اپریل ۱۹۷۳ کو شہر حیدرآباد میں باضابطہ بورڈ کی تشکیل ہوئی اور ملک کے ایک سو دو مایہ ناز علماء، صلحاء، اتقیاء اور یونیورسٹیز کے فضلاء پر مشتمل بورڈ بنایا گیا۔ (دیکھئے ملی اتحاد خصوصی ضمیمہ شمارہ نمبر ۲۰۰۰ء)۔ اسی اجلاس میں اتفاق رائے سے حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کو بورڈ کا صدر اور حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہما الرحمۃ کو جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔ اس طرح اگر مسلم پرسنل لا کی ۳۲، ۳۳ سالہ زندگی، بورڈ کی کوششوں کا جائزہ اور اس وقت کے ہندوستان کے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ اور ہندوستان میں تحفظ شریعت کی اجتماعی کوشش کا تصور سب سے پہلے شیخ طریقت مجدد ملت عارف باللہ نمونہ اسلاف حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ نے پیش کیا اور اس وقت ہندوستان میں سب سے قدآور شخصیت حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کی اور نمائندہ ادارہ دارالعلوم دیوبند ہی تھا اور آج بھی ہے۔ مولانا کو اس کا اطمینان تھا کہ یہ ادارہ اس باب میں سرپرستی کا فریضہ انجام دے سکتا اور مرکزی کردار ادا کرسکتا ہے، لہٰذا ان کی نگاہ انتخاب

حضرت حکیم الاسلام نور اللہ پر مرکوز ہوئی اور پھر بفضل خدا وہی ہوا جو امیر شریعتؒ نے سوچا تھا، دنیا نے اپنی آنکھوں سے ان دونوں بزرگوں کے اخلاص وللٰہیت، احیاء امت اور تحفظ شریعت کے تئیں بے لوث جذبات کو دیکھا اور ملت کا اتحاد بھی دیکھا۔

قائدین ملت اور علماء کے اس اتحاد نے ان تمام قیاس آرائیوں کو غلط ثابت کر دیا کہ امت میں اب اتحاد ممکن نہیں۔

کام کا آغاز اور طریقہ کار

حضرت مولاناؒ کی قیادت اور حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کی صدارت میں بورڈ نے سب سے پہلے مسلمانوں کو اسلامی شریعت کی اہمیت بتانے، معاشرے کی اصلاح اور کتاب و سنت کی اساس پر اسلامی معاشرہ تشکیل دینے کی جانب توجہ دلانے سے اپنے مشن کا آغاز کیا، بورڈ نے چونکہ اپنے منشور میں افرادی قوت اور ممکنہ وسائل کی روشنی میں مسلم پرسنل لا کے تحفظ اور مسلمانوں کو شرعی احکام اور اسلامی اخلاق و اقدار پر مبنی اصول زندگی سے واقف کرانا، عائلی قوانین کو پوری جامعیت کے ساتھ نفاذ کے لیے ملکی سطح پر عملی اقدام کرنا اپنا ہدف طے کیا تھا۔ لہٰذا سید منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ نے اسی نہج اور پیٹرن (Pattern) پر کام شروع کیا اور ہمت وحوصلہ، جرأت ولگن، کردار و گفتار اور مؤثر اقدامات کے ذریعے بڑی کامیابی کے ساتھ ملی کارواں کو ۱۹۷۲ء سے تادم حیات (۱۹/ مارچ ۱۹۹۱ء) تک آگے بڑھاتے رہے، زندگی کے سفر میں ہر لمحہ ان کا اوڑھنا بچھونا اور رخت سفر ملت اسلامیہ ہندیہ کی آبیاری، شریعت کا تحفظ اور مسلم پرسنل لا کے پلیٹ فارم سے نفاذ شریعت رہا، یہاں تک کہ راتوں کی نیندیں اور دن کا سکون سب بورڈ ہی کے استحکام کی نذر رہتے تھے جو ایک قائد کی خصوصیت ہوتی ہے۔ اسی بات کو علامہ اقبالؒ نے اپنے اس شعر میں کہا ہے:

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پر سوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

آپ ملی کارواں کے ایسے سالار اعلیٰ تھے، جنھوں نے حالات سے سمجھوتا کرنا اور پیچھے مڑ کر دیکھنا سیکھا ہی نہیں تھا، مختلف مسالک و مذاہب میں بٹی ہوئی ملت، متضاد فکری نظریات رکھنے والی قوم اور مدتوں غلامی اور پسماندگی جیسے چکی کے دو پاٹوں میں پسے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت اور ان کی تنظیم کس قدر دشوار ہے۔ آپ کو اس کا اچھی طرح اندازہ ہے، اس مختلف الخیال قوم کے درمیان اتحاد و اتفاق کا علم لے کر میدان عمل میں جوش جنوں اور دردمندی کے ساتھ منزل کی تلاش میں سرگرداں کوئی سچا اور مخلص قائد ہی رہ سکتا ہے، جس کے اندر قافلہ کی سالاری کی پوری لیاقت موجود ہو۔ مولانا نے پورے طور پر اپنے عمل سے بورڈ کے اس قافلہ کو اچھی طرح یہ احساس دلایا کہ:

منزل راہ رواں دور بھی دشوار بھی ہے
کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے

اور مولانا کا یہی انداز مجنونانہ و خسروانہ، یقین محکم اور عمل پیہم مسلم پرسنل لا بورڈ کی اور اس کے پلیٹ فارم سے ملی قیادت کی کامیابی کا راز تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ مسلمانوں کا متحدہ اور متفقہ پلیٹ فارم بن گیا۔ بنجر زمین لہلہا اٹھی، مایوسی کا طلسم ٹوٹا اور ملت ایک بار پھر تازہ دم ہوگئی۔ کسی نے سچ کہا ہے:

جب موسم گل میں جوش جنوں بڑھتا ہے ترے دیوانوں کا
سب رشک چمن بن جاتا ہے پل بھر میں سماں ویرانوں کا

اور اپنے اس نشانے کو پانے کے لیے اپنی تقاریر، اسفار، سمینار اور اجتماعات کے ساتھ ساتھ جن حالات نے جس چیز کا تقاضا کیا اس کے مطابق آپ نے قیمتی تحریریں مرتب فرمائیں، چنانچہ آپ کی ان تحریروں میں ''مسلم پرسنل لا کا مسئلہ نئے مرحلہ میں، مسلم پرسنل لا، مسلم پرسنل لا بحث و نظر کے چند گوشے، متبنیٰ بل ۱۹۷۲ء ایک جائزہ، خاندانی منصوبہ بندی، یونیفارم سول کوڈ، قانون شریعت کے مصادر اور نئے مسائل، نکاح و طلاق، تحفظ دین کا منصوبہ وغیرہ کتابیں تحریک تحفظ شریعت کے لیے ایک جامع نصاب کا درجہ رکھتی ہیں اور جو نہ صرف مسلم پرسنل لا کے لیے

ناگزیر سرمایہ ہیں بلکہ پوری امت کے لیے چراغ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے پلیٹ فارم سے جدوجہد اور کامیابیاں

یوں تو حضرت مولانا علیہ الرحمہ نے بورڈ کی کامیابی اور اس کے بینر تلے جس طرح ملت کو مستحکم کرنے کی کوشش کی اور جو کامیابیاں انھیں ملیں، بورڈ خود اس کی منہ بولتی تصویر ہے، جس کے لیے یہ کہنا ذرہ برابر مبالغہ نہ ہوگا کہ آج جو کچھ بھی اپنوں اور اغیار کی نظر میں اس متحدہ پلیٹ فارم کی اہمیت اور سیاسی وقعت ہے وہ مولانا کے ہی جہد وعمل کا ثمرہ اور بورڈ کی فکری قیادت کا نتیجہ ہے، بقول مولانا محمد برہان الدین سنبھلی حفظہ اللہ: ''اب تک کے بورڈ کے کارنامے گویا امیر شریعت ہی کے کارنامے کہلانے کے مستحق ہیں۔'' (دیکھئے خصوصی شمارہ ''نقیب'' حضرت امیر شریعت رابع حیات وخدمات/۷۷)

روز اول سے ہی مولانا نے بورڈ کو مقصد زندگی بنایا۔ حالاں کہ جہاں تک مصروفیات کا تعلق ہے تو ایک طرف جامعہ رحمانی مونگیر، امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کی ذمے داری تو دوسری طرف سیکڑوں بہار واڑیسہ اور بنگال کے مدارس کی سرپرستی، مگر کبھی بھی اپنے عمل اور کردار سے ایسا محسوس نہیں ہونے دیا کہ انھوں نے کہیں بھی، کسی بھی مرحلے میں کوئی کوتاہی کی ہو۔

قارئین جانتے ہیں کہ ادارتی امور میں سکریٹری شپ کی ذمے داری کتنی اہم ہوتی ہے، ادارے کا سارا نظام سکریٹری سے متحرک رہتا ہے۔ دراصل بورڈ کی کامیابی کے درپردہ مولانا کی دو خصوصیات ایک ساتھ حرکت پذیر رہیں: ایک ذمے داری کو پوری دیانت داری کے ساتھ نباہنا اور اپنی ذمے داری کے تئیں ہمہ وقت مستعد رہنا اور دوسرے ملت کو مستحکم کرنے کا مخلصانہ جذبہ، مولاناؒ کے ان دونوں صفات محمودہ نے بھرپور اپنے جوہر دکھائے اور بورڈ کو عروج وترقی تک پہنچایا، جس کی گونج عرب وعجم ہی نہیں بلکہ دنیا کے کونے کونے اور دور دراز ملکوں تک مختصر مدت میں سنائی دینے لگی، ایک عرب عالم شیخ یوسف سید ہاشم الرفائی (کویت) ۱۹۸۸ء کی بورڈ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی تحریر میں فرماتے ہیں:

''اس وقت یہی بورڈ متفقہ طور پر مسلمانان ہند کی نمائندگی کا فریضہ حسن وخوبی کے ساتھ انجام دے رہا ہے، جس میں تمام جماعتوں، تنظیموں اور اسلامی انجمنوں کے سربراہان؛ مدارس وتعلیم گاہوں کے ذمے داران، گروہوں، طبقوں اور مسلمان فرقوں کے نمائندے شریک ہیں، بورڈ مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لیے پوری طرح چوکس اور سرگرم عمل ہے۔'' (دیکھئے ہفت روزہ البلاغ کویت (عربی) شمارہ ۱۴۱ جمادی الاول ۱۴۰۸ مطابق ۲/ جنوری ۱۹۸۸ اردو ترجمہ مولانا محمد علاء الدین ندوی۔ نقوش وتاثرات/۱۲۴۔''

مولانا نے کم وبیش ۱۷ سال بورڈ کی ذمے داری نبھائی، بورڈ کے قیام سے قبل اور بعد میں پوری طرح اس میدان کے شہسوار رہے اور اس جواں مردی کے ساتھ کام کیا کہ کم از کم آزاد ہندوستان میں اس کی نظیر نہیں پیش کی جاسکتی، بہ طور مثال چند اقدامات کی طرف ذیل میں اشارہ کیا جاتا ہے:

تحفظ شریعت کی جانب پہلا قدم

اس سے پہلے راقم الحروف نے ''بانیان مسلم پرسنل لا بورڈ'' کے ضمن میں یہ بات لکھی تھی کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کے لیے سب سے پہلے مولانا منت اللہ رحمانی نے پیش قدمی کی۔ اس سے پہلے کسی نے عملی قدم نہیں اٹھایا تھا (ممکن ہے تحریری طور پر اس کا اظہار کیا جاتا رہا ہو) جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ جب ۱۹۵۶ء میں ہندو کوڈ بل پاس ہونے کے بعد مرکزی حکومت کی جانب سے یکساں سول کوڈ کے لیے ۱۹۶۳ء میں باضابطہ ایک کمیشن مقرر کرنے کا اعلان کیا گیا تو مولانا نے اس کے ردعمل میں ۲۸ رجولائی ۱۹۶۳ء کو امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے زیر اہتمام انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ میں اس کمیشن کی مذمت میں کنونشن منعقد کیا، جس کی صدارت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی علیہ الرحمہ نے فرمائی اور اس کونشن کے ذریعے حکومت کی بدنیتی کو مولانا نے

اپنی دانش مندی، بیدار مغزی اور ملی وقومی بیداری کے تناظر میں دنیا کے سامنے بے نقاب کیا۔ اور دو تاریخی اور حوصلہ افزا تجویزیں منظور کیں، جن کے الفاظ یہ تھے:

(۱) حکومت ہند نے مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کے لیے کمیشن کے تقرر کا اعلان کر کے انتہائی غلط اقدام کیا ہے، اجلاس متفقہ طور سے اس رائے کا اظہار کرنا چاہتا ہے کہ مسلمان مسلم پرسنل لا میں کسی تبدیلی کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

(۲) یہ کنونشن مسلمانوں کے ان نادان دوستوں کی روش پر اپنی بیزاری اور افسوس کا اظہار کرتا ہے، جو جدت پسندی کے جنون میں مسلم پرسنل لا میں ترمیم کے غلط مشورے دے رہے ہیں۔ ان دونوں تجویزوں کا یہ اثر ہوا کہ ۱۹۶۳ء کے وزیر قانون مسٹر اشوک کمار سین کو راجیہ سبھا میں تردیدی بیان جاری کرنا پڑا کہ حکومت نے ایسی کسی بھی کمیٹی کے تقرر کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔'' (دیکھئے: نقوش و تاثرات، مرتب عطاء الرحمٰن قاسمی/ ۴۴۸)۔

دوسرا قدم (متبنیٰ بل کے خلاف تحریک)

۲۳ رمئی ۱۹۷۲ء کو راجیہ سبھا میں متبنی بل کا مسودہ پیش ہوا اور اس بل میں متبنی کے سلسلے میں جو تصور پیش کیا گیا، اس کے الفاظ یہ تھے:

''ہندو قانون تبنیت ونفقہ ۱۹۵۶ء کی جگہ یہ نیا قانون یکساں شہری قانون کی حیثیت سے ملک کے تمام شہریوں پر نافذ ہوگا، یہ مسودہ قانون یکساں سول کوڈ کے لیے پہلا مضبوط قدم ہے۔''

مسلم پرسنل لا کی تحریک میں مزید تیزی آگئی اور عروس البلاد ممبئی میں تاریخ ساز کنونشن ۲۷، ۲۸ ردسمبر ۱۹۷۲ء کو ہوا اور پوری امت نے بے نظیر اتحاد کا ثبوت دیا اور اس کنونشن میں اس بل کی پوری قوت کے ساتھ مخالفت کرتے ہوئے یہ قرارداد منظور کی گئی:

''قانون تبنیت ۱۹۷۲ء کو اپنی موجودہ شکل میں یہ اجلاس قانون شریعت میں
مداخلت سمجھتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔''

دوسری طرف بورڈ نے پورے ملک میں رائے عامہ کو ہموار کیا، حیدرآباد، الہ آباد، بھوپال، بنگلور، رانچی، دہلی اور پونے میں اس نے اجتماعات منعقد کیے۔ بورڈ کی مسلسل کوششوں اور مسلمانوں کے اس اتحادی مظاہرے نے حکومت کو پارلیمانی سلیکٹ کمیٹی قائم کرنے پر مجبور کیا اور بالآخر اس بل کی مخالفت کو معقول تسلیم کرتے ہوئے ۱۹۷۸ء کی جنتا پارٹی کی حکومت میں اس وقت کے وزیر قانون اشوک شانتی بھوشن نے پارلیمنٹ میں یہ اعلان کرتے ہوئے کہا کہ:

''اسلامی فقہ متبنیٰ کو وراثتی حقوق عطا نہیں کرتی، یہ قانون مسلمانوں کے جذبات کے مغائر ہے، اس لیے واپس لیا جارہا ہے۔''

واپس لیا اور پھر ۱۶/دسمبر ۱۹۸۰ء میں جب کانگریس دوبارہ اقتدار میں آئی تو پی شیو شنکر کے ذریعے وہ بل دوبارہ پیش تو ہوا لیکن مسلمانوں کو کلیتاً اس سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا، یہ بورڈ کی اپنے وجود کو منوانے کی جانب اہم اور ٹھوس کامیابی تھی۔

تیسرا اقدام (لازمی نسبندی کے خلاف تحریک)

۱۹۷۵ء میں کانگریس کی سرکار تھی حکومت نے جون ۱۹۸۵ء کو لازمی نسبندی کے سلسلے میں ایمر جنسی نافذ کردی، انسانیت کی تاریخ میں ایسی ذلیل حرکت دنیا نے کبھی نہیں دیکھی تھی، جس سے ہندوستانی عوام دوچار ہوئے کہ جبراً ان کی نسبندی کرنے کو قانونی حیثیت سے جواز فراہم کیا گیا اور اس کے لیے ایمر جنسی نافذ کی گئی، حکومت کے اس جبری اقدام پر انسانیت تھرا گئی، اس کے خلاف آواز بلند کرنے کی کسی میں ہمت نہیں ہو رہی تھی، ایسے ناگفتہ بہ حالات میں مولانا نے بورڈ کے پلیٹ فارم سے جس جرأت وہمت اور بلند حوصلگی کا مظاہرہ کیا، ملک کا ہر شہری اس وقت خوف وہراس کی فضا میں سانس لے رہا تھا۔ اخبارات دم بخود تھے۔ علماء خاموش اور قائدین کے ہونٹوں پر قفل لگ گئے تھے، ایسے پر خطر حالات میں ۱۷، ۱۸/اپریل ۱۹۷۶ء کو درگاہ شاہ ولی اللہ دہلی کی

بابرکت فضا میں بورڈ کی مجلس عاملہ کا اجلاس بلایا، ارباب افتا اور مقتدر علماء نے شرکت کی اور جبری نسبندی کے خلاف فتوے کی شکل میں آواز بلند کی۔ حضرت علیہ الرحمہ نے مختلف مقامات پر تقریریں کیں، ملی جماعتوں، تنظیموں اور ائمہ مساجد کے ذریعے مسلم عوام تک نسبندی کی شرعی حیثیت کو اجاگر کیا۔ ایک رسالہ ''خاندانی منصوبہ بندی'' کے نام سے تحریر فرمایا اور برتھ کنٹرول یا خاندانی منصوبہ بندی کے اسلامی موقف کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا، اس کے بعد ۹/اکتوبر ۱۹۷۶ء کو حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کا ایک انٹرویو ریڈیو پر نشر ہوا، اس کو اس طرح پیش کیا گیا کہ جس سے نس بندی کے جواز کا گمان ہونے لگا۔ اس پر پھر مولاناؒ نے ایک وضاحتی بیان شائع کیا اور بڑی جرأت مندی کے ساتھ حکومت کی سازش کو بے نقاب کیا اور ملت کی بروقت اور ہوش مند قائد کی طرح رہنمائی فرمائی۔

چوتھا قدم (مساجد و مقابر کے تحفظ کی کوشش)

اکتوبر ۱۹۷۸ء میں جب الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ نے وہاں کی کارپوریشن کو لکھنؤ کی دو مساجد اور قبرستان اور جے پور راجستھان کی ایک جامع مسجد کو سلب کر کے مفاد عامہ میں لینے کا فیصلہ دیا، جو ایک غیر منصفانہ اقدام تھا، تو اس کے ردعمل میں جنرل سکریٹری بورڈ نے ایک گشتی مراسلہ کے ذریعے مسلمانان ہند کو خبردار کیا، ارباب اقتدار کو اس کے خلاف ٹیلی گرام بھیجنے کی اپیل کی، خاموش جلوس نکالے گئے، اجتماعات کا انعقاد ہوا، یہاں تک کہ اس مدبر قوم نے وزیر اعظم کو میمورنڈم پیش کیا، جس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ لینڈ ایکویزیشن ایکٹ میں ایسی ترمیم کی جائے کہ ہر مذہب کے مقدس مقامات محفوظ ہو جائیں، اس معاملے کو اس خوب صورتی، دانشمندی اور تدبر کے ساتھ ایوان اقتدار تک پہنچایا کہ رام نریش یادو اور بھیرو سنگھ شیخاوت وزیر اعلیٰ راجستھان نے موصوف جنرل سکریٹری علیہ الرحمہ کو خود خط لکھا کہ:

> ''ضروری کارروائی کا حکم دے دیا گیا ہے، سابقہ نوٹس کی اصلاح کی جارہی ہے اور حکومت کا مسجد ایکوائر کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' (دیکھئے نقوش د

تاثرات/۴۵۹)"

اور پھر یہ تمام مقدس مقامات مسلمانوں کو واپس ملے، یہ دراصل حضرت امیر شریعت علیہ الرحمہ کی بروقت کارروائی اور ایمانی بصیرت کا ہی نتیجہ تھا۔

پانچواں قدم (اوقافی جائداد کو انکم ٹیکس سے مستثنیٰ کروانا)

انکم ٹیکس کے قانون (اپریل ۱۹۸۰) کے مطابق ان اوقافی جائدادوں کو انکم ٹیکس ادا کرنے والی پراپرٹیز کے زمرے میں شامل کیے جانے کی بات کہی گئی جن کی آمدنی میں اضافہ ہوا ہو، حکومت نے اس کے لیے یہ چال چلی کہ جن اوقاف کی آمدنیوں میں اضافہ ہوا ہے یا تو اسے انڈین بینک میں فکسڈ ڈپازٹ پر رکھ دیا جائے۔ ظاہر ہے اس کا فائدہ بھی گورنمنٹ کو ملتا، یا پھر ان پر انکم ٹیکس لاگو ہو، اس کا نقصان یہ ہوتا کہ اس طرح اوقافی جائداد رفتہ رفتہ مسلمانوں کی ملکیت سے نکل جاتی۔ حضرت امیر شریعت علیہ الرحمہ نے اس بلا کو ٹالنے کے لیے فوری اقدام کیا، اس وقت کی وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی سے ملاقات کی اور میمورنڈم پیش کیا۔ مولانا نیاز احمد رحمانی کے بقول جو مولانا کے ساتھ تھے، اسی وقت محترمہ وزیر اعظم نے آر وینکٹ رمن کو جو وزیر مالیات تھے، فون کیا اور اوقافی جائدادوں سے انکم ٹیکس کو ختم کیا گیا۔ (آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ خدمات اور سرگرمیاں/۲۴، نقوش وتاثرات/۴۶۲)

چھٹا قدم (قانون وقف میں اصلاح)

بورڈ کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ ہندوستان میں جو مسلمانوں کی اوقافی جائدادیں ہیں ان کو پوری طرح تحفظ حاصل ہو اور یہ چیز اوقاف کے جمہوری کردار سے ہی فراہم ہو سکتی تھی۔ ۱۹۸۴ء میں وقف ترمیمی بل پارلیمنٹ میں پیش ہوا اگرچہ اس بل کی سیاسی حلقوں میں ستائش کی گئی، مگر اس میں بے شمار خامیاں ہی نہیں تھیں بلکہ اس کی رو سے وقف کی جمہوری حیثیت بالکلیہ ختم ہو رہی تھی، اتفاق سے اس بل کو پارلیمنٹ سے منظور کرالیا گیا، اس پر مسلمانوں کا

مضطرب ہونا یقینی اور فطری امر تھا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مسلمانوں نے اس کا اچھی طرح ادراک کرلیا کہ اس کی وجہ سے مستقبل میں اوقاف کو خطرات لاحق ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ جنرل سکریٹری نے اس بل کے منظور ہوتے ہی اس جانب توجہ کی، صدر جمہوریہ، وزیراعظم اور دیگر ارباب سیاست ومنسٹرس کو ٹیلی گرام بھیج کر اپنا موقف واضح کیا اور پورے ملک کے اہم اداروں کو متوجہ کیا کہ وہ بھی ٹیلی گرام بھیجیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بالآخر صدر جمہوریہ کے دستخط کردینے کے باوجود ان کی جدوجہد سے اس بل کے نفاذ کو رکوایا گیا اور اس بل میں جو مفید پہلو تھے اس کے نفاذ کی بات کہی گئی۔

ساتواں قدم (نکاح کے لازمی رجسٹریشن کے خلاف کوشش)

واقعہ یوں تھا کہ یوپی کی حکومت نے اکتوبر ۱۹۸۱ میں مرکزی حکومت سے گزارش کی کہ نکاح سے متعلق ایک قانونی بل لایا جائے، جس میں ملک میں ہونے والے نکاح کا رجسٹریشن لازما اندراج ہوتا کہ نکاح کا ریکارڈ حکومت کے پاس موجود رہے اس بابت سب سے پہلے علماء کی ذمے داری بنتی تھی کہ وہ نکاح کی شرعی حیثیت متعین کریں اور پھر حکومت سے بات چیت ہو، چنانچہ حضرت امیر شریعت علیہ الرحمہ نے مورخہ ۴ر نومبر ۱۹۸۱ء کو ملک کے اہم علما کے نام خطوط جاری کیے جس میں علماء اور مفتیان سے اس بارے میں رائے طلب کی گئی اور علماء نے اس کے جوابات بھیجے۔ ۴،۵ر دسمبر ۱۹۸۲ کو بورڈ کی مجلس عاملہ میں اس پر غور ہوا اور غور وخوض کے بعد ایک رپورٹ تیار کی گئی جو مدراس کے بورڈ کے اجلاس میں پیش ہوئی۔ یوں تو بورڈ نے ۶ر دسمبر ۱۹۸۱ء اور ۲۸ر جولائی ۱۹۹۰ء کو آخری بار مغربی بنگال کی حکومت کے بعض بہی خواہوں نے اس بل کا مسودہ تیار کرلیا، جنرل سکریٹری موصوف کے بروقت اقدام کے نتیجے میں یہ طوفان بھی تھم گیا اور ۱۳ر ستمبر ۱۹۹۰ء کو حکومت مغربی بنگال نے بھی بیان دیا اور باضابطہ حضرت امیر شریعتؒ کو اطلاع دی کہ اب حکومت کا لازمی نکاح رجسٹریشن بل لانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے (دیکھیے: خدمات اور سرگرمیاں/۳۴، نقوش وتاثرات/ ۴۶۵)۔

آٹھواں قدم (مطلقہ کے لیے تادم حیات نفقہ کا مسئلہ)

۲۳/اپریل ۱۹۸۵ء میں سپریم کورٹ کے آئینی بنچ میں ہند کی دفعہ (۱۲۵) کی بنیاد پر مسلم پرسنل لا میں مداخلت کرتے ہوئے مشہور زمانہ شاہ بانو کیس میں یہ فیصلہ سنایا کہ مطلقہ اگر صاحب استطاعت نہ ہو اور سابق شوہر باحیثیت ہو تو تاوقتیکہ مطلقہ دوسری شادی نہیں کرتی یا شادی کے لائق نہ ہو تو پوری زندگی سابق شوہر پر اس کی کفالت لازم ہوگی۔ چونکہ شرع اسلامی جس کی بنیاد کتاب وسنت پر ہے، میں مطلقہ کا نفقہ سابق شوہر پر صرف اسی وقت تک ہے، جب تک کہ وہ عدت میں ہو۔ اس فیصلے سے سپریم کورٹ نے نہ صرف یہ کہ پرسنل لا کی مخالفت کی بلکہ قانون فطرت اور انسانی اصول زندگی سے انحراف کیا۔ آیت قرآنی کی من مانی تفسیر کی۔ یہ جسارت جسٹس چندر چور نے کی تھی۔ ہر شر کے پیچھے خیر اور ''ان مع العسر یسرا'' کے اصول کے مطابق سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ بھی بورڈ کی ترقی اور عروج کا باعث بنا۔ ملک میں گلی گلی اور کوچے کوچے میں اس کی آواز گونجنے لگی، جن لوگوں نے اس وقت کے مسلمانوں کے جوش وخروش دیکھے ہیں ان کی شہادت کے مطابق مسلمانوں میں اس طرح کا جوش اور اپنے مذہب کے تئیں بیداری کا مظاہرہ آزاد ہندوستان میں پہلی بار دیکھنے کو ملا۔ اس میں بھی حضرت امیر شریعتؒ کی کاوش صحت کی ناہمواری کے باوجود پورے طور پر شامل رہی۔ جگہ جگہ تقریریں کیں، اسفار کیے اور مسلمانوں کو اس کے لیے تیار کرنے کا کام حضرت موصوف نے بہ خوبی انجام دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس تحریک میں مرد، عورت، بوڑھے اور بچے سب یک آواز ہو گئے اور آخر کار حکومت ہند نے ۶/مئی ۱۹۸۶ء کو قانون حقوق مسلم مطلقہ ایکٹ پاس کر کے سپریم کورٹ کے تادم حیات نفقہ کے قانون کو رد کیا اور اسلامی قانون نفقہ روبعمل آیا، بلاشبہ یہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور حضرت امیر شریعت کی کامیابی کا تاریخ ساز کارنامہ تھا (دیکھئے نقیب کا خصوصی شمارہ حضرت امیر شریعتؒ حیات وخدمات/۱۳۳،۱۳۴)

نواں قدم (مجموعۂ قوانین اسلامی کی تیاری)

بار بار ہندوستان کی عدالت اور اغیار کی طرف سے مسلم پرسنل لا اور وہ نصوص جن کی بنیاد پر مسلمانوں کے عائلی قوانین ترتیب دیے گئے ہیں، کی من مانی تفسیر وتوضیح کی گئی جیسا کہ "متاع بالمعروف" کی تفسیر جسٹس چندر چور نے "تادم حیات گذارہ" سے کی۔ مسلمانوں کی طرف سے بھی اور غیر مسلموں کی طرف سے اس قسم کی جرأتیں سامنے آنے لگیں، اس کے بعد ارباب بورڈ بالخصوص حضرت امیر شریعتؒ کو اس کا احساس ہوا کہ اس کے سد راہ کی کوشش کی جائے، چنانچہ حضرت موصوف نے اپنی "کچھ بھی کر گزرنے والی" فطرت اور مزاج کے مطابق اس کا بھی منصوبہ بنالیا اور اس کے لیے حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی علیہ الرحمہ، مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی، حضرت مفتی احمد علی سعید، حضرت مولانا محمد برہان الدین سنبھلی قاسمی اور حضرت مفتی نعمت اللہ، مفتی امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کو حضرت علیہ الرحمہ نے جمع فرمایا اور پھر مجموعۂ قوانین اسلامی کی تیاری کا کام شروع ہوگیا۔ جیسے جیسے کام آگے بڑھتا رہا۔ اسے مشاہیر علماء کی خدمت میں نظر ثانی کے لیے بھیجا جاتا رہا۔ حضرت کی نگرانی میں نکاح، طلاق، خلع، فسخ، ایلا، ظہار، لعان، حضانت، ولایت، میراث، وصیت، ہبہ اوران تمام احکام پر مشتمل، جو ۱۹۳۷ء کے شریعت اپلی کیشن ایکٹ کے تحت دستور ہند میں مسلم پرسنل لا کے نام سے منظور شدہ ہیں، یہ مجموعہ قوانین اسلامی مکمل ہوگیا، جس کا ایک ایڈیشن حضرت قاضی صاحب کے دور صدارت میں بورڈ سے اور ایک نسخہ مولانا محمد ولی رحمانی دامت برکاتہم نے مونگیر سے شائع کرایا، حضرت الاستاذ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی حفظہ اللہ کے بقول:

"آزاد ہندوستان میں یہ کام نہیں بلکہ کارنامہ ہے" (دیکھئے: ماہنامہ ملی اتحاد، خصوصی گزشتہ شمارہ، نومبر ۲۰۰۰ء)

دسواں قدم (ملک میں نظام قضا)

کسی بھی ملک میں نظام قضا احکام شرعیہ پر عمل درآمد اور تنفیذ کی عملی شکل ہوتی ہے اور

کتاب وسنت میں نزول احکام وشرائع کا منشا ہی اسے بتایا گیا ہے، اور انسانی تاریخ کا تجربہ بھی یہی رہا ہے کہ جس خطہ ارضی میں نظام الٰہی جس قدر مستحکم رہا ہے، جرائم اور ظلم وزیادتی سے وہاں کی انسانیت اتنی ہی دور رہی ہے۔ آپ اسے نظام قضا کہیں یا کسی مستحکم اصول کے تحت زندگی گزارنے کا نام اسے دیں۔ بہرحال انسانیت کی اصلاح اور شر وفساد سے اسے محفوظ رکھنے کے لیے کسی زاویے سے قانون کا سہارا لینا ایک ناگزیر امر ہے۔

دوسرے یہ کہ اسلام کا اپنا مستقل ایک نظام قانون (نظام قضا) ہے جو دنیا کے تمام منفرد خودساختہ عدالتی نظام سے اعلیٰ اور بہتر ہے۔ کتاب وسنت پر مبنی یہ بھی ایک سچائی ہے کہ اسلام کی بقا کے لیے نظام قضا اتنا ہی ضروری ہے جتنا انسان کی بقا کے لیے خون، مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ بہار واڑیسہ میں برسوں اس کا تجربہ کر چکے تھے۔ اس کا اچھی طرح ان کو اندازہ تھا اور وہ پورے ملک میں اس فلسفہ کی روشنی میں اسلام اور دین کا احیا چاہتے تھے، امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے پلیٹ فارم سے اس میدان میں آگے بڑھتے تو پرخار وادیوں سے گزرنا پڑتا۔ اتفاق سے خود ان کی اپنی محنتوں سے وجود میں آنے والا ملت کا متحدہ پلیٹ فارم انھیں ملا اور انھوں نے پورے ملک میں نظام قضا کے استحکام کو بورڈ کے ایجنڈے میں شامل کیا اور پھر ملک کے مختلف شہروں میں بورڈ کا دار القضا قائم ہوا۔ ممبئی، آکولہ، دھولیا، اندور، آسنسول، پیرولیا، لکھنؤ، دہلی اور سیتاپور، ان کی زندہ مثالیں ہیں۔ میں یہاں یہ بات کہتا چلوں کہ اس ملک میں بورڈ متحدہ پلیٹ فارم کی شکل میں اگر زندہ رہنا چاہتا ہے تو بورڈ کو اس شعبہ پر ترجیحی طور سے توجہ دینی ہوگی۔

گیارہواں قدم (اصلاح معاشرہ کی تحریک)

ایک طرف حضرت امیر شریعتؒ نے تحفظ شریعت کے لیے ملک کی عدالت عالیہ، ارباب سیاست اور حکمراں جماعتوں سے مقابلہ کیا تو دوسری طرف ہندوستان کی مسلم آبادی کو مستحکم کرنے کا ان کے اندر در آنے والی سماجی برائیوں اور غیر اسلامی رسوم ورواج کی اصلاح کے لیے ملک گیر جدوجہد کی۔ ملک کے بڑے شہروں میں منظم اجتماعات کا انعقاد کیا۔ ائمۂ مساجد

کو اصلاحی موضوعات پر خطبات دینے کے لیے خطوط بھیجے، مختلف موضوعات پر کتابچے تیار کروائے، بے جا طلاق کی روک تھام کے لیے چھوٹے چھوٹے رسالے چھپوا کر عوام تک پہنچائے۔ کتاب وسنت کے مطابق زندگی گزارنے اور ایک صالح معاشرہ تشکیل دینے کے لیے علما اور ارباب دانش کو متوجہ کیا۔ صوبائی سطح پر اس کے لیے کمیٹیاں تشکیل دیں اور خود بھی اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعے کوشش کرتے رہے اور علمائے کرام کو بھی اس پر ابھارتے رہے۔ معاشرے کی اصلاح میں خواتین کا بھی بڑا اہم رول ہوتا ہے بورڈ نے کان پور کے اجلاس ۱۹۸۹ء میں ''سال خواتین'' کے عنوان سے سیمینار اور اجتماعات منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ مرد وخواتین کو ایک دوسرے کے حقوق پہچاننے اور قدر کرنے کی جانب توجہ دلائی، جس کے دوررس نتائج سامنے آئے۔ معاشرے میں اسلامی روح اور تازگی محسوس کی جانے لگی۔ لوگوں کا اپنے مسائل کے حل کے لیے دارالقضاء کی طرف رجوع کرنے کا رجحان بڑھا۔ ملک میں اسلامی بیداری کی جانب مولانا کا یہ بھی بڑا مبارک قدم تھا۔ آپ کی ان کوششوں سے خواتین میں بھی یہ احساس زندہ ہوا کہ ہماری بھی سماج میں کوئی حیثیت ہے اور یہ بھی دین کی خاطر اپنے دائرے میں رہتے ہوئے بڑے سے بڑا کام انجام دے سکتی ہیں۔ میڈیا کے ذریعے بھی اصلاح معاشرہ کی جانب آپ نے توجہ فرمائی۔ چنانچہ اس کام کو منظم کرنے کے لیے انھوں نے جناب محمد مسلم صاحب سابق ایڈیٹر دعوت کو اصلاح معاشرہ کمیٹی کا کنوینر بنایا، انھوں نے بھرپور دلچسپی لی اور اپنے اداریوں میں غیر اسلامی رسوم ورواج کی نشان دہی اور دیگر اخبارات کو اپنے اثر ورسوخ کے ذریعے اس جانب متوجہ کیا۔ اس کے تمام مواد آج بھی دعوت کے ریکارڈ میں موجود ہیں۔

بارھواں قدم (بابری مسجد کی بازیابی کے لیے جدوجہد)

۱۹۸۶ء کا وہ دن اہل توحید کے لیے بڑا اذیت ناک تھا۔ مرکز توحید بابری مسجد میں ۱۹۴۸ء کو رکھے گئے بتوں کی وزیر اعظم کے حکم سے پوجا کی اجازت مل گئی۔ ہندوستانی مسلمانوں

نے اس کو رکوانے کی مختلف سطح پر کوششیں کیں، مگر دن بدن حالات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔ فسادات اور قتل وخون کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ۶/دسمبر ۱۹۹۲ کو رہی سہی جمہوریت کا جنازہ بھی اس ملک سے اٹھ گیا، جب مسجد شہید کردی گئی، غرض حالات کی ابتری کو دیکھتے ہوئے علماء اور دانشوران نے بورڈ کے ذریعے اس مسئلہ کو طے کرانے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ بانیٔ مسلم پرسنل لا بورڈ نے ۳/دسمبر ۱۹۹۰ء کو بورڈ کی مجلس عاملہ بلائی اور یہ تجویز منظور کی:

''بابری مسجد، مسجد ہی ہے نہ تو یہ غصب شدہ زمین پر واقع ہے اور نہ مندر توڑ کر اس کی جگہ بنائی گئی ہے۔ یہ مسجد ہے اور مسجد کی جگہ خدا کی ملک ہے۔ نہ اسے تبدیل کیا جاسکتا ہے، نہ اس کی خرید وفروخت ہوسکتی ہے۔ نہ کسی مصلحت کی بناپر کسی فرد، جماعت یا حکومت کے حوالے کی جاسکتی ہے اور نہ کوئی حکومت اسے ایکوائر کرسکتی ہے۔'' (پرسنل لا بورڈ خدمات اور سرگرمیاں ۳۶)

جنرل سکریٹری کی توجہ اس وقت اس مسئلے کی جانب یوں بھی ضروری تھی کہ حالات سے تنگ آکر بہت سے لوگوں نے مختلف قسم کی باتیں کہنی شروع کردی تھیں، جو ان کے مسجد کی شرعی حیثیت سے ناواقفیت، وقتی مفاد پرستی اور دین سے دوری کا نتیجہ تھے۔ اس فیصلہ کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں نے مسجد کی شرعی حیثیت جانی اور مسجد کا دینی موقف ان کے سامنے آیا۔ رائے بدلی اور پھر پرامن طریقہ سے قانونی جنگ کے ذریعے اسے حاصل کرنے کی جانب مسلمان متوجہ ہوئے۔ حضرت امیر شریعتؒ کا یہ قدم وقت اور حالات کے رخ کو بدل دینے والا تاریخی قدم ثابت ہوا۔ ہمارا ایمان ہے کہ ''ان الامر کلہ للہ'' مگر اللہ اپنے بندوں کے ذریعے ہی زمین پر کرشمات دکھاتا ہے، جی چاہتا ہے کہ یہ کہہ دوں کہ اگر امیر شریعت زندہ ہوتے تو شاید بابری مسجد کے ساتھ ہونے والی یہ ذلیل حرکت امت کو دیکھنے کو نہ ملتی، یا پھر ملک کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

حضرت امیر شریعتؒ کے یہ وہ کارنامے ہیں جو نمایاں اور دنیا کے سامنے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی موصوف علیہ الرحمہ نے ظاہری اور باطنی طور پر ذہن سازی اور فکری لحاظ سے

ملت اسلامیہ ہندیہ ہی نہیں بلکہ مسلم امہ کے لیے بے شمار کام انجام دیے جو مسلمانوں میں خود اعتمادی، ہر طرح کے حالات سے نبرد آزما ہونے اور ایک مستحکم قوم کی حیثیت سے زندہ اور مستعد رہنے کے لیے روحانی، فکری، تعلیمی، سیاسی، دعوتی، اتحادی اور شعوری طاقت فراہم کرنے والے ہیں۔

امیر شریعت کی خصوصیت اور کامیابی کا راز

حضرت امیر شریعتؒ کی یہ خصوصیت تھی کہ انھوں نے مسلم اور غیر مسلم دونوں اقوام کے ہر طبقہ کو مخاطب کیا، خواندہ اور ناخواندہ مرد و عورت، مسلم غیر مسلم، امراء رؤسا اور معاشرے کے کمزور و لاچار ہر گروہ سے جہاں جو خرابی دیکھی، بڑی بے باکی، ایمانی جرأت و فراست، اعلاء کلمۃ اللہ کی ذمے داری اور دینی فریضہ کی ادائیگی کے جذبے سے، اپنی تقریروں، تحریروں اور گفت و شنید میں، بغیر کسی وقتی مصلحت کی پروا کیے، ان پر نکیر کی۔ ان کامرانیوں کے پیچھے جو چیز کارفرما تھی وہ تھا بروقت اقدام کا عمل اور کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ انھوں نے اپنے عمل سے ہمیشہ یہ ثابت کیا کہ موقع ہاتھ سے نکل جانے کے بعد کوئی کام کرنا سانپ کی لکیروں پر لاٹھی پیٹنے کے مرادف ہے۔

⊙⊙⊙

مولانا انیس الرحمٰن قاسمی ☆

امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ اور امارتِ شرعیہ

امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ عالم اسلام کے ان ممتاز، صاحب بصیرت بزرگوں میں سے تھے جنھوں نے اپنے وسعت علم، بصیرت ایمانی، فکر و تدبر اور جہد و عمل کے ساتھ اللہ کی شریعت کو نافذ و جاری کرنے میں اپنی زندگی کا قیمتی حصہ صرف کیا۔ ایمان واتحاد کی دعوت، اللہ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق فیصلہ کرنا، نظام عدالت کو قائم اور اس کو وسیع کرنا ان کی زندگی کا بنیادی واہم مشغلہ تھا۔ بلکہ یوں کہیں کہ نظام امارت نہ صرف ان کی فکر و عمل بلکہ عقیدہ کا جزء تھا، یہی وجہ ہے کہ امارت شرعیہ سے ان کی وابستگی فکر و شعور کی ابتدائی زندگی ہی سے تھی۔ قطب عالم حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ امارت شرعیہ کے بانیوں میں تھے اور مسئلہ امارت شرعیہ پر انھوں نے انتہائی عالمانہ خطبہ تحریر فرمایا تھا۔ حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی ان کے فرزند ارجمند تھے اور ابتداء ہی سے کاروان امارت میں شریک تھے، یہاں تک کہ ۱۹۵۷ء میں جب وہ امیر شریعت منتخب ہوئے تو انھوں نے اس نظام کو پوری قوت و توانائی سے آگے بڑھایا۔ اور علمی و عملی طور پر اجتماعیت کے تصور کو واضح کیا۔ وہ فرماتے تھے کہ اسلامی زندگی کی تشکیل

☆ ناظم امارتِ شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ، پھلواری شریف، پٹنہ

کا تصور جماعتی نظام کے بغیر ممکن نہیں اور یہ اجتماعی نظام اسی وقت تشکیل پا سکتا ہے، جب کہ خالص دین، یعنی کلمۂ واحدہ کی بنیاد پر امت کے افراد ایک شخص کی اطاعت کا عہد کریں۔ اور جب تک وہ امر بالمعروف اور نیکیوں کا حکم دیتا رہے، اس کے احکام بلا چوں چرا تسلیم کریں۔ انھوں نے امارت شرعیہ کے مقصد کے بارے میں ایک جگہ تحریر کیا ہے:

''ہمارے سلف نے آج سے پچاس سال پہلے امارت شرعیہ کی بنیاد رکھی۔ جس کا مقصد امت اسلامیہ کو خالص دین محمدی اور کلمہ واحدہ کی بنیاد پر ایک امیر کے تحت ایک مرکز پر جمع کرنا اور حسب استطاعت احکام اسلامی کی تنفیذ اور کلمۃ اللہ کو بلند کرنے کی اجتماعی کوشش اور ایسا ماحول پیدا کرنے کے لیے امت کو متحرک رکھنا ہے، جس میں دین اپنی کامل شکل میں پایا جائے اور مسلمان اسلامی زندگی کو اپنا کر سارے عالم کے لئے نمونہ بن سکیں۔ اور اس طرح یہ امت اپنا وہ فریضہ انجام دے سکے، جو اس امت پر قیامت تک عائد کیا گیا ہے۔''

وہ مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''تمام مسلمانانِ بہار واڑیسہ اس نظام اجتماعی کی حقیقی روح کو سمجھ کر اپنے اندر کی تمام فرقہ بندیوں سے ماوراء ہو کر کلمۂ واحدہ کی بنیاد پر منظم ہو جائیں اور اپنے اس اجتماعی نظام کو اتنا طاقت ور بنا دیں کہ ان کے معاشرے میں احکام خداوندی کی مخالفت کرنے کی ہمت کسی میں نہ ہو۔''

دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں:

''امارتِ شرعیہ ہر طبقہ اور خیال کے مسلمانوں کا مشترکہ ادارہ ہے، جس کا بنیادی مقصد عقیدہ کی وحدت پر مسلمانوں کی شرعی تنظیم ہے، تا کہ اللہ کا حکم بلند ہو۔ مسلمانوں میں ممکن حد تک اسلامی احکام جاری ہوں اور مسلمان اس ملک میں اسلامی زندگی گزار سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد عظیم، تعصب، تنگ نظری، پارٹی بندی اور اپنے مسلک سے ہٹے ہوئے لوگوں پر طعن و تشنیع کرنے سے حاصل

نہیں ہوسکتا۔''

خدمات کے اعتبار سے حضرت امیر شریعت رابع نے جو پالیسی بنائی اسے وہ خود تحریر فرماتے ہیں:

''امارت شرعیہ نے صحیح اور واضح نصب العین کے ساتھ خدمت کی راہ اپنائی ہے، بنیادی طور پر وہ مسلمانوں کی دینی تنظیم ہے، امارت شرعیہ چاہتی ہے کہ مسلمانوں کی زندگی مذہبی بنیادوں پر استوار ہو، وہ اچھے مسلمان اور شریف انسان بنیں۔ ان میں اعلیٰ انسانی روایات اور بلند اخلاقی قدریں پیدا ہوں اور اگر ان میں داخلی یا خارجی اختلافات رونما ہوں تو امارت شرعیہ ان کے معاملات کو حل کرتی ہے۔ امارتِ شرعیہ نے ہزاروں مقدمات فیصل کئے ہیں۔ اور نہ معلوم کتنے اختلافات دور کئے ہیں۔ اس کی یہ خدمت اتنی اہم اور مثالی ہے کہ ہمارے بہت سے ہندو بھائیوں نے بھی امارت شرعیہ کے ذریعے اپنے جھگڑے ختم کرائے ہیں۔ یہ انصاف و اعتماد امارت شرعیہ کا بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔ امارت شرعیہ نے مسلک و مشرب، مذہب اور ذات پات کے فرق کے بغیر انسانوں کی قابل لحاظ خدمات انجام دی ہیں۔ ہر قسم کے فرق سے بلند ہوکر انسانوں کی خدمت کرنا امارت کا نصب العین ہے۔''

اسی نصب العین کے مطابق انھوں نے ۱۵رنومبر ۱۹۸۱ء کو جب امارت شرعیہ کے دفتر، ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ اور شفاخانہ کی بنیاد رکھوائی تو اپنے تحریری خطبہ میں کہا:

''آج دفتر امارت شرعیہ کی مرکزی عمارت، ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ اور شفاخانہ کی بنیاد رکھی جارہی ہے۔ آنے والے دنوں میں جب یہ عمارتیں تیار ہوں گی تو مجھے یقین ہے کہ انسانی خدمت کا بہترین ذریعہ ثابت ہوں گی۔ یہ تین قسم کی عمارتیں دراصل امارت شرعیہ کے اندازِ فکر کو ظاہر کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ امارت شرعیہ کی نگاہ میں کن چیزوں کی کیا اہمیت ہے؟ دفتر خاموشی کے ساتھ نظم وضبط کی تعلیم دیتا

ہے، ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ امارت شرعیہ کی نگاہ میں تعلیم کی کیا اہمیت ہے اور وہ نوجوانوں کو کس طرز کی تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دے رہی ہے؟ شفاخانہ کی عمارت رفاہی خدمت کی علامت ہے اور یہ اشارہ ہے کہ امارت شرعیہ چاہتی ہے کہ انسان بیماری کی تکلیف نہ جھیلے۔ ہر شخص صحت مندر ہے اور خوشی کی زندگی گزارے۔ مولانا سجاد اسپتال کی اسکیم اسی احساس کا نتیجہ ہے۔ ان تینوں چیزوں سے انسانوں کو فائدہ ہوگا اور یہ چیزیں ہمارے ملک کی بنیادی ضرورت ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ اس ضرورت کو پورا کرنے کی طرف امارت شرعیہ نے ایک چھوٹا سا سہی مگر مضبوط قدم اٹھایا ہے۔''

امیر شریعت رابع حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ نے تقسیم ہند کے بعد ۱۹۵۷ء میں امارت کی ذمے داری قبول کی تھی، یہ دور اور اس کے بعد کے حالات پر آشوب تھے مگر انھوں نے بڑی جرأت واستقامت کے ساتھ مسلمانوں کی رہنمائی کی اور ملی وملکی مسائل کے متعلق اظہار رائے میں سچائی اور حقیقت پسندی کو سامنے رکھا۔ مفاد ومصلحت پسندی کو کبھی گوارا نہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عہد میں اور اس کے بعد امارت شرعیہ کبھی حکومت واقتدار سے متاثر نہیں ہوئی اور نہ ہی کبھی اس نے مسائل ومعاملات پر گفتگو کرتے وقت اقتدار کی پیشانی پر نظر کی۔ بلکہ ہمیشہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کیں اور آج بھی اس کا یہی طریق عمل ہے۔

حضرت امیر شریعت علیہ الرحمہ نے ملکی مسائل کے بارے میں امارت شرعیہ کا یہ موقف رکھا کہ اس ملک کے مسائل کا حل یہاں کے باشندوں کی مرضی کے مطابق ہی ہوسکتا ہے۔ اور ایسا کوئی قدم کامیاب نہیں ہوسکتا جسے عوامی تعاون حاصل نہ ہو۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمارا ملک مختلف مذہب، تہذیب، اور روایات کا ملک ہے اور یہی اس کا حسن ہے۔ جب تک اپنی تہذیب، اپنے مذہب اور اپنی روایات کو باقی رکھتے ہوئے دوسروں کے ساتھ رواداری کا معاملہ نہ ہوگا نہ ملت ترقی کرے گی اور نہ ملک۔

اس لئے اس ملک کے باعزت شہری ہونے کی حیثیت سے ہمیں ملک کے مسائل کو حل

کرنا ہے۔اس کی بھلائی میں ہماری بھلائی ہے۔اوراس کے بگاڑ میں ہم سبھوں کا نقصان ہے۔
اسی طرح ایک مسلمان ہونے کے ناطے ہمیں ملت کے مسائل بھی باغیرت، باحمیت اور صاحب شریعت ملت کی حیثیت سے طے کرنے ہیں اور یہ معاملات اس وقت طے ہوں گے جب مسلمان آگے بڑھ کر انھیں طے کرنا چاہیں گے۔

امارت شرعیہ نے امیر شریعت رابع کے دور میں ملکی وملی مسائل کے حل، مسلمانوں کی جان ومال کی حفاظت، مدارس ومساجد اور مسلم پرسنل لا کے تحفظ، زبان وتہذیب کی حفاظت و ترقی، ایک باغیرت شہری کی حیثیت سے زندہ رہنے اور باغیرت انسان کی طرح مرنے کا سبق بہ خوبی سکھایا اور شعبۂ تحفظ مسلمین کے ذریعے یہ سارے کام لئے، بلکہ ریلیف وراحت کاری اور باز آبادکاری کے مثالی کام انجام دیے۔ وہ فرقہ وارانہ فسادات، مسلمانوں کی نسل کشی، مساجد کے انہدام اور ملت کے مصائب وابتلاءات پر نہ صرف فکرمند ہوئے بلکہ انھوں نے پوری جرأت و بصیرت سے ان کے سدباب کی کوشش کی جس میں کامیابی ہوئی۔

حضرت امیر شریعتؒ نے جب ان خطرات کو مسلمانوں کے دین، مساجد ومقابر، عائلی قانون وغیرہ پر بڑھتا ہوا محسوس کیا۔ اور یہ دیکھا کہ یہ خطرات بہار واڑیسہ ہی میں نہیں بلکہ پورے ملک میں بڑھ رہے ہیں اور اب مسلمانوں کی مذہبی آزادی، ملی تشخص، اور مسلم عائلی قانون (پرسنل لا) کی بقا کی کوئی ضمانت نہیں۔ اور یہ کام صوبائی طور پر کامل طریقہ پر انجام نہیں پاسکتا تو اس کے لئے پورے ملک کے مسلم قائدین وعلماء کو امارت شرعیہ کے بنیادی اصول یعنی ''کلمہ واحدہ'' کی بنیاد پر متوجہ کیا، جس کے نتیجے میں ۱۹۷۲ء کے ۲۷، ۲۸ر دسمبر کو ممبئی میں ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا کنونشن'' منعقد ہوا۔ ۱۹۷۳ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ قائم ہوا۔ اور یہ کارنامہ ان کے دور امارت کا نہایت ہی زریں اور تاریخی کردار کا حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تشکیل سے لے کر اب تک بورڈ کے کاموں میں امارت شرعیہ کا کردار بنیادی اور تاریخی رہا ہے۔

امیر شریعت رابع کے دور میں شعبوں کی غیر معمولی ترقی ہوئی۔ دارالقضاء کی اضلاع اور کمشنری میں توسیع ہوئی۔ دارالافتا کو ملک وبیرون ملک میں ایسی مرجعیت حاصل ہوئی کہ وہ

ملک کے اول درجہ کے دو تین دار الافتا میں شمار ہونے لگا۔ تعلیم کے نظام میں وسعت ہوئی۔ اور اس کا شعبۂ تعلیم غیر معمولی طور پر متحرک ہوا۔ بیت المال کے ذریعے کمزوروں اور محروموں کی کفالت میں وسعت آئی۔ تبلیغ و تنظیم کا کام وسیع ہوا۔ ان کے عہد میں فکر امارت کو قبولیت و وسعت حاصل ہوئی۔

آندھرا پردیش، کرناٹک و مہاراشٹر آسام اور اس کے قرب و جوار کے صوبوں میں امارتِ شرعیہ کے ماتحت دار القضاء قائم کیا گیا اور بحمد اللہ یہ سارے دار القضاء عظیم دینی خدمات انجام دے رہے ہیں اور دینی خطوط پر فصل خصومات کا اپنا ریکارڈ ہے جو نہ صرف ہندوستان بلکہ عرب ممالک کے لیے بھی حیرت انگیز چیز ہے۔ اللہ جل شانہ نے حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے کام میں بڑی برکت دی تھی۔ ان کے دور میں ظاہری و معنوی ہر اعتبار سے امارت شرعیہ کو ترقی ہوئی۔

مفتی سہیل احمد رحمانی قاسمی ☆

امارت کے تاریخ ساز امیر شریعت

حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی نوراللہ مرقدہ

امیر شریعت رابع حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی نوراللہ مرقدہ اپنے علم وفضل، پاکیزہ کردار وعمل، خاندانی وجاہت ملی خدمات وخصوصیات اور روحانی کمالات کی وجہ سے ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے، آپ قطب عالم مجدد علم وعرفان حضرت مولانا سید محمد علیؒ کے فرزند ارجمند مرکز رشد واصلاح خانقاہ رحمانی کے سجادہ نشیں، گہوارہ علم وفن دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ اور دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مجلس منتظمہ کے رکن رکین رہے، مشہور ومنفرد تعلیم گاہ جامعہ رحمانی کے روح رواں اور سرپرست، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے بانی ومحرک اور تاحیات اس کے جنرل سکریٹری، مسلمانان ہند کی نگاہوں کے مرکز اور تحفظ شریعت کے عظیم ترین پاسباں تھے۔

آپ کی ولادت باسعادت ۵/مئی ۱۹۱۲ء مطابق ۹/جمادی الثانی ۱۳۳۲ھ منگل کو خانقاہ رحمانی مونگیر میں ہوئی، آپ کا مبارک نام منت اللہ اور کنیت ابوالفضل رکھی گئی، آپ قطب عالم کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں، جس کی وجہ سے والد محترم آپ کو بہت چاہتے اور خصوصی توجہ فرماتے اکثر سفر میں اپنے ساتھ بھی لیجاتے تین سال کی عمر ہی سے آپ کی تعلیم وتربیت کا سلسلہ شروع کر دیا گیا ۱۹۱۶ء میں والد محترم نے بذات خود قرآن پاک پڑھایا پھر انجمن حمایت اسلام محلہ دلاور پور مونگیر میں آپ کو داخل کر کے مشہور ومعروف فقیہ اور جید عالم دین حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کی نگرانی وسرپرستی میں آپ کی تعلیم وتربیت کا باضابطہ سلسلہ

☆ مفتی امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، ورکن آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

شروع ہوا، میزان الصرف والدمحترم نے ہی شروع کرایا، دونوں بزرگوں کی خاص توجہ حضرت پر رہی پوری محنت کرتے اور آپ سے پوری محنت لیتے بھی رہے۔ حضرت مولانا بھی پوری توجہ اورانہماک سے حصول تعلیم میں لگے رہے، جس سے آپ میں صلاحیت ومہارت پیدا ہوتی گئی اور آپ اساتذہ کی نظروں میں مقبول ہوتے گئے اور قدر ومنزلت بڑھتی گئی۔ اس کے بعد ۱۹۲۲ء میں آپ کو حضرت مولانا مفتی عبداللطیف صاحب صدر شعبہ دینیات عثمانیہ یونیورسیٹی حیدرآباد کی نگرانی وسرپرستی میں حیدرآباد بھیج دیا گیا۔ حضرت مولانا مفتی عبداللطیف صاحب حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے اجلہ خلفاء میں تھے، حضرت مونگیری علیہ الرحمہ سے خاص تعلق اور قلبی لگاؤ تھا، حضرت مفتی صاحب اپنے زمانے کے مشہور ومعروف اساتذہ ذی استعداد علماء ومشائخ میں شمار کئے جاتے تھے۔ آپ نے حضرت مونگیریؒ کے اس ہونہار فرزند پر خاص توجہ دی انہیں بنانے اور سنوارنے میں پوری محنت اور دلچسپی سے حضرت کو تعلیم وتربیت کے زیور سے آراستہ کرنے اوران کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں منہمک ہوگئے۔ ہر ہفتہ امتحان لیتے، کسی بھی رعایت سے کام نہیں لیتے، آپ بھی کبھی شکایت کا موقع نہیں دیتے پورے حوصلہ کے ساتھ حصول تعلیم میں رات دن مشغول رہتے جس سے آپ کی صلاحیتوں میں غیر معمولی اضافہ ہوتا گیا صرف ونحو اور منطق کی بنیادی اصطلاحات آپ کو زبانی یاد ہوگئیں، اور استعداد پختہ ہو گئی۔ لیکن حیدرآباد میں آپ کا قیام صرف ایک سال ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۴ء تک رہا اس مختصر سی مدت میں آپ نے عربی زبان وادب اور معقولات کی کتابیں پڑھیں، جس میں اچھی خاصی مہارت پیدا ہوگئی تھی۔

حیدرآباد سے واپسی کے کچھ ہی دنوں بعد ۱۹۲۴ء ہی میں مزید تعلیم کے لئے آپ کو دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھیج دیا گیا آپ نے ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مشہور ترین اساتذہ سے جو اپنے علم وفضل میں ممتاز مقام رکھتے تھے اردو، عربی زبان وادب میں مہارت حاصل کی خاص طور پر شمس العلماء، حضرت مولانا حفیظ اللہ صاحب سابق استاذ مدرسہ عالیہ ڈھاکہ جو اس وقت دار العلوم ندوۃ العلماء کے صدر المدرسین اور اہتمام کے منصب پر فائز تھے بہت ہی لائق وفائق اساتذہ

میں انکا شمار ہوتا تھا۔

دوسرے حضرت مولانا حیدر حسن خان ٹونکی جو دار العلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث اور جامع معقول ومنقول تھے، مولانا حیدر حسن خان صاحب کو معقولات اور علوم الہیہ میں مولانا غلام احمد صاحب صدر مدرس مدرسہ نعمانیہ لاہور اور اپنے برادر اکبر حضرت مولانا محمود حسن خان ٹونکی، اور حدیث میں حضرت مولانا شیخ حسین بن محسن انصاری اور حضرت مولانا سید نذیر حسین دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا، اور بیعت واجازت حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے حاصل تھی۔ دار العلوم ندوۃ العلماء میں اپنے استاذ کی سبکدوشی کے بعد شیخ الحدیث کے منصب پر فائز تھے بہت مشفق اور بافیض بزرگوں میں تھے طلباء پر خاص توجہ، تدریسی ذوق اور طلباء کے ساتھ شفقت میں ممتاز تھے۔

ایسے بزرگوں اور جید اساتذہ کی صحبت وتربیت سے حضرت ممدوح نے غیر معمولی فائدہ اور فیض حاصل کیا آپ ابھی مشکوٰۃ، اور ہدایہ وغیرہ ہی کی جماعت میں تھے کہ ابا حضور حضرت قطب عالم کا وصال ۹/ربیع الاول ۱۳۴۶ھ مطابق ۳/ستمبر ۱۹۲۷ء میں ہوگیا۔ ندوہ میں مجموعی طور پر آپ کا قیام چار سال رہا، اور عالمیت تک کی تعلیم حاصل کر کے آپ وطن آگئے۔

۱۹۲۹ء میں خاندان کے قافلہ کے ساتھ آپ کو حج کی سعادت نصیب ہوئی یہ آپ کا پہلا حج تھا۔ اس وقت آپ کی عمر تقریباً ۱۷رسال ہوگی، یہ انتہائی سعادت اور خوش نصیبی کی بات ہے کہ عمر کے اس حصہ میں آپ کو حج وزیارت کا شرف حاصل ہوا۔

۱۹۳۰ء میں ہندوستان کی عظیم دینی درسگاہ دار العلوم دیوبند تشریف لے گئے، اس وقت کے باکمال اساتذہ اور محدثین سے مختلف علوم وفنون کی تعلیم حاصل کر کے ۱۹۳۳ء میں دورہ حدیث سے فراغت حاصل کی اسی طرح چار سال دار العلوم دیوبند میں بھی قیام رہا۔

ندوہ سے دار العلوم دیوبند کا علمی سفر بھی بڑا ہی سبق آموز ہے، جس کو ایک بڑے عالم دین اور بزرگ شخصیت نے بیان کیا ہے، حضرت مولانا عبد الصمد رحمانی نائب امیر شریعت نے حضرت مولانا علیہ الرحمہ کے دار العلوم دیوبند میں داخلہ کرانے کا واقعہ یوں بیان فرمایا ہے کہ

مولوی منت اللہ کو ندوہ میں داخل کرایا گیا تھا مگر ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ وہاں کے بہت سے طلبہ بعد نماز عصر میدان سے فٹ بال کھیل کر اس وقت جماعت میں شریک ہوئے کہ ان کی تکبیر اولیٰ فوت ہوگئی، میں نے محسوس کیا کہ یہ کسی طرح مناسب نہیں ہے، یہ قابل تنبیہ اور قابل اصلاح ہے، اس لئے مولانا موصوف کو دارالعلوم ندوۃ العلماء سے دارالعلوم دیوبند منتقل کر دیا گیا۔ اس واقعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا کی تربیت جن بزرگوں کے زیر سایہ ہوئی وہ تکبیر اولیٰ کے فوت ہونے کو قابل تشویش سمجھتے تھے جماعت کا چھوٹنا تو بڑی بات ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ہو یا دارالعلوم دیوبند، دونوں اداروں میں فطری صلاحیتوں اور تعلیمی ذوق وشوق کی وجہ سے آپ ہمیشہ ممتاز رہے، جماعت میں ہمیشہ اول درجہ سے کامیاب ہوتے رہے جس کی وجہ سے اساتذہ کی خصوصی توجہ حاصل رہی، اساتذہ آپ کو بہت مانتے اور قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتے، حوصلہ افزائی کرتے تعریفی کلمات کہتے اور روشن وتابناک مستقبل کی دعائیں دیتے، تصنیف وتالیف کا ذوق وشوق تو ندوہ میں پیدا ہو چکا تھا، لیکن دارالعلوم دیوبند کی خوشگوار علمی فضا اور سازگار ماحول نے مزید پختگی اور وسعت فکر کی ہمہ گیری نے وسعت پرواز عطا کر کے گوہر نایاب بنا دیا، دیوبند میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی، حضرت مولانا اصغر حسین دیوبندی، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی رحمہم اللہ آپ کے خاص اساتذہ میں سے ہیں۔ البتہ طالب علمی ہی کے زمانہ سے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بہت قریب رہے اور ان سے بے پناہ تعلق اور والہانہ عقیدت تھی، حضرت امیر شریعت رابعؒ حضرت مدنی کے محبوب شاگردوں میں رہے، حضرت مدنیؒ کے ایک اشارہ پر سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ ہر وقت آپ کے دل میں موجزن رہتا، یہی وجہ ہے کہ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں جب حضرت شیخ الاسلام گرفتار کر لئے گئے تو حضرت امیر شریعت رابعؒ نے حضرت الاستاذ کی محبت وعقیدت میں گرفتاری دی اور جیل کی صعوبتیں خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیں۔ حضرت شیخ مدنیؒ جب بہار کا دورہ کرتے تو حضرت امیر شریعت رابعؒ ہی پروگرام کے تمام امور ومعاملات طے کرتے اور پورے پروگرام میں شامل

رہتے اور آرام وراحت کا بہتر سے بہتر انتظام کرواتے تاکہ حضرت شیخ کو کسی طرح تکلیف اور پریشانی نہ ہو، جبکہ کچھ لوگ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی پروگرام کے معاملے میں دخیل ہوں لیکن تاحیات حضرت شیخ نے اس معمول کو ترک نہیں کیا۔

حضرت امیر شریعت رابع علیہ الرحمہ کو تین سندوں سے احادیث کی اجازت حاصل ہے۔ ایک علماء دیوبند سے جو مشہور و معروف ہے۔ یعنی حضرت شیخ الاسلام حسین احمد مدنی سے اجازت حاصل تھی اور حضرت مدنی کو حضرت شیخ الہندؒ سے انہیں حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ ان کو حضرت شیخ عبدالغنی مجددیؒ انہیں شاہ اسحاقؒ انہیں شاہ عبدالعزیزؒ اور انہیں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے اجازت حاصل تھی۔

دوسری سند حضرت مولانا محمد عارف صاحبؒ ہر سنگھ پور، ضلع دربھنگہ کے واسطے سے ان کو حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ نے اجازت عطا فرمائی، ان کو شاہ محمد اسحاق صاحب علیہ الرحمہ نے اور انہیں حضرت شاہ عبدالعزیز نور اللہ مرقدہ نے اور ان کو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمہ نے اجازت مرحمت فرمائی ہے، تیسری سند حضرت فضل رحمٰن سے حاصل ہے جن کو حضرت شاہ عبدالعزیز نے اجازت دی اور ان کو حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ نے اجازت دی ہے۔ تیسری سند میں حضرت شاہ محمد اسحاقؒ کو حذف کرکے حضرت کی یہ قریب ترین سند ہے جس میں حضرت امیر شریعت رابع سید شاہ منت اللہ رحمانی نور اللہ مرقدہ اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نور اللہ مرقدہ کے درمیان صرف تین واسطے ہیں۔ یعنی حضرت امیر شریعت کو حضرت مولانا محمد عارف صاحب، حضرت مولانا فضل رحمٰن، حضرت شاہ عبدالعزیز، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے اجازت تھی۔

حضرت ممدوح تینوں واسطوں سے اپنے شاگردوں کو اجازت مرحمت فرماتے تھے:

۱۵/جنوری ۱۹۳۴ء میں بہار میں بھیانک زلزلہ آیا، ہزاروں لوگ ہلاک ہوگئے، یہ بڑا ہی سنگین اور تباہ کن زلزلہ تھا، جس نے مونگیر شہر اور اطراف کی بستیوں کو تہہ و بالا کر دیا تھا، بڑے پیمانے پر جانی و مالی نقصان ہوا تھا، ہزاروں افراد ہلاک اور زخمی اور بے گھر ہوگئے تھے، دیگر

اضلاع بھی غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے تھے، خصوصا دربھنگہ، مظفر پور، چمپارن وغیرہ، اس نازک موقع پر آپ نے ریلیف کمیٹی قائم کر کے مصیبت زدہ لوگوں کی خدمت اور راحت رسانی میں تقریبا ۹ رماہ مصروف رہے اور متاثرہ افراد کے درمیان ریلیف وراحت رسانی کے کاموں میں حضرت نے بہت نمایاں کام کیا، اسی درمیان اس قیمتی ہیرے کی ملاقات ہیرے کو پہچاننے والے اور قدر رداں جوہری حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ سے ہوگئی، حضرت مولانا ابوالمحاسنؒ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کی دینی حمیت وغیرت اور ملک وملت کی خدمت کے بے پناہ جذبہ اور لگن سے بہت متاثر ہوئے، چنانچہ ۱۹۳۵ء میں جمعیۃ علماء صوبہ بہار کا آپ کو ناظم بنایا۔

۱۹۳۸ء میں جمعیۃ صوبہ بہار کا عظیم الشان اجلاس چھپرہ میں ہوا حضرت امیر شریعت رابع بحیثیت جنرل سکریٹری اس اجلاس میں شریک ہوئے، جس کی صدارت حضرت مولانا احمد سعید دہلوی ناظم جمعیۃ العلماء ہند نے کی، یہ تین روزہ کانفرنس اپنے مقاصد کے اعتبار سے بہت کامیاب ہوئی، اسی طرح ۱۹۳۹ء میں دوسری صوبائی کانفرنس دربھنگہ میں ہوئی جس کی صدارت حضرت مولانا مدنی علیہ الرحمہ نے فرمائی، بڑی تعداد میں علماء اور اصحاب علم ودانش شریک ہوئے اور عوام الناس کا بھی بڑا مجمع تھا جس میں جمعیۃ علماء کی مقبولیت میں غیر معمولی اضافہ ہوا، اس وقت حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ صوبائی جمعیۃ کے صدر اور حضرت مولانا منت اللہ رحمانی نور اللہ مرقدہ اس کے جنرل سکریٹری تھے، اس طرح کافی دنوں تک جمعیۃ علمائے ہند کے معزز رکن اور صوبائی ناظم کی حیثیت سے جمعیۃ کی بڑے مشکل حالات میں تنظیم کی۔ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۶۴ء تک جمعیۃ علماء ہند کے کاموں میں شریک رہے، مشاہیر کی حیثیت سے وہ مرکزی جمعیۃ کے رکن رکین بھی تھے، مگر ۱۹۶۴ء میں صوبائی جمعیۃ علماء کی میٹنگ میں یہ بحث ہوئی کہ انہیں مشاہیر بہار کی حیثیت سے جمعیۃ کا رکن رکھا جائے یا نہیں، اور بدقسمتی سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ مشاہیر بہار کی حیثیت سے انہیں رکن نہیں بنایا جا سکتا، اس طرح عملا انہیں جمعیۃ علماء کی سرگرمیوں اور میٹنگوں میں شرکت سے الگ کیا گیا، لیکن اس کا آپ کے ذہن ودماغ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

۱۹۴۲ء میں برادر محترم حضرت مولانا لطف اللہ رحمانیؒ سجادہ نشیں خانقاہ رحمانی کے

وصال کے بعد آپ خانقاہ رحمانی کے سجادہ نشیں بنائے گئے، تصوف وسلوک کے سلسلہ میں بیعت تو آپ کو والد محترم ہی سے حاصل تھی، لیکن تعلیم وتربیت کے لئے ابا حضور نے اپنے خلیفہ خاص حضرت مولانا محمد عارف صاحبؒ ہرسنگھ پور ضلع دربھنگہ کے سپرد فرمادیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ والد محترم کی وفات کے بعد بھی آپ انہیں سے وابستہ رہے۔ سجادہ نشیں بننے کے بعد آپ عملی سیاست سے الگ ہوتے چلے گئے اور پورے انہماک کے ساتھ روحانی اور اصلاحی کاموں میں مشغول ہوگئے، جس کے اثرات سے خانقاہ رحمانی فیوض وبرکات کا سرچشمہ بن گیا، بڑی تعداد میں مختلف طبقہ کے لوگ آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہونے لگے۔ جس کی تعداد ایک اندازہ کے مطابق سولہ لاکھ ہے، آپ نے چراغ دل جلا کر اتنے دلوں کو روشن کیا، روحانی قدروں اور خلق اللہ کی ہدایت وخدمت کے لئے عمر عزیز کا ایک ایک قطرہ نچوڑ کر گلشن انسانیت کو سیراب کیا، اور خانقاہ رحمانی مرجع خلائق اور ملک گیر دینی تحریکات کا مرکز بن گئی۔

آغشتہ ایم بر سرِ خار بخونِ دل
قانون باغبانی صحرا نوشتہ ایم

ہر کانٹے کے سرے کو ہم نے خون دل سے رنگین کیا ہے، اور اس طرح صحرا وچمن کی باغبانی وپاسبانی کا قانون (روشنائی سے کاغذ پر نہیں) بلکہ خون دل کی سرخی سے تحریر کیا ہے۔

امیر شریعت خامس حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب جو عالم ربانی، مصلح امت ومرشد اور صاحب نسبت روحانی پیشوا اور بافیض بزرگ تھے ۱۹۷۳ء میں حضرت امیر شریعت رابعؒ نے حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ نائب امیر شریعت کے انتقال کے بعد نائب امیر شریعت نامزد فرمایا تھا، حضرت رابع کی حیات تک اس منصب پر فائز رہے، ان کے وصال کے بعد ۳۱ر مارچ ۱۹۹۱ء میں آپ امیر شریعت خامس منتخب ہوئے، حضرت امیر شریعت رابع کے بارے میں فرماتے تھے۔

> ''حضرت امیر شریعت رابع رحمۃ اللہ علیہ اپنی ولایت کو اجتماعی خدمت کی چادر میں چھپا رکھا تھا، لوگ سمجھ نہیں سکتے تھے کہ وہ ولایت کے کس مقام پر ہیں، مگر جب وہ خانقاہ میں اپنے حجرے کے پچھم طرف سائبان میں خصوصی مجلس میں

تشریف فرما ہوتے تھے تو ان کی ولایت چھپتی نہیں تھی، سمجھنے والے سمجھ جاتے تھے
کہاں اور کس کی مجلس میں ہیں''۔

ایک موقع پر جامعہ رحمانی کی تقریب میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری طیب صاحب ؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''یہ باعث فخر ورشک ہے کہ مونگیر کی سرزمین میں علم کے دو سوتے اور دو چشمے ایک ساتھ جاری ہیں، دونوں میں ایسا سنگم ہے کہ ایک دوسرے سے ممتاز ہیں، ایک چشمۂ شریعت ہے تو دوسرا چشمۂ معرفت، ایک چشمہ علوم ربانی کا ہے تو دوسرا چشمہ معرفت ایزدی کا، جامعہ رحمانی کی عمارت سے جلال علم آشکارا ہے تو کاشانۂ رحمانی سے جمال معرفت ہویدہ ہے''۔

ایک مخلص نے آپ کے بعد آپ سے خانقاہ کے مستقبل کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے برجستہ جواب دیا:

''خانقاہ آج سے بہتر انداز پر چلے گی ولی سلمہ اس ذمہ داری کو اچھی طرح نبھائیں گے، پوری طرح ان کی تربیت کردی گئی ہے اور وہ ہر طرح اس کے اہل ہوچکے ہیں''۔

آج خانقاہ رحمانی قطب عالم حضرت مونگیریؒ کی روحانی خدمات قطب زماں حضرت مولانا امیر شریعت رابع رحمۃ اللہ علیہ کی توجہات اور موجودہ سجادہ نشیں مفکر اسلام حضرت مولانا محمد ولی رحمانی مدظلہ کی ریاضت ومجاہدات کے روحانی اثرات سے عوام وخواص کا اصلاح باطن کے لئے جم غفیر کا رجوع یہ دیکھنے اور محسوس کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔ موجودہ سجادہ نشیں نے اس مرکز رشد وہدایت کی مرکزیت وجامعیت کو روحانیت کا سمندر بنادیا ہے۔

جنات حلقۂ بیعت میں

حضرت امیر شریعت رابع علیہ الرحمہ کے سلسلہ بیعت وارشاد سے جہاں لاکھوں انسان

فیضیاب ہوئے اور ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہوکر روحانی تربیت حاصل کی، جنات بھی آپ سے بیعت ہوکر حلقہ ارادت میں داخل ہوئے اور آپ سے رشد وہدایت کی تربیت حاصل کی۔ مشہور عالم دین حضرت مولانا عبدالکریم پاریکھؒ ناگپور نے اس سلسلہ میں حضرت مولانا کو ایک خط لکھا اور آپ سے یہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو حضرت نے اثبات ونفی میں جواب دینے کے بجائے اشارے میں جواب دیکر مولانا عبدالکریم پاریکھ جیسے بزرگوں کو خوبصورتی کے ساتھ ٹال دیا۔

(تفصیل کے لئے پڑھئے حضرت امیر شریعت رابع نقوش وتاثرات صفحہ ۲۲۰، ۲۲۳)

اسلامی اوقاف پر ٹیکس نہیں لگایا جاسکتا ہے

یہ بات آج کی نہیں بلکہ ۱۹۳۷ء کی ہے کہ حکومت بہار نے زرعی آمدنی پر ٹیکس لگانے کے لیے ایک بل پیش کیا، جس میں اسلامی اوقاف پر بھی ٹیکس لگانے کی تجویز رکھی گئی، حضرت امیر شریعت نور اللہ مرقدہ نے اوقاف سے متعلق حصہ کی مخالفت کی اور فرمایا کہ اسلامی اوقاف پر ٹیکس لگانا ناجائز ہے۔ حکومت کے مثبت انداز میں سوچنے کے بجائے اس کے قانونی مشیر بلدیو سہائے ایڈوکیٹ جنرل نے یہ چیلنج کیا کہ اگر یہ محصول یا ٹیکس مذہبا غلط ہے تو قرآن وحدیث سے اس کا ثبوت پیش کیا جائے کہ مسلمانوں کا مذہب ٹیکس عائد کرنے سے روکتا ہے۔ حضرت امیر شریعتؒ نے اس موقع پر اسمبلی میں یہ مدلل اور مبسوط تقریر فرمائی۔ اسمبلی کے ارکان اور خود ایڈوکیٹ جنرل پر اس کا گہرا اثر ہوا، اس زمانہ میں اسمبلی کاؤنسل وغیرہ میں معقولیت تھی لوگ علمی باتوں کے وزن کو سمجھتے تھے، اس تقریر کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے اس مسئلہ کے حل کے لیے مرکزی قیادت سے گذارش کی، جس کے نتیجہ میں مولانا ابوالکلام آزادؒ اس مسئلہ کو حل کرنے پٹنہ تشریف لائے، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ اور حضرت امیر شریعت نور اللہ مرقدہ سے گفتگو ہوئی، مولانا آزادؒ نے حضرت امیر شریعتؒ کے خیال کی تصویب کی اور پھر حکومت کو حکم دیا کہ مسلمانوں کے اس مطالبہ اور موقف کو تسلیم کرلے، چنانچہ حکومت نے اس کو مان لیا۔ یہ تقریر بھی چھپ چکی ہے، جس کا

مطالعہ بہت ہی مفید اور کارآمد ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہی دل چسپ ہے اور انداز بیان نہایت ہی مؤثر اور مدلل بھی۔ چند جملے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

ایڈوکیٹ جنرل نے اپنی جوابی تقریر میں کہا تھا کہ قرآن مجید اور حدیث جو اسلامی قانون کی بنیاد ہیں اس میں یہ کہیں نہیں ہے کہ اوقاف پر ٹیکس نہ لگایا جائے اور نہ اس کو ثابت کیا جاسکتا ہے۔ میں ادب کے ساتھ ایڈوکیٹ جنرل کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مجھ کو ان کی تقریر سے سخت حیرت ہوئی، میں سمجھتا تھا کہ ان کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہوگا۔لیکن تعجب ہے کہ حکومت کا اتنا بڑا ذمہ دار انسان اسمبلی میں اس قدر غیر ذمہ دارانہ بیان دے سکتا ہے؟

انہیں اسلامی قانون کی بالکل خبر نہیں ہے، انہیں اس کی بھی اطلاع نہیں ہے کہ اسلامی قانون کی بنیاد کن کن چیزوں پر ہے۔ایڈوکیٹ جنرل کو چاہئے تھا کہ وہ حکومت کو مشورہ دیتے کہ وقف پر ٹیکس لگانے کا تعلق مسلمانوں کے مذہب سے ہے لہٰذا اس کو صوبہ بہار کی مذہبی جماعت ''امارت شرعیہ'' یا جمعیۃ علماء سے باضابطہ دریافت کیا جائے اور دریافت کرنے کے بعد اسلامی قانون اسمبلی میں بیان فرماتے، لیکن صحیح علم حاصل کیے بغیر اسلامی قانون کو غلط طریقہ پر اسمبلی میں بیان کرنا ناجائز اور نامناسب جرأت و جسارت ہے۔انہیں اسلامی قانون کی واقفیت نہیں ہے، اس لیے نہ ان کو یہ حق ہے اور نہ ان کے لیے مناسب ہے کہ اسلامی مسائل پر فتویٰ دیں۔ (مسلم پرسنل لا زندگی کی شاہراہ؛ص ۲۲۷، ۲۲۸)

۲۱ر جنوری ۱۹۵۷ء میں امیر شریعت ثالث حضرت مولانا قمرالدین صاحب کا وصال ہوگیا، ان کے وصال کے بعد امیر شریعت رابع کی حیثیت سے کسی کا انتخاب کرنا ایک پیچیدہ اور دشوار مرحلہ تھا، امارت شرعیہ کو ایسے بالغ نظر عالم دین عالی حوصلہ اور وسیع الفکر قائد کی ضرورت تھی جو ملی مسائل کی ترجمانی ہمت وجرأت کے ساتھ شرعی خطوط پر کر سکے، اس وقت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی نوراللہ مرقدہ کی جامع شخصیت ایسی تھی جو امارت شرعیہ جیسے قابل فخر ادارہ کے مردہ جسم میں روح ڈال کر زندہ و متحرک اور فعال بنادے، چنانچہ حضرت مولانا کی غیر معمولی ذاتی صلاحیتوں کی وجہ سے علماء و مشائخ نے پورے اعتماد و یقین کے ساتھ متفقہ طور پر ۲۴ر مارچ

۱۹۵۷ء میں آپ کو امیر شریعت رابع کی حیثیت سے منتخب کر کے ملک وملت کا یہ عظیم سرمایہ اور قیمتی امانت آپ کے حوالے کر دیا جو آپ کے لئے بہت ساری ذمہ داریوں کے ساتھ یہ ایک نئی اور اہم ترین ذمہ داری تھی، لیکن آپ نے دینی بصیرت اور خداداد صلاحیتوں کی بنیاد پر نہ صرف یہ کہ اس امانت کے بارگراں کو محفوظ رکھا بلکہ اس کے دائرہ کار کو اتنا پھیلایا اور وسعت دی کہ پورے ہندوستان میں امارت شرعیہ کی خدمات اور طریقہ کار کو اعتماد اور وقار حاصل ہوا، اور امارت شرعیہ کے اثرات کو پورے ہندوستان میں محسوس کیا جانے لگا۔

حضرت امیر شریعتؒ کی بے پناہ صلاحیتوں، انتھک کوششوں اور ان کے غیر معمولی اخلاص وللٰہیت نے امارت شرعیہ کو نہ صرف یہ کہ ترقی کے بام عروج پر پہنچایا، بلکہ ایک زندہ کارآمد اور عظیم ترین فعال ادارہ میں تبدیل کر دیا۔

یہ حقیقت ہے کہ جن حالات میں آپ امیر شریعت منتخب ہوئے، اس وقت امارت شرعیہ کی مالی حالت بہت خراب تھی، عوام سے اس کا رشتہ بہت حد تک ٹوٹ چکا تھا، چونکہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ بانی امارت شرعیہ ونائب امیر شریعت کا وصال ۱۸/نومبر ۱۹۴۰ء میں ہو چکا تھا اور امارت شرعیہ کا دفتر خانقاہ مجیبیہ کے ایک کھپرہ پوش مکان کے دو کمروں میں تھا، لیکن امارت شرعیہ کے کاموں میں وہ ہماہمی اور سرگرمی نہیں تھی جو نائب امیر شریعت حضرت مولانا سجادؒ کے زمانے میں تھی۔

حضرت امیر شریعت دفتر امارت شرعیہ میں

حضرت امیر شریعت رابعؒ ۲۷/ مارچ ۱۹۵۷ء کو گیارہ ارکان شوری کے ہمراہ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف تشریف لے گئے، حضرت مولانا شاہ امان اللہ صاحبؒ سجادہ نشین سے ملاقات واجازت کے بعد دفتر امارت شرعیہ میں تشریف فرما ہوئے۔

حضرت مولانا عثمان غنی صاحبؒ ناظم اور مفتی امارت شرعیہ کی سربراہی میں جملہ کارکنان امارت شرعیہ نے آپ کا والہانہ استقبال کیا، آپ نے دفتر کا اجمالی معائنہ فرمایا دوران

معائنہ معلوم ہوا کہ اس وقت بیت المال میں امانتوں کے علاوہ صرف دو روپے ساٹھ پیسے ہیں اور سالانہ آمد و خرچ اکیس ہزار روپے ہیں۔ پھر آپ کے سامنے کتاب الاحکام پیش کی گئی اور حضرت امیر شریعت رابعؒ نے اپنا پہلا فرمان تحریر فرمایا۔ جو حسب ذیل ہے۔

حضرت امیر شریعت کا پہلا فرمان

۱۔ امارت شرعیہ ہر طبقہ اور خیال کے مسلمانوں کا مشترک ادارہ ہے، جس کا مقصد بنیادی عقیدہ کی وحدت پر مسلمانوں کی شرعی تنظیم ہے، تا کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو، مسلمانوں میں ممکن حد تک اسلامی احکام جاری ہوں اور مسلمان اس ملک میں اسلامی زندگی گزار سکیں، ظاہر ہے کہ یہ مقصد عظیم تعصب، تنگ نظری، پارٹی بندی اور اپنے مسلک سے ہٹے ہوئے لوگوں پر طعن و تشنیع سے حاصل نہیں ہوسکتا، اس لیے کارکنان امارت کا فرض ہے کہ وسعت نظر اور فراخدلی سے کام لیں۔ پوری یکجہتی کے ساتھ مقصد عظیم پر نظر جمائے ہوئے فروعی اور جزوی اختلافات سے دامن بچاتے ہوئے آگے بڑھیں اور جب تک کسی مسلک اور خیال سے کفر و اسلام کا اختلاف نہ ہو، رواداری ترک نہ کریں۔ ہر معاملہ میں بالخصوص تبلیغ و ہدایت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں زمانہ رسالت ﷺ اور عہد صحابہؓ کے اسوہ کو مشعل راہ بنائیں اور ایسا طریق کار اختیار کریں کہ مختلف مسلک اور خیال کے افراد و اشخاص اس مقصد عظیم کے لیے امارت شرعیہ کے گرد یہ حسن ظن رکھتے ہوئے جمع ہوسکیں کہ یہاں ان کی انفرادیت پر حملے نہ ہوں گے اور ان کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھا نہ جائے گا۔

امارت شرعیہ کی ترقی اور استحکام میں اس فکر اور طریق کار کو بنیادی مقام حاصل ہے۔ اس لیے امارت کے ہر کارکن پر اس کی پابندی لازم ہوگی۔

۲۔ محکمۂ قضا جو امارت کا سب سے اہم شعبہ ہے۔ اس کے نظام کو پورے صوبے میں پھیلانا بہت ضروری ہے۔ تا کہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو فائدہ پہنچ سکے اور مقدمات کے فیصلے جلد سے جلد ہوسکیں۔ اور انہیں اسلامی زندگی گزارنے میں سہولت ہو اس کے لیے ضرورت ہے کہ

(الف) جن اضلاع یا کمشنری میں ممکن ہو، قاضی مقرر کیے جائیں اور اس حلقہ کے مقدمات وہیں دائر ہوکر فیصلہ پائیں

(ب) مقرر کیے جانے والے قاضیوں کی تربیت کا نظم مرکزی دارالقضاء پھلواری شریف میں کیا جائے کہ وہ مقدمات کی سماعت اور فیصلے کے طریقوں کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

(ج) قاضیوں کی سہولت کے لیے اردو زبان میں ایک رسالہ مرتب کیا جائے جس میں فقہ کی معتبر کتابوں کو سامنے رکھ کر قاضیوں کے اختیارات، فرائض، مقدمات میں شہادت کے شرعی اصول اور ضابطے، فسخ نکاح اور خلع کے وجوہ اور طریقے اور ان سے متعلق مسائل درج کیے جائیں اور بطور مثال ونظیر عہد رسالتؐ وصحابہؓ اور مشہور قضاۃ اسلام کے فیصلے لکھے جائیں۔ مقرر کیے جانے والے قاضی باضابطہ اس رسالہ کا مطالعہ کریں تا کہ اس کی روشنی میں مقدمات کا فیصلہ کرسکیں۔

اس فرمان کے مطالعہ کے بعد آسانی کے ساتھ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ امیر شریعت رابع کے عزائم کیا تھے؟ اور وہ کن اصولوں کے تحت امارت شرعیہ کے کاموں کو آگے بڑھانا چاہتے تھے؟ اور کن میدانوں میں امارت شرعیہ کے ذریعہ مسلمانوں کی ملی اور اجتماعی خدمت کا ارادہ رکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو جرأت وتدبر اور دوراندیشی ومعاملہ فہمی عطا کر رکھی تھی اور جس بصیرت وعزیمت کا آپ کو مالک بنایا اس نے آپ میں بے پناہ کشش اور دل کشی پیدا کردی۔ خندہ پیشانی کے ساتھ ملنے کا معاملہ ایسا رہا کہ اس کی وجہ سے لوگ والہانہ انداز سے آپ کی طرف لپکتے تھے اور آپ کی باتوں پر عمل کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اپنی زندگی کے آغاز ہی سے امارت کی تحریک ودعوت سے آپ وابستہ رہے۔ آپ کی ذات گرامی سے ملک وملت کو جو فائدہ پہنچا اور آپ کے دور امارت میں امارت شرعیہ نے جو ہمہ جہت ترقی کی ہے وہ روز روشن کی طرح واضح ہے۔

آزاد اسلام کا نعرہ

۱۹۵۸ء میں حضرت امیر شریعت نے بہار کے مرکزی شہر دربھنگہ میں ایک عظیم الشان

جلسہ سے خطاب فرمایا۔اس موقعہ پر آپ نے ایک تاریخی تقریر فرمائی جس میں مسلمانوں کو آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام کا نعرہ دیا۔آپ نے فرمایا: میں سمجھتا ہوں کہ ہر مسلمان کی یہ ذمہ داری ہے کہ ہندوستان کے قانون کو اسلام سے قریب تر کرنے کی جائز اور پر امن کوشش کرے۔اگر ملک میں کوئی برائی ہے اور اس پر ہم راضی اور خوش ہیں اور اس برائی کو ہم دور کرنا نہیں چاہتے تو ہمیں اس ملک میں رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ایسی حالت میں ترک وطن واجب ہے۔

آپ نے مزید فرمایا:

> ''امارت شرعیہ ہر مسلک ومشرب کے مسلمانوں کا ادارہ ہے، یہ کسی خاص مسلک کی تنظیم نہیں ہے، اہل حدیث ہوں یا بریلوی، دیوبندی ہوں یا ندوی، میں یقین دلاتا ہوں کہ اس نظام میں انہیں اپنی انفرادیت کے محفوظ رکھنے کا پورا موقعہ ملے گا۔''

اس تقریر سے جہاں مسلمانوں میں اپنے ملی وجود کو باقی رکھنے کا جذبہ پیدا ہوا وہاں انگریزی اور ہندی پریس نے روایتی طریقہ پر خاص انداز میں اس کا نوٹس لیا۔

مشہور انگریزی روزنامہ سرچ لائٹ ہندی روزنامہ آریہ ورت اور دوسرے اخبارات نے اس صدائے حق کے خلاف مسلسل مخالفانہ نوٹس اور مضامین شائع کیے۔سرچ لائٹ ایک متوازن اخبار سمجھا جاتا ہے، مگر اس نے بھی یہ شاہ سرخی جمائی: Plan to convert all non muslims to islam? communal campaign by amir shariat (Serch light) Nov. 28 1957)

(تمام غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کا پلان؟ امیر شریعت کی فرقہ وارانہ تنظیمی جدوجہد)

دوسرے اخبارات نے بھی عوام میں غلط فہمی اور اشتعال پیدا کرنے کے لیے مختلف انداز میں تبصرے کیے مسلمانوں میں کچھ لوگ جو حکومت کے ہوا خواہ تھے، انہوں نے بھی اپنا فرض پورا کیا۔اور امارت کے خلاف حکومت کو مشتعل کرنے کی کوشش کی مگر بحمد اللہ اس غلط پروپیگنڈے سے نہ حضرت امیر شریعتؒ مرعوب ومتاثر ہوئے اور نہ امارت کے کارکنوں میں کوئی سراسیمگی پیدا

ہوئی، امارت شرعیہ کے ترجمان نقیب نے پوری قوت کے ساتھ غلط فہمیوں کو دور کرنے اور غلط پروپیگنڈے کو مٹانے کی کامیاب کوشش کی، اردو پریس کے بڑے حلقہ نے امارت کی خدمات کو سراہا۔ حضرت امیر شریعتؒ کے پیغام کی تحسین کی اور ایسے نازک وقت میں جرأت وہمت اور حق گوئی وبے باکی کے ساتھ مسلمانوں کی رہنمائی پر مبارک باد دی۔

دلیرانہ مطالبہ

مشہور اہل علم اور صاحب قلم حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے امارت شرعیہ کی جد وجہد اور حضرت امیر شریعتؒ کے اقدام کو سراہتے ہوئے اپنے ہفت روزہ صدق جدید میں دلیرانہ مطالبہ کے عنوان سے حضرت امیر شریعتؒ کے پیغام وبیان اور امارت شرعیہ کے موقف کی تائید میں تفصیلی نوٹ لکھتے ہوئے یہ تحریر فرمایا:

> ''بہت اونچا جا رہا ہے امارت شرعیہ، اب بھی یہ دم خم رکھتا ہے کہ آزاد ہندوستان کے اندر آزاد اسلام کے خواب کی تعبیر پوری کرائے گا۔ اللہ تعالی اس ہمت کو استقامت نصیب کرے۔ جدید امیر شریعت بہر صورت اپنے اس مؤمنانہ اقدام کے لیے مستحق تبریک وتحسین ہیں'' (صدق جدید)

آپ کے امیر شریعت منتخب ہونے کے بعد ایک موقع پر امارت شرعیہ کی مخالفت زور وشور سے شروع ہوئی کچھ لوگوں نے چندہ روکنے کی کوشش کی، کچھ ارباب سیاست اور اہل ہوس کو آپ کا امیر شریعت بننا پسند نہیں آرہا تھا، طرح طرح سے امارت کی مخالفت کی جانے لگی، ذاتیات پر حملے ہوئے، مبلغین اور کارکنوں کو تنگ اور پریشان کرنے کی کوشش بھی کی گئی فرضی خطوط کا سلسلہ بھی شروع ہوا، متوازی امارت شرعیہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی، اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ حالات بہت نازک اور بظاہر حوصلہ شکن ہوگئے۔ مخالفتوں کا سخت طوفان تھا، رات تاریک تھی کشتئ امارت گرداب بلا میں گھری ہوئی تھی۔ حافظ کا یہ شعر اس وقت کے حالات کے عین مطابق ہے۔

شب تاریک و بیم موج گردابے چنیں ہائل
کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا

لیکن حضرت امیر شریعت رابعؒ نے خدا پر لازوال یقین، عزم وحوصلہ، صحیح فیصلہ، تدبر، اور صبر واستقامت کی بدولت، دشواریوں میں کامیابی کی راہ تلاش کر کے کامیابی کی شمع روشن کردی، امارت شرعیہ میں نئی روح ڈال دی، اور آج امارت شرعیہ بہار اڑیسہ وجھارکھنڈ ہی نہیں پورے ملک میں بلکہ عالم اسلام میں اپنی امتیازی خصوصیت اور شناخت کے ساتھ متعارف ہے اور ہر جگہ امارت شرعیہ کو دیکھا اور اس کے اثرات کو محسوس کیا جاسکتا ہے، ہندوستان میں اسلام کی سر بلندی، تحفظ شریعت اور تنفیذ شریعت میں امارت شرعیہ کی خدمات کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

تحفظ فلسطین کانفرنس

۶ر جون ۱۹۶۵ء میں عرب اسرائیل جنگ شروع ہوئی اسرائیل نے مصر، شام، اردن اور فلسطین کے بہت سارے علاقے پر غاصبانہ قبضہ کرلیا جس سے پورے عالم اسلام کے مسلمانوں کو سخت تکلیف پہونچی اور حضرت امیر شریعت رابعؒ نے بھی اپنے دل میں درد اور چبھن محسوس کرتے ہوئے ۲۵ر جون ۱۹۶۵ء کو امارت شرعیہ پٹنہ تشریف لائے، عربوں کی حمایت میں بیان دیا اور ان کی امداد واعانت کی اپیل کی، جس کا لوگوں نے خیر مقدم کیا۔ ۶ر اگست ۱۹۶۵ء میں تحفظ فلسطین کے نام سے انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ میں عظیم الشان کانفرنس منعقد کی جس میں شام کے سفیر عمر ابوریشہ، مصر کے نمائندہ جمال مناع علی، خصوصیت کے ساتھ شریک ہوئے، ان دونوں حضرات نے نہایت ہی فصیح وبلیغ اور پرسوز خطاب فرمایا، سامعین پر خاص تاثر اور کیفیت طاری ہوئی، امیر شریعت رابع رحمۃ اللہ علیہ نے اس موقع پر اپنا کلیدی خطبہ تحریری پیش فرمایا جو چھپ چکا ہے اور کتابی شکل میں موجود ہے، قابل مطالعہ ہے، اس موقع پر امارت شرعیہ نے ایک لاکھ روپے کا عطیہ عرب مہمانوں کے حوالہ کیا جس سے امارت شرعیہ کے وقار واعتماد میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ ۱

ایمرجنسی کے سنگین حالات میں نسبندی کی حرمت کا فتویٰ

حضرت امیر شریعت رابعؒ ہمیشہ حق وصداقت کے علمبردار رہے، مصلحتیں ان کے پیش نظر کبھی نہیں رہیں، نہ ہی کسی طرح کے دباؤ کو کبھی انہوں نے محسوس کیا، جسے حق اور صحیح سمجھتے بلا چوں وچرا اظہار کر دیتے، اعلان حق میں کبھی تامل اور تکلف سے کام نہیں لیتے واضح طور پر اپنی رائے کا اظہار کر دیتے، بند کمروں میں نہیں بلکہ جلسوں اور کانفرنسوں میں، صرف زبانی ہی نہیں بلکہ تحریری بھی، یہ ۷۴ء۱۹، ۱۹۷۵ء کی بات ہے ملک میں ایمرجنسی نافذ تھی، جبری نسبندی کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، ملک میں خوف وہراس کا ماحول تھا، زبان بند تھی، ممتاز علماء اور اصحاب افتاء کے لئے سخت ترین آزمائش کا وقت تھا، انہیں ہراساں اور خوفزدہ کر کے خاندانی منصوبہ بندی کی حمایت وتائید میں فتویٰ دینے پر مجبور کیا جارہا تھا، حتی کہ حکومت کی ترغیب وترہیب سے متاثر ہوکر بعض لوگوں نے نسبندی کی حمایت میں فتویٰ بھی دے دیا تھا، آل انڈیا ریڈیو سے مصطفیٰ علی اکبر نے حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند جو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر بھی تھے ان کے انٹرویو کو کاٹ چھانٹ کر لگا تار وقفہ وقفہ سے کئی دنوں تک نشر کیا، جس کی وجہ سے پورے ملک میں اضطراب اور بے چینی کی لہر دوڑ گئی، حضرت امیر شریعتؒ نے اس کے خوفناک نتائج کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور اس موقع پر پوری جرأت وہمت کے ساتھ حق وصداقت کا اظہار کرتے ہوئے ایسا مفصل وضاحتی بیان بورڈ کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے شائع فرمایا کہ حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کا اعتبار ووقار بھی متاثر نہ ہوا اور جبری نسبندی کے متعلق علماء کے سامنے واضح موقف بھی آ گیا۔

۱۸/۱۷/ اپریل ۱۹۷۶ء کو پولیس اور مسلح جوانوں کے نرغے میں مہندیان، درگاہ شاہ ولی اللہ دہلی میں مجلس عاملہ اور ملک کے ممتاز علماء کا اجتماع بلایا اور جبری نسبندی کے خلاف پوری جرأت ایمانی کے ساتھ انتہائی جرأتمندانہ فیصلہ کیا، جس میں مسئلہ کی صحیح وضاحت کی گئی، شرعی موقف کو واضح کرتے ہوئے جبری نسبندی کے حرام ہونے کا فتویٰ دیا گیا اور ممتاز علماء کے

دستخطوں سے اسے شائع کر کے ملک کے گوشے گوشے میں اس کو پہونچایا گیا، مزید حضرت امیر شریعت رابعؒ نے ''خاندانی منصوبہ بندی'' کے نام سے ایک مفصل رسالہ اردو، ہندی، انگریزی اور دوسری زبانوں میں چھپوا کر پورے ہندوستان میں بھیجوایا جس سے مسلمانوں نے راحت کی سانس لی اور ملت اسلامیہ ہند کو نیا حوصلہ ملا۔

اس وقت کے حالات کے تناظر میں یہ انتہائی خطرناک اور دلیرانہ فیصلہ تھا جس کے نتیجہ میں سخت ترین سزا کا قوی امکان تھا، لیکن اللہ کے اس محبوب بندے کو ایمرجنسی کی سنگینی اور حکمراں کی زبردست طاقت و دہشت بھی مرعوب نہیں کر سکی۔

دفتر امارت شرعیہ کی منتقلی اور کاموں کی ترتیب

بعض ناگزیر حالات و وجوہات کی بنیاد پر امارت شرعیہ کے پرانے دفتر کو خالی کرنا پڑا، قاضی حسین احمدؒ ناظم امارت شرعیہ کی معاونت سے حضرت قاضی نورالحسن رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مکان دفتر کے لئے مل گیا، اور امارت شرعیہ کا دفتر خانقاہ مجیبیہ سے اس مکان میں منتقل کر دیا گیا، از سر نو کاموں کا نقشہ اور لائحہ عمل تیار ہوا، اور پورے نظم وضبط کے ساتھ وسیع پیمانے پر امارت شرعیہ کا کام شروع ہوا، اور کاموں کا دائرہ پھیلتا گیا، نئے نئے شعبے قائم ہوتے گئے، کام بڑھتا گیا اور جگہ تنگ ہوتی گئی، بالآخر نئی اراضی کی تلاش شروع ہوئی بحمداللہ لب سڑک وسیع وعریض زمین حاصل ہوگئی، حصول زمین کے سلسلہ میں جناب اخلاق الرحمٰن قدوائی سابق گورنر بہار، جن کی دلچسپی اور امارت شرعیہ سے گہری وابستگی اور حضرت رابعؒ سے والہانہ لگاؤ اور بے پناہ عقیدت ومحبت کی بنیاد پر امارت شرعیہ کو وسیع وعریض زمین ملی لکھتے ہیں:

> ''امارت شرعیہ کو میں نے اس حال میں دیکھا جب وہ ایک بوسیدہ عمارت میں تھی، گلیوں میں اس کا دفتر تھا، مجھے خوشی ہے کہ میری گورنری کے زمانہ میں یہ زمین امارت کو ملی، زمین حاصل کرنے کے لیے حضرت امیر شریعتؒ نے اپنے صاحبزادہ مولانا محمد ولی رحمانی کو ذمہ دار بنایا تھا، وہ مناسب موقعوں پر توجہ

دلاتے اور تعلق رکھنے والوں کو اعتماد میں لے کر ان سے مدد لیتے، نتیجہ میں
حکومت بہار نے پھلواری شریف میں سڑک کے کنارے ایک بڑی اراضی
امارت شرعیہ کو قیمۃً دی مولانا مرحوم کی یہ شرافت اور عظمت تھی کہ انہوں نے
راج بھون پہنچ کر میرا شکریہ ادا کیا"

جب زمین حاصل ہوگئی تو ۱۵/ نومبر ۱۹۸۱ء کو سنگ بنیاد کا عظیم الشان اجلاس ہوا اور حضرت امیر شریعتؒ کے مبارک ہاتھوں یہ کار خیر انجام پایا، جس میں ملک کے نامور علماء خاص طور پر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحبؒ، مولانا مفتی ضیاء الحق دہلویؒ کے علاوہ ہزاروں اصحاب علم ودانش، مخلصین ومعاونین امارت شرعیہ شریک ہوئے۔

اس موقع پر آپ نے بحیثیت صدر اجلاس خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

"آج دفتر امارت شرعیہ کی مرکزی عمارت، ٹیکنیکل انسٹی چیوٹ اور شفاخانہ کا سنگ بنیاد رکھا جارہا ہے، آنے والے دنوں میں جب یہ عمارتیں تیار ہوں گی، تو مجھے یقین ہے کہ انسانی خدمت کا بہترین ذریعہ ثابت ہوں گی یہ تین قسم کی عمارتیں دراصل امارت شرعیہ کے انداز فکر کو ظاہر کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ امارت شرعیہ کے مقاصد میں کن چیزوں کی اہمیت ہے۔"

دفتر خاموشی کے ساتھ نظم وضبط کی تعلیم دیتا ہے، ٹیکنیکل انسٹی چیوٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ امارت شرعیہ کی نگاہ میں تعلیم کی کیا اہمیت ہے، اور وہ نوجوانوں کو کس طرز کی تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دے رہی ہے، شفاخانہ کی عمارت رفاہی خدمت کی علامت ہے اور یہ اشارہ ہے کہ امارت شرعیہ ہر انسان کو صحتمند اور تندرست دیکھنا چاہتی ہے۔"

۲۰/ نومبر ۱۹۸۳ء کو مرکزی عمارت، جسے دارالامارہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، افتتاح گورنر بہار جناب اخلاق الرحمٰن قدوائی کے دست مبارک سے عمل میں آیا، جس میں ہندوستان کے مختلف حصوں سے تشریف لائے ہوئے ممتاز علماء کرام، اکابرین ملت اور ہزاروں

کی تعداد میں مخلصین نے شرکت کی اور صدارت حضرت امیر شریعت رابعؒ نے فرمائی۔

اس موقع پر آپ نے فرمایا یہ عمارت آپ کے سامنے کھڑی ہے ابھی بہت کام باقی ہے، اس نئی عمارت کو مکمل کرنا ہے، ہاسپٹل کی عمارت بنانی ہے اور ٹیکنیکل سنٹر کی تعمیر ہونی ہے۔ قومی اور ملی کاموں کا انحصار افراد پر نہیں ہوتا، میں رہوں یا نہ رہوں اسے پورا کرنے کی ذمہ داری آپ سبھوں پر ہے، امارت شرعیہ نے اپنی خدمات، ترقی اور مقبولیت کی بنیاد پر ایک چھوٹے پودے سے تناور درخت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اور صرف دو سال کے عرصہ میں اس کی پہلی منزل مکمل ہوئی ہے کون جانتا تھا کہ دو سال کے بعد ہم لوگ افتتاح کی تقریب میں پھر جمع ہوں گے۔ لیکن کل کا خواب آج کی ٹھوس حقیقت ہے۔ جو سامنے کھڑی ہے۔ (خطبۂ صدارت امیر شریعت رابعؒ)

خواب ہر شخص دیکھتا ہے لیکن خواب کو حقیقت کے سانچے میں ڈال کر اسے ایک زندہ وجود عطا کرنا ہر شخص کے بس کا کام نہیں ہے، امارت شرعیہ اور ملت اسلامیہ کی خوش نصیبی تھی کہ حضرت امیر شریعت رابعؒ کی قیادت اور رہنمائی حاصل ہوئی۔ وہ ایسے دینی رہنما اور قائد تھے جو حال میں نہیں مستقبل میں جیتے ہیں، جو لوگ حال میں جیتے ہیں ان کی حیثیت پانی کے بلبلے کی مانند ہوتی ہے وہ سطح آب پر ذرا دیر کے لیے نمودار ہوتے ہیں اور پھر غائب ہو جاتے ہیں لیکن تاریخ ساز قائد و رہبر اپنے پیچھے ایک ایسی تاریخ چھوڑ جاتے ہیں جو آئندہ نسلوں کے لیے مشعل راہ کا کام دیتی ہے، یقیناً حضرت امیر شریعت رابعؒ تاریخ ساز قائد تھے۔

امارت شرعیہ ملت کی قوت و استحکام کا سرچشمہ

مشہور صحافی جناب حیات اللہ انصاری صاحب سابق ایڈیٹر قومی آواز امارت شرعیہ کے سلسلہ میں اپنے احساسات و تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''امارت شرعیہ کی ساٹھ سالہ تاریخ بڑی بے داغ اور پاک وصاف ہے، ہمارے سو سال کے پرانے ادارے ہیں لیکن ان کی تاریخ میں کہیں نہ کہیں جھول

آ گیا ہے، لیکن امارت شرعیہ کے بارے میں ایسا نہیں کہا جا سکتا، مولانا ابو المحاسن محمد سجادؒ اور مولانا ابو الکلام آزادؒ نے اس طرح کے ادارے کا خواب پورے ہندوستان کے لئے دیکھا تھا لیکن بعض ناگزیر حالات کی بنا پر پورے ملک کی سطح پر یہ نظام قائم نہ ہو سکا تاہم بہار واڑیسہ کے لوگوں کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے یہاں نہ صرف نظام قائم ہے بلکہ مختلف جہتوں سے دین وملت کی بڑی گراں قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔''

مسلمانوں کے بہت سے ادارے ہیں بلا شبہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں لیکن انہوں نے کوئی خاص کام اپنے ذمہ لے رکھا ہے، اس کے برعکس امارت شرعیہ میں ایک ہی چھت کے نیچے بہت سارے کام انجام پا رہے ہیں، ایک طرف دار القضا کا شعبہ ہے جو مسلمانوں کے باہمی نزاعات کا تصفیہ کے ذریعہ یک جہتی اور ہم آہنگی کو مضبوط کر رہا ہے۔ دوسری طرف دار الافتاء کا شعبہ ہے جو دینی مسائل میں مسلمانوں کی رہنمائی کر رہا ہے۔ تبلیغ وتنظیم کا شعبہ ہے جو دور دراز کے گاؤں میں لوگوں تک دین کی باتیں پہنچا رہا ہے اور ان کو تنظیم کی لڑی میں پرو کر متحد ومنظم کر رہا ہے۔ تو تحفظ مسلمین کا شعبہ فساد زدہ اور مصیبت زدہ لوگوں کے درمیان راحت رسانی اور آبادکاری کا کام انجام دے رہا ہے، اگر ایک طرف مدارس ومکاتب کے ذریعہ دینی علوم کی اشاعت ہو رہی ہے تو دوسری طرف عصری علوم کے میدان میں ملت کے ہونہار فرزندوں کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ اس طرح امارت شرعیہ ملت کی قوت واستحکام کا سرچشمہ ہے۔ (نقیب ۱۱رجون ۱۹۸۴ء)

عہد ساز ادارہ کا انقلابی اقدام

مولانا عبد الاحد ازہری قاضی شریعت مالیگاؤں مہاراشٹر امارت شرعیہ کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ:

''ملک کی مسلم تنظیموں اور اسلامی اداروں میں امارت شرعیہ بہار اڑیسہ وجھارکھنڈ اپنی حسن کارکردگی اور شاندار قومی وملی خدمات اور تعمیری وانقلابی کارناموں کی بنا

پر منفرد اور نمایاں مقام کی حامل ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا واحد ملی ادارہ اور دینی مرکز ہے۔ یہ ساری ترقی مرہون منت ہے میر کارواں حضرت امیر شریعت رابع مولانا منت اللہ رحمانی کا، آپ امارت شرعیہ کے نہ صرف چوتھے امیر شریعت تھے بلکہ اس کے روح رواں رہے۔ حضرت موصوف گوناگوں خصوصیات کے حامل تھے، ایک طرف ظاہری علوم وفنون کے محرم اسرار ہیں تو دوسری طرف باطنی علوم کے رمز شناس ہیں، جہاں درس وتدریس کے مسند کے امین ہیں وہیں دوسری طرف مشیخیت وطریقت کے اداشناس بھی ہیں۔'' (نقیب ۹ر جون ۱۹۸۴)

امارت شرعیہ کا نظام اسلام کے اجتماعی نظام کی روح اور اسپرٹ ہے

مولانا حمید الدین عاقل حسامی امیر ملت اسلامیہ آندھرا پردیش حیدرآباد۔ اپنے پیغام میں لکھتے ہیں:

''وہ ایک غیور ہستی مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نور اللہ مرقدہ کی تھی جو دل دردمند اور فکر ارجمند کا بہترین نمونہ اور روشن دل اور بے داغ دماغ کا حسین سنگم تھے، وہ نبض شناس اور ان لوگوں میں تھے جو حال کے آئینہ میں مستقبل کی تصویر دیکھ سکیں، انہوں نے اس حقیقت کو سمجھا کہ آزادی کے بعد مسلمانوں کو جس چیز کی ضرورت ہوگی وہ یہی نظام امارت ہے، امارت شرعیہ نے قیام سے لیکر اب تک جو کچھ کیا ہے وہ کام نہیں بلکہ کارنامہ ہے۔ امیر شریعت رابع حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کے زمانہ میں اس کی شہرت وعظمت ریاست سے لیکر بیرون ریاست ہی نہیں بلکہ باہر کی دنیا تک پہونچی۔ امیر شریعت کی انتھک محنت اور مسلسل جد وجہد اپنی جگہ قابل صد فخر اور تاریخ امارت شرعیہ کے لئے عظیم یادگار ہونے کے ساتھ ساتھ دوسری ریاستوں کے لئے روشنی کا مینار ہے جس سے وہ روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔'' (نقیب ۵ر دسمبر ۱۹۸۳ء)

امارت شرعیہ کی خدمات ہر طرح لائق ستائش اور قابل تحسین ہے

مفکر اسلام عالم اسلام کے مشہور عالم دین حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''امارت شرعیہ نے اپنی پچاس سالہ زندگی میں دین وملت کی جو خدمت کی ہے وہ ہر طرح لائق ستائش اور قابل تحسین ہے۔ امیر شریعت رابع حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی کے دور امارت میں امارت شرعیہ کا اعتماد وقار بلند ہوا اور اسکا کام زیادہ سے زیادہ وسیع ومنظم ہو گیا، نئے نئے شعبوں کا آغاز ہوا، جگہ جگہ دار القضاء قائم کیا گیا، شرعی فیصلوں کی اہمیت اور اس کے احترام کا اظہار ہوا، قضاۃ کی تربیت کا نظم کیا گیا اور قاضیوں کا تقرر عمل میں آیا، دارالافتاء کو مزید منظم کیا، بیت المال کی توسیع ہوئی، تحفظ مسلمین اور تبلیغ کے شعبے قائم ہوئے، گاؤں گاؤں اور اضلاع سے رابطہ قائم کیا گیا، مسلمان عورتوں کے حقوق کی نگرانی، مشرکانہ رسوم اور اخلاقی مفاسد اور عادات بد کی مخالفت کی کوششوں کو تیز کیا گیا، فرقہ وارانہ فسادات میں مفید خدمات انجام دی گئیں یہ سب حضرت امیر شریعت رابع کی محنتوں کا نتیجہ ہے، مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں جو قائدانہ کردار ادا کر رہے ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں، غرض ان کے دور میں امارت شرعیہ نے ہر طرح ترقی وکامیابی کے مراحل طے کئے ہیں۔'' (نقیب ۵ر دسمبر ۱۹۸۳)

امارت شرعیہ کی خوبصورت اور شاندار عمارت، اس کے پہلو میں مولانا سجاد ہاسپٹل اور ٹیکنیکل سنٹر کی پر وقار عمارت حضرت رابعؒ کی تنظیمی صلاحیت، اخلاص ومحنت کے گہرے اثرات اور جدو جہد کا نتیجہ ہے آج یہ سب پیغام دے رہے ہیں اور زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ حضرت مولانا کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے، خدمات کے لحاظ سے ان کا نام روشن وتابناک ہے، بحیثیت امیر شریعت اس طرح کام کیا کہ اس منصب کی عظمت بڑھ گئی، امارت

شرعیہ ملک گیر دینی وملی تحریکات کا مرکز بنی اور ایک صوبہ کا ادارہ پورے ملک میں باوزن ہوگیا، وہ کام کرنا اور کام لینا جانتے تھے، کام کرنے کا سلیقہ، صحیح پلاننگ اور بروقت صحیح اقدام کی بے پناہ صلاحیتیں ان میں موجود تھیں وہ ملت کے خداترس قائد ورہنما اور بے لوث مجاہد ومرشد تھے۔

حضرت امیر شریعت رابعؒ کے اہم کارنامے

۱ امارت شرعیہ کی مرکزی عمارت کی تعمیر

۲ مسلم پرسنل لا بورڈ کی تاسیس اور اس کے پہلے جنرل سکریٹری

۳ تحفظ قوانین شریعت کے لئے اقدامات اور ایوان حکومت میں جرأت مندانہ اظہار حق

۴ دوران ایمرجنسی خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف مجاہدانہ سرگرمیاں اور حرمت کا فتویٰ اور شرعی احکام کی وضاحت۔

۵ مولانا سجاد اسپتال، ٹیکنیکل سنٹر کا قیام

۶ تربیت قضاء کے لیے بہار کے ممتاز علماء کا جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر میں اہم اجتماع

۷ امارت شرعیہ میں ملکی سطح پر ممتاز ومعروف علماء، علماء ہند کے لیے نظام قضا کی علمی حیثیت اور کیفیت قضاء کی عملی تربیت کا

اجتماع، جس کا افتتاح مولانا نے فرمایا، اس موقع پر آپ کا کلیدی خطبہ جو تحریری شکل میں شائع شدہ ہے۔

۸ ملک کے مختلف حصوں میں امارت شرعیہ اور دارالقضاء کے طرز پر کاموں کا آغاز۔

۹ امارت شرعیہ کے انداز فکر طریق کار اور خدمات کو پورے ملک میں وقار واعتماد کا حاصل ہونا۔

امیر شریعت رابعؒ کے جرأت مندانہ فیصلے

بعض بڑے نازک مواقع پر آپ نے جرأت مندانہ فیصلے کیے، ۱۹۷۵ء میں ایمرجنسی کے درمیان آپ نے کھل کر خاندانی منصوبہ بندی کے سرکاری پروگرام کی مخالفت کی اس کے

خلاف لکھا اور تقریریں کیں، نیز امارت شرعیہ اس کی مخالفت میں فتوی دیتی رہی، دارالعلوم کے اجلاس صد سالہ کے بعد جو قضیہ پیدا ہوا، اس کو حل کرنے کے لیے ایک ماہ اپنے اخراجات سے دہلی میں مقیم رہے اور آخر وقت تک مصالحت کے لیے کوشاں رہے، بابری مسجد کے مسئلہ میں جب بعض حلقوں کی طرف سے ایسا نظریہ سامنے آنے لگا کہ وہ اس کی شرعی حیثیت کو نظر انداز کر کے مصالحت کی سوچ رہے ہیں تو آپ نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ارکان عاملہ کا خصوصی اجلاس طلب کیا اور پوری جرأت کے ساتھ اپنے موقف کا اظہار کیا کہ مسجد ہمیشہ کے لیے مسجد ہے اور اس میں کوئی لین دین نہیں ہو سکتی۔

امیر شریعت رابعؒ کے دور امارت کا زندہ و تابندہ کارنامہ اور تاریخی کردار آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام ہے، سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کی تنسیخ جو شاہ بانو کیس میں (اس نے ۲۳/اپریل ۱۹۸۵ء کو دیا تھا) ۵/مئی ۱۹۸۶ء کو پارلیامنٹ سے نئے مسلم مطلقہ بل کا متفقہ طور پر پاس ہونا، اسلام کے منصفانہ اور فراخدلانہ قوانین اور عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے بارے میں واضح بیانات، پھر خود مسلمانوں میں اصلاح معاشرہ کی ہمہ گیر تحریک اور تعمیر ملت کے لئے عملی وفکری جد وجہد اور اس کے اثرات سے پرسنل لا بورڈ کے وہ عظیم الشان جلسے جو ممبئی، کلکتہ، بنگلور، رانچی، حیدرآباد اور کانپور، رائے بریلی، دیوبند، بلکہ کشمیر سے کالی کٹ اور کنیا کماری تک آپ کی نگرانی میں ملک کے بیسوں مقامات پر ہوئے جس کی نظیر سالہا سال میں نہیں ملی، امیر شریعت رابع کا احساس ذمہ داری، ملت کے ساتھ ربط و تعلق اور اس کے مصائب پر دل گیر و فکر مند ہونا، مسلم پرسنل لا کی تحریک ہی میں محدود نہ تھا، وہ فرقہ وارانہ فسادات، مسلمانوں کی نسل کشی، مساجد کے انہدام وغیرہ کے واقعات پر بھی ایسے ہی فکر مند ہو جاتے تھے، چنانچہ نومبر ۱۹۸۹ء میں بھاگلپور میں ایک سفاکانہ اور انسانیت سوز فرقہ وارانہ فساد ہوا، امیر شریعت رابعؒ نے اس سلسلہ میں جو کچھ ممکن تھا کیا، ان کا ایک اہم ملی، علمی و شرعی کارنامہ اور مبارک اقدام اردو میں تدوین قانون اسلامی و شرعی کی ترتیب و جمع کا وہ کام ہے جو انہوں نے ممتاز علماء ماہرین قانون شرعی اور اہل اختصاص کے ذریعہ شروع کی جو بہت حد تک ان کی زندگی میں مرتب و مکمل ہو گیا۔

ملک کے مختلف صوبوں میں امارت کا قیام

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی لکھتے ہیں کہ:

''مولانا کی ہی للّٰہیت اور محنت کا ثمرہ ہے کہ آسام میں امارت شرعیہ قائم ہوئی کرناٹک میں امارت شرعیہ سرگرم عمل ہوئی اور حیدرآباد دکن میں اس کی تنظیم عمل میں آئی، مالیگاؤں میں دارالقضاء کھلا اور برہان پور میں دارالقضاء قائم ہوا۔''

(امیر شریعت رابع نمبر ۶۰)

حضرت امیر شریعت کا وصال

امارت شرعیہ کا یہ قافلہ حضرت امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانی صاحب کی قیادت میں رواں دواں تھا کہ اس مرد حق آگاہ پر ۲ اور ۳ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۹ر اور ۲۰ر مارچ ۱۹۹۱ء کی درمیانی شب میں وصال ہوگیا اور امارت شرعیہ اپنے تاریخ ساز امیر شریعت سے محروم ہوگئی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اپنے بانی و مفکر اور روح رواں اور اولوالعزم جنرل سکریٹری سے محروم ہوگیا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ۲۴/ مارچ ۱۹۵۷ء کو امیر شریعت منتخب ہوئے اور ۱۹/ ۲۰/ مارچ کی درمیانی شب میں آپ کا وصال ہوا۔

۱۹ر مارچ منگل کے دن معمول کے مطابق روزہ رکھا، بعد نماز عصر قرآن پاک کا وہ حصہ حافظ صاحب موصوف سے سماعت فرمایا جسے تراویح میں پڑھنا ہے، تمام لوگوں کے ہمراہ افطار کیا، باجماعت عشاء کی نماز بحالت قیام ادا کی، نماز تراویح بیٹھ کر پڑھنے لگے، چار رکعت تراویح کی نماز پڑھنے کے بعد قلب میں بے چینی کا احساس ہوا، خادم کو اشارہ کیا اور خاموشی کے ساتھ مسجد سے نکل کر حجرے میں آئے اور بستر پر لیٹ گئے، بے چینی بڑھتی گئی، کبھی لیٹ جاتے، کبھی ٹہلنے لگتے، لیکن اس بے چینی اور اضطراب کی حالت میں بھی زبان پر مسلسل کلمہ کا ورد جاری

تھا جوں ہی نماز مکمل ہوئی لوگوں کو خبر ملی، لوگ آنے لگے، ڈاکٹروں کو خبر دی گئی، پندرہ بیس منٹ کا وقفہ اس حالت میں گذر گیا، آپ لیٹے تھے غنودگی سی طاری ہوئی، لوگوں نے محسوس کیا کچھ آرام ہو رہا ہے، کسی کو کیا پتا کہ حضرت ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہے ہیں، داعی اجل کا بلاوا آچکا تھا، روح قفس عنصری کو چھوڑ کر عرش اعلیٰ کی طرف پرواز کر چکی تھی، ڈاکٹر آئے اور دیکھنے کے بعد جب کہا کہ حضرت اب ہمارے درمیان نہیں رہے تو کوئی یقین کرنے کو تیار نہیں تھا اور یقین بھی کیسے آتا، ابھی تو وہ لوگوں کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے، لیکن حقیقت حقیقت ہے، مجبوراً ماننا پڑا اور پورے ملک میں اس عظیم حادثہ کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی، پوری ملت اس غم سے نڈھال ہو گئی، جس نے سنا وہ اپنی جگہ ساکت و منجمد ہو کر رہ گیا، دوسرے دن بعد نماز مغرب جامعہ رحمانی کے وسیع و عریض احاطہ میں نماز جنازہ ادا کی گئی جس میں محتاط اندازے کے مطابق پچاس ہزار سے زائد عقیدت مندوں نے جنازہ میں شرکت کی، (ناچیز کو بھی شرکت کی سعادت نصیب ہوئی، وہ میرے مربی و استاذ بھی تھے اور مرشد بھی) والد محترم قطب عالم حضرت محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کے بازو میں پرنم آنکھوں سے اپنے مرشد ممتاز عالم دین ملت کے محافظ و پاسبان، مقدس اور پاکیزہ روحوں کے جانشیں کو ہزاروں عقیدت مندوں نے ہمیشہ کے لئے دفن کیا۔

نماز روزہ اور قرآن سے بے پناہ محبت

حضرت والا کو صوم و صلوٰۃ اور قرآن سے گہری محبت تھی، رمضان کے روزوں کے ساتھ ساتھ نفلی روزے خاص کر یوم عاشورہ اور صوم شعبان وغیرہ کا بڑا ہی اہتمام رہتا، برآمدہ میں افطار کا انتظام ہوتا طلبہ و اساتذہ اور مہمانوں کے ساتھ افطار کرتے، سامان افطار کے علاوہ آب زمزم بھی دسترخوان پر ہوتا، رمضان میں بعد نماز عصر پابندی کے ساتھ قرآن کے اس پارہ کی سماعت کرتے جو اس رات تراویح میں پڑھا جاتا، عام دنوں میں بعد نماز فجر طلباء و اساتذہ، تلاوت کلام پاک میں مشغول ہو جاتے، اور حضرت ہاتھ میں تسبیح لئے مسجد کے صحن میں پھرتے رہتے اور اس منظر کو دیکھتے رہتے، آپ بہت خوش نظر آتے اور چہرہ چمکتا نظر آتا، بڑا ہی دلکش اور روح پرور منظر

ہوتا، دیکھنے والوں پر خاص کیفیت طاری ہوجاتی، جب تک آپ مسجد میں موجود ہوتے کوئی وہاں سے جانے کی ہمت نہیں کرتا، تکبیر اولیٰ کے ساتھ باجماعت نماز پنجگانہ سے دیوانگی کی حد تک فطری محبت اس شخص کی طرح تھی، جس کی کیفیت کو حدیث پاک رجل قلبه معلق فی المسجد اذا خرج منه حتی یعود الیه (بخاری ومسلم) میں بیان کیا گیا ہے۔

نماز کے سلسلے میں آپ کا معمول یہ تھا کہ حجرہ سے سنت پڑھ کر ٹھیک وقت پر مسجد میں تشریف لاتے، آپ کو دیکھتے ہی لوگ اپنی صفوں میں کھڑے ہوجاتے اور تکبیر شروع ہوجاتی، ایک منٹ کی بھی تاخیر نہ ہوتی جس سے نمازیوں کو انتظار کرنا پڑا ہو، نماز و جماعت میں تاخیر وناغہ کرتے ہوئے میں نے کبھی آپ کو نہیں دیکھا، نماز و جماعت کا اہتمام آپ کی زندگی کا لازمی حصہ تھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ نماز پڑھتے ہوئے ہی رفیق اعلیٰ کا بلاوا آیا، آخری نماز بھی باجماعت ادا کی اور کلمہ پڑھتے ہوئے بڑے آرام کے ساتھ مولائے کریم کے دربار میں اس طرح حاضر ہوگئے کہ نہ ہی کوئی نماز ذمہ میں باقی رہی، نہ رمضان کا کوئی روزہ قضا ہوا۔ یقیناً آپ عظمتوں کے تاجدار تھے۔

حضرت امیر شریعت رابعؒ کا عہد امارت

حضرت مولاناؒ کا عہد امارت تقریباً ۳۴/ سال پر محیط ہے۔ جس کو امارت شرعیہ کے لیے عہد زریں کہا جاسکتا ہے۔ آپ نے اس عہد میں امارت شرعیہ کو فعال اور متحرک بنانے کے لیے پوری جدوجہد کی، اس کے نظام کو غیر منقسم بہار واڑیسہ میں پھیلایا، ہر گاؤں میں اس کی تنظیم قائم کی، اس کے شعبہ جات کو آگے بڑھایا، جگہ جگہ دار القضا قائم کیے، مبلغین کا تقرر کیا، بیت المال میں آمدنی کا دائرہ بڑھایا۔ کہنا چاہیے کہ امارت شرعیہ نے کافی مضبوطی کے ساتھ ترقی کی اور اسلامی نظام حیات سے مسلمانوں کو آشنا کیا، امارت شرعیہ کا دفتر جو پہلے پھلواری شریف کے اندر واقع تھا، جس میں ناچیز نے بھی کام کیا ہے، اور آج بھی وہ جگہ موجود ہے، جہاں قاضی نور الحسن کے نام سے بچوں کا اسکول چلتا ہے، لب سڑک وسیع وعریض زمین حاصل کر کے مرکزی عمارت تعمیر کرائی، حضرت مولانا سجادؒ کے نام پر سجاد ہاسپٹل بنوایا، حضرت امیر شریعتؒ رابع کا عہد

عہد زریں ہے، جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔

آپ کو اللہ رب العزت نے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا، وہ قطب زماں، شب زندہ دار عابد و زاہد، عظیم مدبر وقت کے نباض، بدلتے ہوئے حالات کے پیچ و خم اور نزاکتوں پر کڑی نگاہ رکھتے تھے وہ مقاصد شریعت کے محافظ و نگہبان اور قوم و ملت کے بے لوث پاسبان تھے۔ ان کی دوررس نگاہ ہر سطح پر ہونے والی تبدیلیوں پر فوراً پہونچ جاتی اور آپ اسکا سخت نوٹس لیتے، اس کے حل کے لیے تڑپ اٹھتے اور بے چین ہو جاتے۔ اس طرح آپ نے پوری زندگی اور توانائی ملک و ملت کے سنوارنے اور امارت شرعیہ کو مضبوط اور مستحکم کرنے میں صرف کر دی اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ہرگز نہ مرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت امیر شریعت رابعؒ کی خدمات کا دائرہ بے حد وسیع ہے امارت شرعیہ کو انہوں نے اپنے خون جگر سے سینچ کر پوری دنیا میں متعارف کرایا، جامعہ رحمانی کو ہندوستان کی منفرد و ممتاز جامعہ کی شکل دی، ہندوستانی مسلمانوں کو مسلم پرسنل لا جیسا باوقار متحدہ پلیٹ فارم دیا جس کے وہ بانی و روح رواں اور تا حیات کامیاب ترین جنرل سکریٹری رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ ملک و ملت کے مسائل ان کی زندگی تھی، انکا حوصلہ ہمیشہ بلند رہتا، ایمرجنسی کا خوفناک ماحول ہو یا فسادات کی تباہ کاریاں ان کے چہرے پر کبھی کسی نے خوف و ہراس نہیں دیکھا۔ وہ عظیم تھے گذر گئے اور روشن و تابناک کارنامے بطور یادگار چھوڑ گئے اللہ رب العزت کروٹ کروٹ ان کو جنت نصیب فرمائے اور ان کے قبر کو نور سے بھر دے۔ آمین

———— ⊙⊙⊙ ————

مولانا قاضی محمد جسیم الدین رحمانی ☆

نظام قضاء کی توسیع
حضرت مولانا رحمانیؒ کا حصہ

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ نے ۱۹ر شوال ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۶ر جون ۱۹۲۱ء کو صوبہ بہار واڑیسہ کے لیے امارت شرعیہ کی بنیاد رکھی، جس کی تنظیم علی منہاج النبوۃ کی گئی اور اس تنظیم کو چلانے کے لیے کئی شعبے بھی قائم فرمائے۔ مثلاً بیت المال شعبۂ تبلیغ، شعبہ دارالافتاء اور شعبۂ دارالقضاء۔ یہ تمام شعبے اپنی اپنی جگہ کام کرنے لگے۔ مگر ان تمام شعبوں میں چوں کہ دار القضاء کی اہمیت اور افادیت زیادہ تھی اس لیے اس وقت کے اکابرین امارت نے مسلمانوں کو اس کی اہمیت سے روشناس کرایا اور شہر سے لے کر گاؤں تک اس کا تعارف کرتے ہوئے اس کی خدمات لوگوں کو بتائیں۔ چناں چہ دیوانی و فوجداری ہر قسم کے مقدمات خاص طور پر مختلف اسباب ووجوہ کے تحت مقدمات فسخ نکاح وخلع باہمی، وراثت، اوقاف، تولیت مساجد، ولایت نکاح صغار وغیرہ کے بکثرت دارالقضاء میں دائر ہو کر فیصل پاتے رہے بلکہ کئی مقدمات سرکاری عدالتوں سے منتقل ہو کر بھی یہاں آئے جن کے فیصلے قاضی شریعت امارت شرعیہ نے کیے اور پھر ان فیصلوں کو فریقین نے تسلیم کرتے ہوئے اس پر عمل بھی کیا۔ اس طرح قبل آزادی و بعد تقسیم ہند وحصول آزادی اس ملک میں قوانین اسلامی کا اجراء ونفاذ ہوتا رہا اور یہ سلسلہ تاہنوز جاری ہے۔ امارت شرعیہ کے قیام سے قبل ''انجمن علمائے بہار'' کے تحت چند دارالقضاء پٹنہ، مونگیر، سہسرام، آرہ وغیرہ

☆ سابق قاضی شریعت امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ

میں قائم تھے مگر جب امارت شرعیہ میں شعبۂ دارالقضاء قائم ہوا تو یہ تمام دارالقضاء امارت شرعیہ کی طرف منتقل ہو گئے اور یہی دارالقضاء اصلاً قائم ہو کر اپنا کام کرتا رہا۔ بقیہ دارالقضاء معطل ہو کر رہ گئے۔ اس کے قاضی حضرت مولانا محمد نورالحسنؒ تھے اور ان کی خدمات تقریباً ۲۷ رسال۔ حضرت امیر شریعت اول کے وقت سے حضرت امیر شریعت ثالث مولانا سید شاہ قمرالدین تک۔ رہیں۔
(بحوالہ تربیت قضا کے دو ہفتے ۱۴)

حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی سجادہ نشین خانقاہ رحمانی مونگیر نوراللہ مرقدہ کا انتخاب مؤرخہ ۲۴ر مارچ ۱۹۵۷ء مطابق ۲۱ر شعبان ۱۳۷۶ھ کو بحیثیت امیر شریعت رابع بہ مقام سوپول دربھنگہ جلسۂ عام میں ہوا، جس کے نگراں و سرپرست کی حیثیت سے مجاہد ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب علیہ الرحمہ موجود تھے، حضرت مولانا رحمانی علیہ الرحمہ اپنے انتخاب کے چوتھے دن مجلس شوریٰ کے گیارہ ارکان کے ساتھ بغرض معائنہ دفتر امارت شرعیہ تشریف لائے اور جہاں پہلا فرمان کارکنان امارت کو وسعت نظری سے کام لیتے ہوئے اور فروعی اختلافات سے بچ کر آگے بڑھنے اور ہر مسلک کے افراد واشخاص کو ساتھ لے کر چلنے کے سلسلے میں جاری کیا وہیں دوسرا اہم فرمان نظام قضاء کی توسیع کے لیے بھی جاری فرمایا۔ چوں کہ آپ کی نظر میں نظام قضاء کی بڑی اہمیت تھی۔ آپ قوانین اسلامی کے اجراء وتنفیذ کی جدوجہد کے ساتھ مسلمانوں کو ان قوانین پر عمل کرنے کے لیے سہولت کی راہیں پیدا کرنا اور کورٹ کی پریشانیوں نیز وہاں کے غیر شرعی فیصلوں سے انھیں نجات دلانا چاہتے تھے۔

اس دوسرے فرمان کا متن یہ ہے:

> ''محکمۂ قضا جو امارت کا سب سے اہم شعبہ ہے اس کے نظام کو پورے صوبے میں پھیلانا ضروری ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو فائدہ پہنچ سکے۔ مقدمات کے فیصلے جلد ہو سکیں اور انھیں اسلامی زندگی گزارنے میں سہولت ہو اس لیے ضروری ہے کہ:
>
> (۱) جن اضلاع یا کمشنری میں ممکن ہو قاضی مقرر کیے جائیں اور اس حلقہ کے

مقدمات وہیں دائر ہو کر فیصل پائیں۔

(ب) مقرر کیے جانے والے قاضیوں کی تربیت کا نظم مرکزی دار القضاء پھلواری شریف میں کیا جائے تاکہ وہ مقدمات کی سماعت اور فیصلوں کے طریقوں کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

(ج) قاضیوں کی سہولت کے لیے اردو زبان میں ایک رسالہ مرتب کیا جائے جس میں فقہ کی معتبر کتابوں کو سامنے رکھ کر قاضیوں کے اختیارات و فرائض، مقدمات میں شہادت کے شرعی اصول و ضابطے، فسخ نکاح اور خلع کے وجوہ اور طریقے اور اس کے مختلف مسائل درج کیے جائیں اور بہ طور مثال و نظیر عہد رسالت و صحابہ اور مشہور قضاۃ اسلام کے فیصلے لکھے جائیں۔ مقرر کیے جانے والے قاضی باضابطہ اس رسالہ کا مطالعہ کریں تاکہ اس کی روشنی میں مقدمات کا فیصلہ کر سکیں۔ (بحوالہ تربیت قضا کے دو ہفتے ۱۶ تا ۱۸)''

توسیع قضا کے سلسلے میں یہ فرمان صرف تحریر تک موقوف نہیں رہا بلکہ حضرتؒ نے اس کی تیاریاں بھی شروع کر دیں۔ اس کا ایک عملی پروگرام مرتب فرمایا، سب سے پہلے حضرت امیر شریعتؒ نے علماء و مفتیان کرام کی تربیت کا باقاعدہ نظم کیا جانا طے کیا۔ اولاً تربیت قضاء کی تاریخ پھلواری شریف میں ۸/تا ۱۳/ مارچ ۱۹۵۸ء مقرر کی گئی لیکن یہ پروگرام حضرت کی طویل علالت کے سبب ملتوی کرنا پڑا۔ بعد میں ماہ اگست و ستمبر کی تاریخوں میں تربیتی پروگرام رکھا گیا، یہ پہلا تربیتی کیمپ خانقاہ رحمانی، مونگیر میں از ۲۹/ محرم ۱۳۷۸ھ مطابق ۱۶/ اگست ۱۹۵۸ء تا ۵/ صفر ۱۳۷۸ھ (۲۱/ اگست ۱۹۵۸ء) اور از ۱۴/ صفر ۷۸ھ (۳۰/ اگست ۱۹۵۸ء) تا ۱۹/ صفر ۱۳۷۸ھ (۴/ ستمبر ۱۹۵۸ء) منعقد کیا گیا، اس سلسلے میں آپ نے چھیالیس اکابر علماء و مشائخ کے نام دونوں صوبوں میں قیام قضاء کی ضرورت کو دینی ضرورت اور صرف ایک دار القضاء پھلواری شریف کے ناکافی ہونے کا ذکر کرتے ہوئے جو خطوط ارسال فرمائے اس کا اقتباس درج ذیل ہے:

''یہ عریضہ ایک اہم دینی ضرورت سے ارسال خدمت ہے۔صوبہ میں ہر سال ہزاروں ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ لوگ نکاح کے بعد اپنی بیویوں کے ساتھ ظلم وستم کرتے ہیں۔طلاق دیے بغیر چھوڑ دیتے ہیں...ان کی بیوی ان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہے تو اسے طلاق بھی نہیں دیتے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ یا تو اس کے نام پر اپنی زندگی نہایت کس مپرسی اور فقر وفاقہ میں گزار دیتی ہے۔یا غیر شرعی طریقے اختیار کرتی ہے یا بغیر طلاق حاصل کیے دوسرے سے ناجائز طور پر عقد کر لیتی ہے،اس سے اسلامی معاشرہ برباد ہوتا ہے...اگر عورت حکومت کی عدالت میں درخواست دے کر ایسے شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہے تو ظاہر ہے عدالتوں میں مسلم اور غیر مسلم حاکموں میں کوئی امتیاز نہیں۔ بالعموم ان عدالتوں میں نکاح فسخ کرنے والے حاکم غیر مسلم ہی ہوتے ہیں،اور شرعاً ان کا فسخ نافذ نہیں۔اگر وہ اس فسخ کے بعد عقد ثانی کرتی ہے تو زندگی بھر حرام فعل میں مبتلا رہتی ہے۔اس دینی مشکل کا حل صرف امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ کے پاس ہے اس ادارہ میں نکاح وطلاق کے معاملات کے لیے قاضی مقرر ہیں،جن کے فیصلے شرعاً نافذ اور قابل قبول ہیں۔اس وقت تک دفتر دار القضاء...صرف ایک ہے اور وہ پھلواری شریف ضلع پٹنہ میں ہے۔ایک دفتر قاضی پورے صوبہ کی ایسی اہم اور کثیر الوقوع ضرورتوں کو پورا نہیں کرسکتا۔اس لیے ضروری ہے کہ جہاں جہاں بھی قضاء کا نظم ممکن ہو کیا جائے۔

اس اہم دینی ضرورت کو پورا کرنے کی خاطر حسب ذیل لائحہ عمل بنایا گیا ہے:

۱-صوبہ میں ایسے لوگوں کو قاضی مقرر کیا جائے جو دینی علم اور عقل و دیانت میں امتیاز رکھتے ہوں اور اعزازی طور پر اس دینی کام کو انجام دے سکیں۔

۲-ان مقرر شدہ قاضیوں کا تعلق کسی مدرسے سے ہو تو بہتر ہے۔

۳-اس مدرسہ کے منتظمین سے درخواست کی جائے کہ وہ امارت کے مقرر کردہ

قاضی کو ہفتہ میں دو دن (جمعرات، جمعہ) قضاء کا کام کرنے کی اجازت دیں۔
ایک کمرہ دفتر دارالقضاء کے لیے عنایت کریں، جس پر دفتر کا بورڈ لگا ہوا اور جس میں قاضی بیٹھ کر اپنے فرائض انجام دے سکے۔
مذکورہ بالا امور کے پیش نظر جتنے حضرات بھی صوبہ کے اندر مل سکیں انھیں مقررہ تاریخوں میں کسی مناسب جگہ جمع کیا جائے اور ان کی موجودگی میں روزانہ مقدمات کی پیشی ہو۔ وہ حضرات زیر تجویز اور فیصل شدہ مقدمات کی مسلوں کا مطالعہ کریں تا کہ ان مقدمات کی سماعت اور ان کے فیصلوں کا اسلوب و نہج ان کی نظر سے گزر جائے۔
مذکورہ تربیت کے بعد انھیں مختلف علاقوں میں بحیثیت قاضی مقرر کیا جائے اور یا تو انھیں فی الفور فیصلہ کے اختیارات دیے جائیں یا سر دست صرف مقدمات کی مسلوں کی تکمیل ان کے سپرد رہے اور جب قاضی شریعت کو ان کے پختہ کاری کا یقین ہو جائے تو پھر فیصلہ کا حق بھی انھیں دیا جائے۔
مذکورہ لائحہ عمل کے پیش نظر ۲۹ رمحرم ۱۳۷۸ھ (۱۶ راگست ۱۹۵۸ء سے ۵ رصفر ۱۳۷۸ھ (۲۱ر اگست ۱۹۵۸ء) تک اور ۱۴ رصفر ۱۳۷۸ھ (۳۰ر اگست ۱۹۵۸ء) سے ۱۹ رصفر ۱۳۷۸ھ (۴ رستمبر ۱۹۵۸ء) تک خانقاہ رحمانی مونگیر میں مقدمات کی تاریخیں مقرر کر کے ان کی سماعت کا نظم رکھا گیا ہے۔
آپ سے درخواست ہے کہ اس دینی کام میں تعاون کریں، اپنا قیمتی وقت عنایت فرما کر مذکورہ بالا تاریخوں میں تشریف لائیں، مقدمات کی سماعت اور ان کے فیصلوں کو بچشم خود دیکھیں اور پھر اگر کسی حلقہ میں قضاء کی ذمے داری جناب کے سپرد کی جائے تو اس کو قبول فرمائیں، اس عریضہ کے جواب اور اپنی تشریف آوری کی تاریخ و وقت سے مطلع فرمائیں۔ (بحوالہ تربیت قضا کے دو ہفتے، ص ۲۰-۲۳)

خطوط ملنے پر مختلف مدارس اور انجمن کے ذمے داروں نے اپنی خوشی و مسرت کے اظہار کے ساتھ مکمل تعاون کا یقین دلایا اور تربیت کے لیے علماء کرام کو بھیجا۔ تقریباً پانچ سو مہمانان کرام خانقاہ رحمانی مونگیر آئے اور ۴۲ علمائے کرام نے دونوں ہفتوں کے تربیتی پروگرام میں شرکت کی۔ حضرت امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کے علاوہ نائب امیر شریعت حضرت مولانا عبد الصمد صاحب رحمانی، اس وقت کے قاضی شریعت مولانا سید شاہ عون احمد قادری نیز قاضی القضاۃ حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی (استاذ جامعہ رحمانی مونگیر) علیہم الرحمہ بھی شریک ہوئے۔ حضرت مولانا رحمانی علیہ الرحمہ نے اس موقعے پر دو علمی و تحقیقی مقالے اور حضرت مولانا عبدالصمد صاحبؒ نے ایک علمی مقالہ شرکاء تربیت کے سامنے پیش کیا، جو کتابی شکل میں ''تین علمی و تحقیقی مقالے'' پھر بعد کو صرف حضرت امیر شریعت کے دو مقالے ''قضاء کی شرعی و تاریخی اہمیت'' کے نام سے اور حضرت مولانا عبدالصمد صاحبؒ کا مقالہ جدید مسائل کا حل شریعت کی روشنی میں علیحدہ طبع کرایا گیا ہے۔ اور یہ مقالے اہمیت قضاء، نظام قضاء، شرائط اہلیت وغیرہ کے بارے میں بہت عمدہ اور قیمتی ہیں۔ حضرت مولانا شاہ عون احمد قادریؒ نے شرکاء کے سامنے دارالقضاء کی عملی کارروائی کا اجمالی خاکہ پیش کیا۔

تربیت قضاء کی رپورٹ بھی طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے۔ حضرت امیر نے اپنے مقالہ کی ابتداء میں بطور افتتاحیہ یہ ارشاد فرمایا کہ:

''اسلام جس طریقہ حیات کی رہبری کرتا ہے اس کو عملی زندگی میں جاری و نافذ کرنے کا دوسرا نام قضا ہے، بس قضاء ایک ایسا فریضہ محکمہ ہے جس کا قائم کرنا امت مومنہ کا اولین فریضہ ہے''۔

اور مقالہ کا اختتام ان کلمات پر فرمایا:

''روز روز کے حالات نے ہمیں اس شعبے کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر اس کی توسیع کی طرف متوجہ کیا اور اس بنیاد پر آپ حضرات کو زحمت دی گئی۔ مسرت کی بات ہے کہ آپ حضرات نے اس مسئلے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے زحمت

سفر فرمائی''۔

بہر حال یہ تربیتی پروگرام پوری طرح کامیاب ہوا پھر قیام دار القضاء اور تقرر قاضی کے لیے جدوجہد ہونے لگی، جس علاقے میں قاضی کا انتخاب کر کے دار القضاء قائم کیا جاتا پہلے اس علاقہ میں امارت شرعیہ کے مبلغین وکارکنان بھیجے جاتے جو گاؤں اور بستیوں میں جاکر مسئلہ قضاء کی اہمیت اور دار القضاء کی ضرورت لوگوں کو بتاتے۔ پوسٹر اور ہینڈ بل بھی طبع کرا کر بھیجا جاتا، جس میں نظام قضاء کے سلسلے میں ضروری باتیں لوگوں پر واضح ہوتیں، اس کے بعد علاقہ کے صدر مقام پر عظیم الشان اجلاس منعقد ہوتا، اس میں اس علاقے کے علماء وذمے دار ارباب حل وعقد شریک ہوتے، صوبہ اور بیرون صوبہ کے اکابر علماء بھی اس اجلاس میں مدعو ہوتے۔ حضرات علماء کی تقریریں ہوتیں اور پھر مجمع عام میں قاضی کے تقرر کا اعلان ہوتا، حضرت امیر شریعت یا تو خود بہ نفس نفیس شریک اجلاس ہو کر قاضی کو سند عطا فرماتے یا کسی عذر کی بنا پر حضرت خود تشریف نہ لے جاتے، تو امارت شرعیہ کے ذمہ دار حضرات مثلاً قاضی مولانا مجاہد الاسلام صاحب یا موجودہ حضرت امیر شریعت وسابق ناظم امارت شرعیہ مولانا سید نظام الدین صاحب کو سند قضاء اور اپنے پیغام کے ساتھ اس اجلاس میں بھیجا کرتے۔ یہ سند عربی میں ہوا کرتی جس کے اندر مقررہ قاضی کے نام اور ان کے حلقہ قضاء کی تعیین کے ساتھ ضروری نصائح بھی ہوتے۔

چنانچہ سب سے پہلے ۱۰ر شوال ۱۳۷۸ھ مطابق ۱۹ر اپریل ۱۹۵۹ء کو مدرسہ رحمانیہ سوپول ضلع دربھنگہ میں، ضلع دربھنگہ کے چھ تھانوں بیرول، بیہڑہ، جھنجھار پور، مدھے پور، سنگھیا، روسڑا اور ضلع سہرسہ کے ایک تھانہ دھرہرا کے لیے دار القضاء قائم ہوا، مدرسہ رحمانیہ سوپول کے شیخ الحدیث و مہتمم اور اس علاقہ کے ممتاز عالم دین حضرت مولانا محمد عثمان صاحب قاضی مقرر کیے گئے، پھر ضلع پورنیہ کی کثیر مسلم آبادی والے علاقہ کے کشن گنج سب ڈویژن کے لیے حضرت مولانا محمد مصلح صاحب قاضی مقرر کیے گئے، وہاں ۲ر نومبر ۱۹۵۹ء مطابق ۱۸ر جمادی الاول ۱۳۷۹ھ کو دار القضاء کا قیام ہوا۔

۴ر دسمبر ۱۹۵۹ء کو اورنگ آباد سب ڈویژن کے لیے مولانا سید عبدالرؤف صاحب

مرحوم اور ۷ر دسمبر ۱۹۵۹ء کو بکسر سب ڈویژن کے لیے نیا بھوج پور میں مولانا مفتی شمس تبریز مرحوم قاضی مقرر کیے گئے، ارریہ سب ڈویژن اور صدر سب ڈویژن پورنیہ کے لیے بارا عیدگاہ پورنیہ میں مولانا ریاض احمد صاحب ۱۱ر جنوری ۱۹۶۰ء کو قاضی مقرر ہوئے اور ۲۶ر جنوری ۱۹۶۰ء کو دربھنگہ صدر سب ڈویژن کے لیے مولانا محمود احمد صاحب قاضی مقرر ہوئے۔ یہ دارالقضاء اولاً مدرسہ محمود العلوم دملہ میں قائم ہوا۔ لیکن جب مولانا محمد احمد صاحب مدرسہ امدادیہ دربھنگہ تشریف لے گئے تو دارالقضاء دملہ سے مدرسہ امدادیہ دربھنگہ منتقل ہوگیا۔ مارچ ۱۹۶۲ء میں دو مقامات یعنی ڈمرا ضلع چمپارن، اور چترا میں اور مئی ۱۹۶۲ء میں کوآتھ ضلع روہتاس میں بھبھوا سب ڈویژن کے لیے دارالقضاء قائم کیے گئے۔ وہاں کے قاضی علی الترتیب مولانا محمد حسین صاحب، مولانا رحمت اللہ صاحب، مولانا محمد اسحاق رحمہم اللہ مقرر ہوئے۔ اسی طرح ۱۹۶۳ء مطابق ۱۳۸۲ھ سے ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۹۹۱ء تک قیام دارالقضاء کا سلسلہ چلتا رہا۔ اور بہار و جھارکھنڈ اڑیسہ و بنگال کے اکثر مقامات یعنی رانچی، کٹیہار، سیتامڑھی، مظفر پور، دوبا ضلع پورنیہ، مونگیر، سہرسہ، جمشید پور، گریڈیہہ، بیگوسرائے، سمستی پور، راوڑکیلا، آسنسول، جوکہی ضلع ارریہ، بکھرا ضلع پرولیا، سیوان، جام تاڑا، ایٹاہار ضلع اتر دیناج پور پر ذیلی دارالقضاء قائم کیے گئے۔

غرض یہ ہے کہ جہاں جہاں مناسب اشخاص و افراد ملتے گئے اور دارالقضاء کے لیے مناسب جگہیں ملتی گئیں، حضرت مولانا رحمانی علیہ الرحمہ نے اپنے ۳۵ سال کے عہد امارت میں وہاں دارالقضاء قائم فرمائے اور قضاۃ کرام کی تقرری کرتے ہوئے یا تو انھیں مقدمات کی عرضیاں لے کر بعد اندراج حسب ضابطہ کارروائی کرنے اور اولاً مابین فریقین صلح و تصفیہ کی کوشش کرنے ورنہ سماعت و تحقیق کے بعد مع رپورٹ کاغذات اور مسل مقدمہ مرکزی دارالقضاء پھلواری شریف پٹنہ میں بھیجنے کا اختیار تفویض کیا یا بعض قضاۃ کو بعد کارروائی صلح و تصفیہ باہمی یا سماعت کر کے فیصل کر دینے کا اختیار بھی دیا۔ چار صوبوں کے اندر ۲۸ر مقامات میں سے سوپول ضلع دربھنگہ، کشن گنج، بارا عیدگاہ پورنیہ، کٹیہار، مونگیر، اور سہرسہ کے حضرات قضاۃ کو فیصلہ کرنے کا بھی اختیار دیا گیا۔ اور ان کے علاوہ باقی جگہوں کے قضاۃ کو بعد تکمیل کارروائی مسل مقدمہ مرکزی دارالقضاء بھیجنے کی

ہدایت کی گئی۔ان دارالقضاؤں میں چھ کے علاوہ مقامات پر بحمد اللہ دارالقضاء کام کر رہا ہے۔

آپ نے نظام قضا کو انہی صوبوں تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس کا دائرہ کار دیگر صوبہ جات مثلاً مہاراشٹر کے مالیگاؤں معہد ملت علاقہ مرہٹوارہ اورنگ آباد، حیدر آباد (آندھرا پردیش) بنگلور ریاست کرناٹک، آسام، تری پورہ، میگھالیہ میں بھی پھیلایا اور بحمد اللہ وہاں بھی دار القضاء خود مختار ہو کر مصروف کار ہیں۔

جب حضرت امیر شریعتؒ نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ قائم فرمایا اور تاحیات اس کے جنرل سکریٹری بھی رہے تو آپ نے مسلم پرسنل لا بورڈ کے پلیٹ فارم سے فرمایا کہ مسلم پرسنل لا کے نفاذ اور تحفظ شریعت کی عملی شکل دارالقضاء ہے۔اس لیے یہ ہر اس جگہ قائم کیا جانا چاہیے، جہاں اس کا قیام ممکن ہو۔ان کا خیال تھا کہ عائلی مسائل میں سرکاری عدالتوں کے غیر اسلامی فیصلوں سے بچاؤ کا واحد حل دارالقضاء ہے، چناں چہ اس نظریہ کے پیش نظر بورڈ کے اجلاس ہفتم کلکتہ میں کل ہند سطح پر دارالقضاء قائم کرنے کی تجویز پاس ہوئی، جس کا حاصل یہ ہے کہ:

مسلم پرسنل لا بورڈ کتاب وسنت کی روشنی میں ملک کے ہر حصہ بلکہ ہر ضلع میں جہاں نظم امارت وقضا نہیں ہے دارالقضاء کا قیام عمل میں لائے اور متقی واہل علم قاضیوں کا تقرر کرے۔

بورڈ کے اس فیصلے کے بعد انھوں نے بحیثیت جنرل سکریٹری پورے ملک میں دار القضاء قائم کرنے کی تحریک چلائی۔اخباری بیانات جلسوں اور کانفرنس میں اس کی اہمیت و افادیت بتائی مگر قضاۃ کی تقرری سے پہلے بنیادی ضرورت اس کی تھی کہ ایسے علماء دستیاب ہوں، جنھوں نے قضاء کی تربیت حاصل کی ہو، ہندوستان میں نظام قضاء کے تعطل کی وجہ سے علماء اکثر جگہوں میں اس سے غافل و بے توجہ تھے۔اس مقصد کے لیے امارت شرعیہ پھلواری شریف کے مرکزی دارالقضاء میں مؤرخہ ۲۸/ جولائی ۱۹۸۶ء کو پندرہ دنوں کا تربیتی کیمپ لگوایا گیا، جس کے افتتاحی اجلاس کی صدارت صدر بورڈ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نور اللہ مرقدہ نے کی اور حضرت امیرؒ نے اس موقع پر افتتاحی خطبہ بھی دیا، اس تربیتی کیمپ میں ملک کے سات صوبوں سے ۴۹ علمائے کرام شریک ہوئے اور تربیت حاصل کرنے کے بعد ملک کے مختلف حصوں میں ان علماء

نے قضاء کی ذمے داری سنبھالی اور اس طرح حضرت امیرؒ نے قضائے اسلامی میں توسیع فرماکر عام مسلمانوں کو فائدہ پہنچایا اور وہ اپنے عائلی مسائل کو دارالقضاء میں پیش کرکے شرعی احکام و قوانین کو اپنے اوپر جاری و نافذ کررہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے ہماری دعا ہے کہ اللہ جل شانہ ان کی اس عظیم خدمت کے صلے میں ان پر اپنا فضل و کرم فرمائے۔ ان کی قبر کو انوار سے بھر دے اور انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔
آمین

مولانا محمد باقر حسین قاسمیؒ ☆

امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی علمی خدمات: ایک جائزہ

امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ گزشتہ صدی کے مسلمانوں کے لیے ایک ہشت پہل ہیرا تھے اور حقیقی معنوں میں اس شعر کے مصداق تھے کہ:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

امیر شریعت کی جس مسند عالی پر وہ سالہا سال فائز اور جلوہ فرما رہے اس سے خود ان کی علمی گہرائی و گیرائی، فکری سلامتی اور رسوخ و صلابت، اجتہادی صلاحیت، عبقریت اور عزیمت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ متنوع قومی، ملی، تحریکی اور جماعتی سرگرمیوں کے ساتھ حضرت امیر شریعتؒ نے جو علمی خدماتِ جلیلہ انجام دی ہیں وہ ان کا لافانی اور لاثانی کارنامہ ہیں۔ اس مختصر مقالے میں ان کی علمی خدمات کا احاطہ تو مشکل ہے تاہم انہیں چند عنوانات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱- جامعہ رحمانی اور دیگر مدارس

اشاعت دین کے مخلصانہ جذبہ سے حضرت امیر شریعتؒ نے جامعہ رحمانی کی نشأۃ ثانیہ

☆ بانی و سابق مہتمم دارالعلوم الاسلامیہ بستی یوپی

فرمائی، باصلاحیت، ذی استعداد علما کو جمع کیا، تعلیمی وتربیتی معیار کو بلند کرنے پر ہردم ان کی خاص توجہ رہی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ چند ہی سالوں میں جامعہ رحمانی ملک کا مشہور و ممتاز ادارہ بن گیا، اور وہاں کے فارغین حفاظ وعلماء کی تعداد روز افزوں ہوتی گئی۔

حضرت امیر شریعتؒ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم میں تبدیلی ہونی چاہیے۔ ایک تو موضوعات درس میں تبدیلی ہونی چاہیے، وہ مضامین جو اصلاً دینی نہیں ہیں وقت اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق انہیں داخل کیا گیا تھا اب موجودہ عہد کے تقاضوں کے مطابق ان قدیم موضوعات کو بنیادی تعارف کی حد تک باقی رکھتے ہوئے ضروری عصری مضامین ان کی جگہ رکھے جائیں۔

حضرت امیر شریعتؒ کا یہ خیال تھا کہ مدارس عربیہ میں بنیادی ہدف قرآن وحدیث کو بنایا جانا چاہیے، فقہ واصول فقہ کی تدریس میں روایتی طریقے کو ترک نہ ہونا چاہیے، ہرفن کی کم از کم ایک کتاب مکمل ہونی چاہیے، قدیم منطق وفلسفہ کو بہ قدر ضرورت اور اصطلاحات کی واقفیت تک محدود ہونا چاہیے اور ان کے بجائے ضروری عصری علوم کو داخل کیا جانا چاہیے، نحو وصرف ومعانی و بیان جیسے فنون کے لیے وہ کتب منتخب ہونی چاہئیں جن میں مصنف کی الجھی اور پیچیدہ تعبیرات کے بجائے اصل فن اور اس کے قواعد کا بآسانی علم ہوجائے۔[۱]

حضرت امیر شریعتؒ نے اصلاح نصاب کے لیے صوبۂ بہار کے معروف اہل علم، اساتذۂ فن اور اصحاب درس علماء کو جمع کیا، کئی نشستیں ہوئیں، اس موضوع پر حضرت نے ایک وقیع مقالہ بھی لکھا، کافی غور وخوض اور بحث ومناقشے کے بعد ایک نصاب مرتب ہوا، جس کی پہلی تجربہ گاہ جامعہ رحمانی کو بنایا گیا۔ وقتاً فوقتاً اس میں تجربات کی روشنی میں تبدیلیاں بھی کی گئیں اور پھر یہ نصاب مختلف مدارس میں رائج ہوا، اور اس کے نتیجے میں طلبہ میں علمی ذوق وشوق، مطالعہ کا اشتیاق، اساتذہ سے استفسار اور زیر درس موضوعات میں تہہ تک پہنچنے کا وہ عجیب وغریب جذبہ پیدا ہوا جس کی مثال خال خال ہی ملتی ہے۔

حضرت امیر شریعتؒ کے زمانے میں جامعہ رحمانی میں صبح ناشتے کے بعد آدھے گھنٹے کی

مجلس علمی لگتی تھی، جس میں شرکاء کے ذہنوں میں علمی تجسس اور طلب کی آبیاری کی جاتی تھی اور سطحی مطالعے کے بجائے گہرے اور تحقیقی مطالعے کا ذوق پیدا کیا جاتا تھا۔ حضرتؒ کی علمی خدمات میں صلاحیتوں کی تلاش اور افراد سازی و مردم شناسی اور قابلیت نوازی بہت نمایاں ہے، وہ ہمہ وقت باصلاحیت افراد کی جستجو میں لگے رہتے اور یہی تڑپ رہتی کہ کسی طرح افراد کو کام کا بنادیں، اپنے زیر تربیت افراد کی ہر ہر چیز کی نگرانی اسی مقصد سے ہوتی تھی۔

جامعہ رحمانی کے علاوہ ملک کے بے شمار اداروں سے حضرت کا ربط و تعلق تھا، ام المدارس دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ اور ندوۃ العلماء کی منتظمہ کمیٹی کے وہ رکن تھے، اور ہر جگہ تعلیمی و تربیتی اصلاح و ترقی کا جذبۂ صادق ان پر غالب اور نمایاں رہتا تھا۔

۲-امارتِ شرعیہ

حضرت امیر شریعتؒ کی علمی گہرائی و گیرائی، عملی صلاحیت اور مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اکابرین نے بالاتفاق ۱۹۵۷ میں انھیں امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کا امیر شریعت منتخب کیا، امارت شرعیہ ہندوستان میں ایک منفرد و بے مثال ادارہ ہے جس کے اہداف و مقاصد میں وحدت کلمہ کی بنیاد پر امت مسلمہ کی دینی اور شرعی تنظیم کا قیام مسلمانوں میں شعور دینی اور جذبۂ ایمانی بیدار کرنا اور اسلامی زندگی گزارنے کی سہولتیں فراہم کرنا ہے، جب اس عظیم ادارے کی سربراہی آپ کے سر ڈالی گئی تو آپ کی محنت، جدوجہد اور نگاہ دور بیں نے چند برسوں میں اس ادارے کو بڑی ترقی دی، آپ نے سب سے پہلے دارالقضاء کی توسیع پر زور دیا اور یہ واضح کیا کہ امارت شرعیہ ہر طبقہ اور ہر خیال کے مسلمانوں کا مشترکہ ادارہ ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اس ملک میں اسلامی زندگی گزار سکیں اور مختلف ممالک کے ادارے و افراد امارت کے گرد جمع ہوں اور تعاون کریں۔ اور محکمۂ قضا کے نظام کو پورے صوبہ میں پھیلایا جائے۔ امارت کے کارکنان وسعت نظر اور فراخ دلی سے کام لیں۔ فرعی و جزوی اختلافات سے کنارہ کش رہیں، جب تک کسی کے مسلک اور خیال سے کفر و اسلام کا اختلاف نہ ہو رواداری پر قائم رہیں خاص طور پر امیر شریعتؒ

نے مسلمانوں کے آپسی معاملات اور جھگڑوں کو سلجھانے اور حق داروں کو حق پہنچانے کے لیے محکمہ قضا کے نظام کو بڑی وسعت دی۔ دور جن سے زیادہ دارالقضاء کی شاخیں کھولی گئیں، علماء کی تربیت کے لیے کیمپ لگائے گئے اور سیکڑوں علماء کو قضا کے کاموں کی تربیت دی گئی، پہلی مرتبہ جب تربیت قضا کی مجلس خانقاہ رحمانی میں منعقد ہوئی تو حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ نے قضا کے موضوع پر ایک پر مغز مقالہ پڑھا جو قضا کی تاریخ پر ایک قیمتی دستاویز ہے۔ جس میں قضا کی شرعی حیثیت قضا کی شرطیں اور قاضی کے لیے فہم معاملات، علمی استعداد اور عدل وانصاف کی صلاحیت اور دوٹوک فیصلے کی جرأت جیسے امور پر مدلل انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ "قضا کی شرعی اور تاریخی اہمیت" کے نام سے یہ رسالہ متعدد بار طبع ہوا ہے۔

حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دورِ امارت میں امارتِ شرعیہ کے دار الافتاء کے نظام کو بھی مرتب اور منضبط فرمایا۔ استفتا کے جوابات اور اس کے باضابطہ نظام و تربیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کے اہم اور قابل ذکر دارالافتاء میں اس کا شمار ہونے لگا، آپ کو دار الافتاء کے کاموں سے ابتدا ہی سے دلچسپی رہی، تقریباً بیس سالوں تک مسلسل آپ نے استفتاء کے جوابات لکھے، آپ کے دیے ہوئے جوابات کی نقل کا ایک ذخیرہ غیر مطبوعہ شکل میں ابھی بھی محفوظ ہے، جسے دیکھ کر آپ کی علمی بصیرت اور فقیہانہ مزاج کا اندازہ ہوتا ہے، آپ کے دیے ہوئے فتاویٰ کی زبان نہایت سہل اور آسان ہے، واضح بیان اور مؤثر انداز ہونے میں ممتاز ہے، ان گراں قدر تحریروں کی اشاعت کا نظم ہو جائے تو کئی جلدوں میں اہل علم کے لیے ایک قیمتی تحفہ ہوگا۔[۲]

۳- تدوین فقہ

حضرت امیر شریعتؒ کا سب سے اہم علمی کارنامہ مسلم پرسنل لا سے متعلق قوانین شریعت کی دفعہ وار ترتیب ہے، انھوں نے اس عظیم اور نازک علمی کام کے لیے پورے ہندوستان کے چند ایسے علماء کی ٹیم تیار کی جو فقہی بصیرت اور علمی رسوخ کے لحاظ سے امتیازی شان رکھتے تھے،

اور پھر اس ٹیم کے مشورہ اور تعاون سے عائلی قوانین اسلامی کا وہ مستند مجموعہ تیار کیا جو دورِ حاضر کی ضرورت اور تقاضے کی تکمیل کے ساتھ شریعتِ اسلامی کی صحیح ترجمانی بھی ہے۔ ساتھ ہی اسے عدالتوں کے سامنے سند کے طور پر بلا تردد پیش کیا جا سکتا ہے، یہ مجموعہ حضرت کی وفات کے بعد تکمیل و طباعت کے آخری مراحل سے گزرتا ہوا اب منظر عام پر آچکا ہے، اور یہ نکاح و طلاق، ظہار، حرمت مصاہرت، مہر، نفقہ، عدت، حضانت، رضاعت، وراثت، وصیت، ہبہ اور وقف وغیرہ جیسے اہم معاشرتی معاملات کے مسائل پر مشتمل ہے۔ جو متعلق ابواب پر اسلامی قوانین کا مستند دفعہ وار مجموعہ ہے۔ یہ کتاب نہ صرف قابل قدر فقہی ذخیرہ ہے بلکہ زبان و بیان اور ترتیب کے لحاظ سے بھی بہت ممتاز ہے۔

تدوین فقہ کی یہ خدمت حضرت امیر شریعتؒ کی عظیم خدمت ہے جسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اور اسے مستند مرجع کی حیثیت حاصل رہے گی۔

۴-تصانیف و مقالات

حضرت امیر شریعتؒ کو زمانہ طالب علمی ہی سے تصنیفی و قلمی ذوق میسر تھا، جس میں ان کی خداداد صلاحیت، ذہانت، ماحول، اہل علم کی صحبت اور ذاتی محنت سب کا دخل تھا، زمانۂ طالب علمی میں ان کے متعدد مضامین مختلف مجلات و رسائل میں طبع ہوئے۔ طالب علمی کے زمانہ میں آپ نے جامعہ رحمانی مونگیر کے ترجمان ''الجامعہ'' کی ادارت کی، اس زمانہ میں آپ اپنی کنیت ابوالفضل کے نام سے لکھتے تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد خانقاہ رحمانی میں کتابوں کے درس و مطالعہ، تصنیف و تالیف اور افتا نویسی کے کاموں میں اشتغال شروع ہوا، آپ کو اللہ نے بے پناہ ذہانت اور ٹھوس علمی صلاحیت سے نوازا تھا اور علمی و تحقیقی مزاج بھی آپ کو عطا ہوا تھا۔ اس زمانے میں ایک عرصے تک آپ مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کے ترجمان اور ہفت روزہ الہلال کے مدیر بھی رہے اور متعدد گراں قدر مضامین آپ کے نوکِ قلم سے نکلے۔ دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد وہیں کچھ دنوں قیام کر کے آپ نے ''تعلیمی ہند'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جو آپ کی

پہلی باضابطہ کتاب تھی، جس میں زمانہ قدیم سے لے کر ۱۹۳۰ تک کی تعلیمی تاریخ دلائل کی روشنی میں مرتب فرمائی، ہندوستان کے تعلیمی انحطاط کا بھی اس میں موثر اسلوب میں تذکرہ ہے، اور انگریزوں کے مظالم کا بھی بیان ہے۔

ربیع الاول ۱۳۵۰ھ سے صفر ۱۳۵۱ھ تک آپ نے خانقاہ رحمانی کے ترجمان ماہنامہ ''الجامعہ'' کی ادارت بھی کی۔ ۱۹۳۸ میں آپ نے دوسری تصنیف ''ہندوستان کی صنعت و تجارت'' کے نام سے ارقام فرمائی جس میں انگریزوں کے صنعتی وتجارتی مظالم کا مفصل بیان ہے۔

حضرت امیر شریعتؒ کی ایک اہم کتاب ''اسلامی اوقاف اور محصول'' ہے جو دراصل بہار اسمبلی میں کی جانے والی آپ کی مدلل اور موثر تقریر ہے، جس میں آپ نے اسلامی اوقاف پر ٹیکس عائد کرنے کی حکومت بہار کی تجویز کا سختی سے رد کیا اور قرآن وحدیث کے واضح دلائل سے پوری قوت سے یہ ثابت کیا کہ اسلامی اوقاف پر کسی طرح کا ٹیکس نہیں لگایا جا سکتا۔

آپ کی ایک خالص علمی تحریر ''قانون شریعت کے مصادر اور نئے مسائل کا حل'' بھی ہے، اس میں قانونِ اسلامی کی بنیادوں کی توضیح بہت اچھے انداز میں کردی گئی ہے۔

۱۹۵۰ میں آپ نے ''کتابت حدیث'' کے نام سے ایک وقیع علمی کتاب تحریر فرمائی، جس میں احادیث سے متعلق پیدا ہونے والے تمام شکوک کا مدلل رد فرمایا، حضرت کی دیگر تصانیف میں مسلم پرسنل لا، مکاتیب گیلانی، سفر مصر وحجاز، حج کے روحانی، اخلاقی اور اجتماعی اثرات، خطبات امیر شریعت، نسبت اور ذکر وشغل، حج مبرور اور زیارت مقبول، قضا کی شرعی اور تاریخی اہمیت، مدارس عربیہ کے لیے نصاب جدید، خاندانی منصوبہ بندی، مسلم پرسنل لا کا مسئلہ نئے مرحلے میں، مسلم پرسنل لا بحث ونظر کے چند گوشے، یونیفارم سول کوڈ، نکاح وطلاق، تحفظ دین کا منصوبہ، مذہب، اخلاق اور قانون، فتنۂ قادیانیت اور حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ وغیرہ معروف ہیں، جن سے آپ کے ذوق علمی، عمق ووسعتِ مطالعہ، امت کے لیے فکر مندی اور بے لوثی کے مظاہر نمایاں ہیں۔

۵- دیگر علمی امتیازات

(الف) فکری گہرائی: حضرت امیر شریعتؒ کی فکر میں بے انتہا گیرائی و گہرائی تھی، حالات اور ماحول کے تجزیے میں وہ بے حد حقیقت پسند تھے، اور کوئی بھی راہ عمل طے کرنے میں ان پر عجلت طاری نہ ہوتی تھی، ہندوستان کے مخصوص پر آشوب ماحول میں شرعی نظام کی تنفیذ بہت مشکل عمل ہے۔ حضرت امیر شریعتؒ نے اس ضمن میں دو اصول واضح کیے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مسلمان اپنے اوپر اسلامی قوانین جاری کریں اور کم از کم حکومت سے غیر متعلق معاملات میں اسلامی آئین کی مکمل پابندی کریں۔ دوسرا فرض یہ ہے کہ مسلمان اسلام کو نظریۂ حیات کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کریں، اور اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کی اصلاح کریں، اور دنیا میں امن اور باہم اعتماد کو ترقی دیں۔

(ب) فقہی بصیرت: فقہ کے تعلق سے انھوں نے اپنا نقطۂ نظر یوں واضح کیا ہے:

> ''دینی اختلافات کی بڑی وجہ امور مجتہد فیہا اور فقہی جزئیات و فروع میں غیر معمولی شدت اور تعصب بھی ہے، ان فروعی مسائل کے ساتھ ہم نے وہی معاملہ کیا جو امور منصوصہ کے ساتھ ہونا چاہیے تھا، دنیا میں ایسے علاقے بھی ہیں جہاں دوسری فقہ پر عمل کرنے والوں کے پیچھے نمازیں ادا کرنے سے انکار کیا گیا ہے۔ ایسے مقامات بھی موجود ہیں جہاں دوسرے مسالک والوں کے داخلہ پر مسجدیں دھلوائی گئی ہیں کہ ان کے داخلہ سے مسجدیں ناپاک ہوگئیں، ان اختلافات کی بنیاد پر مسلمانوں نے جدال و قتال کیا ہے، کاش ان کی نظر حضرت امام مالکؒ کے اسوہ پر ہوتی کہ جب خلیفہ مہدی اور خلیفہ ہارون نے امام سے چاہا کہ مؤطا امام مالک کی نقلیں کرا کے مختلف اسلامی ریاستوں میں بھیج دیں اور حکم دیں کہ اسلامی ممالک میں اسی

پر عمل کیا جائے تو گرچہ امام مالکؒ کو موقع تھا کہ وہ اپنے مسلک کو عالم اسلامی میں حکومت کے سہارے پھیلا دیں لیکن امام نے ایسا نہیں کیا، بلکہ یہ جواب دیا کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین رسول اللہ ﷺ سے دین لے کر دنیا میں پھیل گئے اور انھوں نے سنت رسول کی بنیاد پر ہی اپنے اپنے طریقوں سے دین کو پھیلایا اور اس پر عمل کیا، تو پھر ہم کو اس کا حق نہیں پہنچتا ہے کہ دین کو ایک ہی طریقہ میں محصور کر دیں اور صحابۂ کرام کے پھیلائے ہوئے طریقوں کو ختم کر دیں جب کہ ان مسالک وطرق کی بنیاد بھی قرآن وسنت پر ہے۔''

''ان فروعی مسائل کو غیر معمولی اہمیت دینے کا سب سے بڑا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے علما اور اصحاب فتاویٰ کی نظر دین کی ابدی بنیادوں اور عالم گیر اصولوں سے ہٹ کر فروع پر آگئی اور اصل دین مستور ہو گیا، جس پر نجات انسانی کا مدار ہے اور چھوٹے چھوٹے مسائل نے اس کی جگہ لے لی، جس سے وحدت اسلامیہ کو غیر معمولی نقصان پہنچا، اخوت اسلامی پارہ پارہ ہو گئی اور وما ارسلنك الا رحمة للعلمین اور وما ارسلنك الا كافة للناس بشيرا و نذيرا کا اعلان بے معنی ہو گیا۔''

''دنیا مادی ترقی میں بہت آگے جا چکی ہے، انسانی فکر کی بلندی اور ایجادات نے اور اس سے پیدا شدہ نئے تمدن نے بہت سے جدید مسائل پیدا کر دیے۔ مستقبل مزید نئے مسائل ہمارے سامنے لائے گا، ظاہر ہے کہ ان مشکلات کا حل اور ان مسائل کا جواب نصوص شرعیہ پر فکر اور ان سے مسائل کا استنباط کیے بغیر نہیں دیا جا سکتا، شرعی اصولوں کو سامنے رکھ کر مسائل کا استخراج کرنا ہوگا اور نئی باتوں کا جواب دینا ہوگا ورنہ امت مسلمہ ہر پیش آنے والی چیز کو قبول کرتی جائے گی۔''

''اس مشکل کا یہ حل کہ فقہائے اسلام کی مدونہ فقہ کو ہر مسلمان کے لیے عام کر دیا جائے اور جس مسئلہ میں جون سی فقہ مشکل کو حل کرتی ہو اسے اختیار کرلیا جائے، ہمارے خیال میں اس طریق کار سے ہماری دقتیں حل نہ ہوں گی، آج بھی ایسے مسائل ہیں، جن میں تمام فقہا کی فقہ خاموش ہے اور زمانہ کی ترقی اور انقلاب کی رفتار اتنی تیز ہے کہ اگر آج ہم کو مشکلات کا حل کسی نہ کسی فقہ میں مل جاتا ہے تو کل یقیناً نہیں ملے گا اور تمام فقہ ساکت نظر آئے گی، اس لیے اگر اسلام ہر زمانے اور ہر مکان کے لیے ہے اور قیامت تک کے لیے ہے، اور اگر محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت عالمگیر ہے، اور آپ کی لائی ہوئی کتاب رہتی دنیا تک کے لیے نور اور ہدایت ہے تو اجتہاد کا دروازہ کھولنا ہوگا، اس کے بغیر ہماری مشکلات کا حل شاید نہ ہو سکے، لیکن ہاں یہ دروازہ اس طرح نہ کھولا جائے کہ دین میں ہماری ذاتی رائے اور شخصی رجحانات داخل ہو جائیں۔''[۳]

اس اقتباس سے حضرت امیر شریعتؒ کی صلابت فکر اور بصیرتِ فقہی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(ج) غیرت دینی اور جرأت ایمانی: حضرت امیر شریعتؒ کی ایمانی غیرت اور دینی جرأت کے بے شمار مظاہر موجود ہیں اور فی الواقع ان کا سرا بھی آپ کے علمی رسوخ اور فقہی بصیرت اور فکری نبوغ سے ملتا ہے۔ مشہور محقق عالم حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ کے اس اقتباس پر یہ مقالہ ختم کیا جاتا ہے کہ:

''لم یخلف احد اباہ فی مجلسہ الا عبد الرحمن ''یعنی عبدالرحمٰن بن قاسم کے علاوہ کوئی شخص اپنے باپ کی مجلس کا صحیح جانشین نہیں ہوا، حضرت مولانا منت اللہ صاحبؒ کے کاموں اور کارناموں کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے والد بزرگوار کے سچے جانشین تھے اور ہمارے دور میں اس فضیلت میں ان کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے، ان میں دار العلوم دیوبند کا علمی

تعمق وتصلب اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کا فکری تنوق وتوسع تھا، علم وعمل اور شریعت وطریقت کی جامعیت، روشن ضمیری، عالی دماغی، مردم شناسی ومردم سازی اور خدمت خلق میں اپنے والد کے پرتو تھے۔"[۴]

آسمان ان کی لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

حواشی:

۱۔ امیر شریعت: حیات وخدمات، ص: ۲۹، ۳۰
۲۔ امیر شریعت: حیات وخدمات، ص: ۱۲۵
۳۔ امیر شریعت: نقوش وتاثرات، ص: ۴۹، ۵۰
۴۔ امیر شریعت: نقوش وتاثرات، ص: ۱۱۹

مولانا محمد قاسم مظفر پوری ☆

دینی مدارس کے لیے فکر مند شخصیت

مدارس اسلامیہ اور جامعات دینیہ کی تاریخ آغاز اسلام سے ہی وابستہ ہے جیسے جیسے اسلام کی اشاعت کا سلسلہ بڑھا اور پھیلا اسی طرح دینی درس گاہوں کی وسعت وکثرت بھی ہوتی گئی۔ خود ہندوستان کے مختلف مسلم ادوار حکومت میں ہزاروں کی تعداد میں مدارس قائم تھے اور ایک حد تک ان مدارس کا تعلیمی و مالی نظام حکومت سے متعلق تھا۔ علم دوست سلاطین نے حاملین علوم و معارف کو نہ صرف اپنے قریب رکھا بلکہ ان کے علوم وصحبت سے وہ فائدہ اٹھاتے اور علماء و مشائخ کی قدردانی کرتے رہے۔ اس عہد کی بڑی علمی، مثالی یادگاریں آج بھی باقی ہیں۔

مسلم سلطنتوں کے زوال کے بعد ان تعلیمی مراکز کا وجود مٹ گیا اور کہیں کوئی نقش باقی نہیں رہا۔ خواہ لاہور کا مرکزی مقام ہو یا دہلی کا پایۂ تخت۔ پھر حق تعالیٰ نے ہندوستان میں علوم دینیہ اسلامیہ کے ہر جہت سے احیاء وحفاظت کا کام علمائے ربانیین اور مشائخ عظام سے لیا اور ہر مدرسہ خانقاہ اور ہر خانقاہ مدرسہ کے علوم و معارف سے تاباں و درخشاں ہوگیا اور نظام تعلیم ونصاب تعلیم اور طریق تعلیم وتدریس کو ایسا باعظمت بنا دیا گیا کہ ان درس گاہوں کے فضلاء و منتظمین و معاونین سبھی معرفت الٰہی اور خشیتِ خداوندی کی نعمت کبریٰ کے حامل ہوتے رہے۔ جن کو جہاں بٹھا دیا گیا وہ علوم نبوت کے ترجمان اور اعمال نبوت کے داعی رہے اور خلق خدا ان سے فیضیاب

☆ مدرسہ رحمانیہ سپول، دربھنگہ (بہار)

ہوتی رہی۔ چاہے سلسلہ ولی اللہی ہو یا دیو بند، گنگوہ، تھانہ بھون اور کاندھلہ کے مشائخ ہوں یا علمائے فرنگی محل یا علمائے گجرات کے دبستان علوم وفنون ہوں۔

اس سلسلے کی تفصیلات کے لیے نزہۃ الخواطر کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ علوم ظاہرہ ہوں یا باطنہ، مدارس ہوں یا خانقاہیں۔ تصنیف و تحقیق کا میدان ہو یا دعوت الی اللہ کی اہم ذمے داری۔ یہ سارے ہی کام علمائے ربانیین کی محنتوں سے عام وتام ہوئے، پھولے پھلے۔ اور امت کے ہر طبقہ کی تشنگی دور ہوتی رہی، آج بھی اس ملک میں جو دینی آثار وشعائر آباد وشاداب نظر آرہے ہیں۔ وہ انھیں مشائخ کی توجہات کا ثمرہ اور ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا نتیجہ ہیں۔ حضرت امیر شریعتؒ کو حق تعالیٰ نے جن علوم وکمالات ظاہرہ و باطنہ سے نوازا تھا، اس کے مختلف عنوانات ہیں اور ان کی زندگی کا ہر گوشہ ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔

مدارس کے قیام کی تحریک

مدارس اسلامیہ کی تحریک، تاسیس اور ان کے قیام کو حضرتؒ نے اپنا اولین ترجیحی کام قرار دیا۔ کیوں کہ آپ کی نگہ بلند نے محسوس فرمایا تھا کہ جب تک مسلمانوں میں صحیح مذہبی تعلیم نہ ہوگی نہ خدا کی معرفت حاصل ہوسکتی ہے نہ وہ صحیح عبادت ادا کر سکتے ہیں اور نہ وہ اپنے انفرادی و اجتماعی مسائل ومشکلات کو سمجھ سکتے ہیں نہ ان کے حل کے لیے کوئی اجتماعی فکر وشعور پیدا ہوسکتا۔ اور نہ ہی وہ ملک میں باوقار و باعزت شہری تصور کیے جاسکتے ہیں۔

چناں چہ حضرت امیر شریعتؒ نے جہاں جامعہ رحمانی مونگیر کو اپنی سرپرستی میں ایک مثالی ادارہ بنایا اسی کے ساتھ آپ نے صوبۂ بہار واڑیسہ و بنگال اور ملک نیپال کے مدارس کی سرپرستی کرتے ہوئے جو تاریخی کارنامے انجام دیے ہیں انھیں کوئی بھلا نہیں سکتا ہے۔ حضرتؒ جس طرح دار العلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے رکن رکین تھے، اور ان مرکزی درس گاہوں میں آپ کی رائے کو وقیع و رفیع سمجھا جاتا تھا اسی طرح آپ کی سرپرستی میں نہ معلوم کتنی درس گاہیں آپ کے حکم سے قائم کی گئیں اور کتنی ہی کا احیاءِ ثانی ہوا۔ مدرسہ امدادیہ دربھنگہ، مدرسہ

رحمانیہ سوپول دربھنگہ، مدرسہ اشرفیہ عربیہ پوہدی دربھنگہ، مدرسہ رحیمیہ گاڑھا، مدرسہ محمدیہ سوپول سہرسہ، مدرسہ اسلامیہ نوہٹہ سہرسہ، مدرسہ فضل رحمانی بھلاہی سہرسہ مدرسہ عربیہ چھٹی سوپول سہرسہ وغیرہ وغیرہ آپ کی کوششوں کے رہین منت ہیں۔

تعلیمی سرپرستی

آپ کی سرپرستی میں اصلاح نصاب کا ایک بڑا کارنامہ انجام پایا۔ حضرتؒ نے یہ محسوس کیا کہ مدارس کا نصاب اور ان کا تعلیمی نظام خوب مستحکم ہو۔ چناں چہ اس کے لیے باقاعدہ ماہرین علماء کی مدد سے ایک جامع و مکمل نصاب تیار کرایا، جس میں اساسی علوم یعنی کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کا غالب عنصر رکھا گیا۔ الحمدللہ تجربہ نے ثابت کردیا کہ وہ ہر جہت سے کامیاب رہے۔

علماء کی پرستی

علماء کی ذمے داری کے تعلق سے امارت شرعیہ کی ایک تجویز پر حضرت والا نے خانقاہ رحمانی میں ایک عظیم الشان سہ روزہ کنونشن منعقد کرایا جس میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، مولانا ابوالعرفان ندویؒ، مولانا حامد صاحبؒ وغیرہم نے شرکت کی اور اس موقع پر حضرتؒ نے مدارس کے علماء کا مقام اور ان کی ذمے داری کو اپنے مؤثر انداز میں تحریری مقالہ کے ذریعہ پیش فرمایا جس کو سن کر سارا مجمع اپنی کوتاہیوں پر نادم نظر آتا تھا۔ تمام شرکاء نے عہد کیا کہ وہ اپنے کام کو پورے اخلاص سے انجام دیں گے۔ اس وقت کا منظر یہ بتا رہا تھا کہ مدارس اور ارباب مدارس کے حقیقی سرپرست و مربی آپ ہی ہیں۔

مدارس کے لیے دستور وضوابط کی ترتیب

مدارس عربیہ کے لیے حضرتؒ نے دستور وضوابط مدرسہ کے نام سے ایک باقاعدہ دستور مرتب کرایا جس میں مختلف عہدہ داروں کی ذمے داریوں کی تفصیلات دفعہ وار درج کرائیں تاکہ

مقامی احوال وظروف کے لحاظ سے کسی جزوی دفعہ کو حذف کر کے تمام ہی ادارے اس سے استفادہ کریں، جزوی نزاع میں لوگ نہ الجھیں۔ اس ضابطہ کی ایک ایک دفعہ ایسی ہے جس سے علم دین کی عظمت و رفعت ظاہر ہوتی ہے۔ پہلی بار اسے حضرت مولانا محمد عثمانؒ صاحب مہتمم مدرسہ رحمانیہ سوپول دربھنگہ نے مدرسہ رحمانیہ سے چھپوا کر شمالی بہار کے تمام مدارس میں بھجوایا تاکہ اربابِ مدارس کے لیے اس کی دفعات رہنما خطوط کا کام دیں۔

مدارس کی دعوت کو مقدم رکھتے

حضرت امیر شریعتؒ (جو میرے مربی و مرشد تھے) ان کو اگر کوئی ارادتمند دعوت دیتا اور انھی تاریخوں میں کسی چھوٹے سے چھوٹے مدرسہ و قرآنی مکتب کی جانب سے دعوت دی جاتی تو حضرتؒ پہلے مدرسہ کی دعوت میں شرکت کو اہمیت دیتے تھے بلکہ بعض شہری پروگرام کو بھی ملتوی فرما کر دیہات کے دور افتادہ علمائے مدارس کی قدر دانی کرتے تھے۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ وہ مقامات جو انتہائی پسماندہ ہیں وہاں دین کا چراغ روشن ہو جائے اور اس کی روشنی سے دوسرے چراغ جل جائیں، اور دین کی دعوت کا ایک مرکز وہاں قائم ہو جائے۔ اگر کسی دور دراز مقام پر حضرتؒ مدرسہ کے ذمے داروں کے تقاضے پر خود شرکت نہیں فرماتے تھے تو اپنے کسی نمائندہ کو وہاں کے نظم و نسق کے لیے متعین فرما دیتے تھے۔ آج بھی حضرت کے یہاں نہ معلوم کتنے مدارس کی فائلیں محفوظ ہوں گی۔

خطوط کے ذریعے تذکیر و اصلاح

اصلاحی خطوط کا جو اہم سلسلہ حضرتؒ کا رہا ہے، اس میں مدارس کے ارباب نظم و نسق اور اصحاب درس و تدریس کو بروقت نصیحت و تذکیر فرماتے تھے اور ادارے کے متعلق ہمیشہ مفید مشورہ سے نوازتے۔ جن مدارس کی آپ نے سرپرستی فرمائی بحمد اللہ وہ اپنی تعلیم و تربیت کے لحاظ سے بسا غنیمت ہیں۔

مدارس کے اجلاس ودستار بندی میں شرکت

بہار، اڑیسہ اور بنگال و نیپال کے بہت سے مدارس کے اجلاس حضرت کی صدارت میں منعقد ہوئے۔ آپ نظما اور ذمہ داران اجتماعات کو مدعوئین علماء کے شایان شان اکرام و اعزاز کے ضابطۂ اخلاق سکھاتے اور فرماتے انزلوا الناس علی قدر منازلھم۔ ہم لوگوں نے مدرسہ رحمانیہ سوپول دربھنگہ میں بار بار ایسی نصیحتوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔

مدارس کے لیے تزکیہ وتوصیہ

آخرالامر یہ کہ حضرتؒ نے تمام مدارس کے لیے جو صحیح تھے نہ صرف اپیل ہی لکھی بلکہ ہر طرح کا تزکیہ وتوصیہ لکھ کر اہل خیر کے درمیان ان کے تعلق سے اعتبار واعتماد پیدا فرمایا۔ بے شک وہ افراد واشخاص کے مربی اور مدارس اسلامیہ ومکاتب دینیہ کے سرپرست اور مختلف تنظیموں کے سربراہ تھے اور کیوں نہیں وہ اللہ کے برگزیدہ تھے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

———— ⊙⊙⊙ ————

حافظ محمد امتیاز رحمانی ☆

جنگ آزادی اور حضرت امیر شریعتؒ

ہندوستان سے انگریزی حکومت کا خاتمہ اور ملک کی آزادی پچھلی صدی کی انسانی تاریخ کا بڑا واقعہ ہے، جس نے نہ صرف انگریزوں کی اس حکومت کا خاتمہ کردیا، جس میں کبھی سورج نہیں ڈوبتا تھا، بلکہ اس نے ہندوستان کے ساتھ عرب ممالک کی سیاسی، ثقافتی اور آئینی تاریخ پر بھی اَن مٹ نقوش چھوڑے، ہندوستان پر قبضہ کی وجہ سے انگریز عرب ممالک پر بھی اپنے انداز کی حکومتیں کررہے تھے، اور برٹش حکومت سپر پاور کی حیثیت سے پوری دنیا کو اپنے چنگل میں لیے ہوئے تھی۔ جیسے ہی ہندوستان میں برٹش حکومت کمزور پڑی اور پھر اس کا خاتمہ ہوا، اس کی عالمی حیثیت بھی بدل گئی۔

وطن عزیز کی صورت حال اور حالات کے پیش نظر ملک آزاد کرانا ضروری تھا، مگر یہ کام بڑا مشکل تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کے ساتھ ایک عظیم حکومت کے خلاف کھڑے ہونے کا جذبہ پیدا کرنا اور تدریجاً آزادی کی منزل تک پہنچنا، ایثار وقربانی کے بے پناہ جذبے، مشکل ترین حالات کو گلے لگانے کے حوصلے، اور غیر معمولی جرأت وبصیرت کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیتیں علمائے کرام کو دی تھیں، انھوں نے اپنی زندگی کی آسانیوں کو بھول کر وطن عزیز سے غیر ملکی سامراج کو ہٹانے اور مٹانے کا ارادہ کیا۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک کی بنیاد رکھی اور تقریباً ڈیڑھ سو سال میں کم از کم انیس ہزار علماء نے جان ومال کی قربانی دے

☆ جامعہ رحمانی، مونگیر (بہار)

کر ہندوستان کی آزادی کی تحریک کو مضبوط کیا اور ۱۹۴۷ میں وہ مرحلہ آیا جب ملک آزاد ہو گیا۔

ملک کی آزادی کی بنیادوں کو مضبوط کرنے اور قربانیاں دینے میں جہاں علمائے کرام کا مثالی کردار رہا ہے، وہیں ان کے زیر اثر مسلم عوام نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ۱۹۳۲ میں جب نان کوآپریشن موومنٹ نے زور پکڑا تو اس کے رد عمل میں پورے ملک میں ۸۲ ہزار افراد گرفتار ہوئے جن میں ۴۲ ہزار مسلمان تھے۔ یہ تعداد بتاتی ہے کہ گرچہ تعداد کے اعتبار سے مسلمان اقلیت میں رہے ہوں مگر ۱۹۳۲ میں آزادی وطن کی تحریک میں ان کی قربانی ''اکثریت'' میں تھی۔

اسی تحریک کے نتیجہ میں حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی علیہ الرحمہ آزادی کی جدوجہد میں پوری سرگرمی کے ساتھ شریک ہوئے اور طالب علمی کے زمانے میں میرٹھ، مظفر نگر، سہارن پور ضلع کے ڈکٹیٹر بنائے گئے۔ اپنی خدمات کی وجہ سے آپ نے آزادی کے متوالوں کے دل میں بڑی جگہ بنائی۔ بڑا منظم کام کیا اور مغربی یوپی کے ہزاروں افراد جیل گئے جن میں خود حضرتؒ بھی تھے۔ آپ نے آزادئ ہند کی خاطر دو دفعہ جیل کی مصیبتیں جھیلیں اور بڑے حوصلے کے ساتھ وطن کی آزادی کے کارواں میں سرفروشانہ شریک رہے اور اس میں نمایاں حصہ لیا۔

حضرتؒ کے جیل جانے کے واقعے نے خانقاہ رحمانی کے مریدین و متوسلین کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ حلقۂ خانقاہ رحمانی میں انگریزوں کے خلاف جذبۂ انتقام بھڑک اُٹھا۔ اس واقعے سے آزادئ ہند کی تحریک میں خانقاہ رحمانی کا براہِ راست اشتراک اور سرگرم حصہ شروع ہوا، جو آزادی وطن ۱۹۴۷ تک جاری رہا۔ ایسا نہیں ہے کہ آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والے قائدین خانقاہ رحمانی کی عظمت کے معترف نہیں تھے یا اس کی عوامی طاقت کو محسوس نہیں کرتے تھے۔ قطب عالم حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کی خدمات، آپ کے تقویٰ اور بزرگی کے اثرات نہ صرف ملک کے اندر بلکہ برما سے لے کر افریقہ تک محسوس کیے جاتے تھے اور حضرت قطب عالم کی حیات مبارکہ میں دو مرتبہ گاندھی جی نے خانقاہ میں حاضری دی اور اس انداز سے عقیدت کا اظہار

کیا کہ خانقاہ رحمانی کے گیٹ پر ہی اپنی چپل اتاری اور وہیں سے دونوں ہاتھ جوڑ کر حضرت کے حجرہ تک پہنچے، اسی طرح دیگر مختلف رہنماؤں نے بھی حضرت قطب عالم مولانا محمد علی مونگیریؒ کی خدمت میں حاضری دی۔ اس زمانے میں حضرت قطب عالم کا موضوع بیعت وارشاد، اصلاح باطن، اصلاح معاشرہ اور قادیانی وآریہ سماجی حضرات کی اسلام مخالف سرگرمیوں کا سد باب کرنا تھا اور حضرت والا اس موضوع سے دوسری طرف توجہ دینے کو تیار نہیں تھے۔

حضرت امیر شریعتؒ کی آزادی کے لیے جدوجہد کے نتیجے میں خانقاہ رحمانی میں تحریک آزادیٔ ہند کے رہنماؤں کی آمد و رفت بڑھتی چلی گئی اور یہ خانقاہ ان کی آماجگاہ بن گئی جو مشکل وقتوں میں ان کی پناہ گاہ بھی ہوتی تھی۔ ۱۹۳۴ میں مونگیر میں تاریخی زلزلہ آیا تو گاندھی جی، خان عبد الغفار خاں، پنڈت جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر راجندر پرشاد وغیرہ مونگیر آئے اور سبھوں نے خانقاہ میں قیام کیا، اس زمانہ کے مہمان خانہ میں جو آج کل خانقاہ میں ہال کے نام سے جانا جاتا ہے، ان معزز مہمانوں کا قیام رہا، خان صاحب پندرہ دن یہاں مقیم رہے، زلزلہ ریلیف کے کاموں کے ساتھ تحریک آزادی سے تعلق رکھنے والے بہار کے تمام قابل ذکر قائدین حضرتؒ سے ملنے خانقاہ آتے رہے، اور اس طرح خانقاہ سے قریب ہوتے رہے۔ حضرت امیر شریعتؒ نے آزادی وطن کی تحریک میں جمعیۃ العلماء کے پلیٹ فارم سے حصہ لیا اور پہلی دفعہ جب ۱۹۳۶ میں اسمبلی کے انتخابات ہوئے تو مسلم انڈیپینڈنٹ پارٹی کے ٹکٹ پر آپ نے الیکشن میں حصہ لیا۔ اور ریکارڈ توڑ کامیابی سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نوازا۔ ۱۹۴۰ء میں آپ باقاعدہ اعلان کر کے پارلیمانی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے اور پھر کبھی الیکشن میں حصہ نہیں لیا، آزادی کے بعد جب آپ کے سامنے ایک موقع پر بہار کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر شری کرشن سنگھ نے پنڈت جواہر لال نہرو کی اس خواہش کا اظہار کیا کہ حضرت راجیہ سبھا کی ممبری قبول فرمائیں تو حضرت امیر شریعتؒ نے جواباً فرمایا کہ میں اسمبلی اور پارلیامنٹ سے دور رہنے کا فیصلہ کر چکا ہوں اس کا اعلان بھی ۱۹۴۰ء میں کر دیا ہے۔

پارلیمانی سیاست سے علاحدگی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضرت نے تحریک آزادی سے اپنے آپ کو الگ کر لیا تھا یا خانقاہ رحمانی کے مریدین، مخلصین اور متوسلین کو یہ ہدایت دی کہ وہ

تحریک آزادی سے اپنے آپ کو الگ کرلیں۔ حضرتؒ نے ملک وملت کے وسیع تر مفاد کے پیش نظر سرگرمی کے ساتھ جدوجہد جاری رکھی اور تحریک آزادی کی جدوجہد میں جو خفیہ سرکلر، پوسٹر اور پمفلٹ شائع ہوکر بہار کے بڑے حصے میں تقسیم ہوا کرتے تھے، ان کی طباعت کا سب سے بڑا مرکز خانقاہ رحمانی تھا، اس کام میں حکیم معین الدین صاحبؒ (چھپیر) شری اُگر موہن جھا (جو بعد میں ایس پی کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے) اور شری چندر شیکھر سنگھ (جو بعد میں وزیر اعلیٰ بہار اور مرکزی حکومت کے وزیر ہوئے) خاص طور پر حضرتؒ کے معاون تھے۔ اور زیر زمین تحریک آزادی کے سرگرم کارکنوں میں تھے۔ اس لیے ''کوئٹ انڈیا'' کی سرگرم تحریک اور انگریزوں پر فیصلہ کن یلغار کے زمانے میں دو مرتبہ خانقاہ کی زبردست تلاشی لی گئی مگر پولس کے ذمے داروں کو تیرہ تیرہ گھنٹہ کی تلاشی کے باوجود یہاں نہ کوئی موجود اشتہار یا پمفلٹ ملا اور نہ پریس، جب کہ دونوں چیزیں یہاں موجود تھیں۔ پولیس نے مکانات سے لےکر کھیتوں تک کا چپہ چپہ چھان مارا تھا، اور مطمئن ہوکر یہ تحریری سرٹیفکٹ دے کر چلی گئی کہ یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔

یہ بھی واقعہ ہے کہ ۱۹۴۲ کے موومنٹ میں انگریزوں نے آزادی وطن کے رہنماؤں کو سختی کے ساتھ پکڑنا شروع کیا تو ایک پالیسی کے تحت بہار کے عظیم رہنما ڈاکٹر شری کرشن سنگھ (سابق وزیر اعلیٰ بہار) نے گرفتاری پر روپوشی کو ترجیح دی اور پندرہ دنوں تک خانقاہ رحمانی میں روپوش رہے داڑھی، کرتا اور پاجامہ کے ساتھ۔ اور ان میں نو دن ایسے بھی گزرے جب وہ ایک بڑی نالی پر تختہ ڈال کر آرام کرتے تھے۔ اور اوپر بکس رکھا جاتا تھا، تاکہ تلاشی ہو تو کسی کا ذہن بھی نالی میں سونے والے کی طرف نہ جائے۔ یہ نالی حضرت امیر شریعتؒ کے کمرہ سے ملحق گدام میں تھی۔

یہ چند واقعات بتاتے ہیں کہ ہندوستان کی آزادی میں خانقاہ رحمانی اور حضرت امیر شریعتؒ کا کتنا سرگرم اور مثبت رول رہا ہے۔ اور آزادی کی زیر زمین تحریک میں ان کی کتنی نمایاں حیثیت رہی ہے۔

—— ⊙⊙⊙ ——

مولانا اظہار الحق مظاہری

مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ
ایک مردم ساز شخصیت

تمہیدی سطور

یہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم حضور اکرم ﷺ کا سب سے بڑا علمی معجزہ ہے، لیکن آپ کی تربیت سے سوا لاکھ صحابہ کرامؓ کا مقدس وجود بھی اس سے کم بڑا عملی معجزہ نہیں ہے بلکہ اس اعتبار سے اس کی اہمیت بڑھی ہوئی ہے کہ بعد والوں کو انھی کے ذریعہ قرآن ملا، ایمان اور ایمانی زندگی ملی اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مردم سازی اور شخصیت سازی بھی وارثین انبیاء کی بہت بڑی ذمے داری ہے اور الحمد للہ وہ کبھی اپنے فریضہ کی ادائیگی سے غافل نہیں رہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت گاہ سے کیسے کیسے آفتاب و ماہتاب نکلے اس سلسلے میں خود امام صاحبؒ کا ایک بیان یہ ہے کہ:

> ''ہمارے تلامذہ چھتیس ہیں، ان میں اٹھائیس عہدۂ قضا کے لائق ہیں، چھ فتوی کے قابل ہیں اور دو قاضیوں اور مفتیوں کو تعلیم و تربیت دے سکتے ہیں یہ کہہ کر ابو یوسفؒ اور زفرؒ کی طرف اشارہ کیا۔''[1]

ہمارے اسلاف میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، سید احمد شہیدؒ اور حاجی امداد اللہ صاحب

مہاجر مکی رحمہم اللہ رحمۃ واسعۃ کی ذوات گرامی مردم سازی کے میدان میں نمایاں شان رکھتی ہیں۔

اسلاف کی فکروں کے امین ملت بیضا کے محافظ، دین حنیف کے بے باک ترجمان امیر شریعت حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی قدس سرہ ہیں جن کی ذات گرامی میرے مقالہ کا موضوع اور جن کی شان مردم گری میری گفتگو کا محور ہے۔

مردم سازی کا محرک

مردم گری اور افراد سازی جوان کا نمایاں وصف تھا اور جس میں انھیں نمایاں کامیابی بھی ملی، جب ہم اس کے اسباب پر غور کرتے ہیں تو سب سے بڑی چیز جو ہمیں نظر آتی ہے وہ صیانت دین اور اشاعت دین کے لیے ان کی گہری اور سچی فکر ہے جو حتی المقدور کام کرنے پر خود ان کو بھی متحرک رکھتی اور مزید رجال کار تیار کرنے کا محرک اور باعث بھی بنتی۔ اس سلسلے میں حضرت قاضی مجاہد الاسلام صاحب نور اللہ مرقدہ کا یہ ارشاد یہاں نقل کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ:

> ''ملت کی فلاح و بہبود اور اسلام کی حفاظت اور اس کی سربلندی کے لیے انتہا درجے کی فکرمندی اور بے چینی ان کی شخصیت کا ایک دوسرا اہم عنصر تھا۔ اس فکر میں شاید ان کو رات میں بھی نیند نہیں آتی تھی، سوچتے تھے اور سوچتے رہتے تھے۔ میں نے طویل عرصہ کی رفاقت میں، اپنی زمین، جائداد، ذاتی املاک اور اپنی نجی ضروریات کے لیے کبھی فکرمند نہیں دیکھا۔ ۲۴ گھنٹے ملی مسائل کے لیے فکر مندی ان کا طرۂ امتیاز تھا۔[۲]

کام اور کام اور کام ہی کا مزاج

نام کے آدمی کو کام کا آدمی بنانے اور کام کے آدمی کو بڑے کام کے لائق بنانے میں خود ان کے کام کا مزاج یقیناً بڑا معاون بنتا۔ ان کے کام کرنے کا مزاج کیا تھا یہ بھی ہم حضرت قاضی صاحب نور اللہ مرقدہ کے حوالے سے ہی نقل کرتے ہیں۔ جس سے کام کرنے کے مزاج

کے ساتھ کام لینے کا انداز اور کام کرنے میں اپنا ہم ذوق بنانے کا ڈھنگ بھی سمجھ میں آتا ہے۔

حضرت قاضی صاحبؒ فرماتے ہیں:

''کام اور کام اور کام ہی کام' یہ تھا ہمارے حضرت کا مزاج۔ کبھی اور کسی لمحے میں ہم انھیں فارغ نہیں پاتے، سفر ہو، حضر ہو، صبح فجر کی نماز کے بعد سے رات کے گیارہ بجے تک خود بھی کام کرتے رہتے اور ہم سب کو کام میں مشغول رکھتے۔''

فرماتے تھے کہ بے کار آدمی شیطان کا کھلونا ہے۔ ہر وقت کام میں مشغول رہو اس طرح سے تمھارے دماغ کو کسی بے کار بات کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں ہوگی۔

اور پھر یہ کہ انھیں کسی کام سے عار بھی نہیں تھا مجھے یاد ہے کہ جب حضرت کی سرپرستی میں جامعہ رحمانی کی ترتیب نو کا کام انجام پا رہا تھا اور اس کو باضابطہ ایک ''جامعہ'' کا درجہ دینے کی کوشش ہو رہی تھی، تعلیم کا معیار بڑھایا جا رہا تھا، طلبہ کی بہتر تعلیم و تربیت کے لیے کچھ فیصلے کیے جا رہے تھے۔ اسی دوران یہ طے پایا کہ درجہ بندی کے ساتھ تحریری امتحان کا نظام رائج کیا جائے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت کے حجرہ میں پرچۂ سوالات کی کاپیاں تیار کرنے کا کام دیر رات گئے تک ہوتا رہتا، اور آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ جہاں میں اور ناظم جامعہ مولانا عارف صاحب یہ کام کرتے تھے وہیں خود پورے وقت حضرتؒ بھی کاربن لگا کہ سوالات کی کتابت کرتے رہتے تھے، ماشاء اللہ طلبہ کی تعداد اچھی خاصی تھی، ہم سب تھک جاتے لیکن حضرت کی ہمت افزا گفتگو اور درمیان میں چائے کی پیالی ہماری تھکن کو دور کر دیتی تھیں... اسی طرح ہر چھوٹے بڑے کام میں حضرتؒ خود دلچسپی لیتے اور کاموں میں خود اس طرح شریک رہتے کہ ان کے رفقاء ایک ٹیم بن کر اور ایک خاندان کے ارکان کی طرح اجتماعی ذمے داری کے

احساس کے ساتھ کام کرتے ،ٹیم کے کپتان خاندان کے بزرگ اور بہترین قائد
کی قیادت میں۔'' [۳]

کام کی دھن

اسی سلسلے میں حضرت مولانا حسین احمد قاسمی قاضی شریعت سہرسہ، جنھوں نے حضرت امیرؒ سے کئی کتابیں بھی پڑھی ہیں، کے تاثرات یہ ہیں کہ:

''جب کام سامنے ہوتا تو شب و روز بیدار ہیں کام کی دھن سوار ہے، خود بھی لگے ہیں۔ رفقا و عزیزوں کو بھی لگائے ہوئے ہیں۔ کارکن کام میں اکتاہٹ محسوس کرتے ہیں تو ظرافت بھرے انداز میں کچھ کھلا رہے ہیں اور کچھ فرما رہے ہیں کہ کام کرنے والے تازہ دم ہوکر کام میں لگ جاتے ہیں۔ ذرہ برابر بھی تکان کا احساس نہیں ہوتا تھا اپنی کاوش اور جد و جہد سے مخالف عناصر اور دشمن ترین معاند کو خاموش فرما دیتے تھے۔ سفر ہو یا حضر ہمہ وقت متحرک رہتے تھے۔'' [۴]

جوہر قابل کی تلاش

مردم سازی کے سلسلے میں حضرت کا انداز کیا تھا یہ تذکرہ آگے آیا چاہتا ہے اس سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ حضرت امیر شریعت رابعؒ کو اللہ رب العزت کی طرف سے افراد سازی کا جو خاص جذبہ اور ملکہ عطا ہوا تھا اس کے تئیں وہ ہمیشہ جوہر قابل کی تلاش میں رہا کرتے تھے۔

حضرت مولانا محمد برہان الدین صاحب سنبھلی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو امیر شریعت کی وفات پر لکھے گئے ایک مقالہ میں حضرت کے بہت سے اوصاف ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

''ایک اور وصف جو اب نایاب نہیں تو کم یاب ضرور معلوم ہو رہا ہے وہ آدم گری اور مردم سازی کا وصف ہے۔ مولانا کو اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں غضب کی

بصیرت عطا فرمائی تھی کہ وہ ایک نظر میں جوہر قابل کو تاڑ لیتے تھے پھر اس کی ایسی تربیت فرماتے تھے کہ وہ (اگر خدا کا فضل وتوفیق شامل ہوتا) ''مس خام'' سے کندن بن جاتا تھا پھر ملک وملت کی خدمت نیز علم وتحقیق کے بعد ان میں وہ جوہر دکھاتا کہ اپنے ہی نہیں غیر بھی اس کا لوہا مان لیتے۔''[۵]

ایک ذہین طالب علم کے لیے وظیفہ جاری کرنے کی کوشش

آئندہ سطور میں ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ حضرت امیرؒ نے جوہر قابل کو کہاں کہاں تلاش کیا اور ذرے کو آفتاب بنانے کی کیسی کیسی کوشش فرمائی۔

جناب انجینئر شاہ محمد صدیقی صاحب (ایڈوکیٹ) نقوش وتاثرات میں رقم طراز ہیں کہ:

''خانقاہ رحمانی کے احاطے میں ایک پرائمری اسکول چلتا ہے۔ جامعہ اور اسکول میں بھی تعطیل تھی۔ اسی درمیان ضلعی وظیفہ (District Merit Scholarship) کے امتحان کی نوٹس آئی۔ امتحان چار دن بعد ہونا تھا۔ ایک طالب علم کافی ذہین تھا اس امتحان میں اس کے کامیاب ہونے کی پوری امید تھی، اس بات کا پتہ حضرت کو تھا لیکن وہ لڑکا چھٹی پر اپنے گھر پورنیہ گیا ہوا تھا۔ حضرت نے نوٹس دیکھنے کے فوراً بعد ایک شخص کو بلایا اور ڈیڑھ سو روپے اس کے حوالے کیے اور اس لڑکے کو پورنیہ جاکر لانے کا حکم فرمایا۔ میں حیران تھا کہ اگر اس لڑکے کو وظیفہ مل بھی گیا تو سال بھر میں صرف چھیانوے روپے ملیں گے جب کہ حضرت نے ڈیڑھ سو روپے خرچ کر دیے۔ میں نے اپنی بات حضرت سے کہی۔ حضرت نے مسکراتے ہوئے فرمایا: ''روپے بڑی چیز نہیں ہیں۔ اگر یہ لڑکا کامیاب ہو گیا تو اس کا حوصلہ بڑھے گا۔ علم حاصل کرنے کی طرف اس کے قدم بڑھیں گے اور کون جانے کل وہ ایک کامیاب عالم دین، ڈاکٹر، انجینئر یا ریسرچ اسکالر بن جائے۔''[۶]

ذہین نوجوان علماء کی تلاش

یہ ایک ذہین طالب علم کے اندر جوہر قابل کی تلاش کا واقعہ تھا آیئے دیکھتے ہیں کہ ذہین نوجوان فضلاء کی ان کے یہاں کیسی قدر دانی تھی؟ حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی دار العلوم دیوبند حضرت امیر شریعتؒ کے بارے میں یہ فرمانے کے بعد کہ مولانا مردم شناس تھے اور یہ بہت جلد معلوم کر لیتے تھے کہ کون کس ذہن کا ہے اور کس کا ذہن کھلا ہوا ہے اور کس کا بند۔ اپنے چھوٹوں سے مشورہ میں بھی تردد نہیں فرماتے تھے بلکہ ان کو بلا کر مسئلہ ان کے سامنے رکھتے اور سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ لکھتے ہیں کہ:

> ''خاکسار سے فرما رکھا تھا کہ دار العلوم میں جو ذہین طلبہ فارغ ہوں ان کی خبر میں مولانا کو کرتا رہا ہوں۔ عام طور پر اپنے جامعہ کے لیے ایسے ہی ذہین علماء کا انتخاب فرماتے تھے۔ جامعہ میں بہت سارے وہی اساتذہ تھے، جن کی میں نے نشان دہی کی تھی۔ صلاحیت علمی کے ساتھ ایک بات یہ بھی ضرور فرماتے تھے کہ آپ اس کو بھی پیش نظر رکھیں گے کہ ان فارغین میں اجتماعی زندگی گزارنے کی پوری صلاحیت بھی ہو۔ بعض قابل ہوتے ہیں مگر جماعتی زندگی گزارنے پر قادر نہیں ہوتے ان سے کام نہیں چلے گا۔'' [۷]

قصہ ایک منتہی طالب علم کا

آگے بڑھیے تو دار الافتاء، دار العلوم دیوبند کے ایک طالب علم جو بعد میں وہاں مدرس بھی ہو گئے تھے، امیر شریعتؒ کے حوالے سے اپنی ذہنی تربیت کے واقعات یوں بیان فرماتے ہیں کہ:

> ''میں نے ایک روز مفتی مہدی حسن صاحب سے عرض کیا کہ جماعت اسلامی اور مولانا مودودیؒ کے افکار کے بارے میں ہمیں پوری تحقیق کرنی چاہیے، ان کی کتابیں دیکھنی چاہئیں اور جہاں کہیں وضاحت طلب بات ہو اس کے لیے

مودودی صاحب سے دریافت کرنا چاہیے۔ حضرت مفتی صاحب نے اس پر کوئی توجہ نہیں فرمائی۔

مولانا رحمانی علیہ الرحمہ مجلس شوری کے اجلاس میں تشریف لائے تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ساری صورت حال بتائی۔ مولانا بہت شفقت سے پیش آئے میری بات کو سراہا اور یہ مسئلہ دارالافتاء کی کمیٹی میں رکھا اس کے نتیجے میں ایک سوال نامہ مرتب کیا گیا اور اسے مولانا مودودی علیہ الرحمہ کو بھیجا گیا یہ سوال نامہ رسائل و مسائل حصہ چہارم میں چھپا ہوا ہے۔

ایک معمولی سے طالب علم کی بات پر توجہ کرنا، اس پر عمل کرنا یہ حضرت امیر شریعتؒ سے میرا پہلا تعارف تھا، جس کا اثر دل پر ہوا اور مولانا کی ایک عظمت دل میں قائم ہوگئی۔ اس کے بعد جب تک دار العلوم میں مدرس رہا (۱۳۸۰ھ تا ۱۳۹۲ھ) اکثر مسائل اور مرحلوں میں امیر شریعت سے واسطہ پڑتا رہا۔ اور میں نے ہمیشہ ان کو خوردنواز اور شفیق پایا۔ چھوٹوں کو سراہنا، ان کو بڑھانا یہ باتیں اب ہمارے ماحول سے رخصت ہوتی جارہی ہیں۔''

اس کے بعد جب میں مالیر کوٹلہ (جنوری ۱۹۷۳) میں آ گیا تو مولانا مرحوم نے مجھے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی میٹنگوں میں ''مدعو خصوصی'' کے طور پر بلانا شروع کیا، میں کوئی بات عرض کرتا تو پوری توجہ سے سنتے۔ اختلاف کرتا تو اس کو بھی دیکھتے۔ اس طرح حوصلہ افزائی کر کے میری ذہنی تربیت کرنی شروع کی پھر اس کے بعد بورڈ کا تاسیسی رکن اور مجلس عاملہ کا ممبر بنایا۔ (۱۹۸۰)۔ [۵]

دارالافتاء کے یہ مؤقر طالب علم جو حضرت کی تربیت میں پروان چڑھتے ہوئے مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ کے ممبر بنے آج حضرت مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مفتی اعظم پنجاب کے نام والقاب سے علماء کے حلقے میں متعارف ہیں۔

ایک انجینئر صاحب کا اعتراف کہ گونگے کو زبان مل گئی

علماء اور طلبا سے ہٹ کر عام لوگوں کے اندر بھی اگر کوئی ہنر دیکھا تو اس کو جلا بخشنے کی کوشش فرمائی۔ اس کی شہادت کے لیے ایک جلسہ کی نظامت کے حوالہ سے جناب انجینئر شاہ محمد صدیقی (ایڈوکیٹ) صاحب کا ذاتی واقعہ خود انھی کے الفاظ میں بیان کر دینا کافی ہوگا۔ انجینئر صاحب موصوف ''حضرت امیر شریعت: نقوش و تاثرات'' کے مقالہ میں فرماتے ہیں:

''حوصلہ بڑھانے کی بات پر مجھے اپنا ہی ایک واقعہ یاد آ گیا۔ حضرت مولانا محمد ولی رحمانی صاحب دامت برکاتہم، سجادہ نشین خانقاہ رحمانی، کویت کے سفر سے واپس لوٹ رہے تھے۔ اساتذہ اور طلبہ جامعہ رحمانی نے ان کے اعزاز میں ایک شاندار استقبالیہ اجلاس کا اہتمام جامعہ کے احاطے میں کیا تھا۔ اس جلسے میں شہر کے دانشوروں اور اعلیٰ حکام کے علاوہ پٹنہ اور دیگر جگہوں سے علمائے کرام اور صحافی حضرات بھی شرکت کی غرض سے تشریف فرما تھے۔ جلسہ دو بجے دن میں شروع ہونا تھا۔ تقریباً بارہ بجے حضرتؒ نے مجھے بلایا اور فرمایا، نظامت تم کو کرنی ہے، میں نے سمجھا شاید وہ یونہی کہہ رہے تھے۔ کیوں کہ اس سے پہلے کسی جلسے کی نظامت تو کیا میں لاؤڈ اسپیکر پر کبھی بولا بھی نہ تھا۔ میں مسکرایا اور دیگر لوگوں کے ساتھ بیٹھا رہا۔ دس پندرہ منٹ بعد حضرتؒ نے پھر فرمایا: ''تم ابھی تک گئے نہیں! میں ... اور نظامت؟ میں نے گھبرائی سی آواز میں کہا پٹنہ سے تو فلاں صاحب آئے ہیں بہتر ہوتا ... کیا میں ان کو نہیں جانتا؟ حضرت نے تھوڑی تلخی کے ساتھ سوال کیا۔ پھر مسکرائے اور پوچھا، خوف لگتا ہے؟ جی! میں نے جواب دیا۔ نظامت تم کو ہی کرنی ہے۔ حضرت کی دعا سے وہ جلسہ اور میری نظامت دونوں ہی بے حد کامیاب رہے اور اب جلسوں میں خطابت اور مشاعروں میں نظامت میرا مشغلہ بن گیا ہے۔ گونگے کو زبان مل گئی۔''[9]

یہ حضرت کا جذبۂ تربیت ہی تھا کہ ایک ایسے جلسہ کی نظامت جس میں بہت سے علماء کرام موجود تھے کسی عالم کے بجائے ایک ایسے انجینئر صاحب کے ذمہ ڈالی جنھوں نے اس سے پہلے کبھی نظامت نہیں کی تھی۔ پھر ان کی یہ حوصلہ افزائی اور یہ تربیت کیا رنگ لائی؟ وہ آپ نے دیکھا کہ ہر جلسہ کی نظامت ان کے لیے آسان ہوگئی۔

چھوٹی چھوٹی باتوں میں معمولی آدمی سے رائے لینا

حضرت امیر شریعتؒ کی تربیت کا یہ پہلو بھی بہت اہم ہے کہ ہر کام میں لوگوں سے مشورہ لیتے جس سے لوگوں کے اندر سوچنے اور غور کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی اور کسی معاملہ میں رائے دینے کا سلیقہ بھی آتا۔

حضرت قاضی مجاہدالاسلام صاحب نوراللہ مرقدہ فرماتے ہیں:

''میرے نزدیک ان کی یہ سب سے بڑی خوبی تھی کہ وہ چھوٹی سے چھوٹی باتوں میں اپنے رفقاء کار سے اور بہت معمولی لوگوں سے رائے لیتے، لوگوں کے ذہن کو پڑھتے، بحث کرتے۔ انتہائی زبردست قوتِ استدلال کے باوجود اپنے حقیر سے حقیر ساتھی اور رفیق کار کی رائے سمجھ میں آجاتی تو اسے قبول کرنے میں ذرہ برابر تاخیر نہیں کرتے۔ اپنے رفقا پر پورا اعتماد کرتے ان کو آزادانہ اظہار خیال کا موقع دیتے اور پھر جو فیصلہ اجتماعی رائے سے طے ہوجاتا اس پر پہاڑ کی طرح جم جاتے اور جو طے کرتے اس پر فوراً عمل شروع کردیتے اس طرح ان کے رفقاء میں سے ہر ایک یہ محسوس کرتا کہ ہر فیصلے میں اس کی رائے کا دخل ہے عام طور پر بڑے بڑے لوگوں کے گرد وپیش رہنے والے ایک طرح کی گھٹن محسوس کرتے ہیں۔ اپنی بات کہہ نہیں پاتے ہیں لیکن حضرت کا ماحول کھلا ہوا ماحول تھا۔ ان کی مجلس میں چھوٹے سے چھوٹا آدمی بھی جگہ پاتا اور احساس کم تری کا شکار نہیں ہوتا۔''[۱]

چھوٹوں کی باتوں کو زیادہ اہمیت دینا

تربیت ہی کے پیش نظر کبھی چھوٹوں کی باتوں کو مان کر اسی پر فیصلہ بھی کردیتے تا کہ ان کو بھی تجربہ حاصل ہو۔

چناں چہ حضرت مولانا منظور الحسن صاحب ندوی مبارک پور سہرسہ بہار فرماتے ہیں:

''خود اعتمادی اور خودنگری ہی پیدا کرنے کے لیے شاید چھوٹوں کی باتوں کو بھی کبھی کبھی بڑوں کی باتوں سے زیادہ اہمیت دی۔ ایک بار تو میں نے ایک ایسے فیصلے کے بدلنے پر اصرار کیا جس کا نتیجہ میری خوش فہمی اور توقع کے خلاف اور مولانا کے اندیشہ کے عین مطابق ظاہر ہوا۔ میرے اظہار ندامت پر حضرت امیر شریعتؒ نے فرمایا کہ آپ کے مخلصانہ مشورہ پر مجھے کوئی شک نہیں ہے لیکن کچھ تجربہ آپ کو بھی حاصل ہوا۔[۱۱]

یہ تو خانقاہ رحمانی سے باہر کی چند مثالیں تھیں لیکن خود خانقاہ رحمانی کے اندر جہاں حضرت کا مستقل قیام رہتا تھا انداز تربیت کیا تھا؟ اساتذہ میں کیسی خود اعتمادی اور مربیانہ شان پیدا کرنا چاہتے تھے اور طلبہ کے اندر کیسی جرأت، بلا جھجک استاذ سے کسی مسئلہ کو دریافت کر لینے کا شوق و جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے؟ جب یہ جاننے کی ہم نے کوشش کی تو وہاں کے اساتذۂ کرام کے مقالوں میں ہمیں حضرت امیرؒ کی تربیت سے متعلق بہت سی قیمتی باتیں دستیاب ہوئیں۔

ہم سب سے پہلے حضرت مولانا محمد اکرام علی صاحب شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل گجرات، سابق استاذ جامعہ رحمانی کے ایک مقالہ کے اقتباسات ذیلی عناوین کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

مدرس کے انداز درس کا خود جائزہ لینا

مولانا محترم فرماتے ہیں کہ:

''خانقاہ میں قیام کے دوران گاہ بگاہ درس کے اوقات میں حضرت مرحوم جامعہ رحمانی کی درس گاہوں کا گشت فرماتے اور بعض درس گاہ کے باہر کھڑے ہوکر مدرس کے انداز درس کا جائزہ لیتے اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مطالعہ اور محنت ہر مدرس کا مزاج بن گیا۔''

باہر سے تشریف لانے والے نامور علما کو درس گاہوں میں بھیجنا

آگے فرماتے ہیں:

''اور اس سے زیادہ حضرت مرحوم کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ جب خانقاہ رحمانی میں ملک کے کسی بھی نامور عالم کی تشریف آوری ہوتی تو ان کو جامعہ کے تدریسی جائزہ کے لیے کسی بھی مدرس کی درس گاہ میں باصرار بھیج دیتے بعض مرتبہ تو مدرس کے درس میں ان کے استاذ کو بھیجا جاتا اور ان کی موجودگی میں مدرس کو درس کا سلسلہ باقی رکھنا پڑتا۔'' [۱۲]

اس کا سب سے بڑا فائدہ

شیخ فرماتے ہیں کہ:

''دوران درس کسی باصلاحیت عالم کا پہنچ جانا ذہن پر کتنا بار ہوتا ہے اس سے وہی لوگ واقف ہیں جن کو کبھی ایسا سابقہ ہوا ہو۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مدرسین بغیر مطالعہ پڑھانے کی ہمت نہیں کرتے اور اس کی وجہ سے کسی بھی اہم شخصیت کی آمد پر خوف وہراس ان کے دلوں سے جاتا رہا۔''

اس طرح کے واقعہ کی ایک اور شہادت فقیہ ملت حضرت مولانا زبیر احمد قاسمی زید مجدہ ناظم جامعہ اشرف العلوم کنہواں وسابق استاذ جامعہ رحمانی کے الفاظ یہ ہیں:

''میں نے وہیں دیکھا کہ جب ملک کی کوئی نامور ہستی یا کسی عظیم درس گاہ سے

منسلک عالم دین مونگیر میں پہنچتے تو اولاً حضرت مولانا علیہ الرحمہ جامعہ کے خاص اساتذہ کو خبر کر دیتے کہ فلاں صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں وہ آپ کے فلاں سبق میں شریک ہوں گے، چناں چہ عموماً ہی ایسا ہوتا رہتا۔'' [۱۳]

اس کے دو اور اہم فائدے

مولانا موصوف فرماتے ہیں کہ:

''میں نے ایک موقع سے دریافت کیا کہ حضرت اس میں کون سی مصلحت ہے جو اتنا اور ایسا اہتمام کرتے ہیں؟ (حضرت امیر نے) فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ حضرات میں خود اعتمادی و خود شناسی کا جوہر پیدا ہو۔ اپنی صلاحیت پر بھروسہ ہو اور ذہنی مرعوبیت دور ہو اور پھر ملک کی یہ نامور ہستیاں بھی جان لیں کہ جامعہ رحمانی کے اساتذہ کیا ہیں اور یہاں کا تعلیمی معیار کیا ہے۔'' [۱۴]

اساتذہ کے درمیان کسی اہم مسئلہ پر مباحثہ

شیخ الحدیث حضرت مولانا اکرام علی صاحب زیدہ مجدہ فرماتے ہیں کہ:

''عموماً قبیل عصر حضرات مدرسین حضرت مرحوم کے یہاں چائے پر جمع ہو جاتے تھے کبھی چائے کی یہ مجلس خالص فقہی حدیثی مسئلہ کی مجلس بن جاتی تھی، مدرسین کے روبرو کسی مسئلہ کا ذکر چھیڑ دیتے تھے اور سبھوں سے فرداً فرداً رائے لی جاتی تھی، مدرسین اپنی اپنی معلومات کے مطابق رائے دیتے اور پھر باہم مباحثہ کا سلسلہ شروع ہو جاتا اس کی وجہ سے مدرسین کے معلومات میں اضافہ ہوتا اور بحث و مباحثہ کا انداز معلوم ہوتا تھا۔'' [۱۵]

اساتذہ سے مقالہ لکھوانا اور اس پر اساتذہ کی مجلس میں مناقشہ کرنا

شیخ فرماتے ہیں کہ:

''بار ہا ایسا ہوا کہ حضرتؒ نے کوئی اہم موضوع پر مقالہ لکھنے کے لیے کسی مدرس کو کہا اور انھوں نے محنت اور عرق ریزی کے بعد مقالہ تیار کیا اور حضرت کے حوالہ کر دیا۔ وہ مقالہ مدرسین جامعہ کے سامنے پڑھا جاتا تو لوگ بحث میں حصہ لیتے اور پھر اصلاح و ترمیم کے بعد وہ قیمتی مقالہ بن جاتا۔''[۱۶]

مدرسین سے استفتاء کے جوابات لکھوانا

شیخ فرماتے ہیں کہ:

''دار الافتاء امارت شرعیہ کی ڈاک زیادہ ہوجاتی تو جوابات لکھنے کے لیے مدرسین کو ہدایت فرماتے اس کی وجہ سے مدرسین کو بہت سے فقہی مسائل کا استحضار ہوجاتا۔''[۱۷]

اسی طرح کے ایک موقع پر اپنی ذاتی تربیت کا ایک واقعہ فقیہ ملت حضرت مولانا زبیر احمد صاحب قاسمی زیدہ مجدہ، بھی ذکر فرماتے ہیں۔ ہم واقعہ اور پس منظر انھی کے الفاظ میں پیش کر رہے ہیں، موصوف رقم طراز ہیں کہ:

''لکھنؤ کے ناری نکیتن میں پرورش یافتہ ایک مسلم گھرانے کی لڑکی بالغہ ہوجاتی ہے تو حکومت اس کی شادی ایک غیر مسلم سے کر دینے کا پروگرام بناتی ہے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے حضرت علیہ الرحمہ نے اولاً وقت کے وزیر اعلیٰ کے نام ٹیلی گرام کیا اور اجمالاً ان پر واضح کر دیا کہ ایسی بین الملی شادیوں کی شریعت اسلامیہ میں گنجائش نہیں اور پھر ہمیں بلوا کر فرمایا کہ ایسا ویسا ٹیلی گرام تو چلا گیا ہے مگر ضرورت ہے کہ اس طرح کی بین الملی شادیوں کے متعلق جو دلائل اور مضار و مصالح ہیں ان پر مشتمل ایک مختصر تحریر بھی وزیر اعلیٰ کے پاس پہنچے آپ وہ تحریر مرتب کر کے لے آئیے۔ میں نے دبی زبان سے عرض کیا کہ میرا ذوق تحریری نہیں ہمیں تحریر و تقریر کے فن سے خاص مناسبت نہیں،

فرمانے لگے بس آپ لوگوں کا یہی مزاج سہل پسندانہ، سوچنے کا یہی طرز بلکہ ہمت وارادہ کی یہی کمزوری وپستی ترقی کی راہوں میں رکاوٹ ہے۔ آپ جب پڑھے لکھے ہیں اور بحمد اللہ اندرونی صلاحیت موجود ہے تو اسے جلا بخشئے طبیعت و مزاج پر بل ڈالئے اور احساس کم زوری کا شکار مت ہوئیے۔ ہر دن آپ طویل ومختصر فتویٰ لکھتے ہی رہتے ہیں یہ بھی تو ایک فتویٰ ہی، ہوگا۔ جائیے آپ کے گھنٹے خالی کردیے گئے۔ اسباق مت پڑھایئے، جو کچھ میں نے کہا اس کی تعمیل کیجئے اور بعد عصر شام کی چائے پر ملئے۔

بہرحال مجھ سے جس طرح اور جیسا بھی بن پڑا دہ کیا اور مرتبہ تحریر لے کر شام کو حاضر ہوا، حاضرین مجلس نے دیکھا کہ:

بے حجابانہ توجہ، بے تکلف التفات
اس نے رسم ناز و تمکیں توڑ دی میرے لیے

اور پھر تحریر پر ایک نظر ڈال کر اپنی مربیانہ شان کے ساتھ جو کچھ آپ نے فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ کسی کی خفیہ وخوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کا کیسا حسین سلیقہ اور کتنا زبردست ملکہ اللہ نے انھیں عنایت فرمایا ہے۔" [۱۸]

طلبہ کو سوالوں کی اجازت اور اساتذہ کو مطمئن کرنے کی ہدایت

حضرت شیخ الحدیث مولانا اکرام علی صاحب زیدہ مجدہ فرماتے ہیں کہ:

"طلبہ کو عام اجازت تھی کہ تہذیب کے عام دائرہ میں رہ کر دوران درس اپنے اشکال حل کریں اور اساتذہ کو ہدایت تھی کہ طلبہ کو ہر طرح مطمئن کرنے کی کوشش کریں۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ کوئی مدرس بغیر سمجھے پڑھانے کی ہمت نہیں کرتا، اگر کوئی مقام مدرس کی سمجھ میں نہیں آتا تو بلا جھجک دوسرے استاذ سے پوچھ لینے میں عار محسوس نہیں کرتا اس کی وجہ سے مدرسین سے طلبہ بجامعہ

کو بڑا فائدہ ہوا۔ جامعہ رحمانی سے ایسے فضلاء تیار ہوئے جو ملک کے مختلف صوبوں میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں اور زبان وقلم سے علم دین کی خدمت کررہے ہیں۔"[۱۹]

اہم مسئلہ میں مدرسین سے مشورہ لینا

اپنے ماتحتوں سے مشورہ لینا بھی تربیت ہی کا ایک اہم جز ہے اس سلسلے میں حضرت شیخ الحدیث موصوف یوں رقم طراز ہیں کہ:

"جب کبھی جامعہ کا کوئی اہم مسئلہ درپیش ہوا، مدرسین کو بلا کر مشورہ فرمایا کرتے تھے اور اکثر لوگوں کی جو رائے ہوتی اسی پر عمل درآمد ہوتا۔ یہ فیصلہ کبھی حضرت مرحوم کی رائے کے خلاف ہوتا۔ پہلے تو حضرات مدرسین کو اپنی رائے سنا کر ہم خیال بنانے کی کوشش فرماتے۔ اگر مدرسین کی سمجھ میں نہیں آتا تو عمل اسی پر ہوتا جو اکثریت نے طے کیا۔ حالاں کہ حضرت امیر شریعت نور اللہ مرقدہ قانوناً نہ تو مشورہ کے مکلف تھے اور نہ اکثریت کے فیصلے کے پابند تھے۔ یہ سب کچھ ان کی عالی ظرفی اور نیک نیتی کی وجہ سے تھا اور یہ سب اس لیے ہو رہا تھا کہ جامعہ کی تعمیر وترقی پیش نظر تھی۔"[۲۰]

میدان خطابت کا شہسوار بنانے کیلئے حضرت قاضی صاحبؒ کی تربیت

جامعہ رحمانی مونگیر میں قیام کے دوران فقیہ العصر قاضی القضاۃ حضرت مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمی نور اللہ مرقدہ کے اندر تقریری صلاحیت کو اجاگر کرنے میں حضرت امیر شریعتؒ کی توجہ وعنایت کو کیا کچھ دخل تھا یہ خود قاضی صاحب مرحوم ہی کی زبانی سننے کی چیز ہے۔ حضرت قاضی صاحب نور اللہ مرقدہ اپنے مقالہ میں فرماتے ہیں کہ:

"میں جامعہ رحمانی میں تھا، ربیع الاول اور ربیع الثانی کا مہینہ آیا۔ یہ وہ مہینے

تھے جن میں مونگیر شہر میں میلاد کے نام پر بہت سارے جلسے ہوتے تھے۔ کبھی نواب زادہ کے یہاں، کبھی مرزا ظہور بیگ صاحب کے یہاں، کبھی امین الرحمان خان صاحب کے یہاں، کبھی عبدالغنی صاحب وکیل کے یہاں، کبھی کہیں اور، غرض یہ کہ ہر دوسرے تیسرے دن کہیں نہ کہیں یہ جلسہ میلاد منعقد ہوتے جس میں سیرت پر تقریریں ہوتیں۔ ان جلسوں کی دو خصوصیتیں بہت اہم تھیں۔ ایک تو یہ کہ سبھی جلسوں کے شرکاء سامعین و حاضرین ایک ہی ہوتے۔ محسوس ہوتا کہ صرف جگہ بدل گئی ہے اور وہی لوگ جو کل وہاں سن رہے تھے آج یہاں سن رہے ہیں۔ دوسری خاص بات یہ تھی کہ اس مجمع کا بڑا حصہ پڑھا لکھا، جدید تعلیم یافتہ، مہذب اور شائستہ ہوا کرتا تھا، حضرت علیہ الرحمہ اکثر ان جلسوں میں شریک ہوا کرتے۔ اس حقیر کو بھی ساتھ لے جاتے اور ان کا انداز تربیت یہ تھا کہ مجھے تاکید فرماتے کہ تجھے ان جلسوں میں روزانہ ہی تقریر کرنی ہے۔ ہر روز علاحدہ موضوعات پر تقریر کرنی ہے اور پوری طرح تیار ہو کر بولنا ہے۔ چناں چہ ہر جلسہ میرے لیے دردِ سر ہو جاتا، پچاسوں کتابوں سے اس موضوع پر نوٹس تیار کرتا، اور پھر جا کر تقریر کرتا، اس طرح پڑھے لکھے مجمع کے سامنے سیرت سے متعلق ہر موضوع پر تیاری کے ساتھ کئی سال تک تقریر کرنے کی عادت ڈلوائی فرمایا کرتے تھے کہ تقریروں میں محض مجمع کو متاثر کرنے کے لیے جعلی قصے اور کہانیاں سنانے کی بجائے صحابہ و تابعین اور بزرگان دین کے مستند واقعات سناؤ! اس سلسلے میں اصابہ، اسد الغابہ، استیعاب، طبقات ابن سعد صحابہ و تابعین کے حالات پر دار المصنفین کا پورا سیٹ مطالعہ کرنے کو کہتے آج تک میں چند سال کے ان میلادی جلسوں کے ذریعے حاصل ہونے والے فائدے کو محسوس کرتا ہوں۔"[۲۱]

حضرت قاضی صاحب کا ایک اور وقیع اعتراف

حضرت امیر شریعتؒ کی تربیت کے حوالے سے حضرت قاضی صاحب کا یہ اعتراف بھی بہت اہمیت کا حامل ہے فرماتے ہیں کہ:

''حضرت علیہ الرحمہ محض ایک ادارہ اور ایک ذات نہیں بلکہ ایک تحریک اور انجمن تھے۔ مجھے مسائل کو وسیع افق اور وسیع تناظر میں دیکھنے سمجھنے اور مطالعہ کرنے کا ذوق حضرتؒ کی ذات سے ملا۔'' [۴۲]

اساتذہ کو کردار سازی کی نصیحت

حضرت امیر شریعتؒ جس طرح خود مردم گری اور شخصیت سازی کی پوری فکر فرماتے تھے دوسروں کو بھی اس سلسلے میں فکر مند رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ مدرسہ رحمانیہ سپول تشریف لے گئے تو وہاں کے قاضی شریعت کی درخواست پر اساتذہ کو یہ نصیحت فرمائی کہ:

''آپ حضرات اساتذہ اپنی ذمے داری محسوس کریں، تعلیم کے ساتھ تربیت پر بھی دھیان دیں آج تربیت کا فقدان ہے، طلبہ آپ کے پاس امانت ہیں ان پر محنت کی جائے، ساتھ ہی عامۃ المسلمین کی نگاہیں علماء پر رہتی ہیں آپ علماء مستحب وسنن کا اہتمام کریں گے تو عام لوگ فرض کی طرف بڑھیں گے۔'' [۴۳]

موجودہ افراد میں ہی مطلوبہ صلاحیت پیدا کرنے کا مشورہ

یہ واقعہ ہے کہ کسی اہم منصب کے لیے اہم شخصیت ہی کی ضرورت ہوا کرتی ہے، لیکن وہ اہم شخصیت کہاں سے لائیں؟ اس سلسلے میں حضرت کا مزاج تھا کہ: خود اپنے ہاتھ سے مینا و جام پیدا کر۔ ملاحظہ فرمائیں ایک خط کا جواب:

''جناب حافظ محمد اسماعیلؒ رکن شوری مدرسہ اشرف العلوم کنہواں سیتا مڑھی

(متوفی ۱۳۹۲ھ) نے فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت امیر شریعت کی خدمت میں خط لکھا گیا کہ اشرف العلوم میں صدر مدرس کی ضرورت ہے اس لیے کسی ایسے شخص کی نشان دہی فرمائیں جو عالم باعمل ہونے کے ساتھ جید الاستعداد اور منتظم بھی ہو، تو حضرت نے جواب دیا کہ ان صفات کے حاملین اپنی قبروں میں جاچکے ہیں آپ کے پاس جو افراد موجود ہیں، ان سے کام لیجیے اور انھیں کو اس لائق بنائیے۔''

وہ نوجوان صالح علماء کو نخل آرزو قرار دیتے تھے

ہم اس مقالہ کو ناظم امارت شرعیہ حضرت مولانا انیس الرحمٰن صاحب مدظلہ کے ان قیمتی سطور پر ختم کرنا چاہتے ہیں جو مولانا محترم نے بحث ونظر کے ایک افتتاحیہ میں رقم فرمائے ہیں۔ تربیت کے حوالے سے چند اکابر کا تذکرہ کرنے کے بعد حضرت امیر شریعتؒ کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ:

''انھی کے نقوشِ قدم کے پیرو حضرت امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ تھے، جنھوں نے درس وتدریس، تحقیق وتصنیف، تصوف واحسان اور ملی اتحاد واجتماعیت اور قیادت کے لیے سیکڑوں علماء ودانشوروں کو تیار کیا، وہ ملت کے نوجوان وصالح علماء کو نخل آرزو قرار دیتے اور اس طرح ان کے اخلاق وعمل اور فکر ونظر کی آبیاری کرتے جیسے کوئی محنتی کسان اپنے لگائے ہوئے پودوں کی دیکھ بھال کرتا ہے یا جس طرح کوئی مشفق باپ اپنی اولاد کی تربیت کرتا ہے۔''

جب وہ خانقاہ رحمانی مونگیر یا امارت شرعیہ پھلواری شریف میں رہتے تو اپنے ساتھ رہنے والوں کو صبح کی چائے پر بلاتے۔ مختلف مسائل کو ان کے سامنے پیش کرتے اور رائے دینے کو کہتے۔ پھر اس پر جرح کرتے اور اس طرح ان کی تربیت کرتے اور غیر موجودگی میں ذہین و باصلاحیت افراد کی تعریف کرتے پھر یہ کہ سب کی مشکلات کا خود علم رکھنے کی کوشش کرتے اور ان

کی مدد کرتے۔[۶۴]

اختتامیہ

مجھے احساس ہے کہ میری یہ بے ربط تحریر ادبی ذوق رکھنے والے علمائے کرام کے حلقے میں کسی تحسین و پذیرائی کی مستحق نہیں ہوگی لیکن جس عظیم شخصیت کے عظیم کردار کا اس میں تعارف کرایا گیا ہے، وہ یقیناً گلے لگانے بلکہ قلب وجگر میں اتار لینے کے قابل ہے:

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اس مربی اعظم اور پیکر خلوص کے صدقے ہمارے اندر بھی وہی مربیانہ شان پیدا فرما کر ہم سے بھی کردار سازی اور شخصیت سازی کا یہ اہم کام لے لے۔ آمین یارب العالمین۔

حواشی

۱۔ مختصر سوانح ائمہ اربعہ، ص:۶۳ بحوالہ اخبار ابی حنیفہ واصحابہ، ص:۱۵۲
۲۔ امیر شریعت رابع، ص:۲۰
۳۔ امیر شریعت رابع:۲۱
۴۔ امیر شریعت رابع:۳۱۷
۵۔ امیر شریعت رابع:۳۱۷
۶۔ حضرت امیر شریعت نقوش وتاثرات، ص:۴۱۲-۴۱۳
۷۔ حضرت امیر شریعت رابع:۵۶

۸۔ حضرت امیر شریعت نقوش و تاثرات، ص:۲۵۴

۹۔ نقوش و تاثرات، ص:۴۰۹

۱۰۔ حضرت امیر شریعت نقوش و تاثرات، ص:۴۰۱

۱۱۔ نقوش و تاثرات، ص:۴۰۵

۱۲۔ امیر شریعت رابع، ص:۱۸

۱۳۔ نقوش و تاثرات، ص:۲۸۲

۱۴۔ نقوش و تاثرات، ص:۲۸۲

۱۵۔ امیر شریعت رابع، ص:۲۷۲

۱۶۔ نقوش و تاثرات، ص:۲۸۲

۱۷۔ نقوش و تاثرات، ص:۲۸۲

۱۸۔ امیر شریعت رابع، ص:۲۷۲

۱۹۔ نقوش و تاثرات، ص:۲۷۲

۲۰۔ نقوش و تاثرات، ص:۲۸۳

۲۱۔ امیر شریعت رابع، ص:۲۷۲

۲۲۔ نقوش و تاثرات، ص:۲۸۳

۲۳۔ امیر شریعت رابع، ص:۳۴۳

۲۴۔ امیر شریعت رابع، ص:۴۱۳

مولانا محمد انیس الرحمٰن قاسمی ٭

فرقہ وارانہ فسادات اور حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ

آزاد ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں کی نسل کشی پر مبنی منظم اور منصوبہ بند فسادات کی تباہی و بربادی اور جانی و مالی نقصانات کی الم ناک تفصیلات کا تذکرہ کرنا اتنا ہی مشکل ہے، جیسے ریگستان کے ذرّوں کو شمار کرنا دشوار ہے۔ فرقہ وارانہ شعلوں کے ذریعے مسلم آبادیوں کو حصار جبر میں محصور کرنے کی مسلسل سازش کی جارہی ہے، ان کو تعلیمی، اقتصادی و معاشی، صنعتی وتجارتی طور پر مفلوج کرنے کی مہم جاری ہے، دینی و مذہبی مراکز کے خلاف بے بنیاد الزامات پر مبنی پروپیگنڈوں کے ذریعے مسلمانوں کے ذہنوں کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے اور ملک کی عام فضا کو مسموم کرنے کی بھی کوشش ہورہی ہے۔ اس طرح خرمن امن وامان کو خاکستر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر عدم تحفظ کا احساس اس طرح پیدا کردیا جائے کہ ان کا ذہن مفلوج ہوکر رہ جائے اور مستقبل سے مایوس ہوکر یا تو وہ ہجرت کی راہ اختیار کرلیں یا پھر اکثریتی طبقہ کے خوف سے اپنا دینی وملی تشخص ختم کردیں اور ساورکر اور ہیڈگوار کے افکار ونظریات کے سامنے سر تسلیم خم کردیں لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

نامساعد حالات، لرزہ خیز فسادات اور حوصلہ شکن لمحات میں بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی کی شکل میں حضرت امیر شریعت رابع مولانا سید منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ جیسی

٭ ایڈیٹر روزنامہ دیس بدیش، بھاگل پور (بہار)

گراں قدر شخصیت سامنے آتی ہے جس نے مظلوم مسلمانوں میں جذبۂ ایمانی اور حریت فکر و عمل کی روح بیدار کی۔ یاسیت و قنوطیت کے بجائے چراغ عزیمت جلائے رکھنے کی تلقین کی۔ متاثرین فساد کے زخموں پر مرہم رکھنے، بیواؤں اور یتیموں کی حوصلہ افزائی کرنے اور مظلوموں کی باز آبادکاری کے لیے ملک گیر پیمانے پر فکر مند اور کوشاں رہے۔ ملک کے طول و عرض میں جہاں بھی فرقہ وارانہ شعلوں نے آبادیوں کو خاکستر کیا، مظلوموں کی دادرسی کے لیے خود تشریف لے گئے، بعض جگہوں پر امارت شرعیہ کے ذمے داروں کو روانہ کیا اور بعض نازک مرحلوں میں ریاستی و مرکزی وزراء سے اپیل کر کے ان کو مداخلت پر آمادہ کیا۔

حضرت امیر شریعتؒ سوز دروں اور بیکراں ملی جذبات سے سرشار تھے۔ فسادات کی خبروں کے بعد سب سے پہلے متاثرہ علاقوں کی مدد کے لیے پیش قدمی کیا کرتے تھے۔ ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، رانچی، راوڑکیلا، جمشید پور، کلکتہ اور بھاگلپور کے بھیانک فسادات کے بعد میں نے ان کی آنکھوں کو اشکبار دیکھا ہے لیکن ان کے بیباک و جرأتمندانہ اقدامات و بیانات نے ہزاروں یاسیت زدہ مسلمانوں کی زندگی میں نئی حرارت پیدا کی اور ان کو مومنانہ فراست و بصیرت نیز ایمانی غیرت و حمیت کے ساتھ جینے کا سلیقہ و حوصلہ دیا۔

۱۹۶۴ء میں پورا مشرقی ہند فسادات کی زد میں آ گیا تھا، کلکتہ اور اس کے اضلاع میں ریلیف کا کام وسیع پیمانے پر جاری تھا، میں بھی مظلوموں کی خدمات پر مامور تھا اور جادو پور تھانہ کلکتہ میں ریلیف ورک کے دوران گرفتار بھی ہو گیا تھا۔ اس موقع پر مولانا سید احمد ہاشمی صاحب وغیرہ نے اپوزیشن لیڈر جیوتی باسو سے مداخلت کی اپیل کی۔ چناں چہ مجھے رہا کر دیا گیا اس واقعہ کا تذکرہ برادر محترم ہاشمی صاحب نے حضرت امیر شریعتؒ سے دوران قیام کلکتہ جب کیا تھا تو مخدوم حضرت امیر شریعتؒ نے خصوصی شفقت و عنایت کے ساتھ دعائیہ کلمات سے نوازا۔ اس کے بعد مجھ کو جمشید پور اور راوڑکیلا کی خدمات پر بھی مامور کیا گیا، اس دوران قدم قدم پر مجھے ملت کے تئیں حضرت امیر شریعتؒ کی تڑپ، بے چینی اور درد و کرب کے مشاہدہ کا زریں موقع ملا۔

اگست ۱۹۶۷ء میں رانچی شہر اور اس کے قرب و جوار کے مواضعات میں ہولناک فرقہ

وارانہ فسادات ہوئے تھے۔ ایچ ای سی (ھیوی انجینئرنگ کارپوریشن) کے مسلم ملازمین کے کوارٹرز کو خصوصی طور پر نشانۂ جبر وستم بنایا گیا تھا نیز متعدد مواضعات میں قتل و غارت گری کی وجہ سے ہزاروں افراد متاثر ہوگئے تھے۔ اس موقعے پر آپ نے متاثرین کی بازآبادکاری کے لیے خصوصی اقدامات کیے اور متاثرہ علاقوں کا دورہ کر کے مصیبت زدگان کو صبر و ہمت کی تلقین کی اور اخباری بیان میں واضح طور پر فرمایا کہ:

"رانچی کا المیہ اس وقت پورے ہندوستان کے لیے سوالیہ نشان کی حیثیت اختیار کر گیا ہے... گزشتہ برسوں کلکتہ، جمشید پور، راوڑکیلا، فیروزآباد وغیرہ میں جو فسادات ہوئے اس سے یہ بات صاف محسوس ہوئی کہ منظم طور پر صنعتی اور کاروباری حلقوں سے ایک فرقہ کو ختم کرنے کے لیے قتل وغارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا گیا ہے۔"

رانچی کے فرقہ وارانہ فسادات کے بعد جو سنگین حالات پیدا ہوگئے تھے اس کے پیش نظر محترم امیر شریعتؒ نے مرکزی دفتر امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ میں ایک نمائندہ اجتماع بلا کسی تفریق و امتیاز مسلک کے منعقد فرمایا، جس میں حالات وواقعات پر غور وفکر کے بعد قوم وملت اور ملک کے دانشوروں کو چند اہم نکات پر مشتمل پیغام دیا گیا۔ پیغام کے مندرجہ نکات میں فرقہ واریت کے زہر، اس کے انسداد، پولیس کے متعصبانہ کردار، انتظامیہ کی نااہلی اور ارباب حکومت کے غیر منصفانہ طرزِ عمل کا تذکرہ کرتے ہوئے مسلمانوں میں خوف و ہراس اور احساس کمتری کے ازالہ کی کوشش کی گئی اور مسلمانوں سے کہا گیا کہ:

"اپنی جان ومال، عزت وآبرو پر کیے جانے والے حملہ کا مضبوط اور مستحکم طور پر دفاع کریں۔ یہ ہر شخص کا انسانی اور قانونی حق بھی ہے۔ اس لیے موجودہ حالات میں مسلمان ہراساں نہ ہوں اور ہر طرح کے مقابلہ کے لیے ہر لمحہ تیار رہیں اور اس سلسلے میں مؤثر اور مناسب تدابیر اختیار کریں۔"

اس پیغام کے ایک ایک لفظ سے ایمانی حرارت، جرأت وہمت میں اضافہ اور اپنی بقاء

وتحفظ کے لیے قانونی تقاضوں کے ساتھ اقدامات کرنے کا بھی حوصلہ ملتا ہے۔معذرت خواہانہ رویہ اور مداہنت وتملق آمیز پالیسی سے سخت نفرت اور اس کی مذمت حضرت امیر شریعتؒ کا خاص مزاج تھا، انفرادی معاملہ ہو یا اجتماعی، اپنے ہوں یا بیگانے برسراقتدار طبقہ ہو یا عوام۔ ہرایک کے تعلق سے انصاف واعتدال پر مبنی فیصلہ کرنے کی ان کی طویل تاریخ ہے۔انھوں نے متاثرین فساد کو صبر وہمت کی تلقین کے ساتھ اپنی حفاظت اور دفاع کے لیے واضح الفاظ میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے پیغام میں فرمایا تھا کہ:

''آج ہمارا ملک مختلف، اہم اور پر پیچ مسائل میں گھر گیا ہے۔ان مسائل میں اہم مسئلہ فرقہ واریت کا ہے۔اس لعنت نے ملک کے کروڑوں افراد کو متاثر کر رکھا ہے۔ملکی معاشرہ تباہ ہو رہا ہے اس لیے ضروری ہے کہ آپ اس کو درست کریں۔شر کو خیر سے بدلیں۔آپ اس ملک میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ملک کی تاریخ کو نیا رخ دے سکتے ہیں۔بشرطیکہ آپ اس کے لیے تیار ہوں، اتنی سی بات یاد رکھئے کہ ایک بہت بڑی تعداد کا مزاج تخریبی بن چکا ہے۔اسے توڑ پھوڑ، شکست وریخت سے خاص دلچسپی ہوگئی ہے۔اگر آپ اصلاح کرنا چاہیں تو اس کے لیے ضروری ہوگا کہ آپ خود بھی مضبوط ہوں۔اپنی قوت جمع کریں۔شر پسند فتنہ پرور اور شہری زندگی کے امن وسکون کو برباد کرنے والوں کے مقابل مضبوط اور بہترین دفاع کے لیے تیار ہوں۔آپ کی قوت اور دفاعی صلاحیت وہ بنیادی خوبی ہے، جس کے ذریعے آپ ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔آپ مرنا سیکھیں، بزدلوں کو ہر روز ہر صبح وشام موت آتی رہتی ہے، جوان مرد ایک اور صرف ایک بار مرتا ہے۔

میں آپ سے صرف یہ کہوں گا کہ آپ دوسروں پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیں، خدا سے لو لگائیں اور اپنے مستحکم دفاع کے لیے تیار رہیں۔کسی پر حملے کے لیے نہیں بدنیتی سے نہیں، قتل وغارت گری کے ارادے سے نہیں، بلکہ امن قائم کرنے

کے لیے، ملک کے انتظام کو صحیح رُخ پر لانے اور صحیح طریقہ پر چلانے کے لیے
موجودہ صورتِ حال میں بڑھتی ہوئی فرقہ واریت اور نسل کش حملوں کا علاج
میرے خیال میں یہی ہے کہ مظلوموں کو چاہیے کہ وہ اپنا دفاع کریں۔ کیوں کہ
دفاع آپ کا قانونی حق ہے، جسے کوئی بھی طاقت آپ سے چھین نہیں سکتی۔"

حضرت امیر شریعتؒ نے ملک کے طول و عرض میں تقریباً تیس اہم فسادات کے موقع پر متاثرین فساد کی راحت رسانی، باز آبادکاری کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ ان سارے حالات وواقعات کا جائزہ لینے کے بعد حضرت امیر شریعتؒ نے فرمایا کہ میں دو اہم باتیں کہنا چاہتا ہوں ایک حکومت سے، دوسری مسلمانوں سے:

"مجھے حکومت سے یہ کہنا ہے کہ پورے ملک میں ہونے والے فسادات نے یہ
بات ثابت کر دی ہے کہ حکومت فسادات اور یک طرفہ قاتلانہ حملوں کی روک
تھام میں ناکام ہو چکی ہے۔ اس کی مشینری امن قائم نہیں کرتی بلکہ فسادات کی
آگ کو ہوا دیتی ہے۔ پولیس نے ان واقعات پر ظلم کو ڈھونے والی گاڑی کے
انجن کا کردار ادا کیا ہے اور اس کے ذریعے مظلوموں کا نہیں بلکہ بلوائیوں اور حملہ
آوروں کا تحفظ کیا ہے... اس لیے حکومت سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایسی پولیس
اور ایسی انتظامیہ کی ہمیں ضرورت نہیں ہے جو ہماری حفاظت کے بجائے ہم پر ظلم
کی راہ نکالتی ہو۔"

"مجھے دوسری بات مسلمانوں سے کہنی ہے اور وہ یہ کہ ان واقعات نے یہ ثابت کر
دیا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی حفاظت آپ کرنی ہے اور اس پر اعتماد ان کی سب سے
بڑی طاقت ہے اپنے جان و مال کی حفاظت ہمارا اخلاقی اور قانونی حق ہے اس
لیے ہمیں ہر لمحہ ہر خطرہ کا دفاع مضبوط کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے، فسادات
روکنے کی صرف ایک راہ ہے اور وہ یہ کہ حملہ کرنے والے خود اپنے لیے بھی خطرہ
محسوس کرنے لگیں۔ لہٰذا اپنی جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے ہر لمحہ

پوری طرح مستعد رہنا اور ہر طرح کے حالات کا جرأت مندی اور اعتماد علی اللہ کے ساتھ سامنا کرنا ہمارا فریضہ ہے، ہمیں اسی سرزمین پر رہنا ہے اور یہیں جینا اور یہیں مرنا ہے۔ اس لیے فرار اور گریز کی راہ اختیار کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ بس ہمیں اپنے ممکن وسائل کے ساتھ کھڑا ہونا ہے، اپنے دین پر قائم رہنا ہے اور اس طرح اس سرزمین پر عزت کے ساتھ جینے کی راہ نکالنی ہے۔"

علی گڑھ، جمشید پور اور میرٹھ وغیرہ کے واقعات میں پولیس کے متعصبانہ کردار کی مذمت کرتے ہوئے حضرت امیر شریعتؒ نے حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ:

(۱) ملٹری پولیس میں مسلمانوں کو قابل لحاظ اور مؤثر نمائندگی دی جائے۔

(۲) جن حکام کی ناعاقبت اندیشی، غفلت اور سازش سے یہ ہولناک فساد ہورہے ہیں انھیں معطل کیا جائے اور ان پر مقدمات چلائے جائیں۔

(۳) عام پولیس اور فوج میں مسلمانوں کو مناسب ملازمت دی جائے۔

(۴) بی ایم پی کی جن ٹکڑیوں نے گولیاں چلا کر قتل وخون کا بازار گرم کیا ہے اسے معطل کیا جائے۔

(۵) مرنے والوں اور لٹنے والوں کو پورا معاوضہ اور مظلومین کو پوری امداد دی جائے اور نقصانات کی تلافی کی جائے۔

آزاد ہندستان کی تاریخ میں بھاگلپور کا فساد سب سے بھیانک فساد تسلیم کیا گیا ہے یہ مسلمانوں کی نسل کشی کی بھیانک سازش کی ایک اہم کڑی ہے، یہ حادثۂ کرب و بلا اس قدر المناک، وحشت ناک اور افسوس ناک ہے کہ اس کی تفصیلات کو بیان کرنا نہایت مشکل ہے، میں جبل پور، کلکتہ، جمشید پور، راوڑکیلا، رانچی، احمد آباد، میرٹھ، مرادآباد مالیگاؤں اور دوسرے فسادات کی تباہی و بربادی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور ہر المیہ پر آنکھیں اشکبار ہوچکی تھیں لیکن خود اپنے ہی شہر کو شعلہ بداماں دیکھ کر اور ضلع بھر کے متاثرہ علاقوں کا مشاہدہ کرکے یہ احساس ہوتا رہا کہ بربریت وسفاکی کی ایسی بدترین مثال اس سے قبل کہیں بھی دیکھنے کو نہیں ملی ہوگی۔ یہاں

اجتماعی طور پر قانون کے محافظوں نے قاتلوں، درندوں اور رہزنوں کا کردار ادا کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ بھاگلپور فساد ہندو احیا پرستی اور ہندو راشٹر کی بنیاد رکھنے کی ایسی حکمت عملی تھی، جس کے علل واسباب اور محرکات وعوامل پر غور کر کے لائحۂ عمل تیار کیا جاتا تو اس کے بعد گجرات میں دوسری بڑی تباہی کے دلدوز مناظر سامنے نہیں آتے۔ بھاگلپور کا فساد حقیر سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے مذہبی جذبوں کے استحصال کی ایک ایسی بدترین مثال ہے جو ملک کی سالمیت ووحدت کے لیے ایک کھلا ہوا جارحانہ چیلنج تھا۔

۲۴ راکتوبر کی شام سے کرفیو نافذ کر دیا گیا اور کرفیو کے دوران مسلمانوں کی دکانوں، مکانات اور آبادیوں کو تباہ وبرباد کر دیا گیا، بھاگلپور فسادات میں نقصانات کی ایک اجمالی رپورٹ یہ ہے:

متاثرہ محلے ومواضعات کی تعداد:	۲۷۲	شہداء کی تعداد:	۱۳۰۰
متاثرہ خاندان وافراد:	۷۰۰۰۰ ہزار	زخمیوں کی تعداد	۲۵۹
گھر سے بے گھر ہونے والوں کی تعداد	۳۵۰۰۰ ہزار	متاثرہ مساجد	۴۲
دکانیں لوٹی گئیں جلائی گئیں	۷۵۴	متاثرہ مدارس:	۱۸
پاورلوم جلائے گئے لوٹے گئے	۳۰۰۰	متاثرہ قبرستان	۵

اس موقع پر حضرت امیر شریعتؒ بے چین ومضطرب ہو گئے اور مظلومین کی فوری راحت رسانی کے لیے امارتِ شرعیہ کا ایک وفد بھاگلپور روانہ کیا۔ پہلے مرحلے میں دو ٹرک سامان خورد ونوش، کمبل اور ضروری اشیاء کے ساتھ مولانا سعید احمد صاحب جب آئے تھے تو وہ وقت بہت ہی نازک تھا۔ خطرات قدم قدم پر تھے ایک موقع پر فسادی عناصر نے ان کو گھیر لیا اور بہت مشکل سے جان بچی، ایک کیمپ ہمارے یہاں بھی تھا، جس میں سینکڑوں افراد پناہ گزیں تھے۔ بھاگلپور میں سب سے پہلا امدادی سامانِ راحت امارت شرعیہ ہی نے تقسیم کیا تھا۔ اس کے بعد مسلسل ریلیف و باز آبادکاری کا کام بہت ہی منظم انداز سے حضرت امیر شریعتؒ کی ہدایات کے مطابق چلتا رہا۔

۴ رنومبر کو حضرت امیر شریعتؒ کی قیادت میں ایک وفد بھاگل پور آیا، اس وفد میں

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، ہارون رشید چیئرمین اقلیتی کمیشن وغیرہ شامل تھے۔ وفد نے ہسپتال میں زخمیوں کو دیکھا، متاثرہ علاقوں کا دورہ کیا، مظلومین ومتاثرین فساد کو ان کی تشریف آوری کے بعد بہت سکون ملا۔ حضرت امیر شریعتؒ وغیرہ ہمارے یہاں قیام پذیر تھے کہ رات میں فسادیوں نے ہمارے محلے میں منظم حملہ کر دیا، بموں کی بارش ہونے لگی، شور و ہنگاموں کے دوران حضرت امیر شریعتؒ پیکر استقامت نظر آئے۔ آبادی میں جگہ جگہ لوگوں کو ضروری ہدایات دینے لگے، مورچہ بندی کی تلقین کرنے لگے اور نوجوانوں کو جرأت وہمت کے ساتھ مقابلہ پر آمادہ کرتے نظر آئے۔ کچھ دیر کے بعد بلوائیوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بھاگ گئے۔

اس بھیانک رات کی یاد آج بھی ذہنوں میں تازہ ہے، حضرت امیر شریعتؒ کی ذات گرامی کا ایک ایسا نمایاں وصف منظر عام پر آیا جس کی نظیر دور حاضر کے علماء میں نظر نہیں آتی۔ ان کے چہرے پر جلال و جمال کا ایسا حسین امتزاج تھا جس کو میں زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتا۔ قابل ذکر یہ امر بھی ہے کہ اس پُر خطر ماحول میں ان سے عرض کرتا رہا کہ حضرت آپ باہر تشریف نہ لے جائیں، آرام وسکون سے صرف دعا فرماتے رہیں، لیکن انھوں نے گوشۂ عافیت میں بیٹھنا گوارہ نہیں کیا بلکہ گلیوں و ناہموار کوچوں میں ادھر ادھر چلنے لگے اور عوام وخواص کی رہنمائی اس طرح فرمانے لگے جیسے امیر الجیش میدان کارزار میں نظر آتا ہے۔ اور زبان حال سے یہ پیغام ملت اسلامیہ ہند کو دے رہے تھے کہ:

خانقاہوں میں نہ کر گوشہ نشینی اے شیخ
زندگی چاہیے خیبر کے مسلمانوں کی

شہر بھاگلپور اور مواضعات کے چند اہم متاثرہ علاقوں کا دورہ کرنے کے بعد جن حالات وواقعات کا مشاہدہ حضرت امیر شریعتؒ اور ارکان وفد نے کیا تھا اس کی تفصیلی رپورٹ اخبارات ورسائل میں نمایاں سرخیوں کے ساتھ شائع ہو چکی ہے رپورٹ کے اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) یہ فساد پوری طرح منصوبہ بندی کے ساتھ ہوا، جس کی تیاری مہینوں سے کی جا

رہی تھی۔

(۲) اس فساد میں بڑا دخل اس مذہبی جنون کا تھا جو رام شیلا پوجن اور رام جنم بھومی کے نام پر ان سادہ دل ہندوؤں میں منصوبہ بند طریقے پر فرقہ پرستوں نے پیدا کیا اور اس زہر کے ذریعے ان میں مذہبی جنون پیدا کیا۔ جس نے انسانیت کے جذبہ سے ان کو محروم کر دیا۔

(۳) ان فسادات میں بہار ملٹری پولیس (B.M.P.) پوری طرح ملوث رہی۔ اس نے فسادیوں کو حفاظتی چھتری فراہم کی۔

(۴) اس فساد میں اہل سیاست کا بھی دخل ہے اس لیے فسادی عناصر آزادانہ گھوم پھر رہے ہیں۔

(۵) انتظامیہ اور پولیس کا ایک خاص کردار یہ رہا ہے کہ اس فساد کی ذمے داری مسلمانوں پر ڈال دی جائے۔

(۶) فساد کے بارے میں یہ کہنا کہ ۲۴ر اکتوبر کو تاتار پور سے شروع ہوا غلط ہے، حقیقت یہ ہے کہ فساد کا ماحول پہلے سے بنایا گیا اور ۲۲ر اکتوبر کو سبور تھانہ کے فتح پور گاؤں میں فساد برپا کیا گیا۔ ۲۳ر اکتوبر کو رکشہ والوں پر حملہ کیا گیا اور ۲۴ر اکتوبر کو ہزاروں مشتعل و مسلح جلوس کے ذریعے تاتار پور کے قریب فساد شروع کیا گیا اور کرفیو نافذ کر دیا گیا۔

(۷) وزیر اعظم ہند راجیو گاندھی نے دورہ بھاگلپور کے دوران ایس پی دویدی کا تبادلہ روک کر اور یہ کہہ کر کہ شیلا پوجن کے جلوس پر پابندی لگانے میں کچھ تکنیکی دشواریاں ہیں، فسادیوں اور مجرم انتظامیہ کی ہمت افزائی کی۔

حضرت امیر شریعتؒ کی رپورٹ اور اس کے مندرجات کی افادیت و اہمیت وسیع دائروں میں محسوس کی گئی، ان کی تشریف آوری سے مسلمانوں میں اعتماد و حوصلہ پیدا ہوا۔ بے سہاروں کو سہارا ملا، اور اسی کے ساتھ ضلعی انتظامیہ نیز ریاستی حکومت کے رویے میں بھی قابل ذکر تبدیلیاں نظر

آئیں۔ حضرت امیر شریعتؒ نے اس موقع پر بی ایس ایف (B.S.F.) کے کمانڈر وجے کمار سے جو اہم گفتگو کی اس کے اثرات بھی بہت دوررس اور مفید نتائج کے حامل ثابت ہوئے تھے، بعد میں وجے کمار صاحب نے مجھ سے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ ایسے مہاپرش اگر دو چار ہندوستان میں پیدا ہو جائیں تو ملک میں حقیقی امن اور قومی ایکتا کی فضا قائم ہو سکتی ہے۔

بھاگلپور کے متاثرین و مظلومین کی داستانوں کو سن کر اور ان کے حالات خصوصاً موضع چندیری اور موضع لوگائیں کے واقعات رنج والم سن کر حضرت امیر شریعتؒ بیحد رنجیدہ تھے۔ ان کے چہرے پر ان کے قلبی واردات کے اثرات نمایاں تھے، ان کی رپورٹ کی اور بہت سی تفصیلات ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت امیر شریعتؒ کا ایک تاریخی خط ہے جو حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کے نام ہے اور کاروانِ زندگی حصہ چہارم صفحہ ۱۸۰ تا ۱۸۷ پر اس کا مطالعہ کیا اور اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بھاگلپور کے واقعات کا حضرت امیر شریعتؒ کے قلب و ذہن پر کتنا گہرا اثر مرتب ہوا تھا، اس خط کا ہر لفظ اور ہر سطر درد و کرب سے لبریز ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ حضرت امیر شریعتؒ نے امارت شرعیہ کے سارے کارکنوں اور اپنے تمام متعلقین و متوسلین کو بھاگلپور کی راحت رسانی اور بازآبادکاری کے کاموں میں ترجیحی انداز سے لگا دیا تھا۔

بھاگلپور میں ابتدائی و ہنگامی راحت رسانی کے علاوہ بحالی روزگار، دکانداروں اور رکشہ پولروں وغیرہ کی امداد کے ساتھ ایک ہزار ۲۹ مکانات تعمیر کرا کر بے گھر خاندانوں کو آباد کیا گیا اور نئی آبادیوں مثلاً سجاد نگر، رحمانی نگر وغیرہ میں مسجد اور مدرسہ کا بھی انتظام حضرت امیر شریعتؒ نے کیا اور ان کی ہدایت کے مطابق ابھی تک مسجد و مدرسہ کی عملاً نگرانی امارت شرعیہ کر رہی ہے۔ ۲۵ر نومبر کو حضرت امیر شریعتؒ دوسری مرتبہ بھاگلپور تشریف لائے تھے اور آبادکاری کے کاموں کا جائزہ لیا تھا۔ اسی کے ساتھ نئی آبادی میں مسجد اور مدرسہ کا افتتاح بھی فرمایا تھا۔ اس موقع پر آپ نے مسلمانوں کے نمائندہ اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

> ''ملک کے حالات ابھی تک معمول پر نہیں آئے ہیں۔ اس لیے ہم سب کو حوصلہ اور ہمت کے ساتھ اور اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھتے ہوئے امن و سلامتی کے لیے

کوشش کرتے رہنا چاہیے اور ہوش مندی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے اور دین پر ثابت قدم رہتے ہوئے اتحاد اور تنظیم کے ساتھ زندگی گزارنی چاہیے۔''

''ایک خدا کا خوف اگر دل میں پیدا ہو جائے تو سارے خوف مٹ جائیں گے۔ ملک دشمن اور حملہ آوروں کا ہمت اور جواں مردی سے مقابلہ کرو، بزدلی کی موت سے لڑکر مرنا زیادہ بہتر ہے۔''

''ہم خدا کے سوا کسی طاقت اور حکومت پر بھروسہ نہیں رکھتے ہیں، اپنے تحفظ اور مدافعت کے لیے خود کو منظم کرنا ہوگا، ہم دوسروں کے رحم وکرم پر کب تک زندہ رہ سکیں گے، خدا پر توکل، بھروسہ، اور جرأت کے ساتھ دشمن عناصر کا مقابلہ کرنا ہوگا، اور ظالموں کو یہ احساس دلانا ہوگا کہ ان کا بھی نقصان ہوسکتا ہے اور ان کی بھی جان جاسکتی ہے۔''

مظلوم شہدا خصوصاً لوگائیں، اور چندیری کے شہداء کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت امیر شریعتؒ نے رقت آمیز اور درد بھرے انداز میں فرمایا تھا کہ:

''انھوں نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر عزیمت کی راہ پر دین اسلام پر قائم رہتے ہوئے جام شہادت نوش کرلیا اور ایمان واستقامت کے انگنت چراغ پھر سے روشن کر گئے۔ اوگائیں کی سرزمین! تجھے مبارک ہو کہ اب تمہاری نسبت شہدائے احد، شہدائے کربلا اور شہدائے بالاکوٹ سے براہ راست قائم ہوگئی۔''

قیام بھاگلپور کے دوران چند غیر مسلموں اور صحافیوں کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت امیر شریعتؒ نے ''قومی یک جہتی کیسے ہوسکتی ہے؟'' جیسے سوالات کے جوابات دیتے ہوئے فرمایا:

''ملک کے لیے قومی یک جہتی سب سے اہم اور ضروری ہے مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تمام مذہبی لسانی، صوبائی، ثقافتی اکائیاں اپنی اپنی اکائیوں کو اور اپنی اپنی انفرادیت کو ترک کر کے ایک مذہب، ایک زبان، ایک ثقافت سے اپنا ناطہ جوڑ لیں، اس طرح کی یکسانیت کے معنی زندہ اور حقیقی جمہوریت کے نہ ہوں

گے اور نہ ہی ایسی کسی کوشش کی اجازت دستور ہند دیتا ہے ایسی کوشش کرنے
والے فسطائی ذہنیت کے ہوں گے اور ایسی ذہنیت والوں کے ذریعے قومی یک
جہتی کا حقیقی تصور پامال ہوتا رہے گا نیز ایسے ہی افراد فتنہ وفساد برپا کرنے کی
سازش کرتے رہیں گے۔"

فساد بھاگلپور کے بعد حضرت امیر شریعتؒ متاثرین کی راحت رسانی کے لیے ہمہ وقت بے چین نظر آئے۔ چناں چہ سب سے پہلے سامان راحت امارت شرعیہ کی جانب سے ضرورت مندوں میں تقسیم کیا گیا، زخمیوں میں سے محمد نثار اور محمد جلیل کو صدر ہسپتال سے منتقل کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ یہ مرحلہ اگر چہ بہت دشوار تھا۔ چناں چہ میں نے ان دونوں کو پٹنہ روانہ کیا۔ حضرت امیر شریعتؒ نے خصوصی توجہ دی اور ایک معروف سرجن کے ذریعے علاج کرایا یہ دونوں صحت یاب ہو کر ۱۵ر نومبر کو واپس آ گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ شروع سے اب تک امارت شرعیہ کی جانب سے تعاون کا سلسلہ جاری ہے۔ ابھی چند سال قبل بھاگلپور کی نئی آبادی جس کو امارت شرعیہ کے ذریعے بسایا گیا ہے وہاں قبرستان کے لیے ایک زمین کی خریداری میں بیس ہزار روپے سے موجودہ امیر شریعت نے تعاون فرمایا۔ اسی طرح مقدمات کی پیروی خصوصاً ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ وغیرہ کے مرحلہ میں بھی امارت شرعیہ سے حسب ضرورت رقم ملتی رہتی ہے۔ یہ سب حضرت امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی وضع کردہ پالیسی و پروگرام کا نتیجہ ہے۔

حضرت امیر شریعتؒ کی گراں قدر خدمات کو احاطۂ تحریر میں لانا بہت ہی مشکل ہے اور فرقہ وارانہ فسادات کے انسداد کے لیے اس طریق کار کو اپنانے کی ضرورت ہے، جس کی ہدایات مختلف مراحل میں ہمیں دی گئیں۔ ان کے خیالات اور ان کے قیمتی و فکر انگیز بنایات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے اور اس پر عمل کیا جائے تو انشاء اللہ مستقبل تابناک ہو سکتا ہے اور ہندوستان میں فرقہ واریت کے عفریت کا خاتمہ بھی ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت امیر شریعتؒ کی خدمات کو قبول فرمائے اور ہم سب کو ان کی ہدایات پر عمل کرنے کی توفیق عنایت کرے! آمین

مولانا مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی ☆

تحفظ شریعت کا مردِ میداں

امیر شریعت رابع ابوالفضل حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی حیات و خدمات کے کئی روشن باب ہیں، جن پر مقالہ نگاروں نے بہت شرح و بسط سے لکھا ہے، اور جن پر کئی کتابیں تیار ہو چکی ہیں۔ ان تمام ابواب کو جمع کر کے اس پر تجزیاتی نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ حضرت کی ساری تگ و دو اور خدمات کا سلسلہ تحفظ شریعت اور اسلامی قوانین کے دفاع پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ مولانا دارالعلوم دیوبند کے مسائل کے حل کے لیے کوشاں ہوں یا ندوہ کی مجلس شوریٰ میں کوئی مسئلہ زیر بحث ہو، جامعہ رحمانی مونگیر کو عروج و ارتقا کے مختلف مدارج سے گزارنا ہو یا خانقاہ رحمانی کی مسند سجادگی ہو، مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کی تحریک ہو یا اس کا دور نظامت، شاہ بانو کیس میں نفقۂ مطلقہ کے خلاف احتجاج ہو یا ایمرجنسی میں خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف تحریر و تقریر، امارت شرعیہ کے امیر شریعت کی حیثیت سے تنفیذ شریعت اور توسیع قضا کی جہد مسلسل ہو یا انڈپنڈنٹ پارٹی کی سیاسی جدوجہد، قریہ قریہ، دعوت دین کے لیے سفر ہو یا امارت شرعیہ کے لیے جہد مسلسل یہ سب تحفظ شریعت اور دفاع اسلام ہی کے مختلف عنوانات ہیں اور ہر عنوان ایک ضخیم کتاب کا مضمون۔ اس لیے امیر شریعت سادس حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب دامت برکاتہم نے بجا لکھا ہے کہ ''ہندستان میں اسلام کی حفاظت و صیانت کی تاریخ جب بھی لکھی جائے

☆ نائب ناظم امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ، پٹنہ (بہار)

گی وہ ان کے ذکر کے بغیر ادھوری اور نامکمل ہوگی'' بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ مولانا کے جسد خاکی میں جو خون گردش کررہا تھا اور جسم وجان کے رشتے کو برقرار رکھنے کے لیے جو سانس کی آمد ورفت تھی اگر زبان حال کو سننے والے کان ہوتے تو معلوم ہوتا کہ وہ سب تحفظ شریعت ہی کے لیے وقف ہیں، حضرتؒ نے خود بھی بریلویوں کے پیشوا مولوی رفاقت حسین کے نام ایک خط مرقومہ ۱۸ ارمحرم الحرام ۱۳۹۷ھ میں لکھا تھا کہ ''میرا کام سرور کائناتﷺ کے لائے ہوئے دین کی اشاعت وتحفظ ہے''۔اس اجمال کی تفصیل اگر جانی ہو تو مولانا کی زندگی کے مختلف اوراق الٹیے۔

ابھی طالب علمی (۱۹۳۲) کا زمانہ ہے۔انگریزوں کے خلاف ایجی ٹیشن زوروں پر ہے، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ کی قیادت میں تحریک چل رہی ہے اور جاں نثار شاگرد، ان کے جلو میں ہیں، پہلے حضرت کی گرفتاری ہوئی، بعد میں سبھوں کے ساتھ اس جواں سال طالب علم کی بھی ہوئی، سہارن پور جیل میں رکھا گیا، قید وبند کی صعوبت، کھانے کی تکلیف، کرب ناک اور المناک زندگی کے شب وروز، بڑے بھائی مولانا لطف اللہؒ (م ۱۹۴۲ء) ملاقات کے لیے جاتے ہیں۔جیلر حبیب اللہ خورد ونوش میں آرام پہنچانے کی تجویز رکھتا ہے، حضرت سختی سے رد کرتے ہیں، کیوں کہ یہ انتظام سارے ساتھیوں کے لیے نہیں ہوسکتا تھا، فکر ہے تو اپنی نمازوں کی جو ہاف پینٹ اور کھلے ہوئے گھٹنے سے ادا ہورہی تھی، مطالبہ کرتے ہیں تو صرف یہ کہ میرے اور ساتھیوں کے پینٹ میں اتنا کپڑا مزید جوڑ دیا جائے، جس سے گھٹنا ڈھک جائے تاکہ نمازیں ستر پوشی کے ساتھ ہوسکیں، یہ تھا شریعت پر عمل کا جذبہ اور تحفظ شریعت کا مزاج۔

۱۹۳۶ میں جداگانہ انتخاب کے اصول پر مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی کی طرف سے کھڑے ہوئے اور جیت کر بہار اسمبلی آئے، ۱۹۳۸ میں جب زرعی انکم ٹیکس لگایا گیا اور اسمبلی میں اوقاف پر ٹیکس لگانے کا مسئلہ زیر غور آیا تو آپ نے پوری جرأت اور بے باکی کے ساتھ اسمبلی میں اس کی مخالفت کی۔نوبت یہاں تک پہنچی کہ مولانا آزادؒ کو اس مسئلے کے حل کے لیے پٹنہ آنا پڑا۔ مولانا نے شریعت کی روشنی میں اپنا موقف مولانا آزادؒ کے سامنے رکھا، یہ گفتگو اتنی مدلل اور موثر

تھی کہ بالآخر اوقاف سرکاری ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیے گئے، حضرت کی یہ تقریر ''اسلامی اوقاف اور محصول'' کے نام سے ۱۹۳۹ میں طبع ہوئی۔ عبد الرحمٰن عثانی کے ذریعے طبع شدہ یہ رسالہ چھوٹے سائز کے انتیس صفحات پر مشتمل ہے یہ تقریر ''خطبات امیر شریعت'' مرتبہ زین العابدین ایم اے میں بھی ہے۔

اسی دور میں اوقاف بل پیش ہوا۔ مولانا نے بل پر شرعی موقف واضح کیا۔ ۱۹۳۹ میں بہار اسمبلی میں ڈاوری (Dowry) بل پیش ہوا، جس میں مہر اور جہیز کو جرم قرار دیا گیا تھا۔ مولانا نے اس بل کے مضمرات پر روشنی ڈالی اور اسلامی نقطہ نظر پر مدلل خطاب فرمایا۔ جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ کیا گیا۔

۱۹۴۲ میں مولانا کو یہ فکر پریشان کرتی رہی کہ بہار میں تحفظ شریعت اور تعلیم دین کے لیے ایک بڑے ادارے کی ضرورت ہے۔ جامعہ رحمانی مونگیر ۱۹۲۷ سے ۱۹۳۴ تک چل کر بند ہو گیا تھا۔ چناں چہ آپ نے نئی نسل کو اس لائن پر تیار کرنے کے لیے ۱۹۴۲ میں جامعہ کو دوبارہ وجود بخشا، اور اس سے صیانت دین کے لیے رجال کار کی تیاری اور فراہمی کا کام لیا، اس اعتبار سے یہ منفرد ادارہ تھا کہ یہاں طلبہ کی تربیت تو ہوتی ہی تھی، مختلف میدان کے لیے افراد تیار کیے جاتے تھے، یہ افراد معلمین بھی ہوتے تھے اور حضرت کے مریدین و متوسلین بھی اور بیسویں صدی کے آخری ربع میں جن لوگوں نے ملت کی قیادت کی اور تحفظ شریعت کی تحریک میں مولانا کے دست و بازو بنے، ان میں کئی نامور وہ ہیں جن کی مولانا نے ہی خصوصی تربیت کی تھی، پھر تربیت کا نظام بھی ایسا جسے دیکھ کر ''در مدرسہ خانقاہ دیدم'' کا مصداق سمجھ میں آئے۔ ان کی نگاہ کیمیا اثر نے کتنوں کو کام کا آدمی بنا دیا۔

۱۹۴۲ میں مولانا لطف اللہ صاحب کے انتقال کے بعد خانقاہ رحمانی کے سجادہ نشیں ہوئے، خانقاہ کا لفظ ظاہری اعتبار سے اپنی معنویت کھو چکا تھا، اور اس کا مطلب چادر پوشی، نیاز، فاتحہ، عرس، قوالی وغیرہ سمجھا جاتا تھا، شرک و بدعات کا اس قدر شیوع، خانقاہوں کے شیوخ کے توسط سے ہو رہا تھا کہ لوگ اس کے بارے میں بدگمانی میں مبتلا ہو گئے تھے اور ایک اہل علم نے

مروجہ تصوف کو "چنیا بیگم" تک لکھ دیا تھا، مولانا نے خانقاہ رحمانی کو چادر پوشی، عرس، قوالی، محفل سماع اور دیگر مروجہ بدعات سے پاک رکھا۔ جامعہ رحمانی نے اگر تعلیم و تربیت کے ذریعہ تحفظ شریعت کا کام کیا تو خانقاہ نے تصوف کے ذریعے اسلامی قدروں کے فروغ کا کارنامہ انجام دیا۔

۱۹۵۷ میں جب آپ امیر شریعت رابع منتخب ہوئے تو تحفظ شریعت ہی کے لیے اپنے پہلے فرمان میں توسیع قضا کی اہمیت وضرورت پر زور دیا، اور خانقاہ رحمانی مونگیر میں علمائے کرام کے لئے تربیت قضا کے دو ہفتے رکھے گئے اور اس کے بعد بہار واڑیسہ میں قضا کے نظام کو پھیلایا گیا۔ امارت شرعیہ کے دارالافتاء کو ایسا مضبوط کیا کہ دارالعلوم دیو بند کے بعد امارت کے فتاوے سکۂ رائج الوقت کی طرح چلنے لگے اور آج بھی یہ سلسلہ پوری آب وتاب سے جاری ہے۔

آزاد ہندوستان میں جب سیکولر اور جمہوری حکومت کے ذریعے مسلم پرسنل لا کو کالعدم کرنے اور یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کی سازش کی جانے لگی تو حضرت امیر شریعتؒ نے مسلم پرسنل لا کی حفاظت کے لیے تاریخی جدوجہد کا آغاز کیا۔ ۲۸/جولائی ۱۹۶۳ کو امارت شرعیہ کے زیر اہتمام انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ میں ایک کل جماعتی کانفرنس بلائی، جس کی صدارت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ نے فرمائی، مولانا ابواللیث اصلاحیؒ امیر جماعت اسلامی ہند نے اس کا افتتاح فرمایا۔ حضرت امیر شریعتؒ کی ایک سال کی تگ ودو کے بعد ۱۳، ۱۴/مارچ ۱۹۷۲ء کو دارالعلوم دیو بند میں نمائندہ اجتماع ہوا اور اس کے فیصلہ کی روشنی میں ۲۷، ۲۸/دسمبر ۱۹۷۲ء کو عروس البلاد بمبئی میں وہ تاریخی اجلاس ہوا، جس میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی بنیاد پڑی۔ اپریل ۱۹۷۳ میں حیدرآباد اجلاس میں بورڈ کی باقاعدہ تشکیل ہوئی اور حضرت امیر شریعتؒ جنرل سکریٹری منتخب ہوئے اور تادم واپسیں اس عہدے پر فائز رہے، اس طویل مدت میں ساری کوشش خواہ وہ متبنیٰ بل کی شکل میں ہو یا نفقہ مطلقہ کی شکل میں، مساجد و مقابر کے تحفظ کا مسئلہ ہو یا جبری نس بندی کا، اوقاف کی جائیداد کو ٹیکس سے مستثنیٰ کرانا ہو یا بورڈ کے پلیٹ فارم سے اصلاح معاشرہ کی جدوجہد، مقامات مقدسہ پر منڈلا رہے خطرات اور اندیشے ہوں یا قانون وقف میں اصلاح کی تجویز، لازمی نکاح رجسٹریشن کے خلاف کارروائی ہو یا قانون اسلامی کی تدوین، شاہ بانو کیس کا معاملہ ہو یا بابری مسجد کا تحفظ، ختم

نبوت کی تحریک ہو یا تحفظ دین کی مساعی، سارے امور میں حضرت امیر شریعت رابعؒ، تحفظ شریعت کی تحریک کے ایسے نقیب، میر کارواں اور مرد میداں بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں جن کی مساعی سے ملی تحریکیں ہر محاذ پر کامیاب ہوئیں، اور ہر بار حکومت کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا آپ کی مساعی جمیلہ کے نتیجے میں بورڈ پر مسلمانوں کا اعتماد بحال بھی ہوا اور برقرار بھی رہا، مختلف مکاتبِ فکر کے لوگوں کو لے کر چلنا اور اس شان بان سے چلنا کہ فروعی مسائل پس پشت چلے جائیں یہ انھی کے ناخن تدبیر کا نتیجہ تھا۔ آپ نے پورے جوش سے اپنا موقف ملک کے سامنے رکھا اور اعلان کیا:

''میں اس کے لیے تیار ہوں کہ ہماری گردنیں اڑا دی جائیں، ہمارے سینے چاک کر دیے جائیں، مگر ہمیں یہ برداشت نہیں کہ مسلم پرسنل لا بدل کر ایک غیر اسلامی لا ہم پر لاد دیا جائے ہم اس ملک میں باعزت قوم اور مسلم قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔''

یہ خالی نعرہ اور لفاظی نہیں تھی، بلکہ مولاناؒ نے پوری زندگی اس نعرہ کی عملی تجسیم میں صرف کردی، مولانا حامد الانصاری غازیؒ لکھتے ہیں:

''انھوں نے تحفظ شریعت کی تحریک ایسی بے جگری سے چلائی کہ چند برسوں میں گاؤں دیہات تک یہ تحریک پہنچ گئی، عوام وخواص نے ان کی صلاحیت کا لوہا مان لیا، کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ تحریک عرصہ تک ان کی جیب سے چلتی رہی اور کبھی انھوں نے اس کے اظہار کی ضرورت محسوس نہیں کی۔'' (نقوش وتاثرات: ۱۵)

۱۹۸۵ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جلسہ سیرت النبی ﷺ کی صدارتی تقریر میں شیخ الجامعہ سید ہاشم علی اختر نے وحدت ادیان کی وکالت کی تو حضرت مولانا سے رہا نہ گیا، گو صدارتی تقریر کے بعد اس کا موقع نہیں تھا لیکن مولانا نے کھڑے ہوکر پندرہ منٹ وحدت ادیان کے ابطال پر مدلل تقریر کی۔

حضرت کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح دین کی خدمت کے لیے زبان ہوش مند عطا فرمائی

تھی، اسی طرح تحریری صلاحیتوں سے بھی نوازا تھا، حضرتؒ نے اپنی اس صلاحیت کا بھی استعمال تحفظ شریعت اور دفاع عن الاسلام کے لیے کیا، چند کتابوں کو چھوڑ کر سب کا موضوع یہی ہے اسلامی اوقاف و محصول، کتابت حدیث، مسلم پرسنل لا، نسبت اور ذکر و شغل، متبنی بل ۱۹۷۲- ایک جائزہ، خاندانی منصوبہ بندی، قضا کی شرعی اور تاریخی اہمیت، قانون شریعت کے مصادر اور نئے مسائل کا حل، مذہب، اخلاق اور قانون، مسلم پرسنل لا کا مسئلہ نئے مرحلہ میں، مسلم پرسنل لا بحث و نظر کے چند گوشے، یونیفارم سول کوڈ، فتنۂ قادیانیت اور حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ سب کتابیں اسی جذبہ سے لکھی گئی ہیں۔ ان کتابوں نے علمی سطح پر مسائل کی تفہیم اور غلط افکار و خیالات کی تردید میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ یہ ساری کتابیں پرمغز معلوماتی اور شریعت اسلامی کے موقف کو واضح کرنے والی ہیں۔ اسی وجہ سے علمی ہونے کے باوجود زبان سادہ، صاف، شستہ اور عام فہم استعمال کی گئی ہے۔

حواشی

۱۔ اکثر مقالہ نگاروں نے تاریخ ولادت جمادی الثانی ذکر کی ہے۔ لیکن نقوش و تاثرات میں ''زندگی کا سفر'' کے عنوان کے ذیل میں ۱۲ر جمادی الثانی لکھا ہے، چوں کہ یہ کتاب خانقاہ سے چھپی ہے، اس لیے میں نے اسے ترجیح دی ہے۔

نوٹ از مرتب: نقوش و تاثرات میں سہو کتابت ہے، صحیح تاریخ پیدائش ۹ر جمادی الثانی ہے۔ (کیرانوی)

باب چہارم
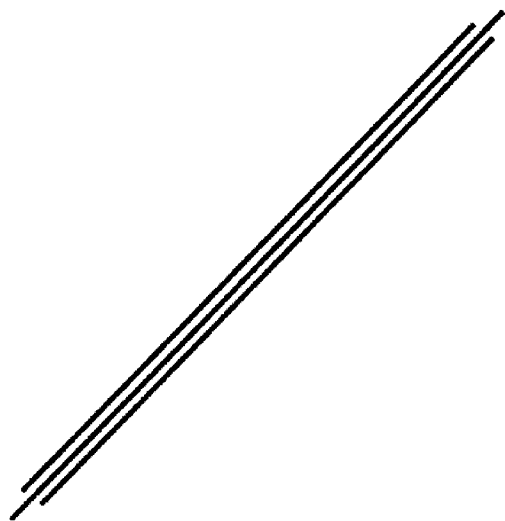
نقوش وتاثرات

مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی ☆

جامع شریعت وطریقت

مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی وفات کو پندرہ سال گزر گئے، مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی وہ زندہ ہیں کیوں کہ ان کے کارنامے زندہ ہیں۔ ان کے لگائے ہوئے باغ تروتازہ ہیں، وہ کب کے جاچکے مگر نظر میں اب تک سمار ہے ہیں "رحل و اراه التراب و ما نسیه کتاب" ان کی سیرت ایک ہشت پہل نگینہ کے مانند ہے، جس کا ہر گوشہ چمک رہا ہے، لو دے رہا ہے، روشنی دکھا رہا ہے، ان کے والد ماجد اویس زمانہ حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے خلیفۂ اجل حضرت مولانا محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء تھے، مولانا سید منت اللہ رحمانی نے اپنے پدر عظیم کی آغوش شفقت میں آنکھ کھولی، دین کا درد اور ملت کا غم ان کے خون میں شامل تھا، دینی حمیت اور اسلامی غیرت ان کو وراثت میں ملی تھی، وہ صرف صوبۂ بہار کے امیر شریعت نہیں، امت کے امیر، صاحب علم وعزیمت تھے، جامع شریعت وطریقت تھے۔ ان کو دیکھنے والے گواہ ہیں۔ ان کو دیکھتے ہی یہ شعر یاد آجایا کرتا تھا:

هِجَانُ الحَيِّ كَالذَّهبِ المُصَفّٰى
صَبِيْحَةَ دِيمةٍ تجنيه جانٍ

(قبیلہ کے شریف زادے ایسے ہیں جیسے صبح کی رم جھم بارش میں خالص سونا چمکے

☆ سابق معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، سابق پروفیسر ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ، سابق مشیر رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ

اور جس کو اٹھانے والا بے تکلف اٹھالے)

مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ ایک قد آور، بلند کردار، اور بلند حوصلہ فرد کا نام ہے۔ جن کے اندر سلف کی صلابت، اہل اللہ کی غیرت، دین حق کی حمیت اور اہل قلوب کی نورانیت جمع تھی، ان کی روح کے لیے جو جسم عطا ہوا وہ جنت کی مٹی سے گوندھا گیا تھا۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے اکتسابی صلاحیت دی تھی اور وہبی نعمت بھی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد عظیم کی آغوش تربیت میں حاصل کی، ان کے بعد فقہ و منطق کی تعلیم مولانا عبدالصمد رحمانیؒ نائب امیر شریعت بہار سے حاصل کی، حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ حضرت مونگیریؒ کے دست گرفتہ، تربیت یافتہ، اور تزکیۂ قلب کی دولت سے آراستہ بزرگ دین تھے۔ وہ صاحب نسبت، صاحب حمیت اور صاحب غیرت عالم دین تھے، مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے نقش قدم پر بلکہ ان کی روح کو اپنے جسم میں سموئے ہوئے بزرگ دین تھے۔

حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کو گیارہ سال کی عمر میں حیدرآباد بھیجا گیا۔ جہاں انھوں نے مشہور عالم دین مولانا مفتی عبداللطیف صاحب رحمانیؒ سابق صدر شعبہ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی سے عربی زبان وادب اور معقولات کی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد چار سال تک دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، زبان وادب میں مہارت پیدا کی، ان کے تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ فطری صلاحیت اور تعلیمی ذوق وشوق کی وجہ سے ہمیشہ درجے میں اول آئے، ندوہ سے عالمیت کرنے کے بعد ہی حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا:

> ''یہی وہ زمانہ تھا کہ پہلی مرتبہ پورے خاندان کے ساتھ (۱۹۲۹ء میں) حج و زیارت کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے، اور حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد خانقاہ رحمانی سے نکلنے والے مشہور ماہنامہ ''الجامعہ'' کی ادارت نہایت خوش اسلوبی اور سلیقہ سے انجام دی، آپ کی تحریری صلاحیت منظر عام پر آئی، علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ نے آپ کی قدر ومنزلت کا اعتراف کیا۔
>
> ۱۹۳۰ء میں علم حدیث کی تکمیل کے لیے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے اور

اس عہد کے باکمال اساتذہ اور محدثین سے علوم دینیہ، معقولات اور احادیث کی تعلیم مکمل کی ـــــ قیام دارالعلوم کے زمانہ میں علمی ترقی اور تقریر وتحریر کی مشق کے لیے طلبۂ صوبہ بہار کی ایک تنظیم ''انجمن اصلاح البیان'' قائم کی، جو آج بھی حلقۂ دارالعلوم میں سجاد لائبریری کے نام سے معروف ہے۔ ایام طالب علمی ہی میں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی قربت اور ان سے جاں نثاری کا تعلق رکھا جس کی وجہ سے آزادی ہند کی تحریک میں آپ نے پر جوش حصہ لیا، طلبہ کے ایک جلوس کے ساتھ دہلی میں گرفتار کر لیے گئے اور ہفتہ بھر دہلی کوتوالی میں رکھے گئے۔ ہندوستان کی جہاد آزادی اور راہِ حق کی یہ پہلی قربانی تھی، آپ کی عزیمت واستقامت اور جرأت وبے باکی کو دیکھتے ہوئے ضلع سہارن پور کی سول نافرمانی تحریک کا آپ کو انچارج بنایا گیا، آپ کی سرگرمیوں سے خوف زدہ ہو کر حکومت نے آپ کو گرفتار کر لیا اور چار ماہ تک سخت سردی کے موسم میں سہارن پور سنٹرل جیل میں قید وبند کی صعوبت سے دوچار ہوئے۔ سنت سجاد آپ نے تازہ کی، قید وبند کی سخت تکلیف میں بھی نماز، روزہ تراویح اور درس حدیث کا سلسلہ اس طرح آپ نے قائم کیا کہ محصور قلعہ میں ایک دینی درس گاہ کی فضا پیدا کر دی۔ ۱۹۳۳ء میں دارالعلوم دیوبند سے آپ نے سند فراغت حاصل کی، تعلیم سے فراغت کے بعد خانقاہ رحمانی مونگیر میں کتابوں کے مطالعہ، درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور افتاء نویسی کے کاموں میں آپ مشغول ہو گئے، ذہانت خدا داد تھی، علمی صلاحیت ٹھوس تھی اور طبعی طور پر آپ کا مزاج بھی علمی اور تحقیقی تھا۔''[۱]

مولانا اپنی عملی زندگی کے ابتدائی دور میں صحافت کے ذریعہ بھی خدمت کی، صوبۂ بہار کی مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی نے ہفت روزہ ''الہلال'' جاری کیا، مولانا اس میں برابر اداریہ اور ملاحظات لکھتے رہے، اور جیسا کہ مولانا نیاز احمد رحمانی کا بیان ہے کہ حضرت امیر شریعت رابعؒ نے انگریزی کی استعداد اچھی پیدا کر لی تھی، انگریزی میں تقریر بھی کی تھی اور انگریزی اخبارات سے

خبریں انتخاب کرلیا کرتے تھے، مولانا نے صحافت کے ساتھ تصنیف وتالیف کا کام بھی کیا۔ فتنہ انکارِحدیث پرایک اہم تصنیف پیش کی۔ اجتماعی کاموں میں آپ کا کارنامہ جو سب سے پہلے منظر عام پر آیا وہ ان تباہ شدہ اور لٹے ہوئے انسانوں کی مدد تھا جو جنوری ۱۹۳۴ء کے زلزلہ میں تباہ ہوئے تھے۔

مولانا کے کارناموں کو بیان کرنے والوں نے محبت وعقیدت کے ساتھ اور تفصیل سے بیان کیا ہے، اور مولانا کا حق تھا کہ ان کے کارنامے پردہ خفا میں نہ رہیں بلکہ دنیا کے سامنے آئیں۔ نوجوان ان سے سبق حاصل کریں اور دینی راہ پر چل کر خدمت خلق کرنے والے اور قومی خدمات کا جذبہ رکھنے والے مولانا منت اللہ رحمانی کے نقش قدم کو نشان راہ سمجھیں اور ان کی روحانیت اور دینی خدمات کو منارۂ نور یادر کریں۔

راقم کے نزدیک حضرت مولانا محمد علی مونگیری قدس اللہ سرہ کی دینی عظمت کا مشاہدہ ان کی اس جدوجہد سے عام مسلمانوں کے سامنے نمایاں ہوئی جب انھوں نے قادیانیت کی اس شرپسند آندھی کا مقابلہ کیا جو وبا اور پلیگ کی طرح مونگیر، بھاگلپور، مظفر پور اور دربھنگہ کے ضلعوں میں پھیل رہا تھا، عوام انگریزوں کی چال کو نہیں سمجھ رہے تھے کہ مسلمانوں کے اندر ایک متنبی (مدعی نبوت) کو کھڑا کرنا ان کی سیاسی مصلحت کا آئینہ دار تھا اور اہل ایمان، اہل دل اور اصحاب معرفت کی زبانی ہم سب نے سنا ہے کہ اگر حضرت مونگیریؒ نے ردقادیانیت کے لیے جدوجہد نہ کی ہوتی تو یہ کئی اضلاع شرک نبوت کی نجاست سے بھر جاتے۔ حضرت مونگیریؒ نے اپنی جان و مال سب کچھ حرمت نبی کریم ﷺ پر قربان کردیا، اور اس وقت تک اطمینان کی سانس نہیں لی جب تک کہ اس فتنہ کو وہاں سے ختم نہیں کرلیا۔ مرحوم مولانا سید محمد الحسنیؒ بانی مجلّہ ''البعث الاسلامی'' نے سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، اور حضرت مونگیریؒ کی کتابوں کے حوالے دیے ہیں اور اس سلسلہ میں مولانا کی تڑپ، دعاؤں کے اہتمام اور عسرت اور تنگی کی حالت میں اپنی یا گھر کی ضروریات کو تج کر کتابیں چھپوانے اور تقسیم کرنے کا تذکرہ کیا ہے، آپ کے جانشیں حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے اسی طرح ہر ایسے فتنہ کا مقابلہ کیا جو دین کے خلاف سازشی

نوعیت کے پیش آتے رہے۔اپنے والد ماجد کے کارنامے کو جاری رکھا، اور شعلہ ایمانی کو سرد نہیں ہونے دیا۔آپ نے فتنہ انکار حدیث پر ایک اہم تصنیف پیش کی، کتابت حدیث کے نام سے اپنی کتاب مرتب فرمائی اور اس فتنہ کو اٹھانے والے کی جہالت، حدیث سے ناواقفیت اور ان کی قیاس آرائیوں کا مسکت جواب دیا۔مولانا ۱۹۴۲ء میں اپنے بڑے بھائی مولانا لطف اللہ رحمانی کی وفات کے بعد صاحب سجادہ بنائے گئے۔جس سجادہ پر آپ نے قدم رکھا وہ ریشم کے دھاگوں اور سنہرے حاشیوں سے مزین نہیں تھا، وہ ایک کانٹوں بھری چادر تھی، جس پر قدم اہل عزیمت ہی رکھ سکتے تھے، وہاں شب و روز کی جفاکشی تھی، ملت کی خبر گیری کے لیے راتوں کو تڑپنا اور رونا اور دن دینی جدوجہد میں صرف کرنا، ان کی راتیں اگر "وتبتل الیه تبتیلا" دکھاتی تھیں تو دن ان کے "ان لك فی النهار سبحا طویلا" کا کرشمہ دکھاتا تھا۔حضرت مونگیریؒ نے جس طرح اپنی آرزوؤں کے مطابق اور دینی علمی صواب دید کے پیش نظر انجمن ندوۃ العلماء کی بنیاد رکھی۔اور اس کے لیے ایک نمونہ کی درس گاہ قائم کی، ان کے صاحب زادہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی نے اپنی خانقاہ کے مدرسہ کو جامعہ رحمانی کا درجہ دیا تاکہ وہ یکسو ہو کر اپنے نقشہ کے مطابق اپنا فرض ادا کریں، جس طرح ان کے والد ماجد نے ایک نمونہ ندوۃ العلماء کے نام سے قائم کیا تھا جو "غرس طاب غارسُها فطابا"[۱] کا مصداق پورے عالم اسلام کا ایک مثالی ادارہ ہے۔درمیان میں ہچکولے بھی پیش آئے، زلزلے بھی آئے، دیواریں گریں بھی اور اٹھیں بھی، مگر نتیجہ کے لحاظ سے بانی کے مبارک ہاتھوں کی ایک یادگار علامت خیر کی حیثیت سے نمو پذیر شجر سایہ دار بن گیا، اسی طرح مولانا منت اللہ رحمانیؒ کا دربار تعمیر کردہ مدرسہ خانقاہ رحمانی کا جز بن گیا، اگر خانقاہ دار العلم والمعرفہ ہے تو مدرسہ دار العمل اور تجربہ گاہ ہے، خانقاہ میں روح کے تزکیہ کا اہتمام ہے اور مدرسہ میں دل و دماغ کو حق تعالیٰ جل شانہ سے وابستہ کرنے کے طریقے بتائے جاتے ہیں۔حضرت مونگیریؒ نے جس کی بنیاد رکھی، اپنی محنت سے حضرت مولانا رحمانیؒ نے اسے جامعہ کی شکل دے دی اور پورے ملک میں اس کی خدمت کا اعتراف ہے۔

حضرت امیر شریعت رابع مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی زندگی کو کچھ اس پہلو سے دیکھئے تو

معلوم ہوتا ہے کہ خدا ترسی عاقبت بینی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے درد کا مداوا تلاش کرنے میں سوائے مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے کوئی دوسرا فرد نظر نہیں آتا، قانون سازی کوئی ان سے پوچھے، پیچیدہ حالات میں شریعت کے احکام کو کوئی ان سے دریافت کرے، مسلمانوں پر جو افتاد آئی اور جن مصائب سے وہ گزرے ہیں، ہر موقع پر جو ہاتھ ان کی مدد کے لیے بڑھے ان میں مولانا منت اللہ رحمانیؒ کا ہاتھ پہلے نظر آیا، مضبوط ہاتھ، ایمان کی طاقت سے بھرے ہوئے بازو صداقت شعاری میں اپنی مثال آپ تھے۔

حضرت امیر شریعتؒ کی زندگی سے متعلق نقوش و تاثرات خانقاہ رحمانی سے شائع ہو چکے ہیں اور امارت شرعیہ بہار جس کے وہ امیر تھے اس نے بھی ایک پانچ سو صفحہ کا رسالہ مرتب کیا ہے، تاثرات کے بیان کرنے میں تکرار نظر آتا ہے لیکن بغیر اس کے چارۂ کار بھی نہیں تھا، اگر چہ یہ دونوں سوانح کی مرتب کتابیں نہیں ہیں لیکن ان کے اندر جو مضامین ہیں انہی کو آگے پیچھے مرتب کر دیا جائے تو ان کی سوانح حیات کا اچھا نمونہ سامنے آ جائے گا۔ راقم نے چند حوالہ جات ان رسالوں سے اخذ کئے ہیں لیکن دراصل جن باتوں نے متاثر کیا اور دل و دماغ نے اعتراف کیا وہ خود اپنے ذاتی تجربات ہیں۔ پھر ان کتابوں نے اور ان پر مشتمل مقالات نے دل و دماغ کی ان اہمیت کو جاگزیں کر دیا۔ مولانا کی جو سوانح لکھی جائے گی ان میں امیر شریعت کی باوقار شخصیت کا ضرور ذکر آئے گا اور ان کی زندگی میں مسلمانوں پر جو افتاد آئی اور جہاں بھی آئی اور جس طرح بھی آئی ہر ایک میں مولانا منت اللہ رحمانی سامنے نظر آتے ہیں۔ مسلم پرسنل لا کے وہ صرف جنرل سکریٹری نہیں بلکہ اس کے بانی، مفکر، اور روح رواں تھے۔ امارت شرعیہ کو جب انھوں نے اپنے ہاتھ میں لیا اس وقت کا سرمایہ شاید دو روپے اور کچھ آنے تھے، اور ۱۹۷۸ء میں مولانا نے اپنی رپورٹ میں بتایا تھا کہ بزرگوں کے چھوڑے ہوئے چند پیسوں میں اللہ نے وہ برکت رکھی تھی کہ آج اٹھارہ لاکھ روپے کے بجٹ سے کام چلایا جا رہا ہے۔ شہر شہر میں دارالقضاء کے دفاتر قائم کیے، اور مختلف گاؤں میں مدرسے قائم کیے۔ فسادات کے موقع پر جمشید پور، راوڑکیلا، بھاگلپور اور اسی طرح کے دوسرے مقامات پر جو مسلم کشی کا بازار گرم کیا گیا اس کی فکر

مندی اوراس کے لیے ہاتھ پیر مارنے اور مصیبت زدہ افراد کی مدد کرنے میں مولانا صرف شریک نہیں رہے بلکہ دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح کا تعاون پیش کرتے رہے۔ پھر خانقاہ میں اپنے اور اپنے والد کے مریدوں کا تزکیہ ان کو ذکر و شغل کی راہ پر لگانا مولانا کا کارنامہ رہا۔ میری ذاتی واقفیت مولانا سے اس وقت ہوئی جب رابطہ عالم اسلامی کا بین الاقوامی جلسہ مکہ میں ہونے جارہا تھا۔ رابطہ کے ذمے داروں نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے رائے طلب کی کہ ہندوستان سے کن لوگوں کو بلایا جائے۔ حضرت مولانا علی میاںؒ کے فرستادہ ہونے کی حیثیت سے راقم نے حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کا نام پیش کیا اور حضرت تشریف لائے، ان کی خدمت میں نے اپنے ذمے لی، ان کے مواصلات کا انتظام، مدینہ منورہ کا قیام سب نیاز مندانہ حیثیت سے راقم کے ذمے رہا، اس موقع پر حضرت کی بے نفسی، تواضع، انکسار اور ہوش مندی اور اصابت رائے کے بہتیرے نمونے نظر سے گزرے، اسی طرح مؤتمر المساجد میں مولانا کو دعوت دی گئی، اور آپ نے شرکت کا حق ادا کیا، جس سے ہندوستانی علماء کا وقار بڑھا، اور بلانے والے بھی خوش ہوئے، میں نے اپنی آنکھوں سے مولانا کا وہ جوش دیکھا جو باوجود معمر ہونے کے صاف نظر آرہا تھا۔ اس عاجز کی قیام گاہ پر حضرت نے قیام فرما کر عزت افزائی کی، اور جب مدینہ منورہ سے واپس آئے اور میرے فلیٹ میں جو تیسری منزل پر تھا ایک بڑا سوٹ کیس اٹھائے ہوئے تشریف لائے، کیوں کہ لفٹ خراب تھی تو اس وقت میں نے کہا: حضرت آپ نے مجھے خبر دے دی ہوتی تو میں خود آجاتا یا میرا کوئی لڑکا کم سے کم اتنی خدمت کرتا کہ آپ کا سوٹ کیس پہنچا دیتا، فرمایا: بار برداری کی مجھے تربیت ملی ہے، دوسروں پر بوجھ ڈالنے کی عادت نہیں ہے۔ اس زمانہ میں میں اپنی تعلیمی کمی کو پورا کرنے کے لیے انگلستان گیا تھا، اور ایک مختصر سفرنامہ بالاقساط ماہنامہ ''المجیب'' پھلواری شریف میں شائع ہورہا تھا۔ مولانا نے ان کاغذات کو دیکھ کر فرمایا: ''اگر آپ چاہیں تو میں ان کو چھپوا دوں ایک مفید چیز ہوگی'' میں نے عرض کیا کہ جو رائے عالی ہو۔ چناں چہ مولانا محمد علاء الدین ندوی استاد جامعہ رحمانی کے مقدمہ کے ساتھ یہ رسالہ چھپا اور حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کی قدر دانی کا نتیجہ تھا کہ ایک بے قدر کو لوگوں نے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا۔ مرحوم و

مغفور مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ نے چند لفظوں میں ایسا تبصرہ کیا جو میرے لیے سند کا حکم رکھتا ہے۔ اس کے بعد مجھے حضرت امیر شریعتؒ کے مہمان بننے کا بھی شرف حاصل ہوا۔ مولانا کا رکھ رکھاؤ علمی حیثیت سے جو تھا وہ اپنی جگہ پر بہت مناسب تھا، اس کے ساتھ خوش دلی اور خوش گفتاری اور ہر ایک کے ساتھ محبت اور کرم نوازی کا سلسلہ بھی قائم تھا۔ اس پر ایک لطیفہ یہ پیش آیا کہ آموں کا موسم تھا، ایک صاحب کو آم سے پرہیز تھا۔ لیکن وہ دستر خوان پر شریک تھے۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ صبح بھی اپنے پرہیز کو توڑ کر کے شریک ہوئے تھے اور اب جو شریک ہوئے ہیں وہ فقہی لحاظ سے صحیح ہے کہ اختلاف مجلس سے احکام بدل جاتے ہیں۔

مولانا سید منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کے مقبول عنداللہ ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ آپ کا انتقال اس وقت ہوا جب تراویح کی نماز میں شریک تھے اور جو آخری لفظ آپ کے کان میں پڑا وہ اللہ کا کلام تھا۔ دل گواہی دیتا ہے کہ جب ان کے جسد اطہر کو لوگ قبر کی طرف لے جا رہے ہوں گے تو زبان حال سے کہہ رہے ہوں گے: یا لیت قومی یعلمون بما غفرلی ربی و جعلنی من المکرمین۔

———— ⊙⊙⊙ ————

حواشی

۱ از: امیر شریعت رابع حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی کی حیات وخدمات، ص ۱۲۰، ۱۲۱

شائع کردہ: امارت شرعیہ بہار واڑیسہ، پھلواری شریف پٹنہ، بہار

۲ ایک پودا ہے جس کو زمین پر اگانے والا اچھا تھا، لہٰذا وہ پودا بھی شاداب ہو گیا (ابوتمام)

ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاریؒ ☆

مولانا سید منت اللہ رحمانی

تھی جس کی فقیری میں بوئے اسداللھی

مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی شخصیت گوناگوں خصائص و امتیازات سے عبارت تھی۔ اتنی مختلف اور متنوع خصوصیات بیک وقت بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء، اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ تمام خصوصیات نہ صرف ان کی ذات کے لیے بلکہ ملک و ملت اور انسانیت عامہ کے لیے مفید اور کارگر تھیں۔

علم و حلم، معاملہ فہمی، ذکاوت حس، دوراندیشی، حسن انتظام، رہنمائی و دیدہ وری ان کی امتیازی خصوصیات تھیں۔ پیر طریقت ہونے کے ساتھ وہ میدان سیاست کے بھی شہ سوار رہے اور ان دونوں متضاد خصوصیات کو اپنی نسل میں بھی انھوں نے بخوبی منتقل کیا۔ روحانیت اور سیاست کا یہ حسین اجتماع اگرچہ نادرالوجود نہیں لیکن قلیل الوجود ضرور ہے۔

مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ الولد سر لأبیہ کے بمصداق اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کے سچے وارث اور معنوی جانشین تھے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ تزکیہ و تربیتِ خلق کا نظام قائم و برقرار رکھا بلکہ اسے مزید روشن و تابناک بنایا اور زیر تربیت افراد میں اس کی روح جاری و ساری کی۔ وہ نہ صرف ایک مردم شناس اور پارکھی قائد تھے بلکہ مردم ساز بھی تھے۔ انھوں نے دین و ملت کی رہنمائی کے لیے جو ٹیم تیار کی اس نے بھی کارہائے نمایاں

☆ سابق امیر جماعت اسلامی ہند

انجام دیے۔ وہ جن اداروں، انجمنوں اور پلیٹ فارموں سے وابستہ رہے اور جن کی سرپرستی ورہنمائی کی، ان کا وقار بلند ہوا اور انھیں قدر و وقعت کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ ان کے دور امارت میں امارت شرعیہ، بہار واڑیسہ نے خاصی ترقی کی۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کا وقار بلند ہوا اور ملکی اور حکومتی سطح پر اس کا وزن محسوس کیا جانے لگا۔

مولانا عہد طالب علمی سے ہی تحریک آزادیٔ وطن کی جدوجہد میں شریک رہے اور اس کے لیے زدوکوب اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ تقسیم سے پہلے وہ بہار کی مجلس قانون ساز کے ممبر بھی رہے۔ اپنی اس حیثیت اور منصب اور اثر ورسوخ کو انھوں نے دین وملت اور ملک وانسانیت کی بہتری کے لیے بھی استعمال کیا۔ اس ضمن میں اوقاف کو ٹیکس سے مستثنیٰ کرانے کی ان کی جدوجہد بطور خاص قابل ذکر ہے جب حکومت بہار نے ریاست میں ۱۹۴۷ء میں زرعی آمدنی کے محصول کے ساتھ اوقاف کی آمدنی پر بھی محصول کا بل پیش کر دیا تھا۔ مولانا اس وقت ہاؤس کے ممبر تھے۔

مولانا منت اللہ رحمانی مرحوم ومغفور کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ الجھے مسائل کی گرہ سلجھاتے، مشکل حالات سے نکلنے کی راہیں نکالتے اور ملت کی رہنمائی کا فریضہ نہایت تدبر اور دانشمندی سے انجام دیتے تھے۔ فی زمانہ یہ بڑی قابل قدر چیز ہے۔

مولانا مرحوم ملت کے خیر خواہ اور ہمدرد تھے۔ جہاں وہ دینی مسائل میں دستگاہ رکھتے تھے اور اسلام کی جزئیات پر ان کی نظر تھی وہیں وہ حالات زمانہ سے ہمیشہ باخبر اور بروقت اس کا نوٹس لینے والے تھے۔ جہاں عہد شباب میں انھوں نے شراب کی دکان پر پکٹنگ کرنے والے جتھے کی قیادت کرتے ہوئے گرفتاری دی، وہیں کہولت کے دور میں ''انسانی برادری'' کے اس بیان پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا جس میں مسٹر جے پرکاش نرائن نے ان سے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لینے اور پاکستانی فوج کی مذمت کرانی چاہی تھی۔

مولانا منت اللہ صاحبؒ مسلمانوں کے بہی خواہ اور ملت کا سچا درد رکھنے والے تھے۔ مسلمانوں کی جہالت اور کم علمی پر رہ رہ کر کڑھتے تھے اور کہتے تھے کہ مسلمانوں کے زیادہ تر مسائل

ان کی جہالت کی وجہ سے ہیں۔

مرحوم صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہنے میں ذرا بھی جھجک نہیں محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء کے ایک سابق کارکن کا بیان ہے کہ جب وہاں سے جاری مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے خلاف فتوؤں کا عوام میں شدید ردعمل ہوا تو انھوں نے شعبہ افتاء کے سربراہ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ کیا ان تمام متعلقہ مسائل کو تحریری صورت میں مولانا مودودیؒ کو بھیج کر ان سے براہ راست جواب حاصل کیا جائے۔ مگر ان کی تجویز قابل اعتنا نہ ٹھہری۔ بالآخر دارالعلوم کی شوریٰ کے اجلاس کے موقع پر مولانا منت اللہ صاحبؒ کے سامنے تنہائی میں وہی تجویز رکھی۔ مولانا نے نہ صرف اس کی تائید کی بلکہ انھوں نے خود ہی اس تجویز کو عملی جامہ پہنا کر اس بحران کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ امارت شرعیہ کی طرف سے جو سوالنامہ مرتب کر کے انھوں نے مولانا مودودیؒ کو بھیجا تھا وہ مولانا کی مشہور کتاب ''رسائل ومسائل'' جلد چہارم کے آخر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

مولانا منت اللہ رحمانیؒ کا ہاتھ ہمیشہ زمانہ کی نبض پر رہا اور وہ ملت کے مختلف اجزاء کو باہم جوڑنے اور ایک دوسرے سے قریب لانے میں اپنا کردار ادا کرتے رہے۔ چنانچہ امارت شرعیہ کی ذمہ داری سنبھالنے کے فوراً بعد انھوں نے ۱۹۵۷ء میں جو پہلا اعلان کیا تھا اس میں اپنے معتمد کارکنوں کو ہدایت فرمائی کہ: ''وہ ایسا طریقہ اختیار کریں کہ مختلف مسلک اور خیال کے ادارے اور اشخاص اس مقصدِ عظیم کی انجام دہی کے لیے امارت شرعیہ کے بارے میں حسن ظن رکھتے ہوئے جب جمع ہوں تو یہاں ان کی انفرادیت پر حملے نہ ہوں گے اور نہ ان کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔''

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے یہ تاثرات کتنے وقیع اور برمحل ہیں کہ: ''علم نافع کے ساتھ علم صالح نے ان کی شخصیت میں وہ خوبی پیدا کر دی تھی جو دوسروں کے دماغ کو مطمئن کرتی اور دلوں میں جگہ بنا لیتی ہے۔ یادِ الٰہی اور نالۂ نیم شبی نے ان کے وجود میں بڑی کشش، ان کے چہرے پر رونق اور طمانیت، لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے احترام واعتبار پیدا کر دیا تھا۔ ان

کے فکر و تدبر، معاملہ فہمی اور وقت کی ضرورت کے صحیح ادراک نے اپنے ہم عصروں میں انھیں ممتاز کر دیا تھا۔ قدرت کے ان عطیات کو انھوں نے بڑے سلیقہ اور محنت سے استعمال کیا۔''

بقول پروفیسر شکیل الرحمٰن قدوائی: ''مولانا منت اللہ رحمانی اندر سے مضطرب و بے چین، مگر متوازن و مرتب آہنگ کی شخصیت، جو علم کی روشنی سے منور، مسلسل عزم و حوصلے کے ساتھ عمل کرتی رہی۔''

مولانا صرف مردم شناسی کے جوہر سے ہی متصف نہیں تھے بلکہ ان کے پیش نظر کام لینا ان کا نمایاں وصف تھا۔

مولانا مرحوم نے اپنے پیچھے اپنے تربیت کردہ کارکنوں کی جو ٹیم چھوڑی اور جو علمی و فکری نقوش ''مکاتیب گیلانی''، ''متبنیٰ بل کی کہانی''، ''سفرنامہ مصر و حجاز'' اور ''فیملی پلاننگ'' کی صورت میں چھوڑے وہ قابل قدر ہیں۔

مولانا کی زندگی تو قابل قدر تھی ہی، ان کی موت بھی کچھ کم قابل رشک نہ تھی۔ ۲۹ر مارچ ۱۹۹۱ء کی شب انھوں نے نماز تراویح کے دوران داعی اجل کو لبیک کہا اور اُس جہاں کا رخ کیا جہاں ہم سب کو ایک دن جانا ہے:

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

⊙⊙⊙

مولانا محمد عبداللہ مغیثی ☆

بیسویں صدی کی تاریخ ساز شخصیت

بیسویں صدی ہجری کے نابغۂ روزگار، مشہور عالم دین، شارح شرع متین، وارثِ نبی امین، شمس العارفین، زبدۃ المصلحین، امام المسترشدین، رئیس المتکلمین، سراج الصالحین، سید الواعظین، یادگارِ اولیاء کاملین ابوالفضل حضرت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی نوراللہ مرقدہ، بہت سنجیدہ، جہاں دیدہ، حامل فہم، صاحب الرائے، ذکی الفواد، بے شمار خوبیوں، صلاحیتوں، رفعتوں اور عظمتوں کے حامل تھے۔

۵/مئی ۱۹۱۲ء کو مونگیر کے ایک اہم علمی خانوادے میں پیدا ہوئے، ہندوستان کی قدآور شخصیت، صاحب نسبت بزرگ، ذاتِ ستودہ صفات، فضائل وکمالات، سیرت واخلاق اور ورع وعفاف کا پیکر، دین وشریعت کا بے نظیر سنگم، نادرۂ روزگار، انیسویں صدی ہجری کے آخری قندیل ربانی، بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، خلیفۂ اول سندانِ عشق اور جام شریعت کا بے مثال نمونہ، شیخ طریقت، ولی کامل، حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے سب سے چھوٹے لخت جگر و چشم و چراغ تھے۔ والد بزرگوار کی خدمت، فیض صحبت اور سایۂ عاطفت ہی میں رہ کر تعلیم وتربیت کے مبارک سفر کا آغاز کیا۔ آگے چل کر ندوۃ العلماء اور دارالعلوم دیوبند سے دینی علوم کی تکمیل کی۔

۱۹۲۹ء میں پہلا حج بیت اللہ فرمایا اور روحانی وتربیتی اصلاح کے لئے والد بزرگوار کے

☆ مہتمم جامعہ گلزار حسینیہ اجراڑہ، میرٹھ (یوپی) صدر آل انڈیا ملی کونسل

ہاتھ پر بیعت کی، عمر نوخیز کے پندرہویں سال ہی سایۂ پدری سے محروم ہونے کے ساتھ اصلاحی و تربیتی سلسلہ بھی منقطع ہوگیا اس لئے اس کی باضابطہ تحصیل حضرت مولانا محمد عارف صاحب ہرسنگھ پوری سے کی۔ پھر اس کی تکمیل اور سلوک و احسان کے اعلیٰ منازل طے کرکے اخلاص و للّٰہیت کی بھٹی میں تپ کر روحانی و احسانی تربیت حاصل کی اور پھر انہیں سے خلعتِ خلافت اور معرفت وطریقت کے اعلیٰ مدارج طے کرکے فائز المرام ہوئے۔

مولانا مرحوم کی ذاتِ والا صفات بہت سے امتیازی کمالات وفضائل کی جامع تھی، مضبوط کردار، شائستگی وشیفتگی کا مجسمہ، صبر واستقلال کی چٹان، عالی، فکر ونظر، علم وحلم، زہد وورع، بصیرت وعزیمت، شرافت ونجابت، اخوت ومروت، عالی دماغی، وضع داری، رواداری، جرأت، خدا شناسی، سادگی، روشن ضمیری اور خوش اخلاقی کا مجسم پیکر ہونے کے ساتھ غیر معمولی عالمانہ بصیرت وفراست میں طاق تھے۔ حضرت مولانا شاہ قمر الدینؒ کے انتقال پُر ملال کے بعد آپ امیر شریعت رابع منتخب ہوئے۔

آپ کی جانفشانی اور کدوکاوش کے نتیجے میں امارت کا دائرہ اس قدر وسیع ہوا کہ بہار سے نکل کر اڑیسہ، کرناٹک، آسام، حیدرآباد، مہاراشٹر اور ملک کے دوسرے صوبوں میں بھی دار القضاء قائم ہوگئے۔ اس طرح ۳۴ سال تک اس منصب جلیلہ پر فائز رہ کر ملت کی ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔

مولانا رحمانی صاحبؒ کی جامع ہمہ جہت، عالی وجاہت اور زاہدانہ شخصیت نہ صرف بہار بلکہ برصغیر ہندوپاک کی نامور ممتاز ترین شخصیتوں میں سے تھی۔ تلوین سے بالاتر تمکین پر فائز، سکر سے پاک، صحو میں راسخ، مخلوق سے بے نیاز، خالق کے نیازمند، غفلت سے دور، یادِ الٰہی میں مسرور اور صفاتِ حمیدہ سے متصف ہونے کے ساتھ اخلاق کی جاذبیت، تقریر کی طاقت، آنکھوں کی مروت، لب ولہجہ کی عذوبت، تبسم کی حلاوت، خاندانی وجاہت اور کردار کی پختگی کے ساتھ ایک ایسے انسان تھے جو کرۂ خاکی پر صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا وجود ہندوستان کا افتخار، ایشیاء کا وقار، عالم انسانیت کا اعتبار، میکدہ علم وعرفاں اور رزم گاہِ عزم وعمل کی آن بان،

انسانیت آدمیت اور اخلاق وکردار کا بلند مینار ہونے کے ساتھ...ع

در کف جام شریعت در کف سندانِ عشق

کا پورا پورا مصداق تھا، اور پھر مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا یہ فرمانا کہ وہ بڑی ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے، خدا نے ان میں اتنی قسم کی صلاحیتیں جمع کردی تھیں کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام میں اتنی مختلف النوع صلاحیتوں کی حامل دوسری شخصیت نظر نہیں آتی، مولانا مرحوم کی عظمت وتقدس، تعقل وتدبر اور ہمہ گیری پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔

مولانا اگر ایک طرف خانقاہ رحمانی کے نگرانِ اعلیٰ وسجادہ نشیں ہو کر بحیثیت شیخ طریقت مسترشدین ومنتسبین کے اصلاح باطن کے لئے روحانی منجھائی میں مصروف تھے تو دوسری طرف قومی، ملی، فلاحی اور سماجی تنظیموں کے ذمے دار ہونے کے ساتھ قوم وملت کے بے لوث خادم بھی تھے، یادِ الٰہی، نالۂ نیم شبی وسحر گاہی، بے نفسی، خورد نوازی نے لوگوں کے دلوں میں آپ کے تعلق سے مزید احترام واعتبار پیدا کر دیا تھا، ان کے حکیمانہ انداز، فکر وتدبر، معاملہ فہمی اور وقت کی ضرورت وحالات کے صحیح ادراک نے اپنے ہم عصروں میں انھیں ممتاز بنا دیا تھا، قوم نے ان کی خدماتِ جلیلہ کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی دیانت داری، بے غرضی، حقیقت پسندی، بے لچک اصول پرستی اور حق وانصاف کی بے دریغ حمایت پر اپنے مکمل اعتماد واعتبار کا اظہار کیا۔

مولانا مرحوم نے خانقاہ اور جامعہ رحمانی کے حسن انتظام واستحکام، اہتمام وانصرام اور فروغ کے لئے اپنی زندگی میں بعض ایسے انقلابی تاریخی فیصلے کئے جن سے مولانا مرحوم کے حسن تدبر اور دور بینی کا ثبوت ملتا ہے جس میں امارت شرعیہ کی نشاۃِ ثانیہ اور مین روڈ پر امارت شرعیہ کے شاندار وسیع دفتر کی تعمیر اور پھر اس کے زیر اہتمام شفاخانہ کا قیام، مولانا سجاد اسپتال، انسٹی ٹیوٹ اور ٹیکنیکل سینٹر کی پرشکوہ عمارتیں شامل ہیں۔

مولانا رحمانی نور اللہ مرقدہ اپنے وقت کے کہنہ مشق قلم کار، ادیب وانشاء پرداز کی حیثیت سے اہل علم ودانش میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے، مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی کے ترجمان ہفت روزہ

''الہلال'' پٹنہ کے ادارتی فرائض نہایت بہ حسن وخوبی ادا کیے اور صحافتی تقاضوں کے پیش نظر انگریزی زبان وادب کا مطالعہ کر کے علمی، ادبی، تاریخی، ثقافتی، معاشرتی اور بین الاقوامی مسائل کے تعلق سے اپنے قلم کے جوہر دکھائے، بڑی تعداد میں جامع مضامین اور علمی تحریریں سپرد قلم کیں اور پھر شرعی مسائل پر مختلف کتابچے تحریر فرمائے، مکاتیب گیلانی کا بڑی عرق ریزی انتہائی بالغ نظری اور اعلیٰ حوصلگی کے ساتھ ترتیب وتدوین کا کام انجام دینے کے ساتھ، کتابوں کے حواشی آپ کے ذوق تحقیق کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کی مستقل متعدد معرکۃ الآراء تصانیف ہیں جو طبقۂ علماء میں مقبولیت حاصل کر کے مراجع کی حیثیت حاصل کر چکی ہیں۔ خطبات امیر شریعت، اسلامی قانون، تعلیمی ہند، ہندوستان کی صنعت وتجارت، قضاء کی شرعی اور تاریخی اہمیت، کتابت حدیث، اسلامی اوقاف اور محصول، سفر مصر وحجاز، نسبت اور ذکر وشغل، حج کے روحانی اخلاقی اور اجتماعی اثرات، حج مبرور اور زیارت مقبول، قانون شریعت کے مصادر اور نئے مسائل کا حل، مسلم پرسنل لا بحث ونظر کے چند گوشے، یونیفارم سول کوڈ، خاندانی منصوبہ بندی، نکاح وطلاق، فتنہ قادیانیت اور حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، مدارس اسلامیہ عربیہ کے لئے نصاب جدید وغیرہ، کتابیں اور کتابچے آپ کی علمی ادبی، ثقافتی اور صحافتی کردار کی عظیم یادگار ہیں۔

دینی مدارس کی تنظیم جدید اور نصاب میں اصلاحی وافادی کوششوں سے روایتی دینی تعلیم میں نمایاں اور مفید تر تبدیلیاں رونما ہوئیں، جس کا سب سے پہلا تجربہ جامعہ رحمانی مونگیر میں کیا گیا اور پھر دارالعلوم دیوبند میں تعلیم وتدریس کے لئے کتاب بندی کی جگہ درجہ بندی کرانے کے ساتھ پورے نصاب پر نظر ثانی بھی کرائی اور پھر اس جہاں دیدہ تجربہ کار مرد مجاہد اور درویش صفت انسان نے جس کے سینہ میں فولاد کا دل اور عزم وارادہ کا ہمالیہ چھپا ہوا تھا، اخلاص وعمل کی غیر معمولی قوت وصلاحیت سے مونگیر کو عالمی مرکزیت اور خانقاہ کو مرجع خلائق بنا دیا، جس کے مسلسل ۴۹ سال تک سجادہ نشیں رہ کر ارشاد ویقین اور بیعت وتربیت سے ایک دنیا کو سیراب کیا اور بہ قول پروفیسر یونس حسین:

''ان کے ہاتھ پر ۱۶ لاکھ لوگوں نے توبہ کی اور بیعت ہوئے اور کسٹوڈین

سے زمین خرید کر اس پر جامعہ رحمانی کی چار منزلہ عمارت تعمیر کرائی۔"

حضرتؒ خود فرماتے ہیں:

"جامعہ رحمانی میری زندگی کی اہم پونجی ہے، تعلیمات نبوی اور اشاعت دین کا اہم مرکز ہے، میں خدا کے حضور میں اپنے اعمالِ صالحہ میں جامعہ رحمانی ہی کو پیش کروں گا۔"

اسی طرح امارتِ شرعیہ جس میں مسلمانوں کے باہمی معاملات، لین دین، شادی بیاہ، نکاح وطلاق اور وراثت جیسے اہم مسائل نہایت امانت داری، دیانت داری، غیر جانب داری کے ساتھ قرآن وحدیث کی روشنی میں نہایت توضیح وتنقیح اور تحقیق وتفتیش کے بعد طے ہوتے ہیں، امارت کا دارالقضاء کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ خانقاہ رحمانی اور فقہ اسلامی کی تدوین اور "اسلامی قانون" کی ترتیب جدید جہاں ایک طرف بہت اہمیت کی حامل ہیں وہیں ایک بڑا کارنامہ مولانا کی نباضی، مردم شناسی اور پتھروں کو تراش کر موتی بنانے کی خداداد صلاحیت بھی ہے۔ آپ نے لوگوں کو اپنے آغوش تربیت اور نگرانی میں رکھ کر محققین، مصنفین، مدرسین، واعظین کی ایک ایسی مضبوط ٹیم تیار کی جو ملک کے مختلف میدانِ کار میں اپنی حسن کارکردگی کا جوہر منوا کر عوام وخواص سے دادِ تحسین حاصل کر رہی ہے۔

مولانا مرحوم کی ہمہ جہت وہم آہنگ شخصیت کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک اہم پہلو عوامی رابطہ کا ہے، جس کا تعلق رقیہ اور تعویذ سے ہے، فن تعویذ میں آپ کو بڑا ملکہ اور خاص مہارت حاصل تھی اور آپ کو اس سے پوری دلچسپی بھی تھی۔ اپنی حاجت براری کے لئے آستانہ خانقاہ رحمانی میں مہمانوں کے ہمہ وقت ہجوم کے ساتھ واردین وصادرین کا تانتا بندھا رہتا، جن میں مسلم وغیر مسلم دونوں ہوتے۔ حضرت ہر شخص کو تعویذ ودعا دیتے اور اللہ تعالیٰ اپنے کلام کی برکت سے ان کی مراد پوری فرماتے۔

مولانا کے اخلاق حسنہ، کردار شریفانہ اور مزاج عاجزانہ ومنکسرانہ کے باعث ہر آنے والا بلا جھجک خدمتِ عالیہ میں حاضر ہو کر اپنے اندر یہ احساس اجاگر پاتا:

ہجوم اس قدر کیوں ہے شراب خانہ میں
فقط یہ بات کہ پیر مغاں ہے مردِ خلیق

اور یہ بھی حقیقتِ واقعہ ہے کہ عظمت، مقبولیت، رفعت اور بزرگی نہ منصب و مقام سے ملتی ہے نہ مال وزر کے افراط و انبار سے۔ نہ ہٹو بچو کی صدائے بے ہنگام اور رکھ رکھاؤ مظاہر سے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی یہ ایک خاص رحمت ورافت اور نعمت کبریٰ ہوتی ہے جو اللہ کی راہ میں چلنے والوں کو نصیب ہوتی ہے، مولانا مرحوم نے اسی کے نتیجے میں ہر محاذ پر اپنی قوتِ ایمانی، جذبۂ جاں فروشی، ہوش مندی، بیدار مغزی، اور مجاہدانہ عزم و حوصلہ کا ثبوت دیا ہے اور اسلام کو وحدتِ انسانیت کے داعی کی حیثیت سے پیش کرنے میں بڑی عالمانہ بصیرت، فہم و فراست، اور وسیع النظری کا ثبوت پیش فرمایا۔ ان کے فکر میں گیرائی، گہرائی اور متانت و سنجیدگی مکمل طور پر موجود تھی، حالات کے تجزیہ میں غیر معمولی حقیقت پسندی سے کام لیتے جب کہ راہِ عمل تجویز و طے کرنے میں عجلت یا ناعاقبت اندیشی کا دامن کبھی نہ تھامتے۔ ان کا ذہنی فکری محور یہی تھا کہ مسلمان جس انتشار و افتراق، زوال و پستی، گروہی عصبیت اور پراگندگی کے دلدل میں دھنستا جارہا ہے، تعلیمی، سیاسی، سماجی اور فلاحی پسماندگی کے گرداب میں پھنستا جارہا ہے، ان سے کلیۃً نجات ملے۔ اس کا قومی ملی امتیاز و تشخص باقی رہے وہ اپنے عقیدہ اور مذہب پر مضبوطی سے قائم رہ کر دستور و آئین میں دیے گئے حقوق کی روشنی میں باعزت زندگی گزار سکے۔

مولانا کو پوری طرح احساس تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو متحد کرنا امر لابدی ہے، چونکہ آپ کے مشن کا بنیادی مقصد اتحادِ اسلامی تھا اس لئے آپ نے مسلمانوں کو فروعی مسائل کو نظر انداز کر کے اتحاد باہمی کی دعوت دی، صحیح پلاننگ قیادت و سیادت اور بروقت اقدام کی صلاحیت آپ میں مکمل طور پر موجود تھی جو استادِ محترم حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی عملی زندگی سے ورثہ میں ملی تھی۔ استاذ محترم کے نظریات وافکار سے مکمل طور پر متفق ہونے کے ساتھ وہ ان سے والہانہ عاشقانہ اور عقیدت مندانہ تعلق رکھتے تھے، حضرت شیخ الاسلامؒ کے ارشد تلامذہ اور

محبوب خدام میں سے تھے۔ استاذ محترم کی رضا و خوش نودی کے لئے سب کچھ نثار کر دینے پر فرحت و انبساط محسوس کرتے تھے۔

ملک کی آزادی کی جدو جہد میں جب شیخ الاسلامؒ ۱۹۳۲ء میں گرفتار کر کے سہارن پور جیل بھیج دیئے گئے تو حضرت امیر شریعتؒ جو ابھی طالب علم ہی تھے استاذِ محترم کی محبت اور وطن عزیز کی آزادی کی خاطر برطانوی جبر و استبداد کے مقابلہ میں سراپا جدو جہد بن کر سہارن پور جیل میں دس ماہ تک قید و بند کی صعوبتیں اٹھا کر جیل کو اپنے یوسفی کردار کی جولانگاہ بنا دیا۔

برادر بزرگ حضرت مولانا شاہ لطف اللہ صاحبؒ جب جیل میں ملاقات کے لئے گئے اور حضرت امیر شریعتؒ کو ہاف پینٹ اور آدھے آستین کی قمیص میں قیدی کی حیثیت سے ملبوس دیکھا اور روزانہ پانچ سیر گیہوں پیسنے کے لئے چکی چلانے کی خبر سنی تو ان کی آنکھیں اشک بار ہوگئیں، حضرت امیر شریعتؒ کی اس گرفتاری سے ہی ان کی سیاسی، سماجی، فلاحی، ملی اور ملکی زندگی کا آغاز دار و رسن کی پیغمبرانہ سنت سے ہوا، جس کے لئے غیر معمولی قربانیاں پیش کیں، ملکی سطح پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کورٹ کے ممبر رہے اور یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی تحریک کے سلسلے میں لکھنؤ، علی گڑھ اور دہلی وغیرہ کے بار بار اسفار کئے اور تحریک کا بھرپور ساتھ دیا، جس کے لئے عام جلسوں میں شریک ہوئے اور خاص میٹنگوں میں شرکت اور ذہن سازی کر کے رائے عامہ ہموار کی اور تحریک کو ہر ممکن مدد پہنچائی۔ جب کہ مسلم مجلس مشاورت کے بانی کی حیثیت سے اس کی خدمات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

تبحر علمی، ہمہ دانی، زیرکی، حلم و سنجیدگی اور جامع شخصیت ہونے کی بنا پر ۱۹۵۵ء میں وہ ایشیاء کی عظیم دینی درسگاہ دارالعلوم دیو بند کی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب کئے گئے اور ساری عمر ہر حال میں دارالعلوم دیو بند کے خیر خواہ رہے۔ اسی لئے دارالعلوم دیو بند کے زیر سایہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام میں ان کی مساعی جمیلہ کا زبردست حصہ ہے۔

۱۹۷۳ء میں ان کو بین الاقوامی مؤقر علماء کی موجودگی میں اتفاق رائے سے بورڈ کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا اور مسلسل ۱۸؍ سال تک اس منصب جلیلہ پر فائز رہ کر اس کو فعال و

متحرک بنانے میں ان کا بڑا رول رہا۔ مزید استحکام کے لئے انھوں نے عملی سرگرمیاں شروع کیں، جس کے نتیجے میں چاہے وہ ۱۹۷۵ء میں نس بندی کے خلاف احتجاج ہو، یا اوقاف کی آراضی کو اکوائر کرنے کے خلاف مہم ہو، یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کا بار بار مطالبہ ہو، یا ۱۹۷۲ء تا ۱۹۸۰ء کا متبنیٰ بل ہو، یا ۱۹۸۵ء میں شاہ بانو کیس ہو، انھوں نے ہمیشہ حق گوئی، بے باکی، جرأت و ہمت کے ساتھ اپنے عالمانہ اور مجتہدانہ حق کو ادا کیا۔ مصلحت اندیشی اور حکومت کی خوشنودی کی خاطر کبھی حقیقت سے چشم پوشی اور مداہنت سے کام نہیں لیا بلکہ خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف جب کہ اچھے اچھوں کے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ قلمی جہاد کی غیر معمولی قربانیوں کے ساتھ زبانی جہاد کی عظیم قربانیاں دیں اور بہ قول حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا قدس سرہ، کہ علمائے ہند میں تنہا امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب "فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس کے خلاف قد آدم پوسٹر چھپوا کر (نس بندی حرام ہے) پورے ملک میں نہایت جسارت کے ساتھ تقسیم کرایا اور پوری طاقت کے ساتھ نس بندی کے خلاف آواز اٹھائی۔ مسلم پرسنل لا بورڈ اور تحفظ دین کے تعلق سے بڑی نازک تحریک اور پیچیدہ کام ہے۔ ہندوستان کے سیاسی سماجی پس منظر میں ایسی کوئی بھی تحریک فرقہ وارانہ منافرت بڑھانے کا ذریعہ بن سکتی تھی، مگر بورڈ نے ایسا ایجابی طریقہ کار اختیار کیا، جس کے تحت ملی اور مذہبی باتوں کو مثبت انداز سے پیش کیا جا سکا۔ مولانا مرحوم ہی کی دانائی اور ہوش مندی کا کمال تھا۔ اس کے علاوہ دارالقضاء کے ذریعے قاضیوں کی تعلیم و تربیت، ان کی ٹریننگ اور خانقاہ کا روز افزوں اثر و نفوذ یہ سب ان کی مساعیِ جمیلہ کا نتیجہ تھا۔

مولانا مجاہد آزادی اور جمعیۃ علماء ہند کے سرگرم قائد ہونے کے ساتھ ۱۹۳۸ء میں صوبہ بہار کے ایم ایل اے بھی رہے، وہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے۔ اسمبلی میں ان کی تقریریں یادگار ہیں۔ اس طرح ہر موقع پر اپنی قوت ایمانی اور مجاہدانہ عزم و حوصلہ کا ثبوت دیتے رہے، ۱۹۳۷ء میں عبوری کانگریس حکومت کے اوقاف کی آمدنی پر ٹیکس لگانے کے خلاف اسمبلی میں زبردست مدلل تقریر کی جس سے حکومت کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔

۱۹۴۶ء میں پورا بہار منصوبہ بند فساد کی لپیٹ میں آ گیا اور بہار کے مسلمانوں کی بعض

بستیوں کو بالکل ختم کردیا گیا، ان فسادات میں تقریباً چالیس ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ یہ موقع ہو یا ۱۹۴۷ء اور ۱۹۷۹ء میں بھاگل پور جمشید پور، راوڑ کیلا کے فسادات ہوں امیر شریعتؒ نے بلا امتیاز، انسانیت کی بے مثال خدمت انجام دی اور ایسے نازک و بھیانک حالات میں اپنی جان جوکھم میں ڈال کر نہایت دلیری، بہادری اور فراست ایمانی سے مسلمانوں کی بازآبادکاری کا کار نیک انجام دیا۔

۱۹۶۵ء میں رابطۂ عالم اسلامی (مکہ معظمہ) کی دعوت پر مؤتمر عالم اسلامی میں شرکت کی جس میں آپ نے اپنے افکار و خیالات کے گہرے اثرات چھوڑے، کانفرنس سے فراغت کے بعد شام، عراق، اردن، اور لبنان وغیرہ کا بھی دورہ کیا۔

۱۹۶۷ء میں عرب اسرائیل جنگ کے موقع پر فلسطینی مسلمانوں کی امداد کے مسئلہ پر کمر کس کر میدان عمل میں آئے اور اس کے لئے بے مثال قربانی پیش کی جب کہ اس سے پہلے ۱۹۶۴ء میں حکومت مصر کی دعوت پر مؤتمر عالم اسلامی میں شرکت فرمائی۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ اور خود مولانا رحمانی صاحب نوراللہ مرقدہم نے ہندوستان کی نمائندگی فرمائی۔

۱۹۹۰ء میں مسلم پرسنل لا بورڈ نے پہلی مرتبہ بابری مسجد کے مسئلہ پر غور و فکر کے بعد ایک قرارداد منظور کی جس میں واضح الفاظ میں کہا گیا تھا کہ مسجد اپنی جگہ سے منتقل نہیں کی جاسکتی اور پھر مولانا مرحوم ہی کی قیادت و سیادت میں بورڈ کا مؤقر وفد وقت کے وزیراعظم سے ملا۔ وزیر موصوف نے کسی بات پر تلخ لہجہ اختیار کیا اس پر مولانا رحمانی صاحبؒ نے بروقت برجستہ کسی عہدے اور منصب سے مرعوب ہوئے بغیر وزیراعظم کو واجبی اور مسکت جواب دیا۔

وہ بین الملی و بین الاقوامی مسائل سے گہری دلچسپی کے ساتھ عالمی منظرنامے سے پوری طرح باخبر رہتے، عالمی کانفرنسوں، تعلیمی و اصلاحی سوسائٹیوں، علمی سیمیناروں میں شرکت اور پھر اس تعلق سے اختصاص و امتیاز باقی رکھنا مولانا ہی کی خصوصیت تھی۔

مولانا مرحوم بے لوث انسان تھے وہ اسلامی روایات حریت کا پورا پورا پاس رکھتے تھے، انھوں نے مصر کے سیاسی حالات اور جمال عبدالناصر کی شخصیت اور حکومت پر رائے زنی کر کے اپنے

نظریات اور موقف کا صاف اظہار کر دیا کہ وہ اس طرز حکومت کو مستحسن نہیں سمجھتے۔ ظاہر ہے شاہ وقت کو ایسا الٹی میٹم وہی شخص دے سکتا ہے جس کا سینہ ایمانی قوت سے لبریز ہو، جس کے ذہن ودماغ میں سمندر جیسی وسعت ہو اور اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ کا پورا مظہر ہو اسے کسی لومة لائم کی کوئی پروانہ ہو، وہ حکومت وشہنشاہیت کے نشیب وفراز سے واقف ہو کر ارباب اقتدار کی آنکھوں میں آنکھ ڈال کر کلمة حق عند سلطان جائر کا پورا پورا حق ادا کرتا ہو۔

حضرت مولانا ان تمام صفاتِ حمیدہ سے متصف کیوں نہ ہوتے جب کہ وہ استاذ محترم حضرت شیخ الاسلام کے افکار وخیالات ونظریات اور ان کی جہادی واسیری زندگی کے موقف سے نہ صرف واقف تھے بلکہ انھوں نے دنیا کو خود اس کا نمونہ بن کر دکھایا۔ ان کے اخلاص وللّٰہیت، روحانیت، صفاء باطن اور اظہار ولایت کا مظہر ہے کہ تنظیم ابنائے قدیم دار العلوم دیوبند کے زیر اہتمام یہ عظیم تاریخ ساز ''امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی سیمینار'' منعقد ہو رہا ہے، جس میں امیر شریعت کی شخصیت اور افکار وخدمات پر اہل قلم، علم دوست حضرات اپنے قیمتی مضامین ومقالات اور علمی تحریرات کے ذریعے پیش کر رہے ہیں، جس میں بڑی تعداد میں فضلائے دار العلوم کے ساتھ محبین کا مجمع حضرت مولانا مرحوم کی دینی، تعلیمی، اصلاحی، تبلیغی، ملی، سیاسی، سماجی، فلاحی اور تربیتی خدمات کا اعتراف واعتماد کرتے ہوئے انھیں سلامی دے رہا ہے۔ مولانا مرحوم کے افکار واعمال ان کے جانشینوں، مشن کے ساتھیوں اور ملت کے لیے کام کرنے والوں کے لئے صحیح خطوط اور نشانِ راہ فراہم کرتے ہیں۔

مولانا محمد ولی رحمانی صاحب مبارک باد کے بجا طور پر مستحق وحق دار ہیں کہ انھوں نے مولانا مرحوم کے علمی دینی، ملی ورثہ کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ ان کی تمام تحریکات کو مزید ترقی دے کر جانشینی کا حق ادا کر دیا اور خانقاہ کی قدیم مصلحانہ روش وروایت کو نئی زندگی بخشی۔ حق تعالیٰ مولانا مرحوم کے درجات کو بلند فرمائے اور مولانا محمد ولی رحمانی صاحب کو خیر وعافیت کے ساتھ اپنے والد کے چھوڑے ہوئے مشن کو باقی رکھنے اور ترقی دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین

———— ⊙⊙⊙ ————

مولانا احمد علی قاسمیؒ ☆

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

دین میں اہل کمال کی نہیں لیکن بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ اپنے دین کی خدمت اور پوری ملت کی رہ نمائی اور اس کی اصلاح کا کام لے لیتا ہے۔ المیہ یہ ہے جو بزرگ اور برگزیدہ ہستیاں اور علماء و مشائخین اس دارِ فانی سے رخصت ہو رہے ہیں، آنے والی نسل میں ان سے ہونے والے خلا کو پر کرنے کی نہ تو صلاحیت ہے اور نہ دین و ملت کی خدمت کرنے کا ایسا بے لوث جذبہ ہے۔ آج ہمارا معاشرہ اور ہماری ملت ایسے بیش بہا افراد سے خالی ہوتی جارہی ہے۔

ایسی ہی بے مثال اور بیش بہا شخصیت امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب علیہ الرحمہ کی تھی۔ آپ نے دین و شریعت اور مسلمانوں کی جو خدمت کی ہے اس کو ان صفحات میں نہیں سمیٹا جاسکتا۔ آپ نے شریعت کے تحفظ اور مسلم معاشرہ کو لادینیت کی گندگی سے پاک کرنے کے لیے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل کی۔ یہ آپ کا ایک ایسا کارنامہ ہے، جس کو لوگ رہتی دنیا تک فراموش نہیں کرسکیں گے۔ آپ نے بورڈ قائم کر کے حکومتی سطح پر پرسنل لا کے تحفظ کا بندوبست کیا۔ انھوں نے مسلم معاشرہ کی تشکیل کے لیے ملک گیر تحریک چلائی۔ ملک کے عوام و خواص کو اس کی جانب متوجہ کیا۔ ملک کے طول و عرض کا دورہ کیا۔ کتابچے شائع کیے، اخبارات کے ذریعے عوام کو اس بورڈ سے متعارف کرایا۔ اس کی اہمیت کو واضح کیا اور حکومت

☆ سابق نائب صدر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت و نائب صدر تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند

وقت پر یہ واضح کر دیا کہ وہ مسلمانوں کے عائلی قوانین میں مداخلت کرنے کا ارادہ ترک کر دے۔

مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ خانقاہ رحمانی کے پروردہ تھے اپنے والد مولانا محمد علی مونگیریؒ کے صحیح معنوں میں جانشین اور ان کے لگائے ہوئے پودے خانقاہ رحمانی مونگیر کے محافظ تھے۔ خانقاہ رحمانی مونگیر جدوجہد آزادی کا مرکز رہی ہے۔ مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا شوکت علیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، خان عبدالغفار خانؒ جیسے عظیم مجاہدین آزادی کی یہاں بار بار آمد و رفت رہتی تھی اور یہ سارے کے سارے رہنما اس خانقاہ میں بیٹھ کر ملک کی آزادی کی منصوبہ بندی کرتے تھے۔

مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے بذات خود جنگ آزادی میں سرفروشانہ حصہ لیا اور ملک کو آزاد کرانے کے لیے دوبار جیل کی مصیبتیں جھیلیں۔ یہ وہی خانقاہ رحمانی ہے جو اللہ کے بندوں کی ہدایت اور نفع رسانی کا ذریعہ بنی ہوئی ہے۔ اللہ کے لاکھوں بندے اس خانقاہ کی برکت سے سیدھی راہ اختیار کر چکے ہیں۔

امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کو اللہ نے نہ صرف اپنے دین کا علم عطا فرمایا بلکہ آپ کے اندر ایک ایسا دل بھی عنایت فرمایا تھا، جس کے اندر ملت کی تڑپ اور اس کی پریشانیوں کا احساس رہتا تھا۔ آپ مسلم معاشرہ کی اصلاح کے لیے ہمہ وقت فکر مند رہتے تھے۔ آپ کو مسلم معاشرہ میں موجود بے جا رسم ورواج سے بڑی تکلیف تھی۔ معاشرے کی اصلاح کے موضوع پر ایک بار بڑی دردمندی کے ساتھ آپ نے فرمایا تھا:

> ''معاشرہ کی صلاح واصلاح کی فکرمندی امت محمدیہ کا دینی فریضہ ہے، خیر امت ہونے کے ناطے اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ دوسروں کی اصلاح اس کی اولین ذمے داری ہے۔ قرآن وحدیث میں اس کی بار بار تاکید آئی ہے اور ایک صالح معاشرہ کا قیام حضرت محمد ﷺ کا تاریخ ساز کارنامہ ہے۔ معاشرہ کی اصلاح اعتقادی اور عملی دونوں طریقوں سے ہوتی ہے۔
>
> شریعت پر عمل نہ کرکے خود مسلمان قانونِ شریعت کو پامال کر رہے ہیں۔ اس

جہت میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اس خدمت کو ایک ادارہ کے ذریعے تحریک کی شکل دے کر انجام دینا ضروری ہے تا کہ معاشرہ کی اصلاح ہو، غلط رسم ورواج اور غیر شرعی طرز زندگی کا خاتمہ ہو سکے۔ اس کے لیے حکمت عملی تیار کرنا اور اس پر پوری ایمان داری سے عمل کرنا ہم سب کا دینی فریضہ ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ اسلامی اصولوں کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے، چند رسم ورواج ہیں ان کو مسلمانوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ ہمارے یہ اعمال ہمارے لیے نقصان دہ ہیں۔ اس زندگی کے لیے بھی نقصان دہ ہیں اور آنے والی زندگی (آخرت کی زندگی) کے لیے بھی۔ ہمارا اسلام رسم ورواج کی بندشوں میں جکڑا ہوا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ صحیح اسلامی انقلاب لا کر رسم ورواج کی بندشوں کو توڑا جائے۔''

حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کی زندگی اور ان کے کارنامے ہمارے لیے روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حضرت امیر شریعتؒ کی جوہر شناس طبیعت دین کی خدمت میں ہمہ وقت مصروف رہتی۔ آپ نے جامعہ رحمانی کو ایک مثالی درس گاہ کی شکل میں ڈھال دیا۔ آپ کے وقت میں جامعہ رحمانی کا عہد عہد زریں کہلانے کا حق دار ہے۔ حضرت امیر شریعتؒ کی جوہر شناس طبیعت ملک بھر سے لعل و گہر تلاش کر کے لاتی اور جامعہ رحمانی کا نظام تعلیم بلند سے بلند تر ہوتا جاتا۔

حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ اپنے کام کو بڑی سلیقہ مندی سے انجام دیتے تھے۔ مثال کے طور پر جب بھی آپ کسی اہم اجلاس میں تشریف لے جاتے اور ایجنڈے میں کوئی اہم بات ہوتی تو جامعہ رحمانی میں چائے کی مجلس پر اساتذہ کے سامنے پیش کرتے، اس کے سارے پہلوؤں پر گفتگو ہوتی۔ ایسے میں خود امیر شریعتؒ کی رائے پر بھی بحث وتکرار ہو جاتی۔ آپ نہایت عالی ظرفی کے ساتھ سب کچھ سن کر نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کی میٹنگ ہو یا دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا اجلاس۔ آپ کے اندر عزم وحوصلہ کی کمی نہیں تھی آپ نہایت جرأت مندی سے کسی بھی کام کا فیصلہ کرتے۔ اس جرأت مندی کے متعدد واقعات ذہن

میں ہیں، جن میں سے صرف ایک کا ذکر مناسب ہوگا۔

جب امیر شریعت مولانا قمر الدین صاحب کا انتقال ہوگیا تو اس کے بعد ۲۴؍ مارچ ۱۹۵۷ کو سوپول ضلع دربھنگہ میں امیر کے انتخاب کے سلسلے میں ایک اجلاس کا انعقاد ہوا اس اجلاس میں حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی کو اتفاق رائے سے چوتھا امیر شریعت منتخب کیا گیا۔ اس وقت امارت شرعیہ کی کوئی عمارت نہیں تھی، بلکہ خانقاہ مجیبیہ کے چند کمروں میں ہی امارت شرعیہ کے کام انجام دیے جاتے تھے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امارت شرعیہ کا رابطہ حضرت مولانا سجاد صاحبؒ کے بعد ہی سے عوام سے ٹوٹتا سا جا رہا تھا اور اس کا دائرہ محدود سے محدود ہو کر رہ گیا تھا، لیکن جب امارتِ شرعیہ کی باگ ڈور حضرت مولانا شاہ منت اللہ رحمانی صاحبؒ نے سنبھالی تو اس میں دوبارہ جان پڑ گئی۔ اس کے بعد آپ نے امارت شرعیہ کی حفاظت اور اس کے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے جو کارنامہ انجام دیے وہ نقش لافانی کا درجہ رکھتے ہیں۔

علمی و تصنیفی کارنامہ

آپ نے امارت شرعیہ کو تنظیمی طور پر ہی نہیں قائم رکھا بلکہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کے ساتھ ساتھ مختلف موضوعات پر آپ نے تصنیفی کام بھی انجام دیے۔ یہاں مختصر طور پر آپ کی چند تصانیف کا تذکرہ کیا جا رہا ہے:

(۱) اسلامی قانون۔ متعلق مسلم پرسنل لا (۲) مسلم پرسنل لا سے متعلق شرعی قوانین (۳) مسلم پرسنل لا (۴) قانون شریعت کے مصادر اور نئے مسائل کا حل (۵) مذہب اخلاق اور قانون (۶) مسلم پرسنل لا نئے مرحلہ میں (۷) یونیفارم سول کوڈ (۸) مسلم پرسنل لا: بحث و نظر کے چند گوشے (۹) خاندانی منصوبہ بندی (۱۰) متبنیٰ بل ۱۹۷۲، ایک جائزہ (۱۱) نکاح و طلاق (۱۲) تحفظ دین کا منصوبہ (۱۳) مکاتیب گیلانی (۱۴) سفر مصر و حجاز (۱۵) فتنہ قادیانیت اور حضرت مولانا محمد مونگیری علیہ الرحمہ (۱۶) کتابت حدیث (۱۷) نسبت اور ذکر و شغل (۱۸) قضا کی شرعی و تاریخی حیثیت

⊙⊙⊙

مولانا نور عالم خلیل امینی ☆

حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ
بے باک قائد اور عبقری مربی

اگر یہ سچ ہے اور یقیناً ہے کہ توفیق وصلاحیت بندوں میں محض خدا کی طرف سے تقسیم ہوتی ہیں اور یہ کہ باری تعالیٰ ہی وقت کے تقاضے کے مطابق، رجال کار پیدا کرتا ہے، تو یقیناً یہ بھی سچ ہے کہ خدائے قدیر نے حضرت مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کو بیدار مغز اور باتوفیق بنا کر پیدا کیا تھا، تاکہ وہ آفتابِ آزادی کے طلوع سے ہنوز تلاطم ہائے مصیبت میں گھرے ہوئے ہندی مسلمانوں کی کشتی کے چیدہ سعادت مند ناخداؤں میں سے ایک ہوں۔ خدا نے انھیں دو ایسے زبردست اوصاف سے نوازا تھا، جن میں معاصر علما و قائدین میں سے کوئی ان کا شریک نہ تھا۔ یعنی ذہانت اور جرأت، اسی لئے آزاد اور سیکولر ہندوستان میں مذہب وعقیدہ پر عمل پیرا ہونے کی راہ میں درپیش مسائل اور آزمائشیں مولانا منت اللہ رحمانیؒ اور ان جیسے ذہین وجرأت مند علما و قائدین کی موجودگی میں، مسلمانوں کے لئے حوصلہ شکن نہ بن سکیں۔ کیوں کہ اُن علماء وقائدین نے انھیں مسائل ومشکلات سے نمٹنے، اپنے اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے اور ''سیکولر قومی دھارے'' یا ''یکساں شہری قانون'' کی گردن پر لٹکتی ہوئی تلوار سے بچے رہنے کی ہمت دی۔ چناں چہ وہ تمام حوصلہ شکن حالات کے باوجود، خود اِرادی وخود اعتمادی کے ساتھ زندہ رہنے کے جذبے سے سرشار ہیں اور ملی وقومی زندگی کی بے حساب و بے رحم ناہمواریاں، اُن کے صبر وعزیمت کی چٹان

☆ استاذ ادب عربی ورئیس تحریر ''الداعی'' دارالعلوم دیوبند

سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتی رہتی ہیں اوران شاءاللہ آئندہ بھی ہوتی رہیں گی۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے اسٹیج سے ہندی مسلمانوں کے لئے مولانا کی زبردست خدمات ہمیشہ ناقابل فراموش رہیں گی۔ یہ بورڈ ان کی اور دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ (متوفی شوال ۱۴۰۳ھ/ مطابق ۳۱ر دسمبر ۱۹۸۳ء) رحمۃ اللہ علیہما کی تحریک و دعوت پر مبنی ۲۸ر دسمبر ۱۹۷۲ء کو منعقد تاریخ ساز کنونشن میں، زیر عمل آیا تھا۔ اس اجلاس میں ہندوستان کے مختلف مکاتب فکر کے علماء وفضلاء بہت بڑی تعداد میں شریک ہوئے تھے۔

علماء و قائدین نے متفقہ طور پر مولانا منت اللہ رحمانیؒ کو بورڈ کا جنرل سکریٹری اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو صدر منتخب کیا۔ قاری صاحبؒ کی وفات کے بعد حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ (متوفی جمعہ ۲۲ر رمضان ۱۴۲۰ھ/ مطابق ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء) اس کے صدر منتخب ہوئے اور کئی سال تک اس منصب جلیل کی زینت رہے۔

اس بورڈ کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں نے پوری طاقت سے یہ اعلان کر دیا کہ وہ مسلم پرسنل لا بورڈ میں کسی قسم کی دخل اندازی برداشت نہیں کریں گے۔ مسلم پرسنل لا کو بے اثر کرنے والے، ہندوستان کے قانون ساز اداروں کی طرف سے وضع کردہ قوانین پر مسلسل نظر رکھنے کے لئے بورڈ نے باقاعدہ کمیٹی بنائی، جس نے حسن وخوبی سے اپنی ذمے داری ادا کی اور آئندہ بھی اسی جوش وجذبے کے ساتھ ان شاءاللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی سعیِ مسلسل، ان کی بے پناہ بیدار مغزی اور ہوش مندانہ قیادت کے طفیل مسلم پرسنل لا کی حفاظت ہندوستان گیر تحریک بن کر ابھری اور ملک کے طول و عرض اور شہر و دیہات میں مسلمانوں کے اندر اسلامی شعور کی بیداری اور اسلامی زندگی اختیار کرنے اور جاہلی زندگی سے گریز کرنے اور مذہب وعقیدے کی راہ میں پیہم خطرات اور اندیشوں سے باخبر رہنے کا احساس اجاگر کرنے میں، اس تحریک نے قابل ستائش کردار ادا کیا۔ نیز اس نے جدید تعلیم یافتہ طبقے میں جو مغربی تہذیب کا پروردہ اور مغربی ثقافت کا دیوانہ ہے، اسلامی شریعت کی آفاقیت، ابدیت اور ہر جگہ اور ہر زمانے میں قابلِ عمل ہونے کے حوالے سے، اعتماد

بحال کیا اور یہ یقین بھی کہ اسلامی شریعت اتنی جامع، کشادہ اور لچک دار ہے کہ اس کے پاس زندگی کے نت نئے مسائل کا کلی اور اطمینان بخش حل موجود ہے۔

ہندوستانی سپریم کورٹ نے ۱۹۸۵ء میں شاہ بانو کیس کا فیصلہ کرتے ہوئے یہ حکم دیا کہ مسلم مطلقہ کا اُس کے طلاق دہندہ شوہر پر اُس وقت تک نفقہ واجب ہوگا، جب تک مطلقہ شادی نہ کرلے۔ یہ حکم کھلم کھلا اِسلامی شریعت پر حملہ تھا اور دوسری طرف بورڈ کے لئے ایک بڑا چیلنج اور مسلمانوں کی اپنے دین کے سلسلے میں ذکاوتِ حس کا امتحان بھی۔ مولانا رحمانی علیہ الرحمہ اس وقت پوری طاقت وقوت کے ساتھ حرکت میں آ گئے اور ان کا بورڈ پوری طرح سرگرمِ عمل ہوگیا۔ مولاناؒ اِس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر طرح کمر بستہ ہوگئے۔ ہندوستان کے طول وعرض کا سفر کیا، مسلم رائے عامہ کو اِس حکم کے خلاف بیدار اور ہموار کیا اور اس کے پیچھے مسلم پرسنل لا میں دخل اندازی کے لئے کارفرما جذبے سے عوام وخواص کو واقف کرایا۔ بورڈ نے اس سلسلے میں ملک کے مختلف شہروں میں جلسے اور میٹنگیں کیں۔ قائدین نے اس کے خلاف بیانات دیے۔ مولانا رحمانیؒ کی حکمت عملی اور ان کی ذہانت و جرأت، نیز بورڈ کے صدر حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی بھاری بھرکم شخصیت اور بورڈ سے متعلق علما وقائدین کے جہد مسلسل کی وجہ سے حکومت کو مسلمانوں کے اِرادے کے سامنے سپر انداز ہوکر مطلقہ سے متعلق قانون میں مسلم پرسنل لا کی خواہش کے مطابق بل پاس کرنا پڑا۔ یہ بورڈ کا بلکہ مولانا منت اللہ رحمانیؒ کا ایک تاریخی کارنامہ تھا۔

ہندوستان کی سابق وزیر اعلیٰ آنجہانی اندرا گاندھی نے ہندوستان میں ایمرجنسی نافذ کی اور اپنے تیز وطرار بیٹے سنجے گاندھی کے تعاون سے عام باشندوں میں عموماً مسلمانوں میں خصوصاً، جبری نس بندی کا زور شور اور حکومت کی طاقت سے عمل شروع کیا۔ لوگوں کے منہ بند کردیے گئے۔ زبانیں منجمد کردی گئیں، قلم توڑ دیے گئے، پریس اور ذرائع ابلاغ پر سخت قسم کا سنسر عائد کردیا گیا۔ عوام تو عوام خواص کو ڈرا دھمکا کر بھیگی بلی بنا دینے کی کوشش کی گئی، شہریوں پر وہ آہنی گرفت عمل میں لائی گئی کہ اللہ کی پناہ، وطن عزیز کے عزیزوں کو ذلیل کیا گیا، حرمت وعزت کو پامال کیا گیا، ظلم وجور کے آہنی شکنجوں سے ملک کی چیخ نکل پڑی، جبری نس بندی کے خوف سے لوگ بعض دفعہ اپنا گھر

چھوڑ کر جنگلوں، دھان، گیہوں اور گنے کے کھیتوں میں چھپ کر رات گزارنے پر مجبور ہوئے۔
مسلم علماء کو کبھی ترغیب اور کبھی تہدید کے ذریعے رام کرنے کی کوشش کی گئی، مفتیانِ کرام کو نس بندی کے حق میں فتوے دینے پر مجبور کیا گیا اور زعمائے ملت سے زبردستی انٹرویو کر کے، اُن کی گفتگو کو سیاق و سباق سے ہٹا کر ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات میں نشر کیا گیا۔ خلاصہ یہ کہ اُس وقت کلمۂ حق کا اظہار برے سے برے نتائج کو دعوت دینا تھا۔ چناں چہ بہت سے علماء کسی گوشۂ نامعلوم میں خلوت گزیں ہو گئے یا مصیبت کے ٹلنے کے انتظار میں خاموش رہے۔ وہ ایسا وقت تھا جب خلقِ خدا زبانِ حال و زبانِ قال سے کہہ رہی تھی:

مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ

''خدا کی مدد کب آئے گی؟'' اور گویا پوری قوم یہ کہہ رہی تھی:

ناز جس خاکِ وطن پر تھا مجھے آہ، جگر
اُسی جنت پہ، جہنم کا گماں ہوتا ہے

یہاں یہ بھی کہنے دیجیے کہ آخرش یہی واقعات آنجہانی اندرا گاندھی کی حکومت کے اختتام کا باعث بنے اور اس وقت کے انتخابات میں انھیں شکستِ فاش کھانی پڑی، کیوں کہ انھوں نے نوشتۂ دیوار پڑھنے کی کوشش نہیں کی۔

آسودۂ ساحل تو ہے مگر، شاید یہ تجھے معلوم نہیں
ساحل سے بھی موجیں اٹھتی ہیں، خاموش بھی طوفاں ہوتے ہیں

اِن حالات میں مولانا رحمانیؒ آگے بڑھے، کلمۂ حق کے اظہار کا بیڑا اٹھایا، دہلی میں مسلم قائدین کا اجلاس منعقد کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تمام مسلم علماء و زعماء سے پہلے وہ اور اُن کے دست و بازو رفقائے کار دہلی پہنچے۔ دیگر علماء و قائدین یہ معلوم کرنے کے بعد ہی دہلی پہنچنے کی جرأت کر سکے کہ مولانا رحمانیؒ دہلی پہنچ چکے ہیں۔ مسلم قائدین اور مولاناؒ نے جبری نس بندی کے خلاف بیانات دیے، حضرت مولاناؒ نے مستقل رسالہ لکھا، جس میں نس بندی کے متعلق اسلام کا

موقف واضح کیا گیا، ملک کی مختلف زبانوں میں ان کا ترجمہ ہوا اور ملک کے طول وعرض میں انھیں تقسیم کیا گیا۔ شہریوں خصوصاً مسلمانوں میں اِس کامیاب جدوجہد کی وجہ سے اعتماد پیدا ہوا اور حکومت کو اپنے نامۂ اعمال کا جائزہ لینے کی تحریک ہوئی اس سے بڑھ کر یہ کہ لوگوں کے خلاف کہنے سننے کا حوصلہ ہوا ـــــ یہ واقعہ بھی مولانا رحمانیؒ کی مثالی بے باکی کا غماز ہے۔

آزادی کے بعد سے اب تک فسادات کی آتشِ فروزاں میں مسلسل جلنے اور خانماں برباد ہونے والے مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کرنے میں مولانا کا کردار بھی نمایاں رہا ہے۔ وہ حکام سے ملتے، فساد زدہ علاقوں کا دورہ کرتے، اسباب ونتائج پر حکومت کی توجہ مبذول کراتے، مصیبت زدوں کو ہر ممکن مدد پہنچاتے، ان کی اشک شوئی اور دل جوئی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ وہ یہ سب کچھ ایک فوجی کی چستی، چوکیدار کی بیداری، مومن کی احساسِ ذمے داری اور مجاہد فی سبیل اللہ کی قربانی کی روح کے ساتھ کرتے تھے۔

یوپی کی صوبائی حکومت نے بابری مسجد کے گیٹ پر ۱۹۵۲ء سے پڑا ہوا تالا ہندوؤں کے لیے کھول دیا اور بابری مسجد کے منبر ومحراب میں کھلے عام بتوں کی پرستش کی اجازت دے دی اور مسلمانوں پر مسجد کو کلیتاً حرام کر دیا۔ پھر تشدد اور تعصب پسند ہندو جماعتوں نے رتھ یاترا، پد یاترا اور طرح طرح کی یاتراؤں کے ذریعے، ملک کے طول وعرض میں آگ لگا دی۔ فرقہ وارانہ فسادات کی لَو پہلے سے زیادہ تیز کر دی گئی، قریہ قریہ اور شہر شہر مسلمان ہراساں وخوف زدہ کر دیے گئے، زمین مسلمانوں پر اپنی تمام تر کشادگیوں کے باوجود تنگ ہوگئی، خونِ مسلم کو آب سے زیادہ ارزاں بنا دیا گیا، مسلمانوں کی عزت وناموس کو پامال کیا گیا، ظلم وجور کے ایسے مناظر سامنے آئے کہ دیکھنے اور سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میرٹھ، ملیانہ اور بھاگل پور وغیرہ کے فسادات ہندوستانی تاریخِ سیاست وحکومت پر ایک بدنما داغ بن کر ابھرے اور ظلم وبربریت کے ننگے ناچ کے لیے ضرب المثل کے طور پر صحافی، مؤرخ اور عوام کے قلم وزبان پر شب وروز جاری ہوکر تاریخ کا ناقابلِ محو جزو بن گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ملیانہ و بھاگل پور وغیرہ کی داستانِ خوں چکاں قلم بند کرتے ہوئے کس طرح قلم کاروں کے ہاتھ کانپنے لگتے تھے، روح فرسا واقعات

کی حکایت کرتے وقت الفاظ زبانوں پر ٹوٹ پھوٹ جاتے تھے:

اِس رنگ سے اٹھائی، کل اُس نے اسدؔ کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے، غمناک ہوگئے

دوسری طرف اسلام نا آشنا، انگریزی تعلیم یافتہ وہ طبقہ جس کے ساتھ موروثی طور پر ''مسلمان'' کا لفظ چپک گیا ہے اور جو صرف مغربی تہذیب وتمدن کو راہِ سعادت ونجات سمجھتا ہے، علمائے دین پر سکوت وجمود کی تہمت کا علم لے کر کھڑا ہوگیا اور اپنی تحریر وتقریر میں حسب عادت اُن کو زمانہ نا آشنا، تنگ نظر، حالات سے بے خبر وغیرہ کہنے لگا اور ساتھ ہی یہ فتویٰ بھی صادر کرنے لگا کہ مسلمانوں کی جان ومال کی حفاظت کی خاطر بابری مسجد سے دست کش ہوجانا چاہیے۔

اِن حالات میں مولانا منت اللہ رحمانی مرحوم پھر سامنے آئے اور انھوں نے دسمبر ۱۹۹۰ء میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے سایہ تلے مسلم علماء وزعما کو جمع کیا، اِس اجلاس نے حکومت اور مسلم عوام کے نام دو الگ الگ پیغام دیے۔ حکومت کو یاد دلایا گیا کہ:

''اقلیت کی حفاظت کے بغیر ملک کا مستقبل ہر وقت خطرے میں رہے گا اور ملک کا سیکولر وجمہوری کردار لاء اینڈ آرڈر کے ذریعے باقی رہ سکتا ہے۔ قانون کی بالادستی حکومت کا اوّلین فریضہ ہے۔ مسلسل تین سال سے فرقہ پرست ملک کے اطراف واکناف میں اشتعال انگیز تقریروں، تحریروں اور ویڈیو کیسٹ کے ذریعے فرقہ پرستی کو شعلہ زن کررہے ہیں، جس کی وجہ سے مختلف جگہوں پر بدترین فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور ہورہے ہیں۔ ان پر قابو پانا اور روک لگانا حکومت کی ذمے داری ہے۔ مسلمانوں نے اب تک ملک کے مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے صبر کا دامن تھامے رکھا ہے اور انھوں نے تشدد کا جواب تشدد سے دینے سے گریز کیا ہے۔
بورڈ بابری مسجد کے حوالے سے اپنا موقف واضح کردینا چاہتا ہے کہ مسجد اور

مسجد کی جگہ خدا کی ملکیت ہے، لہٰذا اُن میں کسی طرح کی تبدیلی یا اُن کی خرید وفروخت یا کسی جماعت، فرد یا حکومت کو کسی عقدِ صلح کے ذریعے ان کی سپردگی جائز نہیں اور نہ ہی حکومت کو اکوائر کرنے کا حق ہے۔ نا قابل انکار دلائل و دستاویزات سے ثابت ہے کہ بابری مسجد، مسجد ہی ہے اور بابری مسجد کسی غصب شدہ زمین یا کسی مندر کو توڑ کر نہیں بنائی گئی ہے، لہٰذا شرعاً اس کی حیثیت وہی ہے جو کسی مسجد کی ہوا کرتی ہے، اس لیے ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء والی پوزیشن کے ساتھ بابری مسجد کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا جانا چاہیے۔''

مسلمانوں کے نام پیغام میں کہا گیا کہ:

''اس ملک میں مسلمانوں کا وجود کسی حکومت، کسی اکثریت یا کسی فرقہ کا رہین منت نہیں ہے۔ مسلمان محض خدا کے بھروسے پر یہاں جی رہے ہیں۔ وہ خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کے ذریعے ہی آئندہ بھی یہاں رہ سکتے ہیں اور محض خدا کے طفیل سے وہ دین و ایمان پر مضبوطی سے قائم رہنے کے ساتھ ساتھ ان شاء اللہ روشن مستقبل کی طرف محوِ سفر رہیں گے۔''

مسلمانوں سے مزید کہا گیا کہ:

''فسادات کو خود ہوا نہ دیں۔ لیکن ان کی جان و مال اور آبرو پر جب حملہ ہو تو خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنا دفاع کرنے سے ہرگز دریغ نہ کریں۔''

اس موقع سے ایک باوقار وفد کی سربراہی کرتے ہوئے، مولانا رحمانی علیہ الرحمہ نے وزیرِاعظم چندر شیکھر سے ملاقات کر کے بابری مسجد کے تعلق سے، اسلام کا موقف واضح کرنے اور فرقہ وارانہ فسادات کے دہکتے ہوئے شعلوں کو فرو کرنے کے لئے حکومت کی توجہ مبذول کرانے کی سوچی کہ:

دردِ دل لکھوں کب تک، جاؤں ان کو دکھلا دوں
انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا

مولانا نے جب مذکورہ مسائل پر گفتگو شروع کی تو مسٹر چندر شیکھر نے نہایت نامعقول جواب دیا، جو ہندوستان جیسے ملک کے وزیر اعظم کے لئے کسی طرح موزوں نہ تھا۔ انھوں نے کہا: ''ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک کنویں میں بھنگ ڈال دی گئی ہے اور سب اسی کنویں سے پانی پی رہے ہیں۔'' مولانا کہاں چوکنے والے تھے، آپ نے ترکی بترکی جواب دیا:

طنز و تعریض کی آخر کوئی حد ہوتی ہے
آدمی ہوں، مرے منہ میں بھی زباں ہے ساقی

مولانا نے چندر شیکھر صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''خود حکومت نے تو اسی بھنگ کے کنویں سے پانی نہیں پیا ہے۔''

اس جملے کے بعد چندر شیکھر صاحب کو ہوش آیا اور انھوں نے سنجیدہ ماحول میں وفد کی گفتگو سنی:

پہلے تو عرضِ غم پہ، وہ جھنجھلا کے رہ گئے
پھر کچھ سمجھ کے، سوچ کے، شرما کے رہ گئے

ادھر چند سالوں سے موجودہ ہندوستان میں مولانا کی حیثیت ہندی مسلمانوں کے لیے ایک ماہر حکیم کی ہوگئی تھی، جس سے لوگ پیچیدہ اور لاعلاج مرض کے سلسلے میں رجوع کرتے اور اس کی صحیح تشخیص وتجویز سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ نازک ترین وقت میں بھی مسلمانوں کو اس سے ڈھارس بندھتی تھی کہ ہمارے درمیان مولانا رحمانی علیہ الرحمہ جیسے لوگ موجود ہیں، اس لیے ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل خدا کی مدد اور توفیق سے ضرور نکل آئے گا:

زندگی میں آ گیا جب، کوئی وقتِ امتحاں
اُس نے دیکھا ہے جگرؔ، بے اختیارانہ مجھے

امارت شرعیہ بہار واڑیسہ جھارکھنڈ کے اسٹیج سے، جس کے وہ ۳۴ سال امیر رہے، ان کی خدمات ان کے زندہ جاوید کارناموں کے نامۂ اعمال میں روشن ستارے کی طرح چمکتی اور ہمیشہ کے لیے زمانہ کی زباں پر نغمۂ شیریں بن کر گونجتی رہیں گی ــــ اُن کے عہدِ امارت میں

امارتِ شرعیہ نے کما و کیفاً ہر سطح پر ترقی کی، اس کے شعبوں، اداروں اور شاخوں میں وسعت و بہتری آئی اور امارت کو مسلمانوں کی دینی و ملی زندگی کے سنوارنے اور قانونِ شریعت کے مطابق استوار کرنے میں قابل ذکر و شکر کردار ادا کرنے کا موقع ملا۔

اور اب تینوں صوبوں میں مختلف مقامات پر دار القضاء کا قیام عمل میں آیا، قضاۃ سازی اور مفتیانِ کرام کی ٹریننگ کا باقاعدہ نظام قائم ہوا، اس کے لیے باقاعدہ بجٹ کا ایک حصہ مخصوص کیا گیا۔ امارت کے قائم کردہ دار القضاء کی وجہ سے مسلمانوں کو عائلی مسائل میں سیکولر عدلیہ کا سہارا لینے کے عذاب سے نجات حاصل ہوئی۔ امارتِ شرعیہ کا نظام قضاء و افتاء منضبط اور مرتب ہے کہ بعض دفعہ عدالتوں نے پرسنل لا اور عائلی مسائل میں ان سے رجوع کیا۔

بہار و اڑیسہ و جھارکھنڈ میں امارت کی کارگزاری کو دیکھ کر قائدین کی خواہش ہوئی کہ اس کو وسعت دے کر ملک گیر کر دیا جائے۔ اس سمت میں مولانا کے جوشِ عمل کے نتیجے میں پیش رفت بھی ہوئی اور متعدد صوبوں خصوصاً مشرقی اور جنوبی علاقوں میں امارت کے طرز پر کام شروع ہو چکا ہے اور وہاں کے دار القضاء سرگرمی سے اپنی ذمے داری ادا کر رہے ہیں۔

امارت نے بیت المال کے نظام کو بھی وسعت دی اور اسے نہایت درجہ فعال ادارہ بنا دیا۔ سیلاب اور فسادات سے تباہ حال لوگوں کی امداد، بیوہ گان اور یتیموں کی کفالت اور غریب لڑکیوں کی شادی ایسی خدمات میں بیت المال نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، نیز بہار و اڑیسہ میں مختلف مساجد میں ائمہ و مؤذنین کے انتظام اور ان کی تنخواہ کے بندوبست میں اس نے مدد دی۔ نیز تعلیمی و تربیتی اداروں کا قیام عمل میں آیا۔

چند سال قبل امارت کی مرکزی عمارت کی تعمیر زیرِ عمل آئی جو دفاتر، لائبریری، میٹنگ ہال اور ایک پروقار و قابلِ اعتبار فلاحی ہسپتال پر مشتمل ہے۔ عمارت سادہ و پرکار ہے۔ اس عمارت کی تقریبِ سنگ بنیاد (۱۵ر نومبر ۱۹۸۱ء) کے موقع پر حضرت مولاناؒ نے فرمایا تھا "یہ عظیم الشان تعمیری منصوبہ آپ حضرات کے سامنے ہے۔ میں عمر کی اس منزل میں پہنچ چکا ہوں جہاں لوگ نئے منصوبے نہیں بناتے، لیکن خدا کے فضل اور پورے ملک میں پھیلے ہوئے مخلصین پر اعتماد کرتے ہوئے

یہ نیا کام شروع کیا جارہا ہے۔قومی اور ملی کاموں کا انحصار افراد پر نہیں ہوتا۔ میں رہوں یا نہ رہوں، اسے پورا کرنے کی ذمہ داری آپ سبھوں پر ہے اور دو سال میں یہ تعمیری پراجکٹ پورا ہو گیا۔ فالحمدللہ" (از نقوش تاباں: ص۱۱۶) اس کے علاوہ بہت سے منصوبے زیر غور اور بہت سے زیر تنفیذ تھے، ان کے لیے مال اور وسائل کی فراہمی کا کام بھی جاری تھا۔ لیکن ماشاءَ اللّٰہُ کانَ وَ مَالَمْ یَشَأ لَمْ یَکُنْ۔

کسی انسان کی قیمت، اس کے حسب ونسب کی بہ جائے اس کی اپنی لیاقت اور جوہر سے متعین کی جاتی ہے۔ مولانا کی یہ سعادت تھی کہ وہ الحمدللہ دونوں پہلوؤں سے بڑے تھے۔ علم و فضل وتقویٰ میں مولانا کو جو مقام حاصل تھا، وہ محتاج تعارف نہیں۔ دوسری طرف وہ عظیم ترین باپ یعنی بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ (متوفی ۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۷ء) خلیفۂ خاص حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ (متوفی ۱۳۱۳ھ) کے فرزند ارجمند تھے۔ وہ اسی علمی و دینی گھرانہ میں ۹ر جمادی الاخری ۱۳۳۲ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مونگیر وحیدرآباد میں حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے، جہاں وہ چار سال تک زیر تعلیم رہ کر وہاں کے باکمال اساتذہ سے مستفیض ہوئے، ۱۳۴۹ھ میں ایشیا کی عظیم وقدیم ورجال ساز درس گاہ ودانش گاہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔ وہاں انھوں نے صاحب عزیمت مجاہد وشیخ ومحدث مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء) آخری دور میں برصغیر کے جلیل القدر عالم مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ ثم الباکستانی الکراچوی (متوفی ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء) عالم باعمل مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ (متوفی ۱۳۷۴ھ) ماہر معقولات ومنقولات علامہ ابراہیم بلیاویؒ (متوفی ۱۳۸۷ھ) شیخ الادب والفقہ مولانا محمد اعزاز علی امروہویؒ (متوفی ۱۳۷۴ھ) جیسے یگانۂ روزگار علما سے اکتسابِ علم وآگہی۔ دیوبند میں زمانۂ طالب علمی میں انھوں نے جدوجہد آزادیٔ ہند میں حصہ لیا اور سہارن پور میں اس کی وجہ سے گرفتار بھی ہوئے۔ جیل میں بھی رہے۔

۱۹۳۵ء میں جمعیۃ علمائے بہار کے ناظم عمومی منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں ہی ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک پارٹی تشکیل دی اور مولانا کو اس کا ممبر نامزد کیا۔ اسی جماعت کے نمائندے کی حیثیت سے وہ ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء میں بہار قانون ساز اسمبلی کے سہرسہ سے ممبر

چنے گئے۔ ۱۳۶۱ھ میں خانقاہ رحمانی کی سجادہ نشینی کی خلعتِ فاخرہ سے سرفراز ہوئے۔ ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۵ء میں مادرِ علمی دار العلوم دیوبند کی شوریٰ کے ممبر ہوئے اور تا دمِ حیات اس عہدے پر فائز رہے اور دار العلوم کو اپنے قیمتی مشوروں، طویل تجربوں اور روشن افکار و خیالات سے فائدہ پہنچا کر اپنا دامن اجر و سعادت سے بھرتے رہے۔ ۱۳۷۶ھ/ ۱۹۵۷ء میں امارتِ شرعیہ بہار و اڑیسہ کے چوتھے امیر شریعت کا منصب جلیل سپرد کیا گیا۔ امارت شرعیہ کو مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۶ رجون ۱۹۲۱ء میں قائم کیا تھا۔ ۱۹۴۴ میں مولانا نے جامعہ رحمانی کو از سرِ نو زندہ کیا۔ اس کی بنیاد خود حضرت مولانا مونگیریؒ نے اپنے دستِ اقدس سے ۱۹۲۷ء میں رکھی تھی۔ مولانا نے اپنی نتیجہ خیز صلاحیت و ذہانت و مساعی سے اُسے ہندوستان کا ممتاز ادارہ اور بہار کا بڑا مدرسہ بنا دیا تھا۔ ۱۳۸۳ھ/ ۱۹۶۴ء میں انھوں نے قاہرہ میں منعقد ہونے والی اسلامی کانفرنس میں ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندگی کی۔ واپسی پر سفر کی روداد بھی قلم بند کی۔ متعدد عربی اور اسلامی ملکوں میں منعقدہ کانفرنسوں اور مجالسِ علمیہ میں شرکت کی اور ہر جگہ اپنی ذہانت و فراست اور علم و تجربہ کا نقشِ لافانی ثبت کر دیا۔

میں ان سطروں میں مولانا رحمانیؒ کو برصغیر کا سب سے بڑا اور عدیم المثال عالم نہیں کہنا چاہتا، لیکن مجھے یہ کہنے دیجیے کہ مولانا کو قسامِ ازل نے جو صلاحیتیں ودیعت کی تھیں، ان میں اُن کے معاصرین و رفقائے کار علماء میں کوئی ان کا شریک نہ تھا کہ:

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے

خدائے حکیم ہر ایک کو دین و دنیا سے متعلق سرگرمیوں کی ایک الگ توفیق سے نوازتا ہے اور علم و فضل میں سے ہر ایک کا حصہ اپنے انداز سے متعین کرتا ہے۔ از آدم تا ایں دم انسانوں سے متعلق اس کی یہی سنت رہی ہے: وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (خدا کی سنت تبدیل نہیں ہوا کرتی)۔

خدا اُن کو ان کے اعمال کی بہترین جزا دے اور اُنھیں جنت الفردوس کا مکین بنائے۔

———— ⊙⊙⊙ ————

حواشی:

۱ مغربی یوپی میں بکثرت ایسے واقعات ہوئے، بہار کا مسلم اکثریتی علاقہ پورنیہ کمشنری بھی خاص طور پر اس زد پر تھا۔ (کیرانوی)

مولانا محمد اسرار الحق قاسمی ☆

قومی ملکی اور انسانی مسائل کے بارے میں

مولانا رحمانی کا نقطۂ نظر اور طرز عمل

مولانا کی خدمات وشخصیت پر اہل قلم نے بہت تحریریں لکھی ہیں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی زندگی اور ان کی جہد مسلسل کے بے شمار عنوانات ہیں جس کا ہر عنوان وسیع اور بحر بیکراں ہے، مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی نے ہفت روزہ ''الہلال'' جاری کیا تو اخبار کی پالیسی کا نگراں اور منتظم اعلیٰ کی حیثیت سے آپ نے اپنی پوری ذمے داری ادا کی۔ مولانا کے اہم سیاسی بیانات اور اداریے مسلسل شائع ہوتے رہے، جس کی آزادی کی تحریک، آزادی کے لیے ذہن سازی، آزادی کے لیے آگے بڑھ کر قربانی دینے کا جذبہ بیدار ہوتا رہا۔

۱۹۳۴ء میں مولانا نے ہندوستان اور ہندوستانیوں کو انگریزوں کے بنائے ہوئے برطانوی نظام تعلیم، طریقۂ تعلیم نیز اس کے راستہ سے پہنچنے والے نقصانات اور ممکنہ خطرات کی نشان دہی کرتے ہوئے ہندوستان کی جدوجہد آزادی کو جلتی شمع کی لو اور تیز کرنے کے لیے اپنا پہلا رسالہ ''تعلیمی ہند'' شائع کیا، جس سے ہندوستان میں برطانوی استعمار کے لیے اپنے پسند کے مطابق افراد تیار کرنے کی پالیسی پر مولانا نے پہلی بار کھل کر تنقید کی اور تمام نکات سے اسے واضح کیا۔ چار ماہ سہارن پور جیل میں بھی رہے۔

☆ صدر آل انڈیا تعلیمی وملی فاؤنڈیشن، نئی دہلی

جنگ آزادی میں دارالعلوم دیوبند نے اوراس کے طلباء نے جوحصہ لیاوہ تاریخ آزادی ہند کا ایک نمایاں باب ہے،۱۹۳۲ء میں انگریزوں کے خلاف ایجی ٹیشن میں باضابطہ حصہ لیتے ہوئے مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے طلبائے دارالعلوم کے ساتھ دہلی مارچ کیا،جلوس دفتر جمعیۃ علمائے ہند کی جانب نعرے لگاتا ہوا مارچ کررہا تھا کہ چاندنی چوک میں پولیس نے لاٹھی چارج کیا،مولانا منت اللہ رحمانیؒ زخمی ہوئے اور گرفتار کرلیے گئے اور مستقل ایک ہفتہ تک جیل میں رکھے گئے۔

دہلی سے رہا ہوکر سہارن پور میں آزادی کی تحریک چلانے میں پیش پیش رہے۔وہاں نماز جمعہ کے بعد مساجد میں تقریریں کرتے،آزادی کے متوالوں کے ساتھ غیر ملکی شراب کی دکانوں پر جاکر برطانوی حکومت کے خلاف پکٹنگ کرتے اور شراب پینے،خریدنے سے منع کرتے۔پولیس دوڑتی،روکتی،گھیرا ڈالتی،گرفتار کرتی،تحریک مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی قیادت میں جاری تھی کہ وہ گرفتار کرلیے گئے اور جیل میں ڈال دیے گئے،اس وقت کی جیل اور آج کی جیل میں اب بہت فرق ہے۔مولانا کو اس جیل میں ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے کے جرم میں سخت اذیتیں جھیلنی پڑیں۔

آزادی کی لڑائی میں غیر ملکی کپڑوں اور دیگر مصنوعات کو بھی لڑائی کا عنوان بنادیا گیا تھا اوراس سلسلے میں سودیشی تحریک کے تحت ہندوستانی سامان کی قدر و قیمت اور ضرورت کو اجاگر کرنے،آزادی کی لڑائی میں بدیشی سامانوں کے خلاف ذہن بنانے کے لیے ’’ہندوستان کی صنعت وتجارت‘‘ نامی رسالہ مولانا نے تحریر کیا جو ۱۹۳۸ کے آغاز میں شائع ہوا،جسے حکومت نے ضبط کرلیا اور پولیس نے اس کے بے شمار نسخے جگہ جگہ سے اٹھالیے۔

۱۹۳۷ء میں حکومت بہار نے زرعی زمینوں پر ٹیکس لگانے کا ایک قانون بنایا جس میں اوقاف پر ٹیکس کی تجویز بھی شامل کی،اس تجویز کی مخالفت میں مولانا نے اسمبلی کے اجلاس میں زوردار تقریر کی،مولانا آزادؒ نے کانگریس سے کہا کہ وہ مولاناؒ کی بات مان لے۔

مولانا کی اس تقریر کو ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں شریک بہار کے ایک نوجوان

رہنما عبدالرحمٰن عثمانی المعروف بہ السبع عثمانی جو"الہلال" میں بھی تھے اور دفتر الہلال سے آزادی کی تحریک چلانے والوں کو ہر طرح کمک پہنچاتے تھے، نے شائع کرا کر بنگال و بہار میں بڑے پیمانے پر تقسیم کیا اور اس قانون سازی کی تجویز کو برطانوی حکومت کی چال بتایا۔

۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۲ء کا دور جنگ آزادی کی شدت کا دور تھا لڑائی تیز چل رہی تھی، مولانا طالب علمی ہی کے زمانے سے تحریک آزادی میں شریک ہو چکے تھے، اور اپنی سرگرمیوں کی بنا پر ۱۹۳۲ء میں سہارن پور میں گرفتار ہو کر قید بھی کیے گئے تھے۔

آزادی کی تحریک مولانا سجاد علیہ الرحمہ نہایت دانش مندی اور فراست کے ساتھ دہلی میں بھی چلا رہے تھے، وہ بلی ماران کی ایک تاریک گلی میں ایک کرایہ کے مکان میں خاموشی سے بیٹھ کر تحریک کی زمام سنبھالے ہوئے تھے، ان کے قیام کا علم جمعیۃ علماء میں صرف مولانا حفظ الرحمٰنؒ اور قاضی اکرامؒ کو رہتا تھا، مولانا سجادؒ نے مولانا سید محمد میاںؒ کو جامع مسجد دہلی میں تحریک آزادی کی حمایت میں ہر جمعہ کو تقریر کا حکم دیا۔ چناں چہ مولانا مرادآباد سے خاموشی سے آ کر تقریر کرتے اور چپکے سے کسی راستہ واپس ہو جاتے، پولیس گرفتار کرنے کی کوشش کرتی مگر کامیاب نہ ہو پاتی، آخر ایک جمعہ کو تقریر کے بعد گرفتار کر لیے گئے اور حوالات پہنچا دیے گئے۔ وہاں مولانا منت اللہ رحمانیؒ بھی حوالات میں موجود تھے جو پہلے ہی گرفتار کیے جا چکے تھے۔

جنگ آزادی کی تحریک میں حصہ مولانا سجادؒ کی انڈیپنڈنٹ پارٹی میں شرکت، ۱۹۳٦ء میں باقاعدہ الیکشن جیت کر اور اپنے حریف کی ضمانت ضبط کرا کر بہار اسمبلی کی رکنیت کا حصول، ملکی سیاست میں سرگرمی، مولانا آزادؒ مولانا سجادؒ کے ساتھ مل کر ہندوستان کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے سرگرم رول ادا کرنا، اور اس راہ میں آنے والی پریشانیوں، تکلیفوں، قید و بند، صعوبتوں کو برداشت کرنا، استقامت اور صبر و سکون کے ساتھ ملک کی خدمت کے لیے رواں دواں رہنا، یہ مولانا کی سیاسی زندگی کا ایک مستقل عنوان ہے۔

ملکی سیاست کے ساتھ مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ نے غیر ملکی سیاست اور اس کے نشیب و فراز، بین الاقوامی حالات و واقعات، امت مسلمہ کو پہنچنے والے نقصانات پر اپنے رد

عمل کا اظہار اس طرح کیا کہ اس میں تدبر بھی تھا اور فراست بھی، سیاست بھی تھی اور فکر مندی و دانش مندی بھی، توازن بھی تھا اور اعتدال بھی، چناں چہ یہودیت اور یہودی ریاست پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے فرمایا:

''مغربی یورپ کے ممالک میں بہت ظلم اور ناانصافی ہوئی ہے، جرمنی میں تو یہودیوں کی جڑ کھود کر پھینک دی گئی، اس ظلم اور ناانصافی کا بدلہ مغربی یورپ کے ممالک سے لینا چاہیے۔ اور ان کا ملک جرمنی کو قرار دینا چاہیے، یہ بھی سبھی جانتے ہیں کہ اگر امریکہ اور برطانیہ چاہیں تو یہودیوں کو اپنے یہاں آباد کر سکتے ہیں، کناڈا بہت بڑا ملک ہے، اس کی آبادی کے مقابلہ میں اس کا زمینی رقبہ کئی گنا زیادہ ہے۔ وہاں اسرائیل جیسے یہودیوں کے ایک نہیں کئی ملک قائم ہو سکتے ہیں۔ اگر مغربی ممالک یہودیوں کو اپنے یہاں جگہ دینے پر تیار ہو جاتے تو نہ جرمنی کے یہودیوں کو اس قدر پریشانیاں اٹھانا پڑتیں اور نہ فلسطین کا مسئلہ کھڑا ہوتا، لیکن جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ اصل مقصد یہودیوں کو بسانا نہیں تھا بلکہ امریکہ اور برطانیہ کے مفاد کی حفاظت کے لیے فوجی اڈہ قائم کرنا تھا۔''

وہ اسرائیل کی ریشہ دوانیوں اور مظالم پر پوری دنیا سے اپیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس موقع پر دنیا کے امن و انصاف کے طرف داروں اور استعمار پسندی کے مخالفوں کو اپنی ذمے داری پوری کرنی ہوگی، نہیں تو استعمار پسندوں کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی اسرائیل ساری دنیا کے امن و شانتی کو برباد کر کے رکھ دے گا۔''

مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ نے ۱۹٦۷ میں تحفظ فلسطین کانفرنس منعقد کی جس میں حسب ذیل قراردادوں اور تجاویز کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں کی جانب سے ردعمل ظاہر کرتے ہوئے فرمایا:

۱- اسرائیلی جارحیت کا خاتمہ بلا تاخیر کیا جائے اور عربوں کو ان کی زمین اور خطے

واپس کیے جائیں۔

۲۔اسرائیل کو قطعی طور پر حملہ آور قرار دیا جائے اور بحیثیت ایک مجرم کے اس کی مذمت کی جائے۔

۳۔اسرائیل کو عربوں کے نقصانات کی تلافی پر مجبور کیا جائے۔

۴۔اسرائیلی سلطنت کے بنیادی مسئلہ پر اقدام کر کے عربوں کی تشفی کے مطابق اس کا حل نکالا جائے، اس لیے کہ اسرائیل کا وجود ہی غیر آئینی اور غیر جمہوری طور پر عمل میں آیا ہے۔''

سقوط مشرقی پاکستان اور بنگلہ دیش کے قیام پر مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے اندرا گاندھی کو ایک تفصیلی خط لکھا جس کے آخری حصے میں آپ نے فرمایا:

''بنگالی ہوں یا غیر بنگالی سب انسان ہیں اور ان میں سے کسی کے بھی ساتھ ظلم اور قتل و خون ریزی کا معاملہ انسانیت کے لیے شرمناک ہے۔اس لیے میں آپ سے وزیر اعظم ہونے کی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ ایک اچھا انسان ہونے کے ناطے اپیل کرتا ہوں کہ آپ ان مظالم کے خلاف مؤثر کارروائی کریں۔''

بنگلہ دیش کے قیام کے بعد شیخ مجیب الرحمٰن کے نام ایک مکتوب میں مولانا نے تحریر فرمایا:

''...اس ملک میں حالیہ قتل و غارت گری کے واقعات انسانی تاریخ میں ایک زبردست المیہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان المناک واقعات کی بنا پر جو دشمنی اور نفرت پھیل رہی ہے اس کو ہمیشہ کے لیے ختم ہونا چاہیے۔''

''...میں امید کرتا ہوں کہ حالات کی خرابی کا احساس آپ کو بھی اچھی طرح ہوگا اور مجھے اس کی بھی توقع ہے کہ آپ میری اس بات سے متفق ہوں گے کہ موجودہ حالات میں ان لوگوں (بہاری مسلمانوں) کو آپ کی خصوصی اور حفاظتی توجہ کی ضرورت ہے، انتظامیہ کے سربراہ ہونے کے ناطے ان لوگوں کے مسائل کو حل

کرنا قطعی آپ کی ذمے داری ہے۔"

"ہم لوگوں میں سے کچھ لوگوں کو آپ اپنے ملک میں خیر سگالی کے مشن پر جانے دیں تاکہ ہم لوگ حالات کے اعتدال اور معمول پر لانے میں آپ کے ساتھ پوری طرح تعاون کر سکیں، خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کے درمیان جو بنگلہ دیش کے شہری کی حیثیت سے تقسیم ملک کے بعد ہندوستان سے ترک وطن کر کے وہاں اب وہ بس گئے ہیں، مجوزہ وفد ان لوگوں پر مشتمل ہوگا جو انسانیت نوازی اور کھلے ذہن سے سوچنے سمجھنے اور سماجی کاموں میں اپنے آپ کو لگائے رکھنے کے لیے شہرت رکھتے ہیں۔"

عالم اسلام میں پہلی بار تیل کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے اور اسے عرب سیاست میں ایک اہم ترین اسلحہ اور اسٹراٹیجی کی حیثیت میں رکھنے کے عنوان پر اور شاہ فیصل کے اس اقدام کو سراہتے ہوئے فرماتے ہیں:

"شاہ فیصل اس صدی کے سب سے بڑے مدبر تھے، انھوں نے اپنے تدبر و فہم و فراست اور جرأت و حوصلہ مندی سے یورپ و امریکہ کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا، تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا ہے... شاہ فیصل نے تیل کو قومی ملکیت میں لینے کے بعد اسے سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کر کے صورت حال کو یکسر بدل دیا۔ تیل پر پابندی اور قیمتوں میں اضافہ کے بعد یورپ کے ممالک یہ محسوس کرنے لگے کہ ان کی شہ رگ کٹ گئی ہے... شاہ فیصل کی شہادت سے دنیائے اسلام کا نقصان تو ہوا ہی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ دنیا وقت کے بہت بڑے مدبر اور انقلابی سے محروم ہوگئی۔ تاریخ انھیں ایک ہیرو اور قوموں کی تقدیر بدلنے والے لیڈر کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے گی۔"

مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ نے افغانستان پر کمیونسٹ روس کے حملہ پر سخت رد عمل ظاہر کرتے ہوئے فرمایا:

''افغانستان کے مسلم عوام کی مجاہدانہ جدوجہد ایک انسانی اور اسلامی مسئلہ ہے، واقعات نے جو رخ لیا ہے، اس نے افغانستان کو دنیا کے نقشہ پر سوالیہ نشان بنا دیا ہے... ہندوستان کے مسلمانوں نے انسانی حقوق کی حفاظت اور اسلامی اخوت کی بنیاد پر دنیا بھر کے مسلمانوں سے برابر دلچسپی لی ہے اور انھوں نے مختلف زمانے میں عالمی حالات کے پیش نظر اپنی متفقہ رائے ظاہر کردی ہے۔ بڑی بڑی تحریکیں چلائی ہیں، افغانستان کے حالیہ حالات کا مطالبہ ہے کہ کم از کم مسلمانانِ ہند (جو بہت بڑی انسانی طاقت ہے) کی متفقہ رائے دنیا کے سامنے آئے اور دنیا کو یہ معلوم ہو کہ ہندوستان کے کروڑوں انسان افغانستان کے مسئلہ کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔''

اس طرح مولانا ملکی وملی اور بین الاقوامی سیاست میں مسلسل اپنا قائدانہ رول ادا کرتے رہے، عالم اسلام کے سیاسی حالات پر گہری نظر رکھتے رہے اور ہندوستانی مسلمانوں کو بحیثیت امت مسلمہ کے ایک جزء کے برابر خبردار و آگاہ فرماتے رہے کہ انھیں کیا کرنا چاہیے۔

مولانا کے جرأت مندانہ اقدامات کے نمونے بے شمار ہیں۔ ان میں سے دو بہت اہم ہیں:

۱- جب ایمرجنسی کے زمانے میں جبری نس بندی کا سلسلہ شروع ہوا تو مولانا میدان میں آئے اور پورے ہندوستان میں اس کے خلاف بلاخوف آواز بلند کی اور لٹریچر شائع کیا۔

۲- جب بابری مسجد کے ایشو پر ملاقات کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کے باوقار وفد اور ملت کے نمائندوں سے چندر شیکھر نے یہ کہا کہ مسلمانوں نے بھنگ کھالیا ہے تو مولانا نے فوراً جواب دیا لیکن حکومت نے تو بھنگ نہیں پی اسے تو اپنا کام کرنا چاہیے۔

⊙⊙⊙

مولانا اختر امام عادل ☆

ایک عہد ساز شخصیت

حضرت امیر شریعت رابع مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ ایک عہد ساز شخصیت کے مالک تھے۔ وہ جدید ہندوستان کے معماروں میں ہیں۔ اسلامی ہند کے سقوط کے بعد ملت ہندیہ کی گرتی ہوئی دیوار کو جن بزرگوں نے سنبھالا دیا حضرت امیر شریعت کا نام ان میں نمایاں ہے، حضرت امیر کی شخصیت اور ہندوستان کے وسیع افق پر ان کی پھیلی ہوئی خدمات کا بصیرت مندانہ تجزیہ کیا جائے تو ان کی ذات گرامی ملت مرحومہ کے لیے عطیۂ خداوندی معلوم ہوتی ہے۔

انتشار کا دور

وہ جس دور میں پیدا ہوئے وہ انتہائی انتشار کا دور تھا۔ پوری ملت مختلف میدانوں میں ابتری کی شکار تھی، پیش رو بزرگوں نے ملت کی شیرازہ بندی کی جو کوششیں کی تھیں وہ ابھی تکمیل کے مرحلے میں تھیں، ملک وملت بہت سی قانونی مشکلات سے دوچار تھی، بالخصوص عائلی زندگی کے مسائل میں عدم تحفظ اور بے چینی کا شدید احساس پایا جاتا تھا، اس کو حل کرنے کی شدید ضرورت تھی، عہد جدید میں امت کو کن فکری چیلنجوں کا سامنا ہے؟ نئے مسائل وواقعات پر اصول وکلیات کی تطبیق کس طرح کی جائے؟ اور اس کے لیے قانونی تعبیرات اور تطبیقات میں کس درجہ کی بصیرت اور ہوش مندی کی ضرورت ہے؟ یہ سارے سوالات انتہائی اہم تھے جن کا جواب ہر حال

☆ مہتمم جامعہ ربانی منورواشریف ضلع سمستی پور (بہار)

میں ملت کے قائدین کے ذمے تھا۔ غیر اسلامی ملک میں مسلم اقلیت کو امارت شرعیہ کا جو تصور اور نظام (فقہ اسلامی کی روشنی میں) حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے دیا تھا اس کو وسعت دینے اور وسیع تناظر میں پوری بصیرت مندی کے ساتھ برتنے کی ضرورت تھی۔ حضرت مولانا سجادؒ کا یہ نظام امارت اور نظام قضا علمی حلقوں کے لیے گو اجنبی نہیں تھا مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت سے علمی اور فکری حلقے اس سے مانوس نہیں تھے اور اسی لیے غیر اسلامی ہندوستان میں اس سے اتنا استفادہ نہیں کیا جا رہا تھا جتنا کہ اس کا تقاضا تھا اور ملک وملت کو جیسی اس کی ضرورت تھی۔

عالمی رہنما

اس طرح کے نہ معلوم کتنے مسائل تھے جو منہ کھولے کھڑے تھے اور ضرورت تھی کسی ایسے مرد دانا کی جو فکر ودانش کے ساتھ سوز وساز کی لذتوں سے بھی آشنا ہو۔ جس کی شخصیت میں حلم وبردباری کے ساتھ جرأت وشجاعت کا امتزاج ہو جو مردم ساز اور کیمیا گر ہو۔ جو بزدلی کے ساتھ ماحول کے بہاؤ میں بہہ جانے والا نہ ہو بلکہ اپنے عزم وہمت سے موجوں کا رُخ بدل دینے کی صلاحیت رکھتا ہو جو کسی مخصوص ماحول میں ہی مسیحا کی حیثیت نہ رکھتا ہو بلکہ جس کے نفس مسیحائی سے ایک پورا عہد تازہ دم ہو جائے جو چھوٹے چھوٹے ذروں کو چن کر، جوڑ کر آفتاب بنانے کا ہنر جانتا ہو اور حضرت مولانا رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی انھی عناصر سے مرکب تھی اور وہ ان تمام قائدانہ صفات وخصوصیات کے حامل تھے، جن سے ایک عالمی قیادت تیار ہوتی ہے۔

پرتوِ سجاد

بانی امارت شرعیہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے بارے میں کسی صاحب نظر کا قول بہت مشہور ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ مولانا اپنی تمام علمی وعملی صلاحیتوں کے ساتھ ملکی سیاست اور خدمات کے ہر شعبہ کی سربراہی کر سکتے ہیں اگر پورا ملک ان کے حوالے کر دیا جائے تو وہ ایک شاندار عادلانہ حکومت چلا سکتے ہیں۔

میں نے حضرت سجادؒ کا دور نہیں پایا، ان کو کتابوں میں پڑھا اور سمجھا، لیکن اپنے دور میں جب میں نے حضرت مولانا رحمانی علیہ الرحمہ کو دیکھا، اگر چہ وہ میرے علم وشعور کی ناپختگی کا دور تھا اور ابھی میرے فکر واحساس کی سرحدیں طفولیت سے آگے نہیں بڑھ سکی تھیں۔ میرے لاشعور میں رچے بسے مشاہدات سے بعد میں مولانا کی جو تصویر ابھر کر آئی وہ اسی عالمی قائد ورہنما کی تھی جو ارباب نظر کو کبھی حضرت سجادؒ کی شخصیت میں نظر آتی تھی۔

مولانا مرحوم نے حضرت سجادؒ کی صحبت پائی تھی اور آپ کی اخاذ طبیعت نے حضرت سجادؒ کی زندگی سے بہت کچھ کشید کیا تھا، قدرت نے ذہانت وفطانت اور درک واحساس سے حصہ وافر دیا تھا اس نے ان کے اخذ واستفادہ کی راہ آسان کردی اور وہ پرتو سجاد بن گئے۔ جس مجلس میں بیٹھتے، میر کارواں ہوتے۔ آپ کے فیض بے کراں کی مثال موجودہ دور میں نظر نہیں آتی۔

قیادت کا خلا پر کیا

حضرت امیر شریعتؒ نے اپنی صلاحیتوں سے پورے عہد کو متاثر کیا، اور ملی قیادت میں موجود ایک خلا کو محسوس کیا اور اس کو پر کرنے کی کوشش فرمائی۔ مثلاً:

☆ امارت شرعیہ غیر اسلامی ہندوستان میں مسلمانوں کے ملی اتحاد کا سب سے بہتر اور شرعی نمونہ ہے جس کی داغ بیل حضرت سجادؒ نے ڈالی تھی، اور خانقاہ مجیبیہ کے پاکیزہ ماحول سے اس کا آغاز ہوا تھا اور بانی کے فکر وعزم کی بدولت پوری ریاست بلکہ پورے ملک میں اس کی اہمیت محسوس کی جانے لگی تھی۔ مگر ایک طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود یہ خانقاہ کے احاطے میں سمٹی ہوئی تھی اور اس کا سارا دفتری نظام خانقاہ کے دو چھوٹے کمروں تک محدود تھا، حضرت امیر شریعتؒ نے اس کو بال وپر دیے۔ اس کی اپنی مستقل ایک عمارت تعمیر کرائی۔ اس کے دائرہ کار کو وسعت دی۔ نظام قضا میں توسیع ہوئی اور پھر امارت شرعیہ کا وہ خواب پورا ہوا جس کے لیے اس کی تاسیس عمل میں آئی

تھی۔

☆ والد ماجد قطب عالم حضرت مولانا محمد علی مونگیری علیہ الرحمہ نے مونگیر کی سرزمین میں جس علم وعرفاں کی تخم ریزی کی تھی وہ شدت سے سیل بے کراں بن جانے کا منتظر تھا۔ حضرت امیرؒ کے ذریعے اللہ نے یہ کام بھی لیا اور خانقاہ رحمانی کے بطن سے جامعہ رحمانی وجود میں آئی اور دونوں کے حسین امتزاج سے علم وعشق کی وہ نہر سلسبیل جاری ہوئی، جس سے دل ودماغ کی ہزاروں کھیتیاں لہلہانے لگیں اور اس سے کوئی ایک ریاست نہیں بلکہ پورے ملک نے استفادہ کیا۔

☆ برطانوی عہد استعمار میں، ۱۹۳۷ء میں شریعت اپلی کیشن ایکٹ کے ذریعے مسلم پرسنل لا کو جو تحفظ فراہم کیا گیا، اور پھر آزاد ہندوستان میں دستور سازی کے وقت دفعہ ۲۵ اور ۲۹ کے ذریعے جو ثانوی تحفظ ملا، وہ خود اسی دستور کے رہنما اصول دفعہ ۴۴ کی بنا پر غیر محفوظ ہو کر رہ گیا تھا اور یہ ایک دستوری تضاد ہے جو دستور ہند میں مسلم پرسنل لا کے تعلق سے پایا جاتا ہے۔ چناں چہ بعد کے ادوار (مثلاً ۱۹۵۶) میں اسی خلا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بعض عناصر کی طرف سے یکساں سول کوڈ کی تحریک چلائی گئی اور ہندوستان کے تمام شہریوں پر (بشمول مسلمان) اس کو نافذ کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ اس خلا کی طرف سب سے پہلے جن قائدین نے توجہ کی ان میں حضرت امیر شریعتؒ سرفہرست ہیں۔ چناں چہ آپ ہی کی مساعی جمیلہ سے ملک میں امت کا ایک متحدہ پلیٹ فارم تیار ہوا اور بلا امتیاز مذہب وملت علماء، عمائدین ملت مسلم قانون دانوں اور دانشوروں کے اشتراک سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا وجود عمل میں آیا۔ حضرت امیرؒ اس کے تاحیات جنرل سکریٹری رہے اور پرسنل لا بورڈ کی تمام تر سرگرمیوں کا مرکزی دفتر آپ کی زندگی میں مونگیر رہا۔ یہیں سے تمام منصوبے بنتے اور ان کو عملی شکل دینے کی تجاویز مرتب ہوتی تھی۔ ہر طرح کی آئینی جنگ یہیں سے شروع ہوئی اور اس کا حسن اختتام بھی آپ ہی کے ناخن فکر وتدبیر سے ہوا۔

☆ دستور ہند نے مسلم پرسنل لا کو قانونی تحفظ تو دیا تھا مگر اس کے پاس مسلم پرسنل لا کا کوئی معتبر اور مفصل نمونہ موجود نہیں تھا جس کو عدالتوں کے لیے معیار قرار دیا جاتا۔ حضرت امیر شریعتؒ نے مارچ ۱۹۸۶ سے اس پر کام شروع کیا اور اپنی نگرانی میں اس کام کو تکمیل تک پہنچایا۔ حضرت کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے جس کو ملت ہندیہ کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا۔ ان کے علاوہ حضرت امیر شریعتؒ نے ملک وملت کے لیے دیگر محاذوں پر بھی کام کیا۔

☆ وطن کی آزادی کے لیے سر بہ کفن میدان جنگ میں کود پڑے، زندگی کے بہت سے قیمتی لمحات جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزار دیے۔ حادثے پر حادثے آتے رہے مگر قابض طاقتوں کے خلاف ان کے عزم میں کوئی کمزوری نہیں آئی۔

☆ آزادی وطن سے قبل ریاست میں ایک بہتر حکومت کی تشکیل کے لیے انتخابات میں حصہ لیا اور ۱۹۳۶ میں بہار کے ممبر اسمبلی منتخب ہوئے۔ اور پھر اس پلیٹ فارم سے ملک وملت کی اہم خدمات انجام دیں۔ ۱۹۳۷ میں سرکاری دفاتر میں اردو کے نفاذ کے لیے کامیاب کوشش فرمائی۔ ۱۹۳۷ میں اسلامی اوقاف پر زرعی ٹیکس کے خلاف آواز بلند کی اور اسمبلی میں ارکانِ حکومت کے سامنے تاریخی خطاب فرمایا۔ جس کے نتیجہ میں اوقاف کی جائیداد ٹیکس سے مستثنیٰ قرار پائے۔

☆ ۱۹۳۵ میں جمعیۃ علما بہار کے آپ ناظم مقرر ہوئے اور اس میدان سے بھی آپ نے ملت اسلامیہ کے لیے وقیع خدمات انجام دیں۔ فتنۂ انکارِ حدیث کے خلاف آپ نے پرزور مہم چلائی اور اس موضوع پر ایک اہم رسالہ ''کتابت حدیث'' لکھ کر ۱۹۵۱ میں شائع فرمایا۔

☆ ایک عظیم مصلح ومفکر کی حیثیت سے نصاب تعلیم کی اصلاح اور اس کو عصر حاضر کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کی کوشش فرمائی اور ۱۹۵۴ میں ماہرین تعلیم اور علما واہل قلم کا ایک مؤقر اجلاس خانقاہ رحمانی مونگیر میں بلایا جس کے بڑے دور رس اثرات مرتب

ہوئے۔

☆ ۱۹۶۵ میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اقلیتی کردار کی بحالی کی تحریک میں شمولیت فرمائی، جس سے تحریک میں توانائی اور زندگی آئی اور انجام کار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ آیا۔

☆ ۱۹۶۵ میں تحفظ فلسطین کانفرنس بلائی۔

☆ ۱۹۶۳ میں تحفظ مسلم پرسنل لا کانفرنس طلب فرمائی۔

☆ ۱۹۷۰ میں ریاستی قومی یکجہتی کونسل کے اجلاس میں شرکت فرمائی، اور ذمہ داران حکومت سے صاف صاف باتیں کیں۔

☆ پھر مسلم پرسنل لا بورڈ کی سطح سے کبھی متبنیٰ بل کے خلاف ملک گیر جدوجہد میں مصروف نظر آئے۔ کبھی مساجد ومقابر کے تحفظ کی تحریک میں سرگرم رہے۔ اوقاف اسلامی کوانکم ٹیکس سے مستثنیٰ کرنے کی بھی سعی جمیل کی تو کبھی نکاح کے لازمی رجسٹریشن کے خلاف آواز اٹھائی۔ ۱۹۸۵ میں نفقۂ مطلقہ کے سلسلے میں آپ کی جدوجہد جاری رہی، جس کے نتیجے میں ۱۹۸۶ میں پارلیمنٹ میں قانون تحفظ مسلم خواتین منظور کیا گیا۔

اس طرح پوری زندگی جہد مسلسل میں گزری، حیات مستعار کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا، زندگی کی کسی کروٹ چین کا سانس نہیں لیا اور ان کی حساس طبیعت ملت وملت کے حالات کے تئیں ہمیشہ بے قرار ومضطرب رہی۔

وہ چاہتے تو خانقاہی نظام کے تحت گوشہ نشینی کی زندگی گزار سکتے تھے اور مدرسہ وخانقاہ کے پرسکون ماحول میں اپنے لمحات بسر کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے خلوت کی عافیت پر جلوت کی تلخیوں کو ترجیح دی اور مدرسہ وخانقاہ کی چہار دیواری سے نکل کر ملک وملت کے وسیع آفاق میں پھیل گئے۔ اور اس کے لیے چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا سفر کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ ایک طرف تو وہ مؤتمر عالم اسلامی مصر (مارچ ۱۹۶۴) اور مؤتمر رابطہ عالمی اسلامی مکہ مکرمہ (اپریل ۱۹۶۵) میں شرکت کے لیے پابہ رکاب ہیں تو دوسری طرف بہار کے پسماندہ دیہاتوں کا

سفر کرنے میں بھی کوئی جھجک نہیں ہے۔ انتہائی خستہ راستوں پر جھولتی ہوئی جیپ میں سفر کر رہے ہیں اور کھیتوں کے درمیان ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر پیدل چل رہے ہیں۔

ایک طرف مصر و عرب کی کانفرنسوں کو خطاب کر رہے ہیں تو دوسری طرف بہار و اڑیسہ کے ان پڑھ دیہاتیوں سے ہم کلام ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ہوائی جہازوں پر پرواز کرنے والا شخص ہماری ٹوٹی چارپائی پر بیٹھنے میں کوئی عار محسوس کر رہا ہے۔ اقبال نے سچ کہا تھا:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریل امین بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان

مولانا مفتی جمیل الرحمٰن قاسمیؒ ☆

اجتماعیت، عزیمت اور جہد مسلسل کے پیکر عظیم امیر شریعت

حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ

برصغیر کے نابغہ روزگار، مایہ ناز شخصیتوں میں امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ صاحب علیہ الرحمہ کی شخصیت اہم اور ممتاز شمار کی جاتی ہے۔ حضرت امیر شریعتؒ علم وفضل، جہد وعمل، بصیرت وفراست، تقوی وخشیت، زہد وورع، اخلاص وایثار کے محاسن سے بدرجہ تمام وکمال آراستہ تھے اور ملک وملت کی خدمات کے ہر میدان میں تیزگام نظر آتے تھے۔ عام طور پر لوگ حضرت امیر شریعتؒ کو والد گرامی قدر حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیری، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، ابوالمحاسن حضرت مولانا محمد سجاد صاحب رحمہم اللہ اور دیگر اساطین امت کی صالح تربیت کا گل سرسبد قرار دیتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت امیر شریعت قدس سرہ سلف صالحین، مشائخ کاملین، علمائے ربانیین کے صحیح وارث اور جانشین ہیں۔ حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ امام العلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے فکر ومشرب کے داعی ونقیب ہیں۔

حضرت امیر شریعتؒ نے اکابر ومشائخ کے علوم ومعارف کو عام کیا، اپنی شبانہ روز جد وجہد سے باصلاحیت تلامذہ اور صاحب بصیرت پاک باز علماء کی ایسی جماعت تیار کی جو ملت کے عظیم ترین سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے، اور اپنی دعوتی، تعلیمی، تحقیقی اور اصلاحی خدمات کے میدان میں ایک سند کا درجہ رکھتی ہے، اور تاریخ ساز کارہائے نمایاں کے حوالے سے اپنی شناخت

☆ سابق مہتمم جامعہ رحمانیہ ہاپوڑ (یوپی)

قائم کیے ہوئے ہے۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانیؒ نے تین میدانوں میں خاص طور پر اپنی خدمات کے گہرے نقوش قائم کیے، ایسا لگتا ہے کہ حضرت مولانا رحمانی صاحبؒ کو ان تین اہم کاموں کے لیے منصۂ شہود پر لایا گیا تھا۔ حضرت مولاناؒ نے ان مہمات ثلثہ کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا اور اس کے تعلق سے تلامذہ اور متوسلین کے لیے خطوط کار کی تعیین فرمائی۔

حضرت امیر شریعتؒ نے تحفظ ملت، تحفظ شریعت اور اشاعت تعلیم دین کے لیے سرفروشانہ خدمات انجام دیں، جمعیۃ علمائے ہند، آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور دیگر ملی تنظیموں اور جماعتوں سے حضرت کی وابستگی اور ملی قومی مسائل کے لیے سرفروشانہ جدوجہد حضرت مولاناؒ کی مقدس زندگی کے واضح اور روشن اوراق ہیں۔ دار العلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جیسے عظیم مرکزی اداروں کو ملت اسلامیہ کے دل کی دھڑکن بنانے اور ان کو مرجعیت اور آفاقیت عطا کرنے میں حضرت مولانا رحمانیؒ کے کارہائے نمایاں اور ان کے اسلاف واخلاف کی تابناک خدمات تاریخ کا عظیم حصہ ہیں۔ جامعہ رحمانی مونگیر کی نگرانی، خانقاہ رحمانی کی سجادہ نشینی، امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کی سرپرستی، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی نظامت ان مہماتِ ثلثہ کی روشن کڑیاں ہیں۔

ہندوستان کی تحریک آزادی میں قائدانہ کردار ادا کرنا، ۱۹۴۷ء کے قیامت خیز، ہنگامہ انگیز اور پرآشوب ماحول میں سربکف میدانِ کار میں تیز گام رہنا۔ برادرانِ وطن کو محبت ورواداری کا خوگر بنانا، ٹوٹے دلوں کو جوڑنا، مظلوم ستم رسیدہ مسلمانوں کو ہمت واستقلال کا درس دینا، ان کی ڈھارس بندھانا، ان کی باز آبادکاری میں شب وروز ہمہ تن مصروف رہنا، تعلیم وتربیت کے مراکز قائم کرنا، فقہ اسلامی کی عصری تقاضوں کے مطابق تدوین وترتیب کا اہم کام سرانجام دینا، عیسائیت وقادیانیت جیسے فتنوں کی سرکوبی کرنا، حضرت مولاناؒ کی درخشاں خدمات کے اہم ابواب ہیں۔

مولانا کی فراست، بالغ نظری اور اصابت رائے کے جملہ اکابر اور رفقاء کار قائل رہے ہیں، ہر اہم معاملہ کا آخری فیصلہ حضرت مولاناؒ کی رائے اور تجویز پر موقوف تھا، سیاسی مدبرین و مفکرین نے حضرت مولاناؒ کو اپنا رہنما قرار دیا، حضرت کی آراء کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کیا۔ دانشوروں نے بعض پیچیدہ معاملات میں حضرت کی رائے سامنے آنے پر اپنے فیصلوں کو بسا اوقات تبدیل کرلیا، لال بہادر شاستری، مسز اندرا گاندھی، شری جے پرکاش نرائن، پنڈت سندر لال، شری بشمبر ناتھ پانڈے و دیگر سربراہ، سیاسی قائدین و مدبرین مولانا رحمانی کا دل سے احترام کرتے تھے۔

ملک میں اتحاد و یگانگت کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ مرکزی و ریاستی حکومتوں کو قومی دھارے اور سیکولر شاہراہ پر رواں دواں رکھنے میں مولانا کی عظیم ترین جدوجہد تاریخ کا ناقابل فراموش حصہ ہے۔ مسلمانوں کو جمہوریت اور سیکولرازم کے ثمرات سے روشناس کرانا۔ اس طرح برادران وطن کو بھی مشترکہ سیکولر نظام اور متحدہ قومیت کو جمہوری حکومت کے لیے رگِ جاں باور کرانا، مولانا کی ایمانی فراست وسیاسی بصیرت کا عظیم شاہکار ہے۔

گزشتہ صدی کی آٹھویں دہائی کے آغاز پر فرقہ پرستوں نے اسلامی شریعت پر یلغار کرتے ہوئے یکساں سول کوڈ کے لیے تحریک شروع کی، سیاسی حالات انتشار کا شکار تھے، سیکولرزم کے حامی تذبذب اور بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا تھے، علماء کی جماعت میں سب سے پہلے جس مدبّر نے اس تعلق سے خطرات کو محسوس کیا، اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل کی صورت میں اس کے دفاع اور جواب کے لیے کمر بستہ ہوا، اور علماء کرام کے مختلف طبقات کو متحد ہونے اور مشترکہ پلیٹ فارم پر آنے پر آمادہ کیا وہ مردِ حق، مردِ آہن امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی قدس سرہ کی ذات گرامی ہے۔ حضرت مولاناؒ نے اس ناگفتہ بہ پُر خطر ماحول میں دہلی، دیوبند، لکھنؤ، حیدرآباد، بنگلور، ممبئی، کلکتہ، کیرالہ اور مدراس کے پے در پے متعدد اسفار کیے، مختلف اساطین امت کو مونگیر، دہلی، بمبئی اور حیدرآباد میں جمع کیا، بالآخر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس سرہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی قیادت وسربراہی میں تمام مسالکِ حق

ومکاتب فکر کے علماء ومشائخ اور دانشوروں کا اہم تاریخ ساز کنونشن ۲۷-۲۸ر دسمبر ۱۹۷۲ء کو عروس البلاد ممبئی میں منعقد ہوا۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کو درپیش چیلنجوں پر کھل کر بات چیت ہوئی، اہم تجاویز مرتب کی گئیں، جن میں ایک تجویز مسلمانوں کے نمائندہ مشترکہ پلیٹ فارم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کی تھی، اس کام کے لیے ایک دستوری کمیٹی بنائی گئی، بورڈ کے خطوط کا دائرہ اختیارات اور راہ عمل مرتب کرنے کا کام اس کمیٹی کو دیا گیا، حضرت مولاناؒ کی مخلصانہ وسرفروشانہ مساعی ثمر آور ہوئیں، بالآخر اپریل ۱۹۷۲ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ کو بورڈ کا صدر اور حضرت امیر شریعت قدس سرہ کو بورڈ کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا، حضرت امیر شریعتؒ نے علماء کرام کی جماعت کے لیے مشترکہ راہِ عمل بنائی، اور ملی سرگرمیوں اور تحفظ شریعت کی کوششوں کے لیے جادۂ حق ہموار فرمایا، اکابر واسلاف کا کارواں ساتھ لے کر حق وصداقت کی راہ پر رواں دواں رہے۔ علماء صادقین اور سرفروش مجاہدین کا اسوہ تاباں وفرزاں کیا۔ ۱۹۷۵ء میں ایمرجنسی نافذ کی گئی اس دور میں کلمۂ حق زبان وقلم پر جاری ہوا۔ حضرت امیر شریعتؒ نے اس وقت کلمۂ حق بلند کیا، ظلم وبربریت کے خلاف آواز اٹھائی، نسبندی اور جبری فیملی پلاننگ کو ناجائز کہا، اس تشدد وبربریت کو دستور ہند کی خلاف ورزی قرار دیا، وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کو صحیح حقائق سے آگاہ کیا، اور سرکاری عملہ کے بعض افراد کی ظالمانہ کارروائیوں کو ملک کی سلامتی اور خود ان کی حکومت اور ان کی پارٹی کے لیے خطرناک بتایا۔ حضرت مولاناؒ کی مخلصانہ کوششیں رنگ لائیں، حالات میں بڑی حد تک سدھار آیا، نویں دھائی کے آغاز پر لے پالک بل کے خلاف مولاناؒ کی جدوجہد نتیجہ خیز اور بار آور ہوئی، مسلم اوقاف کو انکم ٹیکس ایکٹ سے مستثنیٰ کرانے، مساجد ومقابر کو واگزار کرانے اور تحفظ دلانے میں مولانا سرگرم عمل رہے، بعض شرارت پسندوں کی جانب سے نکاح کے لازمی رجسٹریشن کی تحریک شروع کی گئی، جو اقلیتوں کو دی گئی مراعات کی خلاف ورزی اور دستور وقانون کی مضحکہ خیزی نیز مسلم پرسنل لا میں بے جا مداخلت کی صریح کوشش تھی، حضرت امیر شریعتؒ نے اس کے خلاف آواز اٹھائی، مسلم پرسنل لا بورڈ کے پلیٹ فارم سے اس کا مقابلہ کیا اور دردمند

انصاف پسند قومی لیڈروں کو ساتھ لے کر اس کے دفاع کی کامیاب کوشش کی اور نکاح کے لازمی رجسٹریشن کو کالعدم کرایا۔

۱۹۸۵ء میں شاہ بانو کیس کی آڑ لے کر نفقۂ مطلقہ کا ہوّا کھڑا کیا گیا، اسلامی آئین کو چیلنج کیا گیا، اور شریعت اسلامی کے قانون کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی گئی، اس وقت مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر تھے، حضرت مفکر اسلامؒ کی قیادت میں امیر شریعتؒ نے انتھک جدوجہد فرمائی، ناتوانی، کمزوری اور ضعف پیری کے عالم میں شب و روز سفر کیے، سیاسی لیڈروں سے بات چیت کی، کئی مرتبہ وزیر اعظم راجیو گاندھی سے ملاقات کی اور نفقۂ مطلقہ کے نفاذ کو شریعت میں مداخلت اور اقلیتوں کو دیئے گئے حقوق کی خلاف ورزی باور کرایا، حضرت امیر شریعتؒ کی جدوجہد کے نتیجہ میں وہ کالا قانون مسترد ہوا اور تحفظ مسلم خواتین کے قانون کو ۱۹۸۶ء میں پارلیمنٹ سے منظوری مل گئی۔

آغشتہ ایم برسرِ خاک بخون دل

قانونِ باغبانی صحرا نوشتہ ایم

بابری مسجد کے خلاف فرقہ پرست عسکری تنظیموں کا میدان میں اترنا آزاد ہندوستان کی تاریخ کا نہایت سیاہ باب ہے، ملک میں ہر طرف یاتراؤں جلسوں جلوسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، فرقہ وارانہ دنگے جمہوریت پسندوں کی ساری کوششوں کو نیست و نابود کر رہے تھے، یک طرفہ نسل کشی کا سلسلہ زوروں پر تھا، ملیانہ، ہاشم پورہ، میرٹھ، دہلی سے لے کر گجرات، بہار تک آگ و خون کا کھیل جاری تھا، حضرت امیر شریعتؒ نے شب و روز محنت کی، اتحاد و ہم آہنگی کی فضا قائم کرنے کے لیے کانفرنسیں کرائیں، لٹریچر شائع کیا۔ ملک کے ذمہ داروں اور سیکولر جماعتوں کے لیڈروں سے ملاقاتیں کیں، اس قضیے کا مناسب حل نکالنے کے لیے علماء دانشوروں اور سیاستدانوں کی برابر میٹنگیں بلائیں، انسانیت دوست انصاف پسند برادران وطن کو میدان میں اتر کر کام کرنے کی تلقین کی۔

نومبر ۱۹۸۹ء میں بھاگلپور کا انسانیت سوز سانحہ نسل کش رونما ہوا، یہاں کے مظلوموں

کی چیخیں، کرب والم کی آوازیں ملک کی سرحدوں کو پار کر گئیں، مشرق ومغرب ہر طرف ان مظلوموں کا ماتم بپا تھا، اپنے ملک کی فرقہ پرستی مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، مولانا آزاد کے فلسفۂ جمہوریت کا منہ چڑا رہی تھی، ہر خاص وعام مصروف فرادو فغاں تھا، حضرت امیر شریعتؒ اس وقت کتنے بے چین تھے، ملک وقوم کو تباہ کرنے والی عاقبت نااندیشوں اور نادانوں کی کارروائیوں پر کس قدر دل گرفتہ رنجیدہ اور مغموم ومحزون تھے، اس کا صحیح اندازہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے تعزیتی مضمون کے اس اقتباس سے بآسانی کیا جاسکتا ہے، حضرت مفکر اسلامؒ تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کا احساس ذمہ داری، ملت کے ساتھ ربط وتعلق اور اس کے مصائب وابتلاءات پر دلگیر وفکر مند ہونا، مسلم پرسنل لا کی تحریک ہی میں محدود نہیں تھا، وہ فرقہ وارانہ فسادات، مسلمانوں کی نسل کشی، مساجد کے انہدام وغیرہ کے واقعات پر بھی ایسے ہی فکر مند ہوجاتے تھے، اور ان کے سلسلہ میں کوئی سعی وکوشش اٹھا نہیں رکھتے تھے، چنانچہ نومبر ۱۹۸۹ء میں بھاگلپور میں ایک سفاکانہ اور انسانیت سوز فرقہ وارانہ فساد ہوا، مولانا نے اس سلسلہ میں جو کچھ ممکن تھا کیا، انھوں نے ایک بڑا مؤثر اور دردانگیز خط تحریر فرمایا، جس میں انھوں نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا تھا، راقم نے اس مکتوب کو سامنے رکھ کر اور اس میں سے کچھ اقتباسات اخذ کر کے اکثریتی فرقہ کے مذہبی پیشواؤں، ملک کے سیاسی رہنماؤں اور ہندوستان کے ممتاز دانشوروں کے نام ایک پراثر خط کا مسودہ بنایا، جس کی بنیاد اور مواد مولانا ہی کا خط تھا، وہ خط ڈاک اور ملاقات کے ذریعہ سربرآوردہ ترین اشخاص تک پہونچایا گیا، اور جہاں تک اندازہ ہے وہ بے اثر نہیں۔'' (بحوالہ پرانے چراغ حصہ سوم، ص:۱۲۵)

حضرت مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندویؒ حضرت امیر شریعتؒ کی زندگی کے مختلف گوشوں پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

''مولانا کی شخصیت اپنی ریاست اور ملک ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ اس عہد کے عالم اسلام کی ممتاز ترین شخصیتوں میں تھی، اللہ تعالیٰ نے علم واخلاص، عزم و قوت ارادی، اصابت رائے، توازن واجتماعیت کی ان کی ذات میں ایسی متعدد خصوصیتیں پیدا فرمادی تھیں، جن کا ایک شخصیت میں بہت مشکل سے اجتماع ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے ایسے متعدد یگانہ دینی وملی تاریخی کام لیے، جس کی نظیر ملنی مشکل ہے، مدارس سے علماء، دانش گاہوں سے فضلاء اور سیاسی میدانوں سے اور جدوجہد کے مرکزوں سے قائدین اور زعماء نکلتے رہیں گے، لیکن ہاتف غیب کی صدا کانوں میں آتی رہے گی:

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مولانا کی وفات سے نہ صرف امارت شرعیہ بہار واڑیسہ جیسی فعال، مؤثر و مبارک تحریک وتنظیم (جس کی نظیر ملنی مشکل ہے) اور ریاست ہائے بہار واڑیسہ کی دینی وملی قیادت میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا، جس کا بظاہر پر ہونا دشوار معلوم ہوتا ہے، اور نہ صرف آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جیسا فعال اور ضروری ادارہ اپنے بانی ومحرک وروح رواں شخصیت سے محروم ہوا بلکہ ہندوستان کی دینی، ملی و فکری قیادت میں ایک ایسا خلا پیدا ہوا، جس کا قحط الرجال کے اس دور میں پر ہونا بہت دشوار معلوم ہوتا ہے۔'' (بحوالہ پرانے چراغ، حصہ سوم:۱۲۶)

حضرت امیر شریعتؒ کی بابری مسجد کے سلسلہ میں مساعی جاری رہیں، اپنی وفات سے تین ماہ قبل ۳/دسمبر ۱۹۹۰ء کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس میں حضرتؒ نے بابری مسجد پر تاریخی تجویز پیش کی جس کو پورے ہاؤس نے باتفاق آراء منظور کیا، اور یہ تجویز اعیانِ ملک وقوم کے پاس بھیجی گئی۔ حضرت امیر شریعتؒ کی ہمہ گیر حیثیت ان کی فراست وبصیرت، فعال مقبول و مرنجاں مرنج شخصیت کی صحیح ترجمانی خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مہتمم وقف دارالعلوم دیوبند کی زبان سے ہوتی ہے:

حضرت خطیب الاسلام مدظلہ العالی رقم طراز ہیں:

''اسلام ایک مکمل نظام حیات ہونے کے لحاظ سے، بے نہایت علم کثیر کا حامل ہے، اس لیے اس میں نہ بذات خود تعصب ہے اور نہ وہ اہل تعصب کا ہم قدم بن سکتا ہے، ایسے ہی اجتماعیت وسیاست کے دائروں میں نہ وہ خود تشدد کی اجازت دیتا ہے اور نہ وہ اہلِ تشدد کا ساتھ دے سکتا ہے۔

دورِ حاضر میں اسلام اور مسلمانوں کے تنزل وانحطاط کی حقیقی بنیاد اس کے سوا کچھ نہیں کہ عملاً دین کے معتقدات کے ترجمان وہ قلیل العلم، رذیل الاخلاق، اور بے حوصلہ افراد بن گئے ہیں کہ دین کے نام پر ان کا دینی اقتدار صرف تعصب پر ہی مبنی اور قائم ہے اور اجتماعی اور سیاسی نظریات کے دعویدار وہ بے مایہ لوگ بنے ہوئے ہیں کہ ان کی دکان از اول تا آخر صرف تشدد ہی پر چلتی ہے۔

حضرت امیر شریعتؒ (رابع) اپنی علمی وسعت اور فکری رفعت کی بنا پر ان نام نہاد دیندار متعصبین سے اور سیاسی متشددین کی حدود درسائی سے بھی کما حقہ واقف تھے اور اس سے بھی باخبر تھے کہ یہ طائفۂ دزداں دین وسیاست ہوسِ اقتدار میں ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ اس لیے دینی اور سیاسی ناکامیوں کا مداوا کرنے کے لیے دین وسیاست کے پردوں میں اپنی چالاکیوں کا ہدف اہل حق اور ارباب علم کو بنا کر اپنی اغراض کی تکمیل کرنے کی کوششیں کرتے ہیں، ان دونوں گروپوں کو ایک یا دو بار نہیں بلکہ ہمیشہ حضرت امیر شریعتؒ کے مدبرانہ، عالمانہ طریق عمل کے نتیجے میں ناکامیوں کے سوا کوئی نتیجہ ہاتھ نہ آیا۔''

حضرت امیر شریعتؒ نے کیسے ناموافق حالات میں کام کیا، معاندین ومخالفین کے طعن وتشنیع اور لومۃ لائم سے بے نیاز ہوکر اپنا عمل جاری رکھا، ان کے ساتھ عالی ظرفی وبلند اخلاقی کا معاملہ کیا۔ خطیب الاسلام حضرت مولانا سالم قاسمی صاحب ان کے اوصاف پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

''اجتماعی اور سیاسی میدانوں میں غیروں سے زیادہ اپنے ان کے مدمقابل رہے، لیکن حضرت موصوف کی یہ عالی ظرفی اور بلند اخلاقی ناقابل انکار ہے کہ مخالفین کی شخصیات اور ان کی رایوں کے احترام میں مولانا موصوف نے کبھی ادنی کمی نہیں کی، لیکن ساتھ ہی اس مسلمہ حقیقت سے انھوں نے کبھی رایوں کے احترام کے باوجود ان سے اتفاق نہیں کیا، دینی، ملی، اخلاقی اور سیاسی اصول کے اگر کوئی رائے برخلاف ہے تو اس سے برملا شائستہ اختلاف میں کبھی ادنیٰ مداہنت مولانائے محترم نے نہیں برتی، ایسے ہی اصولی تفاوت نہ ہونے کی صورت میں ان کا ذہن وفکر کسی تامل کو قبول نہیں کرتا تھا، یہ کہنے میں بات معمولی لگتی ہے لیکن عملی دنیا میں اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ارباب فکر وبصیرت ہی کر سکتے ہیں۔

اختلافی مسائل میں حضرت امیر شریعتؒ کا طرز افہام وتفہیم متانت کے ساتھ اتنا مدلل اور جذاب ہوتا تھا کہ مخاطب اگر اپنی رائے پر بضد نہ ہوتا تو تسلیم نہ کرنے کی صورت میں بھی معقول بنیاد پر ان کی بات کا رد اس کے لیے آسان نہیں ہوتا تھا۔'' (ماخوذ از خطیب الاسلام کا خطبۂ صدارت، ص۳ تا ۵، بر موقع امیر شریعت سیمینار ۱۹ر مارچ ۲۰۰۵ء)

حضرت امیر شریعتؒ کے اہم کارناموں میں ایک بڑا کارنامہ عصری مقتضیات سے ہم آہنگ فقہ اسلامی کی تدوین وتحقیق ہے، مولانا نے اس میدان میں تن تنہا ایک جماعت کے برابر کام کیا ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے انقلابات نے پہلے ہی دن اس ضرورت کا احساس دلایا اور علماء ومحققین کو وقت کے تقاضوں کے پیش نظر مجبور کیا کہ وہ بدلے ہوئے حالات میں امت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیں اور جان لیں کہ درپیش حالات میں امت کی ضرورتوں کا خیال رکھنا مجبوری اور بے کسی کے دور میں رعایتوں اور سہولتوں کا دروازہ کھولنا ناگزیر بن گیا ہے، گویا ماضی میں جزوی طور پر ان نکات پر کام ہوتا رہا، مگر بیسویں صدی کے تقاضے اجتماعیت کی ضرورت واضح

کررہے تھے، حضرت امیر شریعتؒ نے اس سلسلہ میں روز اول سے جدوجہد فرمائی۔ تحقیق شریعت اور نفاذ شریعت کے مختلف ادارے قائم کیے، اپنے رفقاء اور تلامذہ کی ایسی جماعت تیار کی، جس نے کئی صدی کے تقاضوں کو پورا کیا اور فقہ اسلامی کی حسب مقتضا تجدید وتدوین کا اہم کام سرانجام دیا، اس جماعت کے اہم سرخیل علماء میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی اور حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب کا نام نامی سرفہرست آتا ہے۔

حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوری صاحب ان حقائق پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

''ان کے یہ اوصاف اپنی جگہ ہیں، اس کے ساتھ چند کارنامے عظیم یادگار کی حیثیت رکھتے ہیں، انھوں نے اپنی نگرانی میں فقہ اسلامی کی تدوین کرائی۔ جو فتاویٰ عالمگیر کی طرح فقہ اسلامی کا دائرۃ المعارف ہے۔

ہندوستان کے ایک شہنشاہ نے فتاویٰ عالمگیری مرتب کرائے، اور ہندوستان کے ایک گدا نے فقہ اسلامی کی تدوین کرائی، چند سال ہوئے دنیا کے ماہرین قوانین کی کانفرنس میں اسلامی قوانین کی ضرورت محسوس کی گئی، اور دولت کویت نے ''موسوعۃ الفقہ الاسلامی'' کے عنوان سے اس کی تیاری شروع کی۔ ادھر ہندوستان میں اس کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا تو مدرسہ وخانقاہ کے ایک بوریہ نشین نے اس کی ذمے داری لی۔

(ماخوذ: حضرت امیر شریعت نقوش وتاثرات، ص:۱۲۰)

افسوس درویش صفت فقیہ، مدبر، دانشور، داعی اسلام، دردمند عوام، حضرت امیر شریعتؒ نے ۳؍رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ ۱۹؍مارچ ۱۹۹۱ء کو بارگاہِ خداوندی (مسجد) میں بحالت نمازِ تراویح داعی اجل کو لبیک کہا، چند لمحے قبل منادی خداوندی (مؤذن) نے حی علی الصلاۃ، حی علی الفلاح کی مقدس صدا بلند کر کے حضرتؒ کو اللہ کے مقدس گھر کی طرف بلایا۔ اس کا جذبہ تھا کہ حسب معمول زمان ومکان کی تقدیس وتبریک سے حضرتؒ فیضیاب ہوں اپنے محبوب مالک وآقا

سے سرگوشی کریں، پوری امت کے لیے پوری انسانیت کے لیے صلاح وفلاح کی دعاء کریں، مگر اس منادی کو کیا معلوم تھا کہ بارگاہ اقدس میں آج کی حاضری حضرتؒ کی آخری حاضری ہے، حضرتؒ کی سجدہ ریزی الحاح وزاری فریاد وفغاں، اس عالم ممکنات میں آخری فریاد وفغاں ہے، جو بندگانِ خدا کی براءت ونجات اور فوز وفلاح کے لیے آخری دعاء کا درجہ رکھتی ہے، حضرتؒ آخری دعاء دے کر رخصت ہوگئے، مگر بندگانِ خدا تا عمران کی جدائی پر آنسو بہائیں گے۔ فریاد وفغاں کریں گے، ان کے نقوشِ عمل کو اجاگر کر کے فوز وفلاح سے بہرہ یاب ہوں گے، ماحول کو تاباں وفروزاں بنائیں گے، حضرتؒ نے اس مبارک ساعت میں منادی حق کو صدائے فلاح پر لبیک کہا، اور ابدی دائمی سرمدی فلاح کی جانب شاداں فرحاں اور رواں دواں ہوگئے، اور اپنے محبین ومتوسلین کو آخری ساعت میں فوز وفلاح کی راہ پر تیز گام رہنے کا آخری پیغام دے گئے:

تیرۂ وتار تھی پہلے ہی یہاں شامِ حیات
دامنِ چرخ سے اک اور ستارہ ٹوٹا

⊙⊙⊙

ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی ☆

پیکرِ عظمت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ: یادوں کے چند نقوش

سن تو مجھے یاد نہیں ہے۔ شاید حساب سے نکل آئے، لیکن بچپن کی معصوم یادوں کو سن و تاریخ کی پابندیوں سے بوجھل ہی کیوں بنایا جائے، صوبہ بہار میں سمستی پور کے میرے قصبہ 'روسڑا گھاٹ' میں ایک معمولی مکان کے برآمدے پر سامنے سے چادر کا پردہ پڑا ہے، باہر گاؤں کے بوڑھے اور جوان جمع ہیں۔ کچھ علاحدہ مکان کے اندر عورتیں اکٹھی ہیں۔ ہم بچے ماحول کو دیکھ کر 'مصنوعی شریف' بنے ہیں۔ لوگ آرہے ہیں اور جارہے ہیں۔ کچھ دیر بعد اس مکان سے کچھ فاصلہ پر مسجد میں لوگ نماز کے لیے جمع ہوئے۔ گاؤں میں مسلم آبادی کم ہے۔ پر آج مسجد بھری سی ہے۔ ایک نورانی صورت والے بزرگ وہاں مکان پر پردہ کے اندر تھے، یہاں مسجد میں بھی تشریف فرما ہیں۔ (شعور کا دوسرا ورق الٹتا ہے)۔

دریائے گنگا پر اسٹیمر (چھوٹا پانی جہاز) پانی کے سینوں کو چیرتا رواں ہے، بڑا حسین منظر ہے۔ جہاز ساحل سے فاصلہ پر قدرے گہرے پانی میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ بڑی سی کشتی جہاز سے باندھ دی جاتی ہے۔ بڑے بھائی کا ہاتھ تھامے جہاز کے زینہ سے ہم کشتی پر اور پھر ساحل پر آجاتے ہیں۔ ریتلی زمین پر کچھ دور پیدل چل کر تانگہ پر سوار ہوتے ہیں۔ اب ہم 'مونگیر' پہنچ

☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر و صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد

گئے ۔سڑک کے دائیں جانب خانقاہ رحمانی اور عالیشان مسجد ہے۔ بائیں جانب خوبصورت دو جانبی حسین عمارت جامعہ کی ہے، جسے دو جانبوں سے دیواروں نے گھیر کر چوکور بنا دیا ہے۔شراب علم کی لذت نے وطن کے نگارخانہ سے یہاں پہنچایا، اور بچپن کی معصوم اداؤں نے مدرسہ سے پہلی آشنائی حاصل کی۔ میں نے بعد میں جانا کہ گاؤں میں نورانی صورت والے بزرگ 'حضرت امیر شریعتؒ' تھے اور وہاں میرے والدین نے حضرتؒ کے ہاتھوں پر بیعت کی تھی۔اور اسی تعلق سے راہ پاکر میرے بڑے بھائی (اور اب مولانا ذہین اختر ندوی) جامعہ رحمانی میں داخل کئے گئے تھے اور پھر ان کے ساتھ مجھے درجہ حفظ میں داخلہ ملا تھا۔

جامعہ کی عالیشان مسجد سے دکھنی جانب ملحق خانقاہ کا وہ کمرہ ہے، جہاں حضرت امیر شریعتؒ بیٹھتے تھے۔مسجد کی اوپری منزل پر شعبہ حفظ کے درجات لگتے تھے اور مسجد سے باہر قریب میں ہی طلبہ کے رہائشی کمرے اور مطبخ تھے۔ میں نے چار برس یہاں گزارے۔حفظ کی تکمیل کی، اور دستار بندی سے نوازا گیا۔اس دوران میری دنیا یہی مسجد اور اس سے ملحق جگہ تھی اور ہم سب کے لیے مرکز تمنا، منبع فیض اور مطمح نظر 'حضرت صاحبؒ' کی ذات تھی۔اس وقت نہ ہم نام سنتے تھے اور نہ امیر شریعتؒ کے لقب سے اتنے آشنا تھے۔ہمارے گوش وذہن صرف 'حضرت صاحبؒ' سے مانوس تھے، اور اس لفظ کے ساتھ ایک عظمت، ایک وقار اور ایک نورانیت کا ہالہ تصور کے صفحہ پر نقش تھا۔ہم یہ جانتے تھے کہ حضرت صاحبؒ خانقاہ سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اور حضرت صاحبؒ آگئے ہیں۔کیوں کہ ہم بچے حضرت صاحبؒ کے بعض معمولات کو دیکھتے تھے۔آج یہ لکھتے ہوئے احساس مسرت بھی ہے اور خوف اظہار بھی کہ اکثر عشاء کی نماز کے وقت چند طلبہ حضرت صاحبؒ کے کمرہ کے قریب آجاتے۔حجرہ کے باہر برآمدہ میں وضو کا پانی لوٹے میں رکھا جاتا اور ایک لکڑی کی تپائی رکھ دی جاتی۔حضرتؒ آکر وضو کرتے اور پاؤں دھونے کے بعد اسی طرح بیٹھے گھوم جاتے۔وضو کے اس عمل کو ہم بچوں کی نگاہیں محفوظ کرتیں۔حضرتؒ کے گھومتے ہی ایک طالب علم اپنے دونوں ہاتھوں پر پھیلائے تولیہ حضرتؒ کے دونوں ہاتھوں پر رکھ دیتا، اور دوسرا طالب علم چھوٹے تولیہ سے حضرتؒ کے دونوں قدم کے پانی خشک کر دیتا۔ ہاتھ والا تولیہ تو ہلکی

جدو جہد سے مل جاتا، چھوٹے تولیہ کے لیے سخت منافست رہتی۔ سعادت کا تیسرا موقع حضرت کے مسجد میں داخل ہوتے وقت جوتیاں سیدھی کرنے کا ہوتا۔ یہ ہمارے لیے شرف وسعادت بھی تھی اور خاموش تربیت تھی۔

جامعہ رحمانی میں ایک معمول یہ تھا کہ فجر کی نماز کے بعد تمام طلبہ مسجد میں دورویہ صف بنا کر تلاوت قرآن میں مشغول ہوتے تھے۔ آخری صف کے بعد خالی جگہ کے صحن میں حضرت صاحبؒ اپنی نورانی شکل اور لانبے قد کے ساتھ اور ہاتھ میں تسبیح لیے تیز قدموں سے ایک کنارے سے دوسرے کنارے چلتے رہتے۔ تلاوت پندرہ بیس منٹ جاری رہتی، اور حضرتؒ بھی تقریباً اتنی ہی دیر تیز تیز چلتے تسبیح پڑھتے رہتے۔ صبح کے سہانے موسم میں مومنانہ قوت کے انداز اور نورانی وقار لئے اس پیکر میں زندگی کے لیے ایک زندہ پیغام کیسا اثر انگیز ہوتا تھا۔ اجتماعی تلاوت ختم ہوتے ہی شعبہ حفظ کے استاذ جناب قاری عثمان صاحبؒ بآوازِ بلند کچھ مرحومین کے لیے ایصال ثواب کراتے۔ یہ دراصل حضرتؒ کے پاس ان کے حلقہ مریدان کی طرف سے آنے والی خبر وفات اور درخواست ایصال ثواب ودعا کی تعمیل کا نظام تھا۔

ہم بچوں میں یہ بات مشہور تھی کہ حضرت صاحبؒ کے یہاں 'جن' بھی رہتے ہیں۔ مسجد کے اندرونی دروازہ سے حضرتؒ کے حجرہ تک جاتے دائیں جانب باغ اور درختوں پر ہم 'جنوں' کو بھی گھورتے۔ جن کے خوف اور حضرتؒ کے پاس جانے کے اعتماد کی ملی جلی کیفیت کچھ ایسی ہوتی کہ راہ داری سے تنہا گزرتے وقت تو تیز بھاگ جاتے اور احباب کے ساتھ بڑے اعتماد سے چلتے۔ کبھی دوستوں میں منافسانہ چرچا ہوتا کہ ہم نے ایک سایہ کو گزرتے دیکھا ہے۔

چھوٹے بچے یہ کہاں جانتے تھے کہ حضرتؒ کے دن بھر کے معمولات کیا ہیں۔ لیکن حضرتؒ کے حجرہ کے مشرقی جانب ایک بڑا صحن تھا اور اس کے آگے بہت بڑا میدان، جس سے متصل داہنی جانب کچھ کمروں میں طرح طرح کے تماشے آئے دن ہم دیکھا کرتے۔ کوئی زنجیر میں جکڑا، کوئی رسی سے بندھا، کوئی عجیب عجیب حرکتیں کرتا، کبھی کوئی زنجیر لہراتا ہم بچوں کو دوڑاتا۔ خاموش بیٹھے لوگ بھی ہوتے۔ یہ سب دماغی مریض، جنوں کے شکار اور مصیبت کے مارے،

جانے کہاں کہاں سے حضرتؒ کی خانقاہ آتے۔ یہاں وہ ٹھہرتے، کھاتے پیتے اور حضرتؒ سے دعاءشفاء وعلاج پاتے۔ یہ قابل رشک روحانی اسپتال تھا۔ ایسے مناظر جب تک حضرت صاحبؒ خانقاہ میں ہوتے، تقریباً روزانہ دوپہر میں نظر آتے تھے۔

جامعہ میں علم ومطالعہ کا ماحول رہتا تھا۔ ہفتہ کے آخری دن جمعرات کو بعد مغرب طلبہ کے علاحدہ علاحدہ گروپ میں تقریری مشق کے پروگرام ہوتے۔ ہم شعبہ حفظ کے بچے بھی وہاں شامل ہوتے اور علم کی فضیلت واہمیت ذہنوں میں نقش ہوجاتی۔ وہیں مکتبہ سے ہر دن بعد عصر کتابیں مطالعہ کے لیے نکالی جاتیں۔ بچوں کے لیے بڑی اچھی اچھی دلچسپ کتابیں وہاں ملا کرتی تھیں۔

جامعہ رحمانی میں کبھی کبھی پہلوانی کے کرتب بھی ہم بچوں کو دکھائے جاتے اور دینی ماحول میں جسمانی تربیت سکھائی جاتی۔ ایک بار جامعہ کے بڑے میدان میں چند بڑے لحیم وشحیم پہلوانوں کے عجیب عجیب کرتب دکھائے گئے۔ زمین میں گڑھا کھود کر سینہ تک الٹا ایک پہلوان کھڑا ہوگیا اور مٹی بھردی گئی، اور مٹی کے اندر سے اذان کی آواز سنائی گئی۔ ایک پہلوان کے سر پر دوسرا پہلوان سر کے بل کھڑا ہوگیا اور دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے چلتے رہے۔ ظاہر ہے کہ اس علمی اور جسمانی تربیت کے پیچھے حضرت صاحبؒ کی دوراندیشی اور بصیرت کام کرتی رہتی تھی۔

حضرت کی خانقاہ کے پاس ہی ایک چہار دیواری کے اندر دو سادہ قبریں تھیں۔ ایک قطب الاقطاب وبانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کی قبر۔ بڑوں کی دیکھا دیکھی ہم بھی کبھی اندر چلے جاتے۔ خانقاہ میں ہونے والے عرس کے موقع پر بڑا مجمع ہوتا۔ مسجد میں قل شریف کے علاوہ بڑے بڑے علما کی اصلاحی تقریریں ہوتیں۔ ایک بار یہیں ایک صاحب کو تقریر کرتے پہلی بار دیکھا تھا، بچوں میں گفتگو تھی کہ بے داڑھی شخص کی تقریر ہے۔ بعد میں واقف ہوا کہ وہی قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ تھے۔ خانقاہ رحمانی کا سالانہ عرس اسی انداز کا ہوا کرتا، شور شرابہ اور چادر وگل کی عجیب وغریب رسومات سے خالی۔ تقریریں، قل، دعا اور نصیحت۔

پتہ نہیں کون سا موقع تھا، جامعہ اور خانقاہ کی درمیانی سڑک پر طلبائے جامعہ کی بڑی لمبی لائن بنائی گئی۔ سبھی کے بازوؤں پر چھوٹی سیاہ پٹی بندھی تھی۔ ایک خاموش جلوس تھا۔ شہر مونگیر کے مختلف علاقوں سے گزرا، نہ کہیں ہنگامہ، نہ نعرے بازی، شاید ملک وملت کے کسی اہم ترین مسئلہ پر خاموش احتجاجی جلوس تھا۔ حضرت امیر شریعتؒ بہار کے ایک چھوٹے شہر مونگیر میں نہ صرف ملت اسلامیہ کے مسئلہ پر زبردست اقدامی کردار نبھار ہے تھے، بلکہ ساتھ ہی شاہین بچوں کو میدان عمل کے لیے تیار کر رہے تھے۔

جامعہ کے احاطہ میں راستہ کے دونوں جانب بچے استقبال کے لیے کھڑے تھے، صاف ستھرا ماحول اور اسلامی عظمت ونظافت کا منظر تھا۔ حضرت امیر شریعتؒ موجود تھے۔ کچھ دیر کے بعد ایک ادھیڑ عمر کی خاتون سفید باوقار، سر سے پاؤں تک ساڑی میں ملبوس آتی ہیں، ساتھ میں اسی پر وقار لباس وانداز میں اور بھی خواتین اور کچھ مرد بھی ہیں۔ ان کا استقبال ہوتا ہے، انسانوں اور انسانیت کے لیے ان کی بہترین خدمات سے ہم بچوں اور طلبہ کو آگاہ کرایا جاتا ہے۔ پھر حضرت امیر شریعتؒ انسانیت نواز ان خاتون صاحبہ کو انسانیت کے لیے سب سے بہترین پیغام خالق انسانیت کی کتاب قرآن مجید کا نسخہ ہدیہ پیش کرتے ہیں، وہ بڑے ادب اور انتہائی عاجزی کے ساتھ قبول کرتی ہیں۔ یہ خاتون ہیں مدر ٹریسا۔ بچپن میں صفحہ ذہن پر 'اکرموا سید کل قوم' کا جو نقش عملی اس وقت بیٹھا، وہ کیسے ختم ہوسکتا ہے۔ پھر وہ روح پرور نظیف ماحول، اور اس میں کتاب ہدایت کا ہدیہ۔ کیسا سبق آموز پیغام تھا۔ مومنانہ کردار ہی نہیں داعیانہ روح کے ساتھ بھی فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا ایسا ہی نمونہ آج بھی اسلامیان ہند کو اپنانے کی ضرورت ہے۔

مونگیر اس وقت ہندوستان کے نقشہ پر ایک نہ چھپ سکنے والا مقام تھا۔ ایک تحریک، ایک مشن اور ایک پیغام وہاں سے پورے ملک کو مل رہا تھا۔ اور اسی لیے وہاں ہم چھوٹے بچے بڑے بڑے بزرگوں کو آتے، ٹھہرتے اور جاتے دیکھتے۔ اکثروں کو نہ پہچانتے، ویسے ہماری پہچان کی نہ کوئی اہمیت تھی اور نہ ضرورت۔ قائدین ملت اپنے کام میں مصروف رہتے۔ ہاں ہمارے لیے ایک اہمیت ضرور تھی اور وہ یہ کہ کام اس طرح ہوتا ہے، انداز اور طریقہ ایسا اپنایا جاتا

ہے۔ اور پیغام اس کا نام ہے۔ یہ کچھ نتائج تھے، جو شعوری اور غیر شعوری طور پر طلبائے دین کے ذہنوں پر ثبت ہوتے جارہے تھے۔ بہت سے چھوٹے اور دور افتادہ مدارس میں طلبہ کی غیر علمی سرگرمیوں اور کاموں کے بارے میں جو کچھ ہم بعد میں سنا کیے۔ ایسا وہاں جامعہ رحمانی میں ہم نے کچھ نہ دیکھا۔ جو دیکھا اس کے کچھ دھندلے اور کچھ واضح نقوش وہی تھے جو اوپر لکھے گئے۔ ان نقوش میں روشنی ہی ہے، اندھیرا تو نہیں ہے۔ تربیت کی روح ہے جو تعلیم میں، مطالعہ کے نظام میں، حضرتؒ کے معمولات میں، جامعہ کی تقریبات میں، ملک وملت کے مسائل پر ردعمل میں، کھیل وتفریح میں اور پہلوانوں کے کرتب میں، بلکہ انسانیت کی خدمت میں اور دکھیاروں کے غم کو دور کرنے میں، ہر جگہ جاری وساری ہے۔ اسی روح کو نوجوانانِ امت کی گردش خون میں رواں کردینا حضرت امیر شریعتؒ کا مقصود اور مطلوب تھا۔

میرا حفظ قرآن مکمل ہوا، دورہ ہوا، پھر جامعہ کے بڑے احاطہ میں بڑی روحانی تقریب میں دستار سر پر باندھی گئی۔ اتنی لانبی اور اتنے چھوٹے سر پر کہ اس کے آدھے حصے میں ہی سر کے حجم نے چہرہ کو مزید چھوٹا بنادیا۔ بقیہ آدھی دستار کو کاندھے پر اٹھائے، بیٹھ گیا۔ چار برس گزارے، اور ڈھیر ساری حسین یادوں کو دامن میں سمیٹے مونگیر سے ندوۃ العلماء لکھنؤ آ گیا۔ وہی ندوہ جس کی بنیاد حضرت مونگیریؒ نے ڈالی تھی۔ حضرت امیر شریعتؒ کے والد قطب الاقطاب حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ سے ندوہ کا رشتہ تھا۔

ندوہ میں پڑھتے ہوئے ایک موقع پر قائدین ملت کی کسی تقریب میں حضرت امیر شریعتؒ بھی تشریف لائے تھے۔ شفاء خانے کے مہمان خانہ میں ایک کمرہ میں حضرتؒ موجود تھے۔ کچھ طلبہ جو کام میں لگائے گئے تھے، حضرتؒ سے ملاقات کررہے تھے۔ میں بھی ملنے کے لیے موجود تھا۔ مونگیر میں چھوٹے طالب علم کے طور پر حضرتؒ کو دیکھا کرتا تھا۔ یہاں آکر ملاقات وتعارف کا کوئی سلسلہ جاری نہ رہا تھا۔ ایک صاحب نے میرا تعارف کرایا، حضرت برجستہ ان سے بول پڑے: ''میں اس کو جانتا ہوں، اس کی تین پشت کو جانتا ہوں۔'' حضرتؒ نے بجا فرمایا تھا، پر میں حیرت زدہ تھا کہ حضرتؒ اپنی مشغول زندگی میں کس طرح تعلق کو نبھاتے اور یاد

رکھتے ہیں۔ میرے والد صاحب ان سے بیعت تھے، اور ان کی خط و کتابت اور حاضری رہا کرتی تھی۔ لیکن مجھے بھی بغیر ملاقات کے پہچانے رکھا، یہ انہی کا مقام تھا۔ ندوہ کی تعلیم مکمل کر رہا تھا۔ رمضان کے آغاز میں ہی سنا کہ حضرت تراویح کی نماز کے لیے آئے اور پھر جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ خبر سنی، دل پر ایک چوٹ لگی۔ ذہن پر حضرتؒ سے وابستہ بنتے نقوش تھم گئے۔ اور مناظر پلٹ کر شروع سے آنے لگے۔ وہی مسجد، اس سے متصل دکھنی جانب راہداری، اور حضرت کا کمرہ، کمرہ سے باہر خلق کا ہجوم، برآمدہ پر وضو کی جگہ۔ مسجد سے قریب ہی وہ چہار دیواری اور اس کے اندر دو قبریں، اور کچھ جگہ خالی... کیا یہی حضرت کی قبر ہے؟

حضرت امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ ہمہ جہت شخصیت تھے۔ عظمت، جرأت، عمل پیہم، زبردست منصوبہ بندی اور اتحاد و اتفاق، ایک صفحہ پر۔ دوسرے صفحہ پر روحانیت، شفقت و خدمت، دعا و تعویذ، تسکین دل، تقرب خداوندی۔ تیسرے صفحہ پر گہرا علم، مطالعہ و تحریر، مدلل جواب، علم نوازی، علم کی سرپرستی اور خورد نوازی وافراد سازی۔ چوتھے صفحہ پر ملک و ملت کی فکر، سیاسی تدبر، دور اندیشی اور تحمل و اقدام۔

آہ! یہ جبل علم، جبل عظمت، جبل وقار و متانت اور جبل حزم و عمل اسی چہار دیواری میں پیوند خاک ہے۔ لیکن اس کے پیغام کی کتاب سامنے موجود ہے۔ آیئے اس کو پڑھیں اور اپنائیں۔ شاید یہی سب سے بڑا اخراج عقیدت ہو۔

———— ⊙⊙⊙ ————

محمد مشتاق ملک

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری

تاریخ قوموں کے عروج و زوال کی گواہی دیتی ہے۔ اور تاریخ ہی سے حال اور مستقبل کے فیصلے ہوتے ہیں۔ ماضی کی غلطیوں پر جو قوم نظر رکھتی ہے وہ حال اور مستقبل کے فیصلے جرأت اور حرارت کے ساتھ کر لیتی ہے۔ جس قوم کا ماضی درخشاں اور تابناک ہوتا ہے وہ قوم اپنے ماضی سے روشنی لے کر اپنے حال اور مستقبل کو بھی روشن کر لیتی ہے۔ ہماری تاریخ، ہمارا ماضی بڑا شاندار رہا ہے۔ بعض قومیں اپنے ماضی سے شرمندہ و شرمسار ہو کر حال اور مستقبل میں اس کے ازالے کی فکر کرتی ہیں۔ مگر ملت اسلامیہ ہند کی تاریخ بڑی عظمت اور عزیمت والی ہے۔ ہمارے ماضی نے ایسے لعل و گہر ملک اور ملت کی خدمت کے لیے پیدا کیے جس کی نظیر مشکل ہے۔ دیگر اقوام کی تاریخ ایسی شخصیات سے خالی نظر آتی ہے۔ جنگ آزادی سے آج تک ملت کا سفر بڑا عظیم اور باوقار، عظمت اور عزیمت سے پُر ہے۔ بے داغ، بے لاگ، بے غرض، فکر صحیح سے لیس شخصیات نے ملک و ملت کی ہر قوم پر خدمت کی ہے۔ بلکہ ہر دور میں باطل اور حق برسرِ پیکار رہے ہیں۔ ایسے میں حق کے متوالوں کے سامنے غیروں سے زیادہ اپنوں کے مسائل اور رکاوٹیں رہی ہیں۔ اپنی صف کو سیدھی رکھنا اور پھر باطل سے مقابلہ کرنا بڑا دشوار اور کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ مگر ملت کے اِن لعل و گہر نے حالات کے منفی رخ کو مثبت رخ میں تبدیل کر دیا۔ احساس شکست اور پست ہمتی کو ملت سے ختم کر کے ایک نئے حوصلہ اور عزم کی نہ صرف تعلیم دی بلکہ اس کی عملی تفسیر بن کر ملت کی

تاریخ پر چمک رہے ہیں۔

ایسی شخصیات کی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کا نام نامی اسم گرامی اس فہرست کی اولین شخصیات میں شامل نہ کیا جائے۔ آج کے اس پرآشوب دور میں جہاں افتراق، پھوٹ، خودنمائی، مفاد پرستی، ہماری خصوصیات ہوگئی ہیں۔ جامعہ ملیہ (دہلی) میں ہم حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کے نام نامی اسم گرامی کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ یہ تذکرہ اس دور زوال کو عروج سے بدلنے، حالات کی سنگینی کو عزم و استقامت سے اپنے حق میں کرنے کی راہیں کھولے گا۔ کیوں کہ حضرت مولاناؒ میں حقیقی ملی تڑپ عزم واستقلال، طوفان کو روکنے اور اس کے رخ کو موڑنے نے مسلسل جدوجہد، عمل اور قوت فیصلہ جیسی خصوصیات بہ درجہ اتم موجود تھیں۔ لیکن حقیقتاً تاریخ کی شاندار کامیابیوں کے صرف تذکرہ سے قوموں کی تقدیر نہیں بدلتی، اخلاص اور للٰہیت کے ساتھ عمل سے بدلتی ہے۔

میں حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کے تذکرہ سے قبل یہ بات واضح کردوں کہ اس مرد مجاہد اقبال کے شاہین اور خانقاہ سے نکل کر رسم شبیری ادا کرنے والی ہستی نے صرف اپنے اسلاف کی تاریخ نہیں بیان فرمائی۔ بلکہ میدان کارزار میں مسلسل چلتے رہے اور خواہ خانقاہ کے استحکام کا معاملہ ہو یا شریعت محمدیؐ کے تحفظ کا، مسلمانوں کو امارت شرعیہ سے جوڑنے کا کام ہو یا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا یا فرقہ وارانہ فسادات کا، ہرمحاذ پر مولانا رحمانی علیہ الرحمہ شب و روز محنت اور فکر کرنے والی شخصیت تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ حضرت رحمانی علیہ الرحمہ نے اپنی زندگی کا 90 فیصد حصہ ملت کے لیے اور باقی اپنے آرام اور اہل وعیال کے لیے نکالا ہوگا۔ کیونکہ جو خود اپنی ذات میں ایک انجمن، ایک تحریک، ایک انقلاب، ایک فکر ہوتا ہے، اس کے پاس فرصت کے لمحات ہی کہاں ہوتے ہیں:

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

آج ہم اپنے حالات پر غور کریں اور جائزہ لیں تو محسوس ہوگا کہ ہندوستان کے

مسلمان چلتی پھرتی نعشیں ہیں، نہ تو اس کے اندر زندہ قوم کی آواز ہے، نہ دلوں میں ولولے ہیں اور نہ فکر ونظر میں کوئی بلندی۔ انھیں صرف زندہ رہنے کی خواہش ہے۔ ان کی تمنا ہے تو یہ کہ زندگی کے ایام عافیت کے گوشوں میں گزر جائیں۔ موت کا ایک دن معین ہے وہ بہرحال آکر رہے گی، دنیا کی کوئی طاقت اسے ٹال نہیں سکتی، ہمت وعزم کے ساتھ موت کا استقبال کرنا اور خدا کا نام لیتے ہوئے جان کو جان دینے والے کے سپرد کردینا ایک مومن کا کردار ہے۔

یہ الفاظ خانقاہ رحمانی کے جانشین کے ہیں۔ جو روحانی رشد وہدایات کے ساتھ ملت کے سلگتے مسائل پر بے خوف اور بے لاگ نہ صرف تبصرہ کرتے بلکہ ان مسائل پر ملت کی رہنمائی فرماتے۔ مسلمانوں کی تکلیف اور ان پر ظلم وستم سے حضرت کا دل تڑپ جاتا اور مسلسل ان ناانصافیوں کا تذکرہ اپنی مجالس اور مواعظ حسنہ میں کرتے۔

برصغیر ہند وپاک میں خانقاہی نظام کی جڑیں بڑی مضبوط ہیں اور کئی خانقاہیں رشد و ہدایات کے مراکز ہیں۔ مگر حضرت علیہ الرحمہ نے خانقاہ رحمانی کی ایک الگ شناخت بنائی۔ روحانی مرکز کے ساتھ یہ مسلمانوں کی ملی وسیاسی مسائل پر رہبری کا بھی مرکز بن گئی۔

قوم وملت کے نباض

حضرت مولانا تصوف اور معرفت کے رموز سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ یہ انھیں ورثے میں ملی تھی۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ملت کے ستاروں میں وہ آفتاب تھے۔ فکری، عملی، جدوجہد کرنے والے اس آفتاب سے ہی روشنی لے کر آگے بڑھتے تھے۔ ملت اسلامیہ ہند کے مسائل پر بغیر حضرت کے مشورے کے شاید کوئی فیصلہ ہوتا۔ آپ سے مشاورت کے بعد مشکل سے مشکل مسائل کا حل نکال لیا جاتا تھا۔

شخصیت

وہ عالم باعمل، مجاہد آزادی، ملت کے نباض، اچھے خطیب، فکر صحیح سے معمور مصلح قوم،

تجربہ کار سیاست داں تھے۔ ظلم و ناانصافی، قتل و غارت گری کے ماحول میں حضرتؒ نے ملت اسلامیہ ہند کو یہ پیغام دیا کہ:

آپ دوسروں پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیں، خدا سے لو لگائیں اور اپنے مستحکم دفاع کے لیے خود کو تیار کریں کسی پر حملے کے لیے نہیں۔ بدنیتی سے نہیں قتل و غارت گری کے ارادے سے نہیں بلکہ امن قائم کرنے کے لیے ملک کے انتظام کو صحیح رخ پر لانے اور صحیح طور پر چلانے کے لیے موجودہ صورت حال میں بڑھتی ہوئی فرقہ واریت اور نسل کش حملوں کا علاج میرے خیال میں یہ ہی ہے کہ مظلوموں کو چاہیے کہ وہ خود اپنا دفاع کریں۔ دفاع آپ کا قانونی حق ہے جسے کوئی بھی طاقت آپ سے چھین نہیں سکتی۔

آج سے کوئی دو تین دہے پہلے حضرتؒ نے ملت اسلامیہ ہند کو اپنا دفاع خود کرنے کی تعلیم دی۔ آج جب کہ گجرات کے بھیانک فساد کے شعلے بجھے نہیں ہیں۔ یہ بیان نہ صرف مستقبل میں مسلمانوں کو آنے والے خطرات سے آگاہ کرتا ہے بلکہ ان کی بقا کے راستے بھی متعین کرتا ہے۔ ''مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند'' خود کو پہچان اور اپنے دفاع کے لیے خود اٹھ کھڑا ہو۔ دوسروں پر بھروسہ کرنا چھوڑ دے۔ حیدرآباد، دکن کے جری قائد محترم سید خلیل اللہ حسینیؒ نے بھی مسلمانوں کو آواز دی تھی کہ مسلمانو! تم کسی کو مت چھیڑو اور اگر کوئی تمھیں چھیڑتا ہے تو اسے مت چھوڑو۔ حفاظت خود اختیاری مسلمانوں کا حق ہے۔

کرب و بلا میں

حوصلہ شکن حالات تاریخ ساز شخصیتوں کے لیے ایک نئی صبح کا آغاز ہوتے ہیں۔ اور جب تک کسی کے اندر یہ سب برداشت کرنے کی صلاحیت و ہمت نہیں ہو وہ منصب امامت پر سرفراز نہیں ہوسکتا۔ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کے دور کا اگر ہم مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ حضرتؒ پر الزام تراشیاں، بہتان طرازیاں کی گئیں مگر آپ کبھی چیں بہ جبیں نہ ہوئے۔

خانقاہی نظام کا یہ مردِ آہن اپنے مخالف کا مسکرا کر استقبال فرماتا، کیونکہ جس جگر میں رسول کی محبت ہو اور جس کی زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر اور رسول کے تذکرے سے تر ہو وہ مخالف کو دشمن نہیں سمجھتا بلکہ اپنے عمل سے اُسے اسیر کر لیتا ہے۔ مگر افسوس اس دور میں مخالفت کو برداشت کرنے کا حوصلہ ہی کم ہوتا جا رہا ہے۔ صلاحیت، قابلیت معیار نہیں رہی۔ بلکہ خوش آمدی، دولت معیار بنتی جا رہی ہے۔ جب کہ ملت کے ان اُجڑے گیسوؤں کو سنوارنے کے لیے بڑے تحمل اور فیصلہ کرنے کی طاقت کی ضرورت ہے۔ اور حق گوئی و بے باکی سے اجتناب سے قومی و ملی زندگی میں بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ مصلحت کی کچھ حدیں ہیں مگر ہم مصلحت کے نام پر حوادثِ زمانہ کا صرف مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس مردِ مجاہد نے ایک دفعہ فرمایا تھا:

> ''حق و انصاف کی خاطر ہاتھ میں پڑی لوہے کی زنجیر اور جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریاں، آرام دہ مکانات اور زندگی کی آسائشوں سے زیادہ اہم، زیادہ بامقصد اور نتیجہ خیز ہوتی ہیں۔'' (خطبات: ص ۱۹۴)۔

جماعتوں کی عصبیت گروپ بندیوں کا ماحول کل بھی تھا آج بھی ہے۔ جذبات میں بہہ جانا مستقل جدوجہد سے دامن بچانے کی عادت ہم میں موجود ہے۔ حضرتؒ نے فرمایا تھا:

> ''برا نہ مانیے میں جانتا ہوں ہم لوگ صرف نعرہ تکبیر بلند کرنا جانتے ہیں۔ عقل و ہوش کے ساتھ دیر تک تحریک چلانے کا مزاج ہم میں نہیں ہے۔ اس مزاج کو بدلے بغیر کام نہیں چلے گا۔ اپنی اپنی جماعتوں اور اپنے اپنے گروپوں کی سطح سے ذرا بلند ہو کر ملی مسائل پر اجتماعی تحریک اور مل جل کر اقدام کا جذبہ پیدا کیجیے۔
> (خطبات: ۱۹۵)

اتحادِ ملت کی تڑپ اور مشترکہ جدوجہد کا نقشہ حضرتؒ کے ذہن و فکر میں ہر وقت موجود رہتا تھا۔ مسلم مجلس مشاورت، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جیسی عظیم تحریکات اتحادِ ملت اور مشترکہ جدوجہد کا ہی نام تھیں۔ مگر افسوس پہلے مشاورت اور پھر پرسنل لا بورڈ کی تفریق۔ کاش ہم اپنے اسلاف کی اس آبلہ پا جدوجہد کو یاد رکھتے اور خندہ پیشانی سے ہر ایک کو گلے لگانے کی سعی کرتے۔

ان دونوں عظیم تحریکات مجلس مشاورت، پرسنل لابورڈ کے اتحاد کی علامت بنے رہے۔ حضرتؒ کے فرزند حضرت مولانا محمد ولی رحمانی میں بھی اتحاد ملت، مسائل سے آگہی اور اس کے حل کے لیے راستے تلاش کرنے کی جو صلاحیت ہے وہ حضرتؒ سے ہی ورثے میں ملی ہے۔ وہ دنیا کے کسی بھی خطے کے دورے پر ہوں، ملک کے حالات سے باخبر رہتے ہیں۔ مختلف شہروں سے مضبوط ربط بنائے رکھتے ہیں۔ خوش مزاج، خوش اخلاق فرزند سے ملت کو بڑی توقعات ہیں۔

۱۹۹۶ء میں تحریک مسلم شبان کے زیر اہتمام خلیل اللہ حسینیؒ فاؤنڈیشن کے تحت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کی ملی خدمات پر خلیل اللہ حسینی ایوارڈ جوبلی ہال باغ عامہ حیدرآباد میں منعقد تقریب میں بعد از مرگ ایوارڈ دیا گیا۔ جس کو حضرت مولانا محمد ولی رحمانی نے قبول فرمایا۔

آیئے ہم خلوص دل کے ساتھ دعا کریں کہ بارالہا! اب ہمیں بیداری دے۔ یقیناً ہم نے بہت دیر کی ہے۔

———— ⊙⊙⊙ ————

شاہد صدیقی ☆

امیرِ شریعت مولانا منت اللہ رحمانی اور میرا خاندان

امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کا نام آتے ہی ذہن میں ایک ہمہ گیر شخصیت کے حامل رہبر کا سراپا ابھر آتا ہے۔ ایک ایسے قائد کی شخصیت آنکھوں میں پھر جاتی ہے جس پر خود قیادت کو بھی ناز تھا۔ اور اپنے گردوپیش پر نگاہیں ڈالتا ہوں تو قحط الرجال کا شدید احساس ہوتا ہے۔ ملت کی صفوں میں آج دور دور تک کوئی ان سا نظر نہیں آتا۔ وہ دل دردمند، نگاہ دوربیں اور سخن دلنواز کسی میں کہاں۔

یہ تو یاد نہیں کہ میری پہلی ملاقات ان سے کب ہوئی تھی لیکن یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو جن علماء وقائدین سے خود کو انتہائی قریب پایا ان میں امیرِ شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی ذات گرامی کو بڑا نمایاں مقام حاصل تھا۔ آپ والد گرامی محبوب ملت مولانا عبدالوحید صدیقیؒ کے بے تکلف دوستوں میں شامل تھے۔ اور جب بھی دہلی تشریف لاتے ان سے ضرور ملتے۔ قومی وملی مسائل پر دیر تک تبادلۂ خیال کا سلسلہ جاری رہتا۔ دونوں بزرگوں کے مزاج میں بڑا فرق تھا۔ لیکن ان میں بہت سی خوبیاں مشترک تھیں اور جو بات ان دونوں میں حیران کن یکسانیت پیدا کرتی تھیں وہ ان کا حد سے بڑھا ہوا اتحادِ ملت کا جذبہ تھا۔ ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے بکھرے ہوئے شیرازے کو متحد کرنے کے

☆ سابق ایم پی و مدیر اعلیٰ ہفت روزہ ''نئی دنیا''، ڈی ۲۱، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی۔ ۱۳

لیے دونوں ہر وقت بے چین رہتے تھے۔ ایک نے سیاست اور صحافت کو اپنا میدان عمل بنایا تھا تو دوسرے نے علم دین، اصلاح معاشرہ اور بیعت وارادت کو ملت کی شیرازہ بندی کے لیے اپنایا۔ دونوں کو یہ درد اور یہ تڑپ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، فقیہ العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور مفسر قرآن مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جیسے اساتذہ سے ملی تھی۔ امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کو ملت کی شیرازہ بندی کا میدان عمل بلاشبہ اپنے والد حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ سے بھی وراثت میں ملا تھا، جنھوں نے دیوبندی بریلوی اختلاف کی خلیج کو پاٹنے کے لیے ندوہ کی تحریک چلائی تھی۔ پھر امارت شرعیہ کی اس تحریک کو آپ نے اپنے خون جگر سے سینچا جس کی بنیاد مولانا سجادؒ نے پھلواری شریف میں رکھی تھی۔ مجھے اس حقیقت کے اعتراف میں ذرا بھی جھجک نہیں کہ یہ مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی ذات گرامی ہی تھی جس کے دم سے امارت شرعیہ کو وہ مقام حاصل ہوا جو آج تک کسی ملی تنظیم یا ادارہ کو حاصل نہیں ہوسکا۔ امارت شرعیہ پھلواری شریف بلاشبہ آج بھی ہندستان کی سب سے مضبوط و مستحکم اور باوقار ملی تنظیم ہے۔ دارالقضاء کا جو نظام اس ادارہ نے بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ کے طول و عرض میں قائم کیا ہے اس کی کوئی دوسری مثال اس ملک کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اسی ادارہ نے آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تحریک تحفظ شریعت کی جدوجہد کو قیادت بخشی اور یہ امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ ہی تھے جنھوں نے ہندوستان کی انگنت خانوں میں بٹی ہوئی مسلم قیادت کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا کرشمہ دکھایا۔ ورنہ ایک دوسرے پر کفر و شرک کے فتوے داغنے والوں کو متحد کرنے کی کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

جس زمانہ میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا والد گرامی مولانا عبدالوحید صدیقیؒ اگرچہ قومی اور ملی سیاسی سرگرمیوں سے ایک حد تک کنارہ کش ہو چکے تھے اور خود کو پوری طرح سے ملت کی اس آواز کے لیے وقف لوح و قلم کر دیا تھا جسے آپ اسلامی ڈائجسٹ 'ہدیٰ' اور ہفت روزہ 'نئی دنیا' کے نام سے جانتے ہیں۔ لیکن اس زمانے میں بھی جب بھی موقع ملتا مولانا منت اللہ رحمانیؒ آپ سے مشورے ضرور کرتے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ملت کی ہر تحریک کو

روز نامہ نئی دنیا اور پھر ہفت روزہ نئی دنیا نے جو تقویت پہنچائی کسی اور نے نہیں پہنچائی۔ کیا یہ سچ نہیں کہ آزاد ہندوستان میں تقسیم کی ماری ملت اسلامیہ کی ٹوٹی کشتی کو منجدھار میں جن دو افراد نے سب سے مضبوط سہارا دیا، ان میں ایک مولانا عبدالوحید صدیقیؒ تھے جنھوں نے اپنی زبان اور قلم سے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا، شکست خوردہ ذہنوں کو نیا حوصلہ بخشا اور بدلے ہوئے حالات میں جینے کا سلیقہ اور ہمت سے کام لینے کا طریقہ سکھایا تو دوسرے مولانا منت اللہ رحمانیؒ تھے جنھوں نے مسلمانوں کی بکھری ہوئی قیادت کو متحد کر کے اربابِ اقتدار کو شریعت میں مداخلت اور ملی تشخص سے چھیڑ چھاڑ کرنے سے باز رہنے پر مجبور کر دیا۔ ایک بے باک صحافی اور ایک معروف عالم دین کی حیثیت سے مولانا عبدالوحید صدیقیؒ کے ملک و بیرون ملک کے بڑے بڑے علماء و قائدین سے براہِ راست تعلقات تھے۔ لیکن ان میں سے اکثر کے بارے میں مولانا کی رائے بہت زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھی مگر جن چند علماء کی آپ دل سے قدر کرتے تھے ان میں امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ بھی شامل تھے۔ امیر شریعت کے خلوص اور ان کے کردار و عمل سے آپ اس قدر متاثر تھے کہ اپنے عزیزوں کو ان سے فیوض و برکات حاصل کرنے کی تلقین کرتے۔ اور کہتے کہ یہ وہ حق آگاہ عالم اور امام ہیں جو جانتے ہیں کہ قوم کیا ہے اور قوموں کی امامت کیا ہے۔ یہ وہ مرشد و رہبر ہیں جو رسم و راہ منزل سے بے خبر نہیں۔ خود میں امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی جس بات سے بے حد متاثر رہا ہوں وہ ان کی حقیقت پسندی ہے۔ مسلم پرسنل لا کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے آپ نے ایک موقع پر کہا تھا: ''انسان کو نہ قدامت پسند ہونا چاہیے نہ جدت پسند بلکہ حقیقت پسند اور حق پرست ہونا چاہیے۔'' یہ حقیقت پسندی ان میں صرف کہنے کی حد تک نہیں تھی بلکہ عملی زندگی میں بھی وہ بے حد حقیقت پسند تھے۔

ان کے پائے استقامت میں ان حالات میں بھی لرزش نہیں آتی تھی جن حالات میں ہم نے اچھے اچھوں کو جذبات کا شکار ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ کسی بھی حال میں اپنی سمجھ داری پر حرف نہ آنے دیتے تھے۔ میں جب بھی بہار جاتا ان سے ضرور ملتا۔ مونگیر اور پھلواری شریف میں ان سے اپنی تفصیلی ملاقاتیں ہمیشہ یاد رہیں گی۔ بھاگلپور کے فسادات کے بعد جب میں متاثرہ

علاقوں کا دورہ کر کے واپس آ رہا تھا تو آنکھوں میں قتل وغارت کے وہ لرزہ خیز مناظر تھے جو کسی بھی انسان کو اندر سے ہلا دیتے ہیں۔ مولانا خود بھی بے حد مضمحل تھے لیکن ان کی نگاہیں مستقبل کے پردے میں بہت دور تک دیکھ رہی تھیں۔ انھوں نے مجھے سمجھایا۔ غصہ میں کوئی قدم نہ اٹھانے کا مشورہ دیا۔ ان کی رائے تھی کہ آج بہت احتیاط اور سمجھ داری سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے جذباتی ردعمل کے نتیجے میں فرقہ پرست طاقتیں زیادہ مضبوط ہو جائیں۔ وہ بہت غور وفکر کے بعد حکمت عملی بنانے کے حق میں تھے، نہ کہ بھاگلپور اور میرٹھ فسادات کے ردعمل میں۔ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ اس وقت اگر کانگریس اور دوسری سیکولر طاقتوں کو کمزور کیا گیا تو اس سے فسطائی جماعتوں کو فائدہ پہنچے گا۔ اور آخر وہی ہوا جس کا انھیں اندیشہ تھا۔

میں جب بھی ان سے ملا ہر بار یہی محسوس ہوا کہ ایک بہت بڑے انسان سے ملا ہوں۔ وہ ایک خانقاہ کے پیر اور ایک بہت بڑی دینی جماعت کے سربراہ ضرور تھے۔ لیکن دوسرے پیروں اور دوسرے علماء دین سے بہت مختلف تھے۔ ان میں شفقت ومحبت کا ایک بے پایاں دریا موجزن تھا۔ بناوٹ یا تصنع ذرا بھی نہیں۔ اتنا وسیع القلب عالم دین آج تک نہیں دیکھا۔ خورد نوازی کی جو شان ان میں تھی کسی اور میں نظر نہیں آتی۔ وہ یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ ان کی نگاہ جتنی قرآن وحدیث پر تھی اتنی ہی گہری نگاہ وہ عصری علوم وفنون پر بھی رکھتے تھے۔ ان کی جتنی گرفت شریعت پر تھی اتنی ہی پکڑ عام قوانین پر بھی تھی جو ان کی مجلسی گفتگو اور ان کی تقریروں میں ایسا وزن پیدا کرتی تھی کہ مخالفین بھی قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کی یہ بات آپ ان کے مسلم پرسنل لا کے موضوع پر لکھے گئے دستاویزی حیثیت کے حامل مقالات ومضامین میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ میں اس موقع پر نئی نسل کے علمائے دین کو ان مقالات کا مطالعہ کرنے اور ان ہی خطوط پر اپنی صلاحیت کو پروان چڑھانے کا مشورہ دینا چاہوں گا۔ آپ بھی اپنے اندر وہی استعداد پیدا کریں کہ ہم جیسوں کو آپ کے پیچھے چلنے میں فخر محسوس ہو۔ ورنہ اپنے قائد اور امام کی تہی دامانی کا احساس قوموں کو دیمک کی طرح چاٹ جاتا ہے۔ رہبر کی ایک ذرا سی لاعلمی کارواں کی تباہی کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔

یہ مولانا منت اللہ رحمانی کی دوراندیشی، ان کی حقیقت پسندی اور وسیع القلبی کا کرشمہ تھا کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا کنونشن، بمبئی میں مسلمانانِ ہند کے ہر مسلک کے معتمد علماء کی شرکت ممکن ہوسکی تھی۔ اور آپ ہی کے الفاظ میں ''اس کنونشن نے جہاں باہمی اختلافات کو اتحاد کا رخ دیا۔ اور آپس کے فاصلوں کو قرب سے بدلا وہیں یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ مسلم پیشوا اور رہنما اپنے جزوی وفروعی اختلافات کو بھول کر کسی بھی اہم مسئلہ پر جمع ہوسکتے ہیں اور پورے ملک کے مسلمانوں کو غور وفکر کا ایک نیا رخ دے سکتے ہیں۔''

یہ وہ زمانہ تھا جب برادران وطن کی فرقہ پرستی انتہائی ابال پر تھی۔ سرکاری اور غیر سرکاری ہر سطح پر مسلمانوں کے عائلی قوانین یعنی مسلم پرسنل لا کو نشانہ بنایا جارہا تھا۔ اس وقت کے وزیر قانون نے متبنیٰ بل ۱۹۷۲ء پیش کرتے ہوئے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ یہ یکساں سول کوڈ کی جانب سرکار کا ایک مضبوط قدم ہے۔ لاکمیشن کا چیرمین گجندر گڈکر علی الاعلان دھمکیاں دے رہا تھا کہ ''مسلمانوں کو یونیفارم سول کوڈ کو قبول کرنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کرلینا چاہیے۔ اگر انھوں نے خوش دلی کے ساتھ یہ تجویز منظور نہیں کی تو قوت کے ذریعہ یہ قانون نافذ کیا جائے گا''۔ ایسے نامساعد ماحول میں امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی نے حکومت وقت کو حقیقت کا وہ آئینہ دکھایا اور مسلمانوں کے اتحاد کی طاقت کا ایسا مظاہرہ کیا کہ اسے اپنے گریبان میں منہ ڈالنا پڑا۔ یہ کوئی کم بڑی کامیابی نہیں تھی کہ حکومت نے متبنیٰ بل واپس لے لیا اور سی آر پی سی کی دفعہ B-127 سے مسلمانوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ تحفظ شریعت کی اس لڑائی میں ہر قدم پر میں اور میرے خاندان نے ملت کے ساتھ طرح دیا۔ حق اور انصاف کی آواز کو دور تک پہنچانے میں نئی دنیا اور صدیقی خاندان کے دوسرے اخبارات ورسائل کا کیا رول رہا ہے یہ نہ اس کی تفصیل میں جانے کا موقع ہے اور نہ آپ کو اس بارے میں کچھ بتانے کی ضرورت۔

آج جب آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جیسے ادارہ کے حصے بخرے ہورہے ہیں۔ شیعہ پرسنل لا بورڈ اور خواتین مسلم پرسنل لا بورڈ جیسے ناموں سے ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں بن رہی

ہیں تو ہمیں امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی یاد انتہائی شدت سے آتی ہے۔ کاش! کوئی منت اللہ رحمانی پھر پیدا ہوتا اور ملت کی صفوں میں پھر وہی اتحاد پیدا کرتا جس نے ہمارے دشمنوں کے دانت کھٹے کر دیے تھے۔

دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین ودنیا کا سبق تیری حیات

———— ⊙⊙⊙ ————

صفی اختر ☆

ملت کے مسیحا
حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانیؒ

عارف باللہ مولانا حکیم اختر صاحب (کراچی) نے ٹنڈو جام، حیدرآباد (صوبہ سندھ) کا ایک قصہ نقل کیا ہے کہ مجھ سے ایک بار ایگریکلچر ڈپارٹمنٹ سے وابستہ بعض حضرات نے (جن میں کئی ایم ایس سی اور پی ایچ ڈی تھے) پوچھا: اللہ والوں کی صحبت کی کیا ضرورت ہے؟ جواباً میں نے کہا کہ آپ ماہر نباتات ہیں، ماشاء اللہ آپ نے ڈگریاں حاصل کی ہیں، آپ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ ''ہم (مثال کے طور پر) دیسی آم کو لنگڑا آم بناتے ہیں۔'' میں نے کہا: کیسے بناتے ہیں، کہا کہ ہم دیسی آم کی شاخ کی لنگڑے کی شاخ کے ساتھ پیوندکاری کرتے ہیں۔ ذرا سا بھی فاصلہ نہیں رہنے دیتے، کیوں کہ ایک ایک بال کے برابر بھی فاصلہ رہ جائے تو لنگڑے کی خوبو اور سیرت اس دیسی آم میں منتقل نہیں ہو سکتی۔ درج بالا مثال حضرت امیر شریعت رابع حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی صاحبؒ پر منطبق آتی ہے۔ آپ نے مختلف مکاتب فکر کے علماء، غیر علماء، مختلف تنظیموں، جماعتوں اور خانقاہوں سے وابستہ اور ناوابستہ افراد کے درمیان کچھ اسی انداز سے ارتباط (Co-ordination) کا کام کیا۔ آپ متضاد خوبیوں کے مالک تھے۔ مجھے حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ امارت شرعیہ اور دیگر کئی

☆ معاون ایڈیٹر ملی اتحاد، نئی دہلی۔

مقامات پر نشست و برخاست کی سعادت حاصل رہی ہے اور انھیں سننے اور دیکھنے کے مواقع ملے ہیں۔آپ مجھ سے بے حد مشفقانہ تعلق کا اظہار کرتے تھے، جب پھلواری شریف آتے یا دربھنگہ کا سفر ہوتا تو علمی تعلق کی بنا پر ملاقاتوں کا شرف حاصل ہوتا۔ اپنی مجلسوں میں بٹھائے رکھتے اور دعائیں دیتے۔حضرت مولانا سبھوں کو ساتھ لے کر بڑھے اور لوگوں کی قدر دانی کی وہ لوگوں کے حوصلے بڑھاتے، کسی کو ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتے تو بلا کی محبت کے ساتھ۔ان کا غصہ بھی دینی حمیت کی خاطر ہوتا، اہل اللہ کی تمام تر خوبیاں آپ میں تھیں، مونگیر کی خانقاہ کیا تھی جسے پوری ملت اسلامیہ ہندیہ کی تربیت گاہ تھی، کون وہاں نہیں گیا اور کس نے حضرت مولاناؒ سے کسب فیض نہیں کیا؟

آپ نے بھانت بھانت کے لوگوں کو جوڑ کر ملت اسلامیہ کے انقلابی کاز کے لیے کوششیں کیں اور اپنے اسلاف کے نقش قدم کو اپنا راہ نما بنایا۔ بلا مبالغہ گزشتہ چار دہائیوں میں ان کی فکری صلاحیتوں سے افراد سازی کا جتنا عظیم الشان کام انجام پایا اس کی نظیر نہیں ملتی۔اگر ایک طرف انھوں نے قطب دوراں مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کے مشن کو عملی شکل دینے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا تو دوسری جانب ملک وملت کو درپیش مختلف چیلنجز کا منہ توڑ جواب دینے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی اور اس کام کے لیے امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ کو مرکزیت دے کر مختلف الجہات اقدام کیے۔انھوں نے دین و دنیا کو الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں کیا، بلکہ ہر ایک کام کو حسن نیت اور مجاہدہ نفس کے ساتھ محض اللہ کی رضا وخوش نودی کے لیے کیا۔

آپ ۱۹۵۷ء میں امارت شرعیہ کے باضابطہ امیر شریعت منتخب ہوئے اور تمام تحریکیں یہیں سے برپا کیں، خواہ آج اس کا دفتر جہاں بھی ہو۔ملک بھر کے علماء، زعما، مشائخ، ہمدردان قوم وملت اور ارباب فضل وکمال کو جوڑنے اور ان سے کام لینے کا آپ کے اندر زبردست ملکہ تھا۔حضرت امیر شریعتؒ بے حد وسیع النظر اور صاحب ورع وتقویٰ عالم دین تھے، وہ اللہ والے تھے اور عقابی نگاہ رکھتے تھے، جسے ذی صلاحیت پایا اس کی صلاحیتوں کو مزید پروان چڑھایا اور ملت اسلامیہ کے فوز وفلاح کے لیے اوران سے بھرپور استفادہ کیا۔آپ مردم خیز تھے، مردم خور

نہیں۔ آپ ایک ایسے مردم شناس و مردم ساز تھے کہ افراد کی تلاش و جستجو محض تعمیری کاموں کے لیے کرتے، تخریب کے لیے نہیں۔ امیر شریعت نے جس کے اندر جو خوبو محسوس کی، اسے پوری للّٰہیت و اخلاص کے ساتھ کام پر لگایا، افراد کی تلاش و جستجو ہمیشہ جاری رہتی، وہ جہاں جاتے وہاں کی مٹی سے غیر معمولی تعلق رکھتے، جو کام کا ملتا، اسے گلے لگاتے، اس کی تربیت فرماتے۔ اس کے اندر کے جوہر کو مزید نکھارتے اور محض اللہ کی رضا کی خاطر اس سے محبت و عقیدت کا معاملہ کرتے۔ ان کی پوری زندگی سراپا دین تھی وہ دین کی خاطر اللہ کے بندوں سے محبت کرنے میں اپنی نظیر آپ تھے۔ آپ جن کی صلاحیتوں کا ادراک کر لیتے، اسے ہرگز نہ چھوڑتے خواہ وہ جس قدر بھی عدیم الفرصت ہو اور جس کے ہاتھ آنے کے امکانات بھی معدوم ہوں۔ واقعہ ہے کہ مجنوں لیلیٰ کی خاطر دیوانہ پھرتا تھا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ بقول مولانا رومیؒ ''وہ ہر خاک کو سونگھتا تھا'' حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی پوری حیات مبارکہ اس مثل کا مصداق کہی جا سکتی ہے۔

جن اصحاب نے حضرت امیر شریعت کو اپنے لیے نشانِ راہ بنایا وہ کامیاب و بامراد رہے، اور جنھوں نے گلہ و شکوہ اور منفی طرز عمل کو اپنی زندگی کا جزو لاینفک بنالیا، ناکام و نامراد ہوئے۔ حضرت امیر شریعتؒ کی حیات مبارکہ کے اتنے روشن ابواب ہیں کہ ان پر بہت کچھ کام کرنے کی ضرورت تھی، علم و عمل کے ساتھ اللہ نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ میں اصابت رائے کی بھی بے پناہ صلاحیت ودیعت کردی تھی، مشکل ترین حالات میں بھی انھوں نے خود کو جمانے (Assertion) میں کہیں کسی سے Compromise کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، ایسے لوگ خال خال ہوتے ہیں۔ آپ کے نظریات میں حد درجہ اعتدال و توازن تھا، لوگوں کے دلوں میں آپؒ کا اور آپؒ کے دلوں میں (بلاتفریق چھوٹے بڑے) سبھوں کا احترام تھا، آپ نے اس ملک کے مسلمانوں کی بروقت اور صحیح سمت میں رہنمائی کی۔ عوام و خواص دونوں کو بیک وقت جوڑ کر آپؒ نے محض اخلاص و للّٰہیت کی بنیاد پر خدمت دین کا فریضہ انجام دیا، علم و حلم، ذکاوت و دیدہ وری میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔

حضرت امیر شریعت رابع کے وصال کے فوری بعد ان کی زندگی کے روشن ابواب کو اجاگر کرنے اور ان کی حیات مبارکہ کے اہم گوشوں پر علم وتحقیق کا سلسلہ شروع کرنے کی ضرورت تھی۔ اگر ایسا کچھ اب سے پندرہ برس پہلے شروع ہوتا تو آج یقینی طور پر بہت کچھ کام ہو چکا ہوتا۔ اہل علم اور ذمے داران امارت شرعیہ کی طرف سے پورے اخلاص نیت کے ساتھ کام شروع کیا جاتا تو قابل ذکر تحقیقی کام ہوسکتا تھا لیکن اس میں بہت تاخیر ہوئی، تاہم صدیوں بعد بھی کام ہوتے ہیں، اب بھی گنجائش ہے۔

اللہ کرے کہ پورے اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ حضرت امیر شریعتؒ کے چلائے عظیم مشن کو ہم اپنی زندگیوں میں نافذ کرنے کے اہل ہوسکیں۔

———— ⊙⊙⊙ ————

مفتی محمد ارشد فاروقی ☆

مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کی چند نمایاں خصوصیات

مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کے نمایاں اوصاف میں بنیادی صفت تربیت و شخصیت سازی اور رجال کار تیار کرنا تھی۔ وہ حکیمانہ و مشفقانہ اور مربیانہ برتاؤ فرماتے، حوصلہ افزائی کا کوئی موقع نہ چھوڑتے، ان کی تنبیہات بھی عنایات ہوتیں۔ قاضی مجاہد الاسلام قاسمی نے راقم کے ساتھ پیش آئے ایک واقعہ سے متاثر ہو کر اپنا واقعہ اور حضرت رحمانی علیہ الرحمہ کی تفہیمی گفتگو نقل فرمائی۔ فرمایا میں جواں سالی کے دور میں بہار کے کسی گاؤں کے جلسے میں تقریر کر کے واپس لوٹنے لگا تو منتظمین جلسہ نے نذرانہ کی رقم پیش کی، میں نے معذرت کر دی، اب پورے علاقے میں مشہور ہو گیا کہ یہ مولوی بڑا نذرانہ چاہتا ہے۔ حضرت امیر شریعتؒ نے مجھے بلایا اور فرمایا: ''بیٹے جب کوئی کچھ پیش کرے تو قبول کر لیا کرو۔ قاضی جی فرماتے ہیں آج بھی اس جملے کی مٹھاس کانوں میں رس گھولتی ہے''۔

حضرت رحمانیؒ کی تربیت کی کرشمہ سازی ہے جو جامعہ رحمانی کے فضلاء کی ایک جماعت تدریس، افتاء، قضا، تالیف و تصنیف اور خطابت سے متعلق تیار ہو گئی۔ جس کا علمی وقار اہل علم کی نظر میں معتبر ہے۔ قاضی جی فرماتے ہیں: ''امیر شریعت عصرانہ میں شریک اساتذہ جامعہ رحمانی سے پیش

☆ سرائے میر، اعظم گڑھ (یوپی)

آمدہ نئے مسائل کے حل کے بارے میں مذاکرہ کرتے، اور ہر شریک کے لیے موضوع متعین فرماتے، جو کچھ لکھ کر لوگ پیش کرتے، باقاعدہ اس پر بحث ہوتی۔'' اس طرح جامعہ رحمانی کے اساتذہ اور نئے علماء کی فکری اور نظری تربیت ہوتی، وہ اپنی فکری بلندیوں میں دوسروں کو شریک کرتے تھے، اور ترقی کی راہ ہموار کرتے تھے۔ کچھ ایسا ہی طریق کار انھوں نے عائلی قوانین کی ترتیب میں اختیار کیا۔ اس طرح عائلی قوانین پر خاصا فقہی ذخیرہ تیار ہو گیا۔ انھوں نے ملک کے کئی معتمد اصحابِ علم کو خانقاہ رحمانی مونگیر میں بار بار ہفتوں جمع رکھا، اور اجتماعی غور وفکر، تحریر وتالیف، صحت مند بحث وتمحیص کا عادی بنایا۔ حضرت رحمانیؒ کے اسی منفرد انداز تربیت کا شاہکار ''مجموعہ قوانین اسلامی'' ہے، جسے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور مولانا محمد ولی رحمانی نے ملت کے سامنے پیش کیا ہے۔

امیر شریعتؒ کے اسی اسلوب تربیت نے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے لیے فکری اور عملی راہ ہموار کی۔ حضرت کا یہ ذوق ورثہ میں حضرت قاضی صاحب کو ملا، اور فقہ اکیڈمی کے جھنڈے تلے عالمی سطح کے فقہاء، علما اور علوم جدیدہ کے ماہرین جمع ہو گئے۔ امیر شریعتؒ کے حسن تربیت نے قاضی مجاہد کو مجاہد ملت اور صدر مسلم پرسنل لا بورڈ بنایا تو محترم مولانا محمد ولی رحمانی صاحب کو سکریٹری بورڈ و بہترین جانشین بنایا۔

حضرت امیر شریعتؒ کی ایک اہم خصوصیت موقع شناسی اور بروقت اقدام تھا۔ انھوں نے ان خطرات کو محسوس کر لیا جو مسلم عائلی قوانین کے گرد منڈلا رہے تھے، وہ متبنیٰ بل جیسی ترمیمات کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ اور مشاہیر وقت کے مشورے اور باہمی تعاون سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ قائم ہو گیا۔ اور مسلم عائلی قوانین کے تحفظ کے لیے ایک مشترکہ پلیٹ فارم ملت کو مل گیا۔

مولانا رحمانیؒ ہر اس مسئلہ پر نظر رکھتے جو ملت کے لیے مضر ہو یا دین کے خلاف ہو اور بروقت اس کے خلاف قدم اٹھاتے۔ مولانا رحمانیؒ کی ایک شان جرأت و بے باکی تھی۔ وہ اعلان حق میں فاصدع بما تؤمر پر عامل اور لا یخافون لومۃ لائم کے سچے مصداق تھے، ملک میں ایمرجنسی کے دوران جبری نسبندی کے خلاف علماء کی زبانیں گنگ تھیں، تاویلیں کی جا رہی تھیں اور مولانا

رحمانی دہلی میں علمائے کرام کو یکجا کر کے جبری نس بندی کی حرمت کا فتویٰ جاری کر رہے تھے، کتابچے تقسیم فرما رہے تھے، جرأت و بے باکی کی اس سے اعلیٰ مثال پیش کرنا مشکل ہے۔

مولانا رحمانی علیہ الرحمہ کلمۂ حق عند سلطان جائر کا ہمیشہ مظاہرہ کرتے، اور عزیمت کی خاردار وادی میں اترنے کو پھولوں کی سیج پر چلنے پر ہمیشہ ترجیح دیتے۔ مولانا دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن کی حیثیت سے بدون رورعایت رائے کا اظہار فرماتے۔

جب عراق نے کویت پر حملہ کیا تو اس ظلم کے خلاف مولانا رحمانیؒ نے آواز اٹھائی اور ان کے مشورہ سے جب کویت کی حمایت میں باقاعدہ کانفرنس ہوئی جس میں حضرت مولانا احمد علی قاسمی اور مولانا محمد ولی رحمانی پیش پیش تھے تو حضرت امیر شریعتؒ نے اس میں شرکت فرمائی، اور خطبہ بھی پیش کیا۔ انھوں نے صدام حسین کے ظالمانہ رویہ کی مذمت کی حالاں کہ اس وقت رائے عامہ صدام کو صلاح الدین ایوبی قرار دے رہی تھی۔ ملکی مسئلہ ہو یا بین الاقوامی وہ اس میں حق کی حمایت کرتے، مقدور بھر آوازۂ حق بلند کرتے اور ملک کے دستوری حق کو استعمال کرتے۔ جلسے، جلوس، مظاہرے، حسب ضرورت ان تمام چیزوں میں شامل ہوتے۔

مولانا رحمانی علیہ الرحمہ کی تمام نمایاں خصوصیات میں رنگ بھرنے والی خصوصیت خلوص وللّٰہیت تھی، وہ اخلاص کے پیکر، للّٰہیت کے مظہر تھے۔ اخلاص کی روح پھونکنے والے قرآنی تصوف کے حامل ہی نہیں داعی ومنادی بھی تھے وہ صاحب سلسلہ روحانی بزرگ تھے اور تلاوت کتاب تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ کے قرآنی اصول کے آئینہ دار تھے۔ اس عالم ربانی سے ایک عالم نے فائدہ اٹھایا اور عالم باقی کا توشہ تیار کیا۔ ان کے جانشین مولانا محمد ولی رحمانی صاحب پر یہ جملہ قرآنی وکان ابوهما صالحا صادق آتا ہے۔ مرحوم نے ان کے لیے سرسبز وشاداب لہلہاتی کھیتی کی آبیاری کی ذمے داری چھوڑی ہے۔ جو یقیناً کنز لهما کے مصداق ہے۔ مولانا رحمانی علیہ الرحمہ رحمانی صفات سے متصف تھے۔ اللہ تعالیٰ مولانا علیہ الرحمہ کو جنت میں صالحین و شہداء، صدیقین اور نبیین کی رفاقت نصیب فرمائے۔ آمین

⊙⊙⊙

ڈاکٹر عبدالقادر شمس قاسمی ☆

امیر شریعت

حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ

دین و شریعت کے نگہبان اور ملتِ اسلامیہ کے قافلۂ سخت جاں کے میر کارواں حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ قوانین شرعی کی حفاظت اور اس کے عملی نفاذ کے لئے جس قدر بے چین و مضطرب تھے، اس کا صحیح اندازہ تو ان کے رفقاء اور وہ لوگ ہی لگا سکتے ہیں، جنہوں نے ان کی صبح و شام، ان کے گفتار و کردار اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو نہایت قریب سے دیکھا ہو۔ راقم نے حضرت موصوف سے متعلق ان کے عزیز ترین اور سچے جانشین حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کی خدمت و تربیت میں دس برسوں تک رہنے کے دوران جو کچھ سنا اور پڑھا اس کی بنیاد پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ بیسویں صدی میں اس جیسا علم و عمل کا پیکر اور عزم و ہمت کا کوہ گراں پیدا نہیں ہوا اور سچی بات یہ ہے کہ مسلم پرسنل لا کے تعلق سے جو شعور و فکر اور بیداری ہندوستان میں آئی وہ موصوف کی ہی مرہون منت ہے۔

حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے اندر ملی حمیت اور قوانین اسلامی کے نفاذ کی لو

☆ سب ایڈیٹر ہفت روزہ عالمی سہارا، نئی دہلی

مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے جلائی تھی، جسے سخت سے سخت حالات اور تیز و تند آندھی میں بھی وہ روشن رکھنا چاہتے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اسلام دشمن عناصر حکومت کے ذریعہ قوانین اسلامی پر شب خون مارنا چاہتے ہیں تو وہ اسے برداشت نہ کر سکے اور اپنی بے چینی کا اظہار اس وقت کے طبقۂ علماء کے سرخیل حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے کیا۔ پھر کیا تھا دونوں ہی بزرگوں نے اپنی فراست ایمانی، ملی غیرت اور عزم و ہمت و خود اعتمادی کے ساتھ ایک ایسی فضا تیار کی کہ دسمبر 1972ء میں ممبئی میں ایک ایسا تاریخ ساز اجلاس منعقد ہوا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ ایک ہزار سے زائد علماء قائدین اور پانچ لاکھ سے زائد سامعین کا ایک ایسا اجتماع جہاں نہ کوئی دیوبندی تھا نہ کوئی بریلوی اور نہ کوئی شیعہ تھا نہ سنی، بلکہ کلمہ واحدہ کی بنیاد پر سب ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوکر جوش ایمانی کا بھرپور مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس بے مثال اتحاد کا سہرا حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے سر جاتا ہے، جن کی وسعت ذہنی اور شب و روز کی جدوجہد سے ہی ایسا منظر سامنے آیا تھا۔ اس اجلاس کے نتیجے میں ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کا قیام عمل میں آیا اور مولانا منت اللہ رحمانیؒ اس کے بانی جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام سے لے کر ملک کے ہر گوشے میں اس کے تعارف تک ہر جگہ مولانا رحمانیؒ نمایاں نظر آتے ہیں۔ کشمیر سے کنیا کماری تک اور گجرات سے بنگال اور آسام تک کی مہمات اور تحریک کو جو بے مثال کامیابی ملی اس کے پیچھے حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی پرکشش شخصیت اور جہد مسلسل کارفرما تھی۔ ممبئی، حیدرآباد، رانچی، پٹنہ، کلکتہ اور ملک کے بیشتر حصوں میں منعقد ہونے والے بورڈ کے اجلاسوں کے متعلق ملک و بیرون ملک کے بے شمار بڑے بڑے اجتماعات میں شریک رہنے والے حضرت مولانا علی میاں ندویؒ فرماتے ہیں کہ ''میں نے کبھی بورڈ کی طرح پرتاثیر و پرہجوم اجلاس نہیں دیکھے''۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام بہار و اڑیسہ کے چوتھے امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کا عظیم کارنامہ ہے۔ انہوں نے بورڈ کو پوری ملت کی نمائندہ جماعت اور اس کو ایک عظیم قوت میں تبدیل کرنے میں بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ مسلم پرسنل لا بورڈ کو

ملت کے تمام طبقوں اور صاحبانِ اقتدار کے گلیاروں میں جو وقار واعتماد حاصل ہے، وہ انہیں کے طفیل ہے۔ انہوں نے بیش قیمت لٹریچر خود تحریر فرمائے اور کچھ دوسروں سے لکھوائے اور انہیں مختلف زبانوں میں شائع کروا کر مسلمانوں کو اپنے عائلی قوانین کے تحفظ کے سلسلہ میں شعور وفکر اور علم وآگہی سے نوازا اور شریعت پر کسی بھی جانب سے ہونے والے حملوں کا دندان شکن جواب دینے میں ذرا بھی تساہل سے کام نہیں لیا۔

حضرت ممدوح کا ایک اہم علمی کارنامہ ''قوانین اسلامی کی تدوین'' ہے جو انہوں نے ممتاز علماء وفقہا اور ماہرین قانون کے ذریعہ مرتب کرائی۔ اور اس کتاب کو حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کے دور صدارت میں علماء وفقہاء کی جماعت نے کئی بار نظر ثانی کی اور پھر یہ شائع ہوئی۔ مگر افسوس کہ اس اشاعت میں کتاب کا تقریباً ایک تہائی حصہ شامل اشاعت ہونے سے رہ گیا پھر دوسری اشاعت میں مکمل طور پر کتاب شائع ہوئی۔ یقیناً یہ کتاب دار القضاء اور ملکی عدالتوں میں مستند ماخذ اور حوالہ کا کام دے رہی ہے جس میں عائلی قوانین کی دفعہ وار تدوین کی گئی ہے۔ اس کتاب نے قانون دانوں کو ان کتابوں سے بے نیاز کر دیا جو انگریزوں نے مسلم ماہرین سے لکھوائی تھی اور وہی کتابیں آج ملکی عدالتوں میں مقدمات کے فیصل کرنے میں معاون ومددگار ہیں۔

حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے ہندوستانی مسلمانوں کو مسلم پرسنل لا بورڈ کی صورت میں ایک مرکز عطا کیا ہے جو داخلی اور خارجی طور پر انہیں نہ صرف مستحکم کرتا ہے بلکہ ایک زندہ قوم کی طرح جینے کا سلیقہ بھی سکھاتا ہے۔ اللہ ان کے نشانِ راہ پر چلنے کی توفیق دے، آمین۔

⊙⊙⊙

مولانا عین الحق امینی قاسمی ☆

حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ

نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

امیر شریعت رابع حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کو ہم سب سے جدا ہوئے پورے چودہ برس ہو گئے۔ اس درمیان نہ جانے کتنی بار اُن کی قوم نے انھیں خراج عقیدت پیش کیا اور اپنی اپنی تحریروں کے ذریعے یاد کیا۔ مگر ہزاروں صفحات سیاہ کرنے اور اُن کے روشن کارناموں کو نئی نسل تک پہنچانے کے لیے سیمینار کے انعقاد کے باوجود ہمیں یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ ع

"حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا"

یہ اس لیے کہ حضرت امیر شریعتؒ اوصاف و کمالات کی جن بلندیوں پر فائز تھے اور اللہ نے اُنھیں جن خصوصیات سے نوازا تھا وہ گویا اُنھیں کا حصہ تھا۔ وہ بیک وقت علمی و دینی کتابوں کے مستند مصنف اور بلند پایہ مؤلف بھی تھے،۔ اسی کے ساتھ روحانی بزرگ بھی اور اتحادِ ملت کے جاں سوز داعی بھی۔ وہ محدث عصر بھی تھے اور فقیہ زماں بھی۔ وہ اسلامی مدارس کے رکن رکین بھی تھے اور سرپرست و ذمے دار بھی۔ وہ اسلام کے پاسباں بھی تھے اور ہندوستان میں شریعت محمدیؐ کے محافظ بھی۔ وہ ایک عالم دین ہونے کے ساتھ وقت کے بہت بڑے دانشور بھی تھے اور حالات

☆ دارالافتاء مدرسہ حسینیہ ولایت الاسلام، میرٹھ (یوپی)

کے نباض بھی۔ایک طرف ان کے اندر اخلاقی وروحانی بصارت وبصیرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی تو دوسری طرف ملک کے دستور وقوانین پر گہری نگاہ بھی تھی۔حالات سے پیدا ہونے والے مسائل کے استنباط میں ید طولیٰ رکھتے تو قومی وملی سطح پر الجھے ہوئے مسائل کے حل کے لیے بھی عجم کا حسن طبیعت اور عرب کا سوزِ دروں رکھتے تھے۔ پروفیسر یونس حکیم سابق چیئرمین بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ نے اس قدآور شخصیت کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے:

''حضرت امیر شریعت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کی ایک شخصیت میں کئی شخصیتیں خدا تعالیٰ نے جمع کر دی تھیں،ایک تبحر عالم،صاحب نظر فقیہ، استاذ،مرشد،ملت کے مسائل پر گہری نظر رکھنے والے رہنما اور قانون شریعت کے نفاذ،اس کے احترام کا تحفظ اور اس کی بقا کے لیے بے چین روح کو اگر کسی ایک شخصیت میں دیکھنا ہو تو ۳ر رمضان المبارک کی رات تک انھیں دیکھا جاسکتا تھا۔وہ دسیوں اداروں کے سرپرست بھی تھے۔تقریباً پندرہ لاکھ انسانوں نے اُن کے ہاتھ پر توبہ کی اور بیعت ہوئے اور یہ ساری چیزیں اسی ایک شخصیت میں جمع تھیں،جنھیں ہم امیر شریعت کہتے ہیں۔خدا تعالیٰ نے اُنھیں مختلف النوع صلاحیتوں،شکست نہ ماننے والے اور نہ تھکنے والے عزم وحوصلے سے نوازا تھا۔''

لیس علی اللہ بمستنکر
ان یجمع العالم فی واحد

آپ کے تمام اوصاف وکمالات میں جو وصف ممتاز مقام کا حامل ہے وہ ان کے اندر پایا جانے والا عزیمت واقدام کا جذبہ ہے۔امیر شریعتؒ کی اس تحریر کو پڑھئے جو انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے نام پیغام کے طور پر مرتب کی تھی:

''آپ اس ملک میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں،ملک کی تاریخ کو نیا رخ دے سکتے ہیں،بشرطیکہ آپ اس کے لیے آمادہ ہوں،اتنی سی بات یاد رکھئے کہ ایک بہت بڑی تعداد کا مزاج تخریبی بن چکا ہے،اسے توڑ پھوڑ،شکست وریخت سے

خاص دلچسپی ہوگئی ہے۔ اگر آپ اس صورتحال کی اصلاح کرنا چاہیں تو اس کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہوگا کہ آپ خود بھی مضبوط ہوں، اپنی قوت جمع کریں، شرپسند فتنہ پرور اور شہری زندگی کے امن وسکون کو برباد کرنے والوں کے مقابل مضبوط اور بہترین دفاع کے لیے تیار ہوں۔ آپ کی اپنی قوت اور دفاعی صلاحیت وہ بنیادی چیز ہے، جس کے ذریعے آپ اپنی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ آپ مرنا سیکھیں، بزدلوں کو ہر روز اور ہر صبح وشام موت آتی رہتی ہے، جواں مرد ایک بار اور صرف ایک بار مرتا ہے۔ میں آپ سے صرف یہ کہوں گا کہ آپ دوسروں پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیں۔ خدا سے لو لگائیں اور اپنے مستحکم دفاع کے لیے تیار رہیں۔"

حضرت امیر شریعتؒ کی عزیمت کا نتیجہ تھا کہ کل بیس سال کی عمر میں ہی دار و رسن کو بسر وچشم قبول کیا اور چھ مہینے قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے کے بعد برطانوی سامراج کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔

خدا نے آپ کے اندر اتنا شعور ضرور دیا تھا کہ اگر آپ چاہتے تو خانقاہ رحمانی کو محض ذاتی تصنیفات وتالیفات سے دارالمصنفین بنا سکتے تھے، اگر سیاست ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناتے تو سیاسی لیڈر بن سکتے تھے۔ خانقاہ رحمانی کا جو تصور آپ کے ذہن میں تھا اگر صرف اسی کو پروان چڑھاتے تو آج اس کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا اور اگر صرف جامعہ رحمانی کی ترقی مطلوب ہوتی تو اس کی وسعت وشہرت اوجِ ثریا تک جا پہنچتی۔ لیکن انھوں نے زندگی کا جو نصب العین متعین کیا، خدمت دین وخلق کے حوالے سے جو میدان اپنایا وہ عزیمت اور قربانیوں سے پر تھا۔

آپ کے کارناموں کا احاطہ کرنے کے لیے یقیناً یہ سطور کافی نہیں ہیں:

سفینہ چاہیے اس بحرِ بے کراں کے لیے

ان سطروں کو اس حیثیت سے دیکھنا چاہیے کہ وہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالقادر شمس قاسمی

امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ سیمینار

بیسویں صدی کی عظیم و عبقری شخصیت اور دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فرزند امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ نے اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کے وقار و افتخار کے لیے غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے کارہائے نمایاں مختلف جہتوں میں پھیلے ہوئے ہیں جو یقینی طور پر علمائے امت، کارکنانِ ملت اور سرفروشانِ اسلام کے لیے سرمایۂ حیات اور نشانِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فضلائے دیوبند کی تنظیم ''تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند'' نے گزشتہ ۱۹؍ مارچ کو امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے فکر و فن پر دارالحکومت دہلی میں ایک قومی سیمینار کا اہتمام کیا۔ سیمینار بھرپور نمائندگی اور اپنی غیر معمولی افادیت کے اعتبار سے نہایت کامیاب رہا۔ ملک بھر سے ممتاز علماء و قائدین اور دانشوروں نے اس میں بڑی تعداد میں شرکت کی اور اپنے قیمتی مقالات پیش کیے۔ واضح ہو کہ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے منصوبے میں یہ امر شامل ہے کہ اکابر دیوبند کی خدمات جلیلہ کو سامنے لایا جائے اور ان کے طریقۂ کار سے دنیا کو واقف کرایا جائے جن سے حال کی اصلاح اور مستقبل کا لائحہ عمل مرتب کرتے وقت رہنمائی مل سکے۔ اسی کے تحت تنظیم نے اس سے قبل (مئی ۲۰۰۰ء) میں ''الامام محمد قاسم نانوتوی سیمینار'' منعقد کیا تھا۔

۱۹؍ مارچ ۲۰۰۵ء کو صبح ۹؍ بجے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کی فیکلٹی آف انجینئرنگ اینڈ

ٹیکنالوجی کے وسیع ہال میں سیمینار کا آغاز قاری محمد سلیمان قاسمی کی تلاوت کلام اللہ سے ہوا۔ مسند صدارت پر حضرت مولانا محمد سالم قاسمی جلوہ افروز تھے۔ سیمینار کا افتتاح آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے کیا۔ اس کے علاوہ امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین، حضرت مولانا محمد انضال الحق جوہر قاسمی، حضرت مولانا سید محمد ولی رحمانی، حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی، حضرت مولانا عبداللہ کاپودروی، حضرت مولانا مفتی عبداللہ مظاہری، حضرت مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی، ڈاکٹر عبدالحق انصاری اسٹیج کے وقار میں اضافہ کر رہے تھے۔ کھچا کھچ بھرے ہال میں علما، ذمہ داران مدارس، مختلف تنظیموں کے سربراہان، یونیورسٹیوں کے پروفیسر حضرات، سماج کے سربرآوردہ اشخاص، مختلف میدانوں کے ماہرین، میڈیا سے متعلق افراد اور دانشوران موجود تھے۔ ان میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جو دوسری ریاستوں سے تشریف لائے تھے۔ بعض اہم اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

مولانا محمد عبداللہ مغیثی، مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ، مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا فضیل احمد قاسمیؒ، مولانا عبدالاحد تاراپوری، مولانا محمد باقر حسینؒ، مولانا ندیم الواجدی، مولانا آس محمد گلزار قاسمی، مولانا سید عقیل احمد قاسمی، مولانا عبدالوہاب خلجی، ڈاکٹر محمد منظور عالم، جناب یوسف حاتم مچھالا، مولانا عتیق احمد بستوی، مولانا فخر الاسلام قاسمی (کلکتہ) پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر منظور احمد (سابق وائس چانسلر آگرہ یونیورسٹی)، پروفیسر شکیل الرحمٰن (سابق وائس چانسلر متھلا یونیورسٹی)، ڈاکٹر قاسم رسول الیاس، کمال فاروقی اور پروفیسر ڈاکٹر سید محمد اجتباء ندوی۔

اس باوقار اجلاس میں شریک ہونے والے مندوبین کا استقبال تنظیم کے کارگزار صدر مولانا عمید الزماں کیرانوی نے کیا۔ انھوں نے اپنے استقبالیہ خطبہ میں کہا کہ: ''اس سے قبل بھی تنظیم ابنائے قدیم امام قاسم نانوتویؒ پر ایک کامیاب سیمینار کر چکی ہے۔ تنظیم کی یہ کوشش رہی ہے کہ اکابر دیوبند کی دینی، ملی و علمی خدمات کا نہ صرف اعتراف کیا جائے بلکہ ان کی زندگی کے مفید گوشوں کو منظر عام پر بھی لائے تاکہ ان کے تابندہ نقوش کی روشنی میں ملت کو اپنے مستقبل کا خاکہ

تیار کرنے میں مدد مل سکے۔"

سیمینار کا افتتاح آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب نے کیا۔ انھوں نے اپنے افتتاحی خطبہ میں فرمایا کہ "ہمارے ملک کے مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے کہ ان میں برابر ایسے افراد پیدا ہوتے رہے جو اس مطلوبہ بیدار مغزی اور صحیح قوت کردار کے حامل رہے، ماضی قریب کے ایسے ہی عظیم افراد میں ہمارے اس مذاکرۂ علمی کی اختیار کردہ شخصیت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی شخصیت بھی نمایاں طریقے سے سامنے آئی۔" انہوں نے سیمینار کی اہمیت وافادیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "امت اسلامیہ ہندیہ پر جس کے لیے امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے اپنی زندگی کی توانائیاں صرف کیں، اس کا حق ہے کہ ان کی یاد کو بھولنے نہ دے اور اس کے لیے یہ مذاکرۂ علمی ان کا حق ادا کرنے کے ذرائع میں سے ایک ہے۔" انہوں نے تنظیم ابنائے قدیم کے ذمہ داروں کو اس کے لیے مبارک باد پیش کی۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری اور حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے رفیق کار امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب نے اپنے نہایت وقیع خطاب میں فرمایا کہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی زندگی کے ہر رنگ میں امت کے لیے سبق ملتا ہے۔ وہ خانقاہ میں خلق خدا کے پیرومرشد تھے تو سیاست وسماج میں رہنما۔ انہوں نے اپنی تقریر میں حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے ساتھ ۳۴ سالہ رفاقت کے کچھ واقعات سنائے جن سے حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی زندگی کے بعض اہم گوشے اجاگر ہوئے۔

تنظیم کے صدر مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمیؒ نے فرمایا کہ: مولانا منت اللہ رحمانیؒ جن عناصر سے بنائے گئے تھے وہ خالص دینی تھی، علوم بھی، فنون بھی، ماحول بھی، لیکن ان کو جو میدانِ عمل ملا وہ دین دار بھی تھا اور دنیا دار بھی اور انھوں نے دونوں کو اپنی ذہانت، جرأت اور علمیت سے نہ صرف بنایا بلکہ ترقی دی اور سنوارا"۔

تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے نائب صدر حضرت مولانا عبداللہ مغیثی صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ تنظیم ابنائے قدیم نے علماء کو مجتمع ہونے کا بہترین موقع فراہم کیا ہے۔

انہوں نے امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کو مرکز اتحاد قرار دیتے ہوئے ان کی بعض خوبیوں پر روشنی ڈالی۔

ڈاکٹر قاضی زین الساجدین قاسمی صاحب ناظم اعلیٰ تنظیم نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ تنظیم آئندہ بھی اکابر دیوبند پر اسی طرح کے سیمینار منعقد کرتی رہے گی۔ انھوں نے حضرت تجویز پیش کی کہ تنظیم کے تحت ایک فقہی وقانونی ادارے کا قیام نہایت ضروری ہے۔ انھوں نے مولانا منت اللہ رحمانیؒ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا مولانا رحمانی نہ صرف ایک ہوش مند ملی قائد تھے بلکہ انھوں نے بعض ایسے ملی اسلامی اداروں کی بناڈالی جو ہمیشہ ملت کو مولانا کا ممنون رکھے گی۔

اس کے بعد امیر جماعت اسلامی ہند ڈاکٹر عبدالحق انصاریؒ نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ: دور حاضر میں درپیش چیلنجز کے حل کے لیے ہمیں مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے افکار ونظریات سے سبق لینا چاہیے۔ ممتاز عالم دین اور کناڈا میں مقیم حضرت مولانا عبداللہ کاپودروی صاحب نے امیر شریعت کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ آج دنیا میں ہر جگہ امت مسلمہ نہایت نازک دور سے گزر رہی ہے۔ ٹورنٹو سے شائع ہونے والے انگریزی اخبارات کے صفحہ اول پر دارالعلوم دیوبند کو سنسنی خیز طور پر پیش کیا جاتا ہے، مانچسٹر کے ایئر پورٹ پر داڑھی والے مسلمان مسافروں سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا تم دیوبندی ہو؟ ایسے حالات میں علمائے امت میں اتحاد کی شدید ضرورت ہے۔ انہوں نے دارالعلوم دیوبند سے متعلق علماء کے اختلافات کو دور کرنے اور متحد ہونے کی بھی اپیل کی۔

ممتاز عالم دین اور جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ گجرات کے مہتمم مولانا مفتی عبداللہ مظاہری صاحب نے بھی اپنے خطاب میں سیمینار کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی بعض اہم خصوصیات کا ذکر کیا۔ مشہور قانون داں اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن جناب یوسف حاتم مچھالہ صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں جس ماحول میں پلا بڑھا وہ دینی نہیں تھا، اس لیے دینی شخصیتوں سے قربت بھی نہیں تھی بلکہ ہم اس زعم

میں مبتلا تھے کہ علمائے کرام جدید علوم سے بے بہرہ اور دور حاضر کے مسائل سے ناواقف ہوتے ہیں لیکن مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی قربت نے ہمارا یہ زعم باطل کر دیا۔

اخیر میں خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب نے فرمایا کہ ''گزشتہ چند سالوں میں ملت اسلامیہ ہندیہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے بہت سی ایسی مایۂ ناز شخصیات سے محروم ہوئی ہے کہ جو جلوتوں میں ملت کو زبوں حالی سے نکالنے کی جہد مسلسل میں سراپا عمل تھیں اور خلوتوں میں بارگاہ رب کریم میں گناہ گار امت خاتم الرسل پر نگاہ عفو و کرم کی بھیک کے لیے سربسجود رہتی تھیں۔ انہی میں امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانیؒ کی وہ قدآور ذات گرامی بھی ہے۔'' اپنے خطبے کے دوران انھوں نے کہا کہ اجتماعی تنظیم کی حیثیت سے مسلم پرسنل لا بورڈ میں اختلاف آراء کے مراحل پیش آئے، لیکن بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ حضرت موصوفؒ نے اخلاص و بصیرت کے ساتھ ملت اسلامیہ کی اس نمائندہ تنظیم کی مکمل نمائندگی برقرار رکھتے ہوئے مسائل مہمہ کو ناقابل فراموش کامیابی سے ہمکنار فرمایا جس پر ان کی جنرل سکریٹری کے عہدہ عظیمہ پر تاحیات برقراری کو ناقابل شکست شاہد عدل قرار دینا قطعاً مبالغہ سے خالی ہوگا۔''

بہت سے اہم حضرات جو خواہش کے باوجود بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر سیمینار میں شرکت نہیں کر سکے، ان کے پیغامات و تاثرات پیش کیے گئے۔ ان میں دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب، گورنر ہریانہ و پنجاب ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی صاحب، راجیہ سبھا کے ڈپٹی چیئرمین جناب کے رحمٰن خاں صاحب، شامل تھے۔

سیمینار کی مختلف نشستوں میں امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی زندگی کے مختلف گوشوں اور کارکردگی کے مختلف پہلوؤں پر گراں قدر مقالات پیش کیے گئے، جن میں مقالہ نگاروں نے اپنے مطالعات و مشاہدات کی روشنی میں یہ بتایا کہ کس طرح جوش ایمانی اور ملی حمیت کے ساتھ حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ اپنے فرائض منصبی انجام دے رہے تھے اور مختلف شرعی اور قومی و ملی امور و مسائل میں حضرت امیر شریعتؒ کے رجحان اور پرراز مصالح فیصلوں پر بھی روشنی

ڈالی گئی۔ درج ذیل مقالہ نگاروں نے اپنے اپنے مقالات پیش کیے:

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی صاحبؒ، مولانا عبدالحفیظ رحمانی صاحب، ڈاکٹر عبدالحق انصاری صاحبؒ، مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی صاحبؒ، مولانا محمد عبداللہ مغیثی صاحب، مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی صاحب، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب، جناب محمد عبدالرحیم قریشی صاحب، پروفیسر ظفر احمد نظامی، ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی صاحب، ڈاکٹر زبیر احمد فاروقی صاحب، مولانا محمد باقر حسین قاسمی صاحبؒ، پروفیسر بدر الدین الحافظ صاحب، مولانا احمد علی قاسمی صاحبؒ، مولانا محمد برہان الدین سنبھلی صاحب، مولانا محمد قاسم مظفر پوری صاحب، مولانا جسیم الدین رحمانی صاحب، مولانا اختر امام عادل صاحب، مولانا انیس الرحمٰن قاسمی صاحب پٹنہ، مولانا مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی صاحب، مولانا انیس الرحمٰن قاسمی صاحب بھاگلپور، مولانا سہیل احمد قاسمی صاحب، مفتی احمد نادر القاسمی صاحب، (انجینئر) شاہ محمد صدیقی صاحب، مفتی اسعد قاسم سنبھلی صاحب، شاہ عمران حسن مونگیری صاحب، مفتی ارشد فاروقی صاحب، مولانا عقیدت اللہ قاسمی صاحب، محمد اویس صدیقی نانوتوی صاحب، مولانا اظہار الحق مظاہری صاحب، محمد مشتاق ملک صاحب، حافظ امتیاز رحمانی صاحب، عبدالقادر شمس قاسمی صاحب، مولانا غیاث الاسلام رحمانی صاحب ان کے علاوہ بعض وہ مقالہ نگار ہیں جن کے مقالے اجلاس میں ان کی عدم یا غیر موجودگی کی وجہ سے نہیں پڑھے جاسکے یہ مقالے مجموعہ مقالات جن کی اشاعت ان شاء اللہ جلد ہی عمل میں آئے گی، شامل ہوں گے۔ ان مقالہ نگار حضرات کے نام حسب ذیل ہیں:

مولانا محمد اسرار الحق قاسمی صاحب، مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی صاحب، مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب، مولانا بدر الحسن قاسمی صاحب، مولانا عزیز الحسن صدیقی صاحب، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز صاحب، مولانا جنید احمد بنارسی صاحب، جناب شاہد صدیقی صاحب، مولانا سعید الرحمٰن شمس صاحب، مولانا امین عثمانی صاحب، مولانا فہیم اختر ندوی صاحب۔ سیمینار کے افتتاحی اجلاس اور مقالات کی خواندگی کی نشستوں کی نظامت مولانا مزمل الحق الحسینی صاحب اور مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی صاحب نے کی۔

دیگر شرکاء میں مندرجہ ذیل حضرات کے نام اہم ہیں:

مولانا عاصم قاسمی صاحب، مولانا منظور احمد قاسمی صاحب (کٹک)، مولانا فرید الزماں کیرانوی صاحبؒ، مولانا بدزالزماں کیرانوی صاحب، مولانا محمد خالد القاسمی صاحب، مولانا اسعد الاعظمی صاحب، مولانا وارث مظہری صاحب، مولانا نوشاد عالم قاسمی صاحب، مولانا عبدالسلام قاسمی صاحب، مفتی جمیل الرحمٰن صاحب، مولانا عبدالستار سلام قاسمی صاحب، مفتی احمد نادر القاسمی صاحب، مولانا افروز عالم قاسمی صاحب، مفتی ارشد فاروقی صاحب، مولانا یعقوب بلند شہری صاحب، قاضی ذکاءاللہ صاحب، اندور، وسیم الحق صاحب، اخبارِ مشرق، شیخ منظور احمد صاحب، یو این آئی، حاجی عرفان اعظمی صاحب، مولانا صدرالزماں صاحب، مولانا محمد انس صدیقی صاحب، راشد علی صاحب، مولانا محمد رفیق قاسمی بستوی صاحب، مولانا منقاد احمد قاسمی صاحب، مولانا عبدالواحد قاسمی صاحب، جناب ناصر رحمانی صاحب (باڑہ ہندو راؤ)، مولانا نیاز احمد ذاکر القاسمی صاحب (سرائے خلیل)، سید حامد حسین خضر صاحب (گلی قاسم جان)، مولانا افتخار حسین مدنی صاحب، چودھری راحت محمود صاحب، طارق امین صاحب، ادریس صاحب صاحب، جناب مدنی احمد صاحب، اسکول جامعہ، جناب ارشد رضوی صاحب (جامعہ)، ڈاکٹر شفیع ہاشم صاحب (دہلی یونیورسٹی)، ڈاکٹر شفیق احمد خاں صاحب (عربی ڈپارٹمنٹ، جامعہ ملیہ اسلامیہ)، ڈاکٹر حبیب اللہ خان صاحب، جامعہ ملیہ اسلامیہ، ڈاکٹر عبدالوارث خان صاحب، اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نسیم قریشی صاحب (مجلس مشاورت)، مولانا عبدالعزیز ظفر جنکپوری صاحب، مولانا رضوان اختر قاسمی صاحب، قاضی محمد کامل صاحب، مولانا محمد ذکیرالدین ذکی صاحب (ایڈیٹر ہدایت کا راستہ)، عبدالمعید خان صاحب، مشرف حسین صاحب، مولانا کلیم احمد صدیقی صاحب (پھلت)، حسین حسنی صاحب، خالد صابر صاحب، عدنان صاحب، جاوید حبیب صاحبؒ، ڈاکٹر سعید الوحیدی صاحب، عمر گوتم صاحب، حکیم ظل الرحمٰن صاحب، صفی اختر صاحب وغیرہ۔

⊙⊙⊙

ملنے کا پتہ

دارالاشاعت خانقاہ رحمانی، مونگیر